مکالمہ

کراچی

اکادمی بازیافت

مکالمہ کراچی

کتابی سلسلہ: ۱۸

ترتیب: مبین مرزا

یکے از مطبوعات: اکادمی بازیافت

مکالمہ ۱۸

اگست ۲۰۰۹ء تا جولائی ۲۰۱۰ء

کمپوزنگ : **لیزر پلس**، اردو بازار، کراچی

قیمت فی شمارہ :

۴۰۰ر روپے (پاکستان میں)

۲۵ر امریکی ڈالر (بیرون ملک)

ڈرافٹ/ پے آرڈر/ چیک بنام "مکالمہ" ارسال کریں۔

رابطہ : آفس #۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر۳، اردو بازار، کراچی
فون : ۳۲۷۵۱۴۲۸ ای میل : a.bazyaft@yahoo.com

ترتیب

نوبیل امن

نظمیں

خصوصی مطالعہ

طنز و مزاح

تراجم

تبصرے

☆☆☆

حرفِ آغاز

ادب میں وفاداری

ادب میں وفاداری سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کو یوں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ ادیب جب اپنی وابستگی کا اظہار کرتا ہے تو کس سے اور کس بنیاد پر؟ آیا کسی فکر یا نظریے کی بنیاد پر وہ اپنا یہ رشتہ استوار کرتا ہے کہ لسانی یا علاقائی بنیاد پر یا پھر وہ تہذیبی یا مذہبی بنیاد پر ایسا کرتا ہے یا ان سب سے الگ اور کوئی حوالہ اس کے پیشِ نظر ہو سکتا ہے؟ سوال کسی بھی طرح قائم کیا جائے، لیکن اس ذیل میں تفتیش اس بنیاد کی ہوگی جو ادیب کے یہاں وابستگی کا جواز حق ہے اور جس کے لیے وہ اپنے ہنر کو آزماتا ہے۔

کب سے ہمارے یہاں یہ مصرع گونج رہا ہے:

وفاداری بشرطِ استواری

اسی طرح گوئٹے نے کارلائل کے نام خطوط میں ایک جگہ لکھا ہے:

A genius is nothing but loyalty.

گویا مشرق ہو یا مغرب، دونوں ہی جگہ یہ مسئلہ عرصے سے توجہ طلب چلا آتا ہے۔ اپنے عصری، معاشرتی اور تہذیبی تناظر میں آج پھر یہ سوال ہمیں ایک نئی تفتیش کی دعوت دیتا ہے۔ مراد یہ کہ دوسرے بہت سے سوالوں کی طرح یہ سوال بھی ہمارے ادب میں بالکل نیا تو نہیں ہے۔ تاہم یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں، اس لیے کہ ہر عہد اپنے تناظر میں بڑے سوالوں کو بار دگر اٹھا کر دیکھتا ہے اور اپنے حوالے سے ان کے جوابات طلب کرتا ہے۔ یوں بھی جب قیامِ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں یہ سوال ہمارے یہاں پوچھا گیا تھا، اس وقت اس کی نوعیت کچھ اور تھی۔ ایک نئی اور نظریاتی مملکت کے قیام کے فوری بعد، دائیں اور بائیں کی باہم آویزش قوتوں کی کشاکش کے مابین دنیا میں جب تہذیبیں ایک نقطۂ توازن کی تلاش میں تھیں، اس وقت اس سوال کا معنی وہ نہیں تھا، جو آج ہے۔ اس لیے کہ آج ہم یک قطبی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں طاقت کے توازن کا تصور مفقود ہے، اس لیے کہ اقتصادی، سیاسی اور

حربی اعتبار سے ایک غالب قوت یا مقتدرہ اپنی منشا اور مفادات کے تحت اس دنیا کی نظام سازی کر رہی ہے بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں، یہ نظام بڑی حد تک اب دنیا کے مختلف خطوں میں رُو بہ عمل ہے اور اس کے زیرِ اثر اس دنیا کی صورت بھی بدل رہی ہے۔ یہ تبدیلی کہیں سیاسی نوعیت کی ہے تو کہیں جغرافیائی اور کہیں اقتصادی نوعیت کی۔

سارا ماجرا فقط اسی پر موقوف نہیں بلکہ آج کی دنیا نصف صدی قبل کی دنیا سے یوں بھی بہت مختلف ہے کہ اس میں زندگی کے اسلوب اور انسانی تجربہ و احساس کے سانچے میں بھی نمایاں قسم کی تبدیلی آئی ہے۔ اس تبدیلی کا سرنامہ ٹیکنالوجی میں برپا ہونے والا انقلاب ہے، جس نے ایک طرف رسل و رسائل اور نقل و حمل کی دنیا کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو دوسری طرف اس کے زیرِ اثر روزمرہ انسانی صورتِ حال میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کا غیر معمولی اثر انسانی سائیکی میں آنے والے تغیر کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ چناں چہ وہ جو کہا جاتا ہے کہ اب ہم ایک گلوبل ولیج میں سانس لے رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ صرف حقیقتوں کی نوعیت بدل گئی ہے بلکہ ان کے انکشافات کا تناسب اور رفتار بھی بدل گئی ہے۔

اس گلوبل ولیج میں ذہنِ انسانی کے عصبی رویے بالکل نہیں بدلے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زیادہ نمایاں اور مستحکم ہوئے ہیں لیکن قوموں اور تہذیبوں کے وہ امتیازی نقوش جو ان کے نظامِ اقدار اور طرزِ حیات میں ظاہر ہوتے تھے، وہ ماند پڑتے جاتے ہیں — اور یہ کام قدرے تیزی سے ہو رہا ہے۔ غالب نے جب کہا تھا:

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

تو اس کے پیشِ نظر مسئلہ ترکِ رسوم کا تھا جب کہ عہدِ جدید کا تہذیبوں سے مطالبہ اپنے اپنے اصل اصول سے دست برداری کا ہے۔ دراصل عہدِ جدید پورے عالمِ انسانی کو ایک ایسا ریوڑ بنانا چاہتا ہے جسے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا سکے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ پورے انسانی سماج کو ایک روبوٹ قسم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنا عہدِ جدید کا منشا ہے۔ اس کے لیے جو کاوش اور اہتمام کیا گیا ہے، اس کے خاطر خواہ نتائج بھی حاصل ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ سعدی، حافظ، رومی اور قاآنی کی قوم یا بابا فرید، بابا بلھے شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کی قوم یا اسی طرح میر، غالب، انیس اور اقبال کی قوم ذرا ایک نظر خود پر ڈال پائے تو باآسانی اندازہ کر سکتی ہے کہ کولا، فاسٹ فوڈ، موبائل اور انٹرنیٹ والی قوم کے سانچے میں پوری طرح فٹ بیٹھنے میں اُسے مزید کتنا وقت درکار ہوگا۔

تمہید نے طول کھینچا لیکن اس صراحت کے بغیر ہم اپنے سوال کی نوعیت اور معنویت کو اپنے عہد کے سیاق و سباق میں درست طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ تو آیئے اس سوال کو ایک بار پھر قائم

کرتے ہیں ـــــ اب سوال یہ کہ عہد جدید کے اس گلوبل ولیج میں کہ جہاں تہذیبیں اپنا اقداری نظام کھو رہی ہیں اور ان کے امتیازی نشانات زائل ہو رہے ہیں، ذہنی سرگرمیوں کا مزاج اور جذبہ و احساس کا رنگ بدل رہا ہے، ادیب کی وابستگی کس سے ہوگی یا ادب میں وفاداری سے کیا مراد لی جائے گی؟

ادب اور ادیب کا سروکار انسانیت سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کی وفاداری بھی بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق ملک و ملت، انسان سے اور انسانیت سے ہونا چاہیے۔ انسانیت کے آدرش ادب کے آدرش ہونے چاہئیں۔ بادی النظر میں یہ جواب درست اور جامع ہے، لیکن دشواری یہ ہے کہ آج کے مخصوص انسانی حالات کے پیش نظر یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہو چکا ہے، لہٰذا آج یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ جواب اپنے اندر جو مثالیت لیے ہوئے ہے، کیا وہ اس عہد کی زندگی کے ٹھوس اور اٹل حقائق کے مقابل میں کوئی معنویت اور کوئی جواز رکھتی ہے؟ یا نہیں ـــــ!

ادیب کے خواب، اس کی تمنائیں، آرزوئیں اور اس کے آدرش خواہ کتنے ہی بلند، مثالی اور مثالیت پسندانہ کیوں نہ ہوں لیکن اس کا تمام تر سروکار اپنے عہد کی حقیقتوں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے خواب اگر زندگی سے ربط استوار نہیں کرتے اور متشکل نہیں ہوتے، تو وہ صرف اور صرف خواب ہیں، محض فینٹیسی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ خواب اور فینٹیسی بھی ادب کے Paraphernalia میں بے کار نہیں ہوتے، کام آتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ادب کے اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں کُل ادب بہر حال نہیں ہیں۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی ادب حقیقت سے ماورا نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقت اپنے عصری، سماجی اور تہذیبی تناظر سے لاتعلق نہیں ہو سکتی۔ حقیقت انفرادی ہو یا اجتماعی اس کی معنویت کا تعین زمانی و مکانی حوالوں کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ چناں چہ ادیب اپنے زمانے سے لاتعلق ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنی زمین سے۔ اس کا فن ان دو حوالوں کے بغیر تعین قدر کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ وہ جس انسانی تجربے کی جمالیاتی تشکیل کرتا ہے، وہ زمان و مکاں سے مشروط ہے۔ ان حوالوں کے بغیر قدر و قیمت تو رہی ایک طرف، اس واقعے کی واقعیت کا اثبات تک نہیں ہو سکتا۔

اگر آج یہ سوال کہ ادب کسی نظریے کے تحت تخلیق ہو سکتا ہے یا نظریے کے بغیر، اتنا اہم نہیں رہا تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ایسی بحث طلب نہیں رہی کہ ادیب کا مشرب انسانیت بہ حیثیت قدر ہے کہ نہیں۔ اس لیے کہ جس طرح یہ طے ہو چکا ہے کہ وہ شے جو کسی ادبی نگارش کو بڑا بناتی ہے، وہ ادیب کا نظریہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ کچھ اور عناصر ہوتے ہیں جو کسی نظریے کے ہونے یا نہ ہونے سے مشروط نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ادیب کا پہلا سروکار اس انسانی، سماجی اور تہذیبی دائرے سے ہوتا ہے جس میں وہ جی رہا ہے، جو اس کے مشاہدات، تجربات، تعقلات یہاں تک کہ تعصبات تک کی بنیاد میں عامل کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس مرحلے پر اس امر کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے سماج اور اس کے اقداری نظام سے ضروری نہیں کہ ادیب کا رشتہ قبول ہی کا ہو، یہ رد کا بھی ہو سکتا ہے۔

ادیب یوں بھی اپنی فطرت میں non-conformist ہوتا ہے۔ اپنے عہد اور اپنے سماج سے عدمِ اطمینان کا اظہار وہ آزادی سے کرسکتا ہے، بلکہ اگر وہ عدمِ اطمینانی محسوس کرتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کا اظہار کرے۔ اسی سے اُس کے فن کو آب ملتی ہے اور بیان کو تاثیر۔ تاہم معاملہ قبول کا ہو یا رد کا، ادیب کا رشتہ بہرحال اپنے عہد اور اپنے سماج سے ہوتا ہے۔

ادیب کی اپنے سماج سے وابستگی کی ضرورت اور اہمیت محض آج کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ یوں دیکھا جائے تو گوئٹے اور ٹامس مان کو جرمن سماج سے، جب کہ چوسر اور شیکسپیئر اور وکٹورین عہد کے سارے ناول نگاروں کو برطانوی سماج سے اپنی وابستگی عزیز تھی، ہیلس نے تو جنگ کے زمانے میں نغمے تک لکھے تھے اور ٹی ایس ایلیٹ تو اپنی سماجی وابستگی پر باقاعدہ اصرار کرتا ہے۔ اسی طرح روس کے عہد زریں کے جس افسانہ یا ناول نگار کو اٹھا کر دیکھیے ٹولسٹوئے، دوستوئیفسکی، گورکی، چیخوف، شولوخوف سب کے سب اپنے سماج سے وابستگی کو اعزاز جانتے تھے، یہ الگ بات کہ مقتدرہ اور کلیسا سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے۔ اسی طرح فرانس میں فلوبیئر، بالزاک، بودلیئر، والیری اور راں بو کو دیکھ لیجیے، وہ چاہے اپنے سماجی ڈھانچے کی کمزوری اور خامی سے کتنے ہی نالاں اور شاکی ہوں لیکن اپنی وابستگی کا اظہار اسی سے کرتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے مختلف معاشروں اور مختلف ادوار میں ہمیں اپنے عہد اور اس کی انسانی اور مخصوص سماجی صورتِ حال سے ادیبوں کی وابستگی اور وفاداری کا اظہار کھلے بندوں نظر آتا ہے۔ سو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں اگر آج ہم اپنے ادیب سے اس کا سوال کرتے ہیں۔

دیکھا جائے تو عہدِ جدید کے ادیب کے ساتھ تو مسئلہ اور گمبھیر ہے۔ اس کی انسان دوستی یا انسانیت پسندی اپنی جگہ، مگر اس عہد میں جس طرح تہذیبوں کو فنا کا اور شناخت کے گم ہوجانے کا خوف لاحق ہے، اس وقت تو ادیب کی بالخصوص یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے معاشرے اور اس کے تہذیبی نقوش کی بقا کا سامان بالارادہ اور بالالتزام سرانجام دے۔ انسانیت اور اس کے آدرشوں سے اس کی وفاداری بے شک اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے تو اصل میں اُسے اپنے عہد اور سماج کے انسانی رویوں اور تہذیبی رُجحانات کی فکر کرنی ہے، جس معاشرے نے اُسے انسانیت کا شعور دیا اور اقدارِ حیات سے آگاہ کیا ہے اور جو اس کے فن کے لیے raw material فراہم کرتا ہے، اس کی بقا اور پاس داری کا احساس اُسے سب سے پہلے کرنا ہے۔ چناں چہ آج پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے عہد کے مطالبات کو سمجھتے ہوئے اپنے تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے امتیازی نشانات کی بقا اور تحفظ کا نہ صرف ادراک کرنا ہے بلکہ اپنے فن کے ذریعے اس شعور کو اجاگر بھی کرنا ہے۔ اپنے فن سے، ادب سے، تہذیب سے اور انسانیت سے ان کی وفاداری کا یہی اہم ترین اور اوّلین مطالبہ ہے۔

☆☆☆

سرشار صدیقی

کعبہ

میرے چاروں طرف
بندگانِ خدا کا سمندر ہے
اور اس سمندر میں
اک موجِ لرزاں کی مانند
میں بابِ صدیقؓ کی سیڑھیوں پر کھڑا
بند آنکھوں سے
''عرشِ سیہ پوش'' کو تک رہا ہوں
میری دھڑکنیں اپنے آہنگ میں
صرف لبیک کا ورد ہیں
اور دعاؤں کی آیات
لب بستہ حرفِ تمنا کے احرام میں
گردشِ خوں کی صورت
طوافِ حرم کی عبادت میں مشغول ہیں

ظفر اقبال

حمدیہ

جو اک طرح کا ہنر آزمانے والے ہو
قدیم ہو کے بھی میرے زمانے والے ہو

ظہورِ وقت سے پہلے کے ہو یہاں موجود
نہ آنے والے کہیں سے، نہ جانے والے ہو

کسی کے سامنے آتے نہیں ہو قرنوں سے
سنا ہے اب یہ تکلف اٹھانے والے ہو

ہمیں تو آج بھی منظور ہو بہر صورت
نئے نویلے ہو یا وہ پرانے والے ہو

یہ جو بھی ردّ و بدل ہے تمھی کو زیبا ہے
بنانے والے ہو چاہے مٹانے والے ہو

تمھاری ہو سکے تعریف کس طرح ممکن
کہ میرے جیسوں کے بھی ناز اٹھانے والے ہو

ہو زندگی ہی سراسر، کہ ایک بار یہاں
مجھے تو موت کے منہ سے بچانے والے ہو

سو، ہم بھی سب سے بڑا پیر مانتے ہیں تمھیں
کہ تم ہی سب سے بڑے آستانے والے ہو

جمانے والے ہو اپنا ہی کوئی رنگ، ظفر
کہ ہر جما ہوا پہلا اڑانے والے ہو

☆

افسانے

اسد محمد خاں

ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی — ۲۰۰۸ء

اے بھائی مبین مرزا! آداب!

کچھ عجب (یا format) سا بنتا جا رہا ہے کہ ''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی'' کو تمھارے نام لکھے گئے خط کی طرح شروع کرتا ہوں اور اس خط میں دنیا جہان کی باتیں لکھتا چلا جاتا ہوں۔ اپنے سفروں کے احوال، کسی کتاب، کسی دوست کا ذکر خیر۔ یا کچھ ایسا کہ اس پر essay کا گمان ہونے لگے۔ یا کوئی کہانی جو اپنے سنائے جانے پر اصرار کرتی ہو۔ کسی ممدوح، کسی بڑے کہانی کار کا ترجمہ۔ اپنی — یا کسی کی بھی — کوئی نظم، گیت — پتہ بھی۔

گویا بے شمار امکانات سے بھری ہوتی ہے یہ ''ٹکڑوں میں کہی گئی۔۔۔'' کہانی میں مجھے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اس 'کہانی' کے مندرجات کیا ہوں گے۔ اس بار البتہ کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ ۱۹۹۱ کے اپنے سفر انگلستان اور کیرن آرمسٹرانگ کی معرکہ آرا تصنیف "A History of God" کے ذکر تو شاید اس مرتبہ ہوں گے ہی۔

Karen Armstrong کو دوسری بار (مزے لے لے کر) پڑھتے ہوئے مجھے ایک اور بھی مصروفیت لاحق تھی۔ وہ یہ کہ اپنی کہانیوں کو یک جا چھپوانے کا منصوبہ آخری مراحل میں تھا اور میں پروف پڑھ رہا تھا۔ پروف پڑھتے ہوئے میں اپنی کہانی ''براوو براوو'' پر آیا تو خیال ہوا کہ سن ۱۹۷۶ء میں لکھی گئی اس کہانی کا موضوع بہت گمبھیر ہے اور مجھے بہت عزیز بھی ہے — کیوں نہ کہانی پر نظر ثانی کر لی جائے۔ نظر ثانی کیا کی کہ کتنے ہی در کھلتے چلے گئے۔

اٹھارہ بیس دن کی اس revision مصروفیت کو میں نے طویل چھٹیوں کی طرح گزارا۔

سن ۱۹۸۲ء کی مطبوعہ اپنی کتاب ''کھڑکی بھر آسمان'' میں، میں نے نظمیں اور کہانیاں یک جا کی تھیں، اس لیے کہ بعض کہانیوں کے سلسلے میں بڑی دل چسپ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ یعنی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ قطعاً کہانی ہے اور طویل نظم نہیں ہے۔ بعض کہانیاں کسی بڑی تمثیل

scenario کا لگتی تھیں، مثلاً کہانی ''براوو براوو'' میں کچھ بھی بات تھی کہ بیانیے کی سیڑھیاں چڑھتی اترتی۔ یہ کسی سینیریو کی طرح unfold ہوتی چلی جاتی تھی۔

اے میاں مبین! تمھیں علم ہے کہ کہانی کا protagonist کسی Absolute کی تلاش (بلکہ وجودِ مطلق کی دیوانہ وار جستجو) کو اس حد تک خود پر مسلط کر چکا ہے کہ اُس کا کردار اس تلاش سے الگ کر کے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

مرکزی کردار کا ذہنی/روحانی پس منظر میں نے واشگاف الفاظ میں نہ بتاتے ہوئے علامتوں اور اشاروں میں اور کہانی کی بُنت میں، اُس کے ٹائم zones میں اس طرح چھپا دیا تھا کہ توجہ سے پڑھنے والا جان سکے کہ اس کردار کی تربیت اردو زبان کی پانچ سات سو سالہ شعری ادبی روایت میں ہوئی ہے اور یہ کہ ارسطو سے دو سو برس پہلے کے بعض ''نیچری'' فلسفیوں سے اُسے مناسب واقفیت ہے اور دیمقراطیس کے Materialism سے بھی آشنائی ہے۔ ایتھنز کے ویزادوں: سقراط، افلاطون اور ارسطو کے افکار سے عقیدت کی حد تک رہا ہے۔

یہ آدمی جانتا ہے کہ وہ Nature اور کائنات کی حقیقت نہیں معلوم کر سکتا سو نہ صرف ''تشکیک کا درس'' دینے بیٹھ جاتا ہے بلکہ خود کو Agnostic مان کر کسی Supreme Being کے ہونے نہ ہونے کے سوال پر ہی ٹھہرا ہوا ہے۔

اسے ادیان کی تاریخ اور علم کلام سے شغف ہے اور یہ خلیفہ المامون کے عہد کی معتزلہ controversy سے خوب واقف ہے۔

سینٹ اوگسٹین کی طرح یہ شخص سمجھتا ہے کہ خدا اور انسان کے بیچ کی خلیج پاٹی نہیں جا سکتی پھر بھی انسان کی روح خدا کا ادراک کر سکتی ہے۔

یہ شخص تسلیم و انکار اور مطلق پیروی اور طے شدہ روگردانی اور love-hate کے جس مرحلے سے گزر رہا ہے، اس کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ یہ اسے دو انتہاؤں میں سے کسی ایک تک پہنچا دے گا۔ یا پھر تیسری صورت میں اسے ایک دائمی Limbo میں پھینک دے گا۔

اس بے بسی سے نکلنے کی ایک صورت اسے اساطیر میں نظر آتی ہے سو وہ موسیٰ کی حکایت، پھر مسیح کے اسطورے سے مدد لیتا اور Elijah سے اور John the Baptist سے (اور جی زز سے) اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ گمان کرتا ہے کہ یہاں شاید اسے اس کا الٰہ مل جائے گا۔

کہانی شروع ہوتی ہے تو یہ، جیزز کرائسٹ کے get up میں کچھ کمبل اٹھائے اپنے ۳،۴ حامیوں (حواریوں؟) کے ساتھ برآمد ہوتا اور عظیم چورستے پر کرونوگراف کے سایے میں جا کھڑا ہوتا ہے (اگر کرونوگراف بیلیکل ٹائم کا استعارہ ہے) تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ آدمی، جو سوانگ بھر کے آیا ہے مارے جانے لائق ہے۔ (Kill Him! Kill Him! Kill the Bastard!) تاہم ایک کے بعد دوسری

mishap سے گزر گزرا کے یہ واپس گھر پہنچتا ہے اور ایک جنون میں اس اپنے ''مقصود'' کو پکار کے کہتا ہے کہ میں تو خیال کی لطافت میں زندہ رہنا چاہتا تھا پر تو نے یہ کیسی زندگی میرا مقسوم کی ہے؟ تو مجھے جینے مرنے کیوں نہیں دیتا؟ اے میرے دشمن! میرے دوست! یا تو مجھے اپنے ڈھنگ سے زندگی کرنے دے یا مر جانے دے — آگے اس کا (اور کہانی کا) خاتمہ حسبِ حال ہوتا ہے۔

تو بس عزیزم! میں نے عہد نامۂ عتیق سے چند سطریں اور اپنے دوست جون کی کسی نظم سے ایک مصرع لے کر انھیں قوسین میں درج کیا اور یوں اپنی کہانی میں Biblical Time تخلیق کرتے ہوئے اس سے سر تا سر ایک خوش بو میں بسانے کا جتن کر لیا۔

جون سے مصرع quote کرنے کی (زبانی) اجازت لینے گیا تو اسے کہانی سنانی پڑی۔ پھڑک اٹھا میرا یار۔ پھر اس نے ایک دن بہت سے دوستوں (غازی؟ اطہر؟ علیم؟) کو اپنے کزن / دوست (شمس صاحب) کے گھر کھانے پر بلایا اور دوبارہ کہ تین بار یہ کہانی پڑھوا کر سنی۔

اگلے دن وہ میرے گھر آیا تو ایک بیاض لیتا آیا۔ کہنے لگا تو نے میرے جس مصرعے کو ایک آوازے یا 'ندائیہ instrument' کی طور پر لیا ہے ویسے تو وہ ٹھیک ہے۔ اچھا مصرع ہے — لیکن ذرا یہ بھی سن لے، شاید اس سے بہتر لگے۔ اور اس نے یہ مصرع سنایا:

''ایا وراذا! ایا وجہنا! ایا وبرقع! ایا وبالا!''

اور اس نے وہ نظم 'راموز' سنائی (جو اس وقت تک مکمل نہ ہوئی ہوگی) This is it! — میں نے اپنے بیانیے سے جون کا وہ پہلے والا مصرع نکال دیا کیوں کہ اب مجھے جون ہی کی طرف سے ایک جھلملاتی، بلقتی آوازہ — ایک 'ندائیہ instrument' مل چکا تھا۔ پھر اس نے ایک تجویز اور دی کہ اگر ہجوم کی کثرت ظاہر کرنے کو تو یہ کہے کہ 'وہ تعداد میں اتنے تھے جتنے قبیلہ بنو قیدار کے نخل' تو کیسا ہے؟

''نہیں میاں!'' میں نے کہا، ''یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ یہ میری زبان میرا idiom نہیں ہے... ہاں، میاں ہاں! پھر یہ بھی ہے کہ تیرے اس قبیلے — بنو what-ever سے میرا کوئی تعارف نہیں ہے۔''

میں نے خود سے بھی کہا کہ اس کہانی میں scripture سے ایک اور دوست کی بیاض سے ایک quotation لے لیا، بس — کافی ہے۔

لیکن ایک ماہ کے عرصے میں وہ آدمی، جون ایلیا، عربی کلاسیکی ادب سے دو چار سندیں ایسی لے آیا کہ قبیلہ بنو قیدار کو جگہ دینی ہی پڑی۔

ان باتوں کو ۲۷ برس گزر چکے ہیں — اور اب ایک مزے دار صورتِ حال پھر سامنے آتی ہے۔

''راموز'' نظم کی اس سطر میں، جس پر ہم بات کر رہے ہیں، شاعر کامل تخلیقی اپج سے کام لیتے ہوئے تینوں dimensions یعنی: عرض، طول اور بلندی کی abstract entities کو گواہ کرتے ہوئے اپنا بیانیہ پھیلاتا ہے۔ وہ اپنی اس نظم میں کچھ اور ہی مقدمہ بناتا ہے۔

اس کے برخلاف (اور یہ بات مجھے بہت اچھی لگی تھی کہ) میری کہانی کے context میں ہر واُمیفشن اُس مطلق وجود کی بے شمار تجلیوں کی مظہر بن جاتی ہے کہ جو وجود اس کہانی کا بنیادی مسئلہ ہے۔

اور پھر یہ بھی اطمینان تھا کہ کہانی کے مرکزی کردار کا مکالمہ یا تو non-entities کے ایک ہم خیر سے ہے، یا ایک ''موجود / ناموجود'' سے ۔۔ یعنی اُسی مطلق سے ہے ۔۔ جب کہ جونؔ کی نظم ''راموز'' کے تیور خود کلامی کے تھے۔ (Please CHECK!)

درمیانی ۲۲ برسوں میں میں بڑے آنند سے رہا ۔۔ لیکن پھر مجھے اس بی بی کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب "A History..." پڑھتے ...

معتزلہ کے بیان تک پہنچا تھا کہ اُس حوالے پر آیا جہاں بی بی نے ابن حنبل کے Obscurantism اور معتزلہ کے Rationalism کے بیچ مصالحت کی ایک راہ نکالنے کی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو ابوالحسن ابن اسمٰعیل الاشعری (878-941) نے کی تھیں۔ لکھتی ہیں:

> 'al'Ashari was trying to find a middle course between deliberate Obscurantism and extreme Rationalism. Some Literalists claimed that if the blessed were going to 'see' God in heaven, as the Koran said, He must have a physical appreance. Hishsham Ibne Haakim went so far as to say that:
>
> "Allah has a body defined, BROAD, HIGH, and LONG, of equal dimensions, radiating with light, of a broad measure in its three dimensions, in a place beyond place..."

مروادیا! ۔۔ تو اصل میں یہ تھا برادرم جون کا پینترا۔ ''ایاو پہنا! ایاو بالا! ایا درازا!'' یہ عرض، بلندی اور طول، ایک مطلق وجود کی بے شمار تجلیوں میں سے چند تجلیوں کے مظاہر نہیں تھے (جیسا کہ میں سمجھا تھا) یہ تو اپنے literalist بھائی، ہشام ابن حاکم کی comic دلیل تھی جو پوری اس طرح ہے:

> ....in a place beyond place, like a bar of pure metal, shining as a round pearl on all sides, provided with colour, taste, smell and touch.

دیکھا آپ نے! کیا کمال بات سوجھی تھی میرے شیر کو! اور کیا استنباط کیا تھا... قربان جایئے۔

تو بس جون بھائی (جینٹ) نے اپنے پچھلے شہر امروہے میں، اپنے بابا سید شفیق حسن ایلیا صاحب کی کتابیں اُلٹتے پلٹتے، برسوں پہلے ۔۔ اس بونگے literalist اچ آئی حاکم کو براہ راست عربی سے اُٹھایا (کیرن بی بی جہاں بھی ہوگی اُس وقت ۴ سے ۶ سال کی ہوگی)۔

پھر اُس آدمی، جون کی creative genius نے اور اُس کے مسخرے پن نے اس سے

مصرع کہلوایا کہ: ایاہو پہنا! ایاہو بالا! ایاہو درزا!...

کیا پتا بیک گراؤنڈ میں اُسے بھائی literalist کی آواز بھی سنائی دے رہی ہو گی:

لاریب! تو اپنی پہنائی میں کمال چوڑا، اپنے قامت میں بے مثال بلندی کے ساتھ اور اپنی درازی میں مجرد خیال سے بہرحال نکلتا ہوا ہے... اتنا کہ بیان کے احاطے میں نہیں آ سکتا۔ اور ایک لامکاں... ہاں! ہاں! مکاں سے ہوا ہے تو۔ اور ایک فلوغاطس سے بنی 'چیز' کہ سلاخ ہے، ایک ہر رخ سے چمکتا ہوا (مکمل) گولائی والا موتی ہے اور تو رنگ، مزے، خوش بو اور لمس سے مزین ہے... معاذ اللہ۔ بلکہ لاحول!

اور جو لکھا ہے میرے اپنے deductions ہیں جو کتاب 'A History of God' کے دیے quotation اور 'راموز' نظم کی بس ایک سطر کی شہادتوں پر مبنی ہیں۔ وہ نظم جون کے archives میں ضرور کہیں موجود ہوگی۔ علیم اور اطہر تو روانہ ہوئے۔ ہاں، غازی صلاح الدین، برادرم محسن صاحب، بھائی بچھن اور بھائی راحت سعید— عمریں ان کی دراز ہوں— معلوم کریں گے تو 'راموز' دستیاب ہو جائے گی۔

میاں مبین مرزا! دیکھا آپ نے؟ بہتر کا سنگِ میل پار کر چکا تو میں خود کو رفتگاں کے ہجوم میں پاتا ہوں (its a good company, though)۔

اور یہ ایک شخص جون تو جیسے میرے لیے obsession سا بن گیا ہے۔

لیکن آپ ہی بتائیے ایسا بے دریغ، بے ورنگ (امکانات سے چھلکتا ہوا) کوئی اور جدید نظم گو آپ کی نظر میں ہے؟ میں یہ بات اُن (زیادہ سے زیادہ ۲۵) نظموں کی اتھارٹی پر کہہ سکتا ہوں جو ہم نے شاعر سے سنی ہیں یا وہ جو رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔

اے، اس آدمی کو، ایسی ایسی ڈھائی ہزار نظمیں لکھنی تھیں۔ لیکن وہ ذہنی اور شارجہ اور (بخش کے) امریکا جا جا کے 'مٹھی مٹھی' بھر جو لے جانے والوں کے ازدحام کو (اژدھے کہا چاہیے اژدھے)... 'تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں' سنا سنا کے داد لیتا رہا۔ خبیث!

اب ایک امکان یہ ہے کہ دانتے کے تیار کیے ہوئے برزخ میں وہ سقراط اور اووڈ ایسے دیوزادوں (دونوں Esth. کے معتوبوں) کی معیت میں گھاس پر بیٹھا ہوگا۔ ممکن ہے وہیں کہیں صلاح الدین ایوبی صاحب بھی ہوں۔ اور ہو سکتا ہے نہ بھی ہوں۔ کس لیے کہ میاں دانتے نے سکندرِ اعظم کو بھی اپنی Purgatory میں متمکن دکھایا تھا... چلو خیر ہے۔ جہاں رہے خوش رہے اپنا بھائی۔

☆☆☆

اسد محمد خاں

ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی—— ۲۰۱۰ء

میری بعض کہانیوں کے بارے میں

ا۔ ناممکنات کے درمیان

بھائی مبین مرزا! اس بار کچھ اپنی کہانیوں پر گفتگو رہے گی۔

تو آیئے پہلے کہانی 'ناممکنات کے درمیان' پر بات کی جائے۔

یہ سوفی صد فینٹیسی ہے۔ اس کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے۔ نظم ایک طبع زاد mythology ہے، گویا اس قلم کاری گڑھی ہوئی ہے۔ ہندو اسطورے میں خالقِ کل 'برہما' ہے۔ میری نظم میں ایسا نہیں ہے۔

ہندو مائی تھالوجی کے تین بنیادی ارکان ہیں [جو Christianity کی تثلیث یا Trinity سے قطعی مختلف ہیں کہ وہاں خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس ہیں] ہندو مائی تھالوجی کے تین: برہما، وشنو، شوا ہیں۔ پہلا ہے

God the Creator، دوسرا God the Sustainer، تیسرا God the Destroyer۔

میری نظم کا واحد کردار، آدی پُرش ہے:

آدی (مطلب پہلا، شروع کا، ابتدائی) پُرش (مطلب آدمی، مرد، انسان)

سامی مذاہب میں یہ آدم ہے۔ ہندو دھرم میں یہ برہما ہے۔ ہمیں جو بات عجیب لگے گی، یہ ہے کہ برہما پہلا آدمی بھی ہے اور God the Creator بھی۔ مسیحیت میں بھی ایسا ہی التباس ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے خدا بیٹے کے فرائضِ منصبی، خدا کے بندے اور نبی عیسیٰ علیہ السلام کو سونپ دیے ہیں۔ خیر، اب ہم اسدمرخ کی فینٹیسی (آکٹوپس... ایک نظم) پر بات کریں گے:

میرا بیانیہ ہندو مائی تھالوجی سے ایک کردار (نیرا کوتا کا برہنہ مجسمہ) عاریتاً لیتا ہے۔ میں اُسے

آدمی پُرش کا نام دیتا ہوں اور پورے protocol کے ساتھ اسے ایک روحِ زندہ سے مزین کرتا ہوں۔

اس کھیل میں، میں نے مغل عہد کے عظیم شاعر گوسوامی تُلسی داس سے یہ ایک سطر لی ہے: جاگیے برج راج کنور، جاگیے، کنول کُسم پھولے۔ [اللہ غنی! کیا شاعر ہے تُلسی داس!]

یہ شری کرشن جی کی استتی (یعنی مدح میں لکھی گئی نظم) سے ہے۔ پوری نظم پڑھیے، رقص کرنے لگیں گے آپ۔

شری کرشن جی، وشنو کے اوتار ہیں، اس لیے 'جاگیے برج راج کنور' [کرشن جی کو علاقہ 'برج' کا شہزادہ بھی کہا جاتا ہے] کی معنویت بھی غورطلب ہے۔ تو لیجیے، نظم میں 'تخلیقاتی مٹی والے وجود' میں ایک روحِ زندہ حلول کرتی ہے اور 'ایک خلیاتی' زندگی کا کنول کھل جاتا ہے۔ یہ so-called برہمنا، جو میری اس نظم میں خالق سے زیادہ مخلوق ہے، سات دَھڑکنوں سے اپنی انگلیاں ملا کر زندگی کو سلام کرتا ہے۔

اس کی آٹھویں مُدرا روحِ زندہ کے لیے ہے۔

آ کٹوپس—ایک منظر سے پہلے جو نظم ہے، اُس میں آٹھ [سات جمع ایک] 'مُدراؤں' کا ذکر ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ so-called برہمنا نے، ناچتے ہوئے، سات دَھڑکنوں سے اپنی انگلیاں ملا کر (مُدرا کرتے ہوئے) زندگی کا آدر کیا تھا (تعظیم کی تھی)، اور یہ کہ اس کی آٹھویں مُدرا، روحِ زندہ کے لیے تھی۔

اب منظر میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم صرف محرابیں بنانے والی، اپنی طرف اُمڈ آنے والی سات سونڈیں ہی دیکھ سکتے ہیں— اور یہ کہ جو (آٹھویں) سونڈ، عقب میں اَنمی تتلی کی طرف بڑھ گئی ہے، جسے ہم تم نہیں دیکھ سکتے، وہ ہمارا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ یہی prime statement ہے اور اس کے ذیل السطور یہ بیان موجود ہے کہ ہم اور تم، کبھی دو ناممکنات کو ملانے والے پُل کے رُوبرو ہیں اور اس التباس (الیوژن) کا سامنا کر رہے ہیں جسے تخلیق کے روزِ اول سے ہمارے منھ پہ مار دیا گیا تھا۔[expression کے لیے معذرت!] میں پھر دُہراتا ہوں کہ جو سونڈ عقب میں اَنمی تتلی (گویا روحِ زندہ) کی طرف بڑھ گئی ہے— جسے ہم تم نہیں دیکھ سکتے، وہ ہمارا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔!Period

منظر کے فرش پر دور تک متحجر (fossilized) لہروں کا جال بچھا ہوا ہے، مگر یہ optical illusion ہے جو منظر بیان کرنے والے 'میں' کو دوڑنے (یا رقص کرنے) اور اپنے پیروں کی دھمک سے پھر ایک بار چیزیں پیدا کرنے پر اُکساتا ہے— تاہم اس سارے عمل کا نتیجہ خفت اور ناکامرانی ہے۔

کہانی کہنے والے کا بیان ہے کہ وہ روحِ زندہ کا بوجھ اٹھائے دوڑا ہے۔ تو یہ ہر اس تخلیق کار کا مسئلہ ہے جو محسوسات کے اس mad house کو، اس خوابِ پریشاں کو، نیلے امن [یا rationality] کے پھیلاوے میں بدل دینے کا خواب دیکھتا ہے۔ کہانی اسی فرسٹریشن کو فوکس کرتی ہے۔

۲۔ ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن

کہانی 'ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن' پر بات ہوگی۔ یہ اصل میں بندر روڈ کی کہانی ہے۔

بندر روڈ کی میری یادیں، ظاہر ہے، زمانی اعتبار سے، آپ کی یادوں سے مختلف ہوں گی۔ بہت سے لینڈ مارکس بدل چکے ہوں گے، شاید آپ نے 'جامس کلاتھ مارکیٹ' سے پہلے ریڈیو پاکستان کے بس اسٹاپ کو 'ہمیشہ سے' یوں ہی اجڑا ہوا دیکھا ہوگا۔ میں نے اسے زندگی سے — ایک بامعنی زندگی سے چھلکتا ہوا دیکھا ہے۔ اس رونقوں والے 'بھاگوں بھرے' اسٹاپ پر تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک بے مثال مصور صادقین، اب موٹر رکشے سے نہیں اترتے ہوں گے۔ اُس وقت وہ پیرس سے نام کما کے پاکستان لوٹے تھے اور جب جی کرتا تھا اپنے دوست، شاعر عزیز حامد مدنی سے ملنے ریڈیو اسٹیشن آجاتے تھے۔ یہیں ایک بار میں نے علامہ رشید ترابی قبلہ کو، بہت ہی نرمی سے، ریسپشنسٹ سے یہ کہتے سنا تھا کہ ''عزیزم! ہم ملنے جارہے ہیں، چلے جائیں؟'' اُس بھلے آدمی نے علامہ صاحب کو کبھی دیکھا نہ ہوگا: تو سرسری سا پوچھنے لگا کہ کون صاحب ہیں، آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟

میں نے گزرتے ہوئے یہ سنا اور دوڑ پڑا، ''اے بھائی! کیا کہہ رہے ہو؟ آپ علامہ ترابی صاحب ہیں!'' وہ گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھوں سے سلام کرنے لگا۔ ترابی صاحب نے 'نا بیٹے! کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں،' کہتے ہوئے ہمارے سلاموں کا جواب دیا؛ پھر دعائیں دیتے، سر پہ ہاتھ رکھتے، بخاری صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ تو یہ اسٹاپ ذوالفقار علی بخاری کا اور سلیم احمد کا، مدنی صاحب کا اور شاہد احمد دہلوی صاحب کا اور غلام عباس صاحب کا — اور بھی کتنے ہی بے بدل، ادیبوں عالموں شاعروں کا زمنہ تھا۔

یہاں کبھی اُستاد بڑے غلام علی خاں صاحب اور اُستاد بندو خاں صاحب جیسے بے مثال گائیک اور کلاونت آتے اور اپنا جادو جگاتے تھے... میا ری کہاں گئے وہ لوگ!

یعنی ہر بساط کی طرح یہ بساط بھی اُلٹ گئی؟ جونؔ ایلیا کہتا ہے، ''ہاں وہ بساط الٹ گئی...''

خیر، میری یہ کہانی ریڈیو اسٹیشن سے بالکل ملے ہوئے، جانوروں کے اسپتال اور ایس پی سی اے یعنی Society for Prevention of Cruelty to Animals کے زونل آفس سے اور یہاں سے کوئی دو فرلانگ آگے سٹی کورٹ اور سٹی کورٹ کے عقب میں کچھ دور دس بارہ بکھری ہوئی لوکیشنز میں بٹے کراچی یونی ورسٹی اولڈ کیمپس کی کہانی ہے جس میں ٹھیک بندر روڈ پر واقع کے ایم سی کے سامنے اور اُس کے پیچھے ہونے والے ایک بھیانک واقعے کا ذکر (موجود ہے! اور نہیں بھی ہے)... کہ جب سن ۵۳ء میں پاکستان میں پہلی بار (گورمانی کی وزارت داخلہ کے دور میں) نہتے طلبہ پر سرکاری بندوقوں سے فائرنگ کی گئی تھی اور چار لڑکے مارے گئے تھے۔

[اس سے اگلا واقعہ (شاید) سن ۷۰ء میں ڈھاکا یونی ورسٹی کیمپس میں ہوا ہوگا] واللہ اعلم۔

برادرم! میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں نوکری کرتا تھا اور انگریزی ادب کا طالب علم تھا، تو اسی اولڈ کیمپس میں پہلے تین پیریڈز پڑھنے آیا کرتا تھا۔ مجھے بہرصورت بارہ بجے تک آفس پہنچنا ہوتا تھا تو

کیمپس سے نکل، جسٹ بندر روڈ پہ آ کر، اگلی بس پکڑنی ہوتی تھی جو مجھے چار یا چھ میل دور ویسٹ وہارف پہنچا دیتی تھی۔ اس طرح بارہ سے پانچ بجے تک میں اپنا دفتر کا کام کرتا تھا۔ پھر گھر ۔۔۔ اور کیوں کہ گھر کہیں نہیں تھا، اس لیے میں رات گئے تک گھومتا یا پارک وارک میں پڑھتا اور کبھی اس کزن کے ہاں، کبھی اُس کے ہاں سو رہتا تھا۔

میں صبح کو جلد کیمپس آتا اور وہیں کسی چائے خانے میں ناشتا کرنے کے بعد، اپنے شعبے کے کھلنے کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ ہاں، بندر روڈ سے شعبے تک پہنچنے کے لیے مجھے سٹی کورٹ کے کمپاؤنڈ سے یا اُس کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا۔۔۔ تو پام، کینا، کروٹن کے گملے اور پان کی پیک سے بے حال کوریڈور وغیرہ ۔۔۔ یہ بھی منظر ایک ڈیڑھ برس میرے ساتھ رہے تھے۔

ایک حوالہ اس کہانی میں 'یا نان سی' حیدر کا ہے۔ یہ میرے پرانے دوست تاج حیدر کا حوالہ ہے جو بائیں بازو ۔۔۔ یا پی پی پی کہہ لیجیے ۔۔۔ کے سچے، دیانت دار رہنما ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ وہ ایک زمانے میں ماؤزے تنگ کی اور یا نان کلچرل فورم کی خوب خوب باتیں کرتے تھے۔ میرے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ شخص، ام خ بے شک ایک دردمندی کے ساتھ بائیں بازو کی طرف اپنا جھکاؤ رکھتا ہے لیکن اس جیسے نستعلیق کامریڈ بس اتنے legit ہوتے ہیں کہ جتنے سرسری مسلمان زادے، جو خیر کو اپنی زبان سے تو برابر اچھا کہتے ہیں مگر اُس کے نفاذ کے لیے پلک تک نہیں جھپکاتے۔

تو صاحبو! اب یہ ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے!

۳۔ ہے للا للا

اس کہانی کو میں نے ۷۲ء سے ۷۵ء کے دوران لکھا ہوگا۔ یہ میرے ۱۹۸۲ء کے مجموعے میں شامل ہے۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم لوگ، کہانی لکھنے کا کام عادتاً اور کسی اندرونی urge کے تحت کرتے رہتے ہیں، تاہم یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسا کوئی واقعہ سامنے آتا ہے جو ہمیں ہلا کے رکھ دیتا ہے (یا ہم سوچ میں پڑ جاتے ہیں) اور فوری طور پر اس کیفیت کو اپنے میڈیم (افسانے) کی مدد سے ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

یہ کہانی میں نے پی ٹی وی کراچی سینٹر میں پیش آنے والے ایک ایسے واقعے سے متاثر ہو کے، جس نے مجھے ہلا کے رکھ دیا تھا، دو تین روز میں لکھ ڈالی تھی۔ ویسے بات اتنی کوئی گمبھیر نہ تھی۔

میں ٹی وی کے لیے گیت اور plays لکھا کرتا تھا۔ ایک موسیقار اور 'خیال گائیکی' کے نام ور گائیک اُستاد عاشق علی خاں سے، جو میری طرح کم آمیز تھے اور 'لیے دیے' رہتے تھے، میری اور دوست علیم کی ایسی محبتیں ہوگئی تھیں کہ خود ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ ہم professionally تو مصروف رہتے ہی

تھے، اب یہ ہونے لگا کہ میں کسی بھی کام سے پی ٹی وی سینٹر آتا تو اُستاد عاشق علی کے 'میوزک روم' میں آبیٹھتا۔ اُن سے (بیشتر) راگوں کی اور بڑے گائیکوں، موسیقاروں کی باتیں سنتا رہتا۔ علیم بھی فارغ ہوتے تو آجاتے۔

یوں سمجھیے یہ، مجھ 40 plus آدمی کے لیے، موسیقی کے بارے میں 'سیکھنے اور بہرہ مند ہونے کا سنہرا دور تھا۔

استاد کو (کسی بھی پی ٹی وی کے ملازم کمپوزر کی طرح) چوتھے گریڈ میں رکھا گیا تھا — جو وہاں کلرکوں (یا شاید دفتریوں) کا گریڈ ہوتا ہے۔ and mind it خیال گائیکی کے اُستادوں میں اُس وقت بھی بس اتنے ہی فن کار تھے کہ انھیں ایک ہاتھ کی انگلیوں پہ گنا جا سکتا تھا۔

مگر وہ بڑے صبر والے (یا مجبور) آدمی تھے۔ ایک بار مجھ سے علیم سے، کہنے لگے کہ مجھے آٹھ سال کی عمر سے راگ داری سکھائی گئی تھی، اب کوئی پچاس برس سے، دن اور رات، اسی اتھاہ بحرِ علم کی سنگت میں ہوں۔ اگر اپنے کنبے کے بچوں کی طرح بی اے، ایم اے کی پڑی سنبھالتا تو کم از کم ایک پی ایچ ڈی تو کر چکا ہوتا — پھر کیا جب بھی یہ مجھے گریڈ چار میں رکھتے؟

وہ عجیب اور دکھ والی بات، جس نے مجھے لرزہ دیا، کسی گریڈ وریڈ یا پروموشن سے متعلق نہیں تھی۔ وہ اُن کی بے مثال کامپوزیشنز سے متعلق تھی۔

یہاں میں استاد عاشق کی چند خوب صورت دھنوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ اوروں کا تو مجھے اب یاد نہیں، بس اپنے لکھے یہ گیت یاد دلادوں گا، جو آج بھی شاید اپنے کامپوزیشن کی وجہ سے گائے جاتے ہیں۔ مثلاً انوکھا لاڈلا، پیا ترس گئے مورے نین، تو ہی کرے پار میری نیا، میرے اللہ وغیرہ...

ہاں، علیم کی یہ غزل بھی یاد آئی، کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں۔

میرے گیت کا یہ مکھڑا 'انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند'، راگ درباری کی اصل لائن ہے۔ استاد عاشق علی کا اصرار تھا کہ میں اپنے گیت میں اسے اسی طرح رہنے دوں۔ چناں چہ یہی ہوا۔

اُن کا کہنا تھا کہ اس گیت، اور اپنے دوسرے کام کی inspiration لینے وہ حضرت لعل شہباز قلندر کے آستانے، سیہون شریف گئے تھے اور وہاں سے جیسے رنگوں میں نہائے ہوئے لوٹے تھے۔

یہ اُن کی productivity کا بہترین دور تھا۔ انھی دنوں ٹی وی نے اپنے ہر اسٹیشن سے موسیقی کے پروگرام طلب کیے اور یہ کہا کہ بہترین گائیک، کمپوزر اور پروڈیوسر کو نہال کردیا جائے گا اور یہ کہ 'وہ' بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔ کراچی سینٹر والوں نے کہا کہ اُستاد! آپ جو سیہون سے سوغات لائیں ہیں، رب کرے گا تو یہ چوبارے چڑھے گی، سینٹر کا نام اونچا کرے گی۔

اُستاد عاشق علی نے اُن گرتا دھرتا لوگوں کے اس دعائیہ کومنٹ پر کس طرح react کیا ہوگا، مجھے نہیں معلوم، اتنا جانتا ہوں کہ وہ منکسر آدمی تھے، تو بس انھوں نے مسکرا کے سر جھکا لیا ہوگا۔ خیر، یہ

'مقابلہ' حسبِ دستور، پروڈیوسروں اور ان کے ممدوح بیوروکریٹس کے بیچ ایک گھمسان کی لڑائی کی صورت اختیار کر گیا اور ایسا ہوا کہ مغرب سے (درآمدہ) چلتی ہوئی دھنوں سے ترتیب دیے کراچی ہی کے دوسرے نمبر پروگرام کو قابلِ انعام قرار دیا گیا... ایک گیت کو فخرِ موسیقی یا ایسا کچھ کہا گیا (اس کے بول تھے، 'ایس یو این سن')۔ کسی چپڑقناتی لونڈے نے جھالر کے پنڈلی بوٹ پہن کر ایلوس پریسلی کی طرح مٹک مٹک کے گایا تھا۔ بات ختم ہوئی۔

مگر بات ختم نہیں ہوئی۔ چند ہفتے بعد عاشق علی خاں صاحبِ فراش ہوئے اور پھر دو روز بعد خبر آئی کہ خیال گائیکی کا عاشق چلا گیا۔ انا للہ... خبر ٹی وی سے نشر ہوئی۔ عظیم کسی سلسلے میں کیمرا یونٹ لے کر اندرون سندھ گئے ہوئے تھے۔ جون ایلیا کو میں نے فون پر خبر سنائی: کہنے لگا چل، ان کے گھر والوں کے پاس بیٹھ کے رو لیتے ہیں۔ میں نے کہا، تو تیار ملنا، رکشا لے کے آ رہا ہوں۔ گھر کا عام سا پتا معلوم تھا کہ گانے بجانے والیوں کے بدنام محلے، جاپانی روڈ پر کسی بالاخانے کی چھت پہ ان کی رہائش تھی۔ تو اسی رو میں اپنی اجاڑ صورتیں لے کے، گریہ ناک ہوئے، ہم رنڈی بزار پہنچے۔ استاد کا نام لے لے کے دکان داروں، راہ گیروں سے پوچھا۔ عاشق علی خاں کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ گلیوں میں نکل گئے: تو پیشانیوں پہ بال چپکائے دو تین لونڈے لپاڑی قریب آئے، ایک نے کہا کہ سرا! مزہ آ جائے گا ایسا تازہ مال ہے، ایمان سے! میں چکرا گیا، پر جون گلوگیر آواز میں بولا، ''میاں! ہمارا دوست مر گیا ہے! یار، ہماری تو خود رانی چھٹ گئی ہے، ہم کیا مزے کریں گے!'' آخر، پان کی دکان پہ کھڑی ایک نائکہ ٹائپ بائی جی نے کہا، 'فتح علی کے بابا کا تو نہیں پوچھ رہے: وہی جو لڑکیوں کے ٹوشن لیتا ہے؟' ہم نے کہا ہاں، انھی کو پوچھ رہے ہیں۔ اس بھاگوں والی نے پتا سمجھا دیا۔ باقی جیسی جگہ تھی، وہ تو آپ نے کہانی میں پڑھ ہی لیا ہوگا۔

فتح علی سیڑھیوں سے اوبڑ کھابڑ قدم لیتا دوڑتا ہوا آیا، گلے سے لگ کے رونے لگا۔ اوپر لے گیا، تایا سے ملایا۔ میں انھیں ریڈیو پہ سنتا تھا۔ استاد عاشق کی، ان کی جوڑی، نزاکت سلامت جیسی جوڑی تھی۔ یہ خیال گائیکی کا بچ رہنے والا دوسرا ستون تھے۔ جون سے، مجھ سے رو کے کہنے لگے کہ صاحب! میرا سیدھا ہاتھ کٹ گیا۔ گھرانے کا طرّے دار چلا گیا۔ ننگے سر ہو گئے ہم۔

عزیزم! وہ کہانی جس کی میں بات کر رہا ہوں، تھرو آؤٹ strong worded ہے۔ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں نے آواز کو اپنے وجدان میں تراشنے والوں اور اپنے testes میں تلاش کرنے والوں کی جو واضح حد بندی کی ہے اور اپنے idiom کو سرتاسر تیکھا اور تیز رکھا ہے تو یہ اس دکھ-دایک افسانے کی مانگ ہے، کسی طرح کی gimmickry نہیں ہے۔

ہمارے فنونِ لطیفہ پہ جیسا وقت پڑا ہے، یہ ہم سب خوب جانتے ہیں۔

کیا اردو، کیا ہندی — ہمارے مرتے ہوئے میڈیا کے سورج کے یہ بے جان، دھبے — برسن کے یہ داغ بڑھتے، پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ کیمروں، مائیکروفونز کے آگے بے شمار چپڑقناتی، حرام خور،

جھالر لگے پنڈلی بوٹ پہنے سسکیاں لے رہے ہیں کہ ایس یو این SUN، ایس یو این SUN۔

۴۔ موتبر کی باڑی

۵۔ سرکس کی سادہ سی کہانی

عزیزم! ان دو کہانیوں کے بارے میں پڑھنے والے کا عام تاثر کیا ہے پہلے میں اس پر بات کروں گا۔

اول الذکر، ایک بیانیہ کہانی ہے جس میں ہمیں عام سے کرداروں کے گروپ ملتے ہیں۔ یعنی:
(الف) لڑکی آلی اور اُسے لے کے بھاگنے والا گندھی کا لڑکا جو اپنا نام ٹھاکر فلاں بتاتا ہے۔
(ب) باڑی کا موقعے پر موجود موتبر اور سلاپہ گاؤں میں متعین پولیس کا تین فیتوں والا۔
(ج) 'پھکری صاب' علاقے کا ڈی ایس پی اور اُس کی تل والی نیلما جو باڑی کی بہو ہے۔
(د) ناشتا لانے والی عورت، گارڈ، ہولو شکل کا آدمی جو اناس لایا ہے... اور بس۔ باقی لوگوں کے بارے میں ہم قصّہ گو راوی یا کرداروں سے صرف سنتے ہیں، اُنھیں move کرتے نہیں دیکھتے۔

آپ نے دیکھا؟ major اور فعال کرداروں میں دو دو کے تین سیٹ ہیں... گویا کل چھ آدمی۔ صرف تین minor کردار ہیں جو 'کیمرے کے سامنے' آتے اور بس گزرتے چلے جاتے ہیں۔

یعنی یہ معلوم ہوا کہ اصل میں کہانی کو چلا رہے ہیں چھ آدمی اور راوی۔ اللہ اللہ خیر سلا!

یہ passion اور نفسی پیچیدگیوں کی اور ایک احمقانہ (جوونائل) کارروائی کی straight کہانی ہے۔ (علامتی نہیں ہے) جسے میرے اور آپ کے بزرگوں منٹو، بیدی، قاسمی— کسی ایک نے بھی قلم برداشتہ لکھ دیا ہوتا— (اور اس عاجز سے اچھا لکھا ہوتا) گویا بہر حال nut shell result موجود ہے۔ کسی کو حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہا ہا ہا!

گندھی کا لڑکا، آلی کو لے کے بھاگتا ہے۔ دونوں نے احمقانہ سا فیصلہ کیا ہے کہ بارڈر پار کر کے 'ننگر پارکر' چلے جائیں گے جو تھر کا علاقہ ہے۔ سنا ہے اُدھر ہندو بھی رہتے ہیں اور بال ودھواؤں کی دوسری شادی پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ یہ دھر لیے جاتے ہیں، اور باڑی میں، جہاں ایک غیر معمولی صورتِ حال میں بڑی بہو اپنی عائلی زندگی گزار رہی ہے، بند کر دیے جاتے ہیں۔ اگر یہ فرسٹریٹڈ عورت اُن حالات سے نہ گزر رہی ہوتی جو کہانی میں بتائے گئے، اگر اُس کا socalled 'موتبر' سے 'حصّے' جڑا رہتا، اگر 'پھکری صاب' بالکل ہی نچڑا ہوا چھکیت نہ ہوتا، اگر اُس میں کچھ دم خم ہوتا: اگر وہ گندھی کے لڑکے کو بالکل ہی نمٹانے کا فیصلہ نہ کر لیتا، اور اگر نیلما بہو 'عشق پیالہ پی کے، سرندرانہ دینے' کا فیصلہ نہ کر لیتی، تو یہ کہانی کہنے لائق نہ تھی۔

اگلی، یعنی 'سرکس کی سادہ سی کہانی' کے عنوان ہی میں کہانی کار نے قاری کو اشارہ دے دیا ہے کہ یہ کوئی سادہ سی کہانی نہیں ہے۔

یاد کیجیے، انور سجاد کی کہانی 'گائے' اور خالدہ حسین کی کہانی 'سواری' بالکل اسی طرح کی غیر سادہ سی کہانیاں ہیں۔ ابتدائی سطروں ہی میں پتا چل جاتا ہے کہ یہ دونوں دوست کچھ گڑ بڑ کرنے پہ تلے ہیں۔

یہاں جو سرکس دکھایا جا رہا ہے، یہ بھی تماشوں سے الگ تماشا اور دوسرا کوئی سرکس ہے۔ اس کے کرداروں میں، اُن کے میز ازم، یا بی ہے ویئرز میں، اُن کی نشست و برخاست یا موومنٹ میں، اُن کے مکالموں کے لفظ لفظ اور ملبوسات تک میں— 'قد بُت' میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ یہ جو کچھ ہے، face value پہ اس کا اعتبار نہ کیجیے، یہ کسی اور منطقے پر، کسی ہو گزرے— اور جاری قصے کا بیانیہ ہے۔ رنگ ماسٹر، رکھیل بیلا جی بونی اور باقی کے بونے اور شیر کی کھال سے بنا کوسٹیوم پہنے، گل مچھوں والا وہ سنترا ادھ ننگا باڈی بلڈر آسو بلا، یہ سب جو سرکس کھیل رہے ہیں، ایک unsuspecting کمیونٹی پر کھیلا جا رہا ہے۔

بادل الیکٹریشن کی بات پوری توجہ سے سننے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے:

'دوست اِدھر بڑا اکڑ کی ہے— ویسے تو سرکس چل ہی نہیں رہا! اور جو تھوڑا بہت آتا ہے، وہی تینوں مردار آپس میں بانٹ لیتے ہیں، ورکروں کو وعدے وعید کے سوا دیتے ہی کچھ نہیں۔ بے زبان جانوروں تک کو بھوکا مار رکھا ہے— کدھر جاوے، سب لوگ کا شناختی پرچی سرکس کے ساتھ ہے۔ ویسے بھی باہر کے حساب سے دم لیاقت کوئی نہیں ہے۔ نہیں کام ملیگا نہیں جی'

''سفید گایوں کا بیاگر'' اخبار ''ڈان'' میں پڑھے گئے کالم سے مدد لیتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ نامور کالمسٹ بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی کی تحریر ہے۔ کالم کا سالِ اشاعت کہیں فون کرکے معلوم کر لیجیے گا۔

''ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، میرے خیال میں، ایک amalgamation ہے۔ یہ میرے لکھے سفرنامے، قصے، کہانی، essay، نظم، گیت، مکتوب، تراجم، اسکرپٹ، ہذیان اور inspiration وغیرہ سے مل کر بنتا ہے۔ عین ممکن ہے اس کے کچھ (یا بیشتر) حصے boring ہوں۔ تاہم جیسا ہے، جہاں ہے، یہی ہے۔ ہاہا!

۶۔ سارنگ

کہانی 'سارنگ' کے بارے میں کچھ باتیں:

یہاں کہانی کے کرداروں کے بارے میں پہلے میں کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں:

یوں سمجھیے کہ ہندو مائی تھالوجی کے تین بڑے ستون ہیں: برہما، وشنو، شنکر۔ گویا تخلیق کرنے، پالنے، اور خاتمہ کرنے والا۔ Deep down ہندو معتقدات کی تفسیر یوں بھی کی گئی ہے کہ لگتا ہے، یہ تینوں صفات ''تری مورتی'' میں یک جا ہوگئی ہیں جو پرمیشور یا کہ رب الارباب جیسی ہستی ہے۔ یعنی وہ واحد ہے اور مجموعہ ہے خلاقیت کا، ربوبیت کا، اور قیامت گری کا۔

اب آگے سنیے، یہ تینوں برہما، وشنو، شنکر اپنا اپنا ایک 'خاندان' رکھتے ہیں، جو اس طرح ہے:

برہما کی رفیقہ سرسوتی (سرود، گویائی اور علوم کی دیوی)۔ وشنو کی رفیقہ لکشمی (دولت کی دیوی) اور شنکر کی رفیقہ پاروتی یا دُرگا، جن سے پیدا ہوئے گنیش جی۔ گنیش کا چہرہ ہاتھی کا ہے۔

تو ان اساطیر کو مقامی Legends میں متبدل کرتے ہوئے صدیوں کے دورانیے میں، برصغیر کے طول و عرض میں، ہندو دھرم کی بے شمار داستانیں وجود میں آئیں۔ کہا گیا کہ وشنو، نے ہر یُگ میں اپنا اوتار بھیجا ہے۔ اس معلومہ فہرست میں دو نام ہیں: ایک اوتار ہیں شری رام چندر جی اور ایک شری کرشن جی۔ اوتاروں شری رام چندر جی اور شری کرشن میں، پہلے کی رفیقہ سیتا ہیں اور دوسرے کی رادھا۔ (اوتار یعنی آدمی کے روپ میں آنے والا الہٰ) لوک گیت کی لائن ہے: ڈھولا آدمی بن آیا..

اب ہم کہانی کی طرف آتے ہیں:

میری کہانی کے مرکزی کرداروں میں شیوشنکر اُن کی رفیقہ پاروتی اور گنیش جی شامل ہیں۔

شیوشنکر کے کتنے ہی نام ہیں: مہادیو، اُمادر، دگمبر، مہیش، گریجاپتی، کروناسے (رحم کرنے والا)۔

پاروتی کو دُرگا، شیو اَردھانگی (شیو کے آدھے انگوں والی) جگت ماتا، شیراں والی، گریجا، اُما، چنڈی۔

گنیش کو گنپت، گجانند، گریجانند وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ماں نے اسے کیتو (عقل، چمک) کہا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طول و عرض میں کہیں ان تین میں سے ایک کی پوجا پہ توجہ دی گئی، اور کہیں دوسرے یا تیسرے کو پسندیدہ معبود مانا گیا۔

وسطی علاقوں اور جنوب میں گنیش اور لکشمی کی پوجا زیادہ ہوئی۔ مغربی علاقے بنگال وغیرہ میں گنیش کو کم، دُرگا ماں کو زیادہ عقیدت ملی۔ وسطی ہندوستان اور یوپی صوبے میں وشنو کے اوتاروں، رام اور کرشن کی بھگتی پر زور دیا جاتا ہے۔

بنگال میں اور جنوبی ہند میں پاروتی کے بھینکر روپ: دُرگا، چنڈی اور شیراں والی پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ یہ برائی کا، راکھشسوں اور غلط کاروں کا وناش (یعنی خاتمہ) کرنے والا روپ ہے۔

میری کہانی میں شیوشنکر اور پاروتی کا شفیق روپ دکھایا گیا ہے۔ ذلت یعنی پٹے ہوئے، مسلے ہوئے نوجوانوں کو ماں پاروتی، چاہت میں ڈوبا دیکھتی اور انھیں پھول پھینک کر نوازتی ہے۔ اسی طرح جب لڑکی، مہادیو کو ساکشی/گواہ بناتی ہے تو شنکر کا ڈمرو (ڈگڈگی) بجتا سنائی دیتا ہے — یعنی بے نواؤں کے والی، کروناسے شیوشنکر کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔

آخری سطریں ہندو دھرم کو ماننے والے قاریوں کی جمالیات پر (شاید) گراں گزریں گی، یعنی وہ مرحلہ: جہاں بچے ہوئے، ذلت جوڑے کو شنکر کی مسند یعنی باگھمبر (شیر کی کھال) پر میتھن (ملن) کرتے دکھایا گیا ہے۔ بہ حق کہانی میں اس کی منطقی/ جمالیاتی دلیل موجود ہے، اس لیے مجھے کہانی کو اس طرح وائنڈ اپ کرنا پڑا۔ بہ خدا، میں معتقدات پر حرف زنی کرنا نہیں چاہتا۔

آپ کو شنکر پاروتی کی (دو یا تین ہزار سال قدیم) شبیہ، 'لنگم اور یونی' کی علامت یاد ہوگی، یہ تخلیق جاری رکھنے والے انسٹرومنٹس، یعنی reproductive organs ہیں جنھیں pagan ہندوستان ہزاروں سال سے پوجتا آیا ہے۔ دیکھیے کہ کہانی میں اس ملن کو کس طرح بیان کیا گیا ہے:

''کسی آخری ترتیب (شنکر کا تانڈو ناچ) کے پچھواڑے، جہاں کچھ نہیں بچا تھا، زانیوں چنڈالوں کا رستہ روکے ہوئے ایک نئی اور بے خوف زندگی سر اُبھار رہی تھی... دنیا بھر کے مسلے مسلائے، بچے ہوئے میہ ذلت پُرش اور استری [Of course, they are now man & wife] ملن کرتے تھے۔ ان کی دھمنیوں (یعنی سانسوں) میں گرجیا پتی مہیشور کے شوکت وجلال کا ڈمرو بجتا تھا۔''

۷۔ ندی اور آدمی

عزیزم! پہلے اس کہانی 'ندی اور آدمی' کے بارے میں کچھ وضاحت:

کہانی کے عنوان اور بیانیے میں جس 'ندی' کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے، وہ جنوبی بہار کی چھوٹی سی ندی کرم ناسا ہے۔

ہندوستان کے نقشے پر نظر ڈالیے تو ہمالیہ سے نکل، خلیجِ بنگال کی طرف بہتی، گنگا ندی، پہلے مشہور شہر الہ آباد پہ جمنا سے جا ملتی ہے، پھر اپنی رو میں، آگے چل پڑتی ہے۔ صوبہ بہار کے صدر مقام، پٹنہ تک پہنچنے سے پیشتر ہمالیہ سے اُترتی دو چھوٹی معاون ندیاں، گھاگرا اور گنڈک، گنگا میں یکے بعد دیگرے اُترتی ہیں۔ ندیوں کا یہ ملن، ظاہر ہے، گنگا کے شمالی کنارے پر ہوتا ہے۔ تو اس جگہ کے عین مقابل، جنوب کے پچھن سے ایک (بلکہ دو) مسکین سی ندیاں، کرم ناسا اور سون، نقشے کے جنوب مغرب کی طرف بہتی دکھائی دیں گی۔ مگر ان کو بہت غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے، عظیم دریاؤں گنگا، جمنا اور دوسری صف کی ندیوں گنڈک اور گھاگرا کے آگے ان ندیوں کی، کسی بھی نقشے پر، بساط ہی کیا ہوگی (سون ندی سے اس وقت ہمیں کوئی لینا دینا نہیں ہے)۔

اس کرموں والی، کرم ناسا کو شیر شاہ کے والد میاں حسن خان سوری کی وجہ سے اور پھر خود فرید خان شیر شاہ کی وجہ سے اصل اہمیت حاصل ہوئی۔ میاں حسن کو کرم ناسا کے اُوپر لی طرف والی زمین کا ایک ٹکڑا (جہاں اب شہر سہسرام اور شیر شاہ کا مزار ہے) فوجی اقطاع کی طور پر عطا ہوا تھا۔ یہ اقطاع

میاں حسن کے بعد شیر شاہ کے پاس آئی۔ پشاور یونی ورسٹی، شعبۂ تاریخ کے صدر نشین، (مرحوم) ڈاکٹر حسین خان کی ریسرچ کے مطابق، یہ فوجی اقطاع، شمال مغرب سے جنوب مشرق سمتوں میں پھیلی تھی اور اس کی ڈیوائڈنگ لائن یہی اپنی کرم ناسا ندی تھی۔ ہمایوں اور شیر شاہ کی آویزش میں اس ندی کا دلچسپ 'کردار' رہا ہے۔ ایک بار جب ہمایوں اپنی دانست میں جنوبی کنارے پر شیر شاہ کا رستہ روکے بیٹھا تھا، اوپر کہیں مون سون فنامینن کے طفیل، ندی میں راتوں رات باڑھ آگئی۔ ہمایوں کا کیمپ جل تھل ہوگیا۔ ادھر یہ پانی سے بچنے کے جتن کرتے رہے، اُدھر شیر شاہ، ندی کے خشک کنارے پرسے کوئی اسٹریٹیجک موو کرتا، ہنا اور ندی اُلانگھتا ہوا، ہمایوں کے جنوبی پہلو پر ورش کرنے آن بیٹھا۔ سبحان اللہ!

شیر شاہ نے اپنی بلوغیت کے اہم سال کرم ناسا کے قرب میں اور صدر جہاں، حسن علی خان کے ساتھ اور اوجینی راجپوتوں کی رفاقت میں گزارے ہیں، تو میں نے اس کہانی کی بُنت میں ان سبھی کو شریک رکھا ہے۔ نارنگ دیو وکرم اوجینی راجپوت ہے۔ شناور غلزئی فکشن کی دین ہے۔

ولایت پنجاب کا حاکم ہیبت خان نیازی لاہور میں سُوری مملکت کا نمائندہ تھا۔ علاقہ روہ میں ڈیرہ اسمٰعیل خان، پشاور، کوہاٹ سب شامل تھا، [اور یقیناً (موجودہ) فاٹا کا پورا علاقہ بھی روہ کہلاتا تھا]

(شیر شاہ کا دادا ابراہیم خان سوری، اپنے بیٹے میاں حسن خان کو ساتھ لے کر ڈی آئی خان سے ہند 'ہجرت' کر گیا تھا)

یہ دیکھیے کہ پشاور سے نیچے [سندھ دریا کو باؤنڈری لائن بناتے ہوئے] علاقہ بھکر تک، پھر جہلم دریا کے مغربی کنارے سے، سندھ دریا کے مشرقی ساحل تک اور اوپر رُہتاس (وہ جو پاکستان میں ہے) سے گھوم کر ہمالیہ کے سلسلۂ کوہ کے متوازی چلتے ہوئے — ایک دم ملک بنگالے تک، پھر وہاں سے رُہتاس (وہ جو ہندوستان میں ہے) اور کالنجر اور پھر جناب! دریائے نربدا پار کرتے ہوئے، ملک خاندیش کا پورا علاقہ — یہ سب سوری مملکت میں شامل تھا۔ اللہ غنی!

اور ان سب فتوحات وکرامات کا سلسلہ، ایک غریب سی (لیکن تیکھے مزاج کی) ندی کرم ناسا کے جغرافیائی محلِ وقوع سے شروع ہوا تھا، تو مجھ کہانی سنانے والے ام خ نے اپنا پریروگیو استعمال کرتے ہوئے، اِس ندی کو ایک شخصیت اور موونگ فورس کی طرح دیکھا یا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ باقی آپ قاری/اسکالر جانیں — جیسا بھی ہے، یہی اور اتنا ہی ہے۔

عزیزم! میری شیر شاہی فکشن کو اگر کوئی کریڈٹ جاتا ہے تو اُس کا کچھ حصہ ایک محقق اور عالم ڈاکٹر حسین خان (مرحوم) کو جانا چاہیے۔ وہ اس طرح کہ سُور انٹررگنم کے سلسلے میں، میں اپنی کم آگہی یا کجھے خوش فہمی میں مگن رہتا تھا کہ بھائی، میں نے ایشوری پرشاد سے اور (کلکتہ یونی ورسٹی کے اسکالر) قانون گو صاحب کی ریسرچ سے کسب فیض کیا ہے اور یہ کہ میرا ممدوح واقعی گریٹ سلطان تھا، اور بس۔

مگر جب معلوم ہوا کہ شمس آباد (ضلع اٹک) میں سنہ ۱۹۲۹ء میں پیدا ہونے والے ایک کمٹیڈ اسکالر نے ساری عمر اس ایک موضوع پر بے تھکے کام کیا ہے اور ۱۹۸۷ء میں انگریزی میں ایک کتاب "استاد بادشاہاں عرف شیر شاہ سوری" لکھ دی ہے، اور یہ کہ مصنف حسین خان کو خدا خوش رکھے، اس نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے؛ تو یہ سمجھیے کہ یہ عاجز کھل اٹھا۔ میرے دوست حسن ہاشمی نے مجھے وہ کتاب عطا کی اور میں نے دو سال اس کتاب کے ساتھ گزارے۔ معلوم ہوا یہ وہ تصنیف ہے جس سے میری کہانیوں میں ایک جرنیلی سڑک بچھ گئی ہے، جو سایہ دار ہے اور خوب روشن بھی، اور اس میں کہیں کوئی شک شبہ نہیں!

☆☆☆

رشید امجد

ایک مرحوم شہر کی یاد میں

کہاں جانا ہے نہ معلوم، راستہ مدھم مدھم اور فضا میں منڈلاتی رات آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی، وسوسے، وہم اور شک کونوں کھدروں سے جھانک جھانک رہے تھے۔

''کدھر جانا ہے؟'' اپنے آپ سے پوچھا، لیکن اندر بھی گھپ اندھیرا۔

شہر سے نکلتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ تعاقب کرتا اندھیرا اتنی جلدی آن پکڑے گا لیکن اب آگے پیچھے کچھ نہیں تھا، سوائے تہ در تہ اندھیرے کے اور رات پاؤں پسار کر بیٹھ چکی تھی۔ آس پاس کے درختوں پر بیٹھے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک گئے تھے۔ ایک عجیب طرح کا خاموش شور تھا کہ دکھائی دینے والی چیزیں بھی گم سم ہو گئی تھیں اور دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

''یہ کیا اسرار ہے؟''— خود سے پوچھا— ''دکھائی دے کر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

ماضی اور حال کے درمیان یہ نقطہ وقت کے بے رنگ کینوس پر اپنی پہچان کھو بیٹھا تھا۔

ایک کے بعد دوسرا دھماکا، شہر کا شہر آگ کی لپیٹ میں تھا، لیکن احساس سے عاری شہر کے لوگ نہ یہ خوف ناک آوازیں سن رہے تھے، نہ آگ کی تپش محسوس کر رہے تھے۔ آگ اب ان کے دروازے پر تھی لیکن وہ اپنے اپنے گھروں میں نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔

شہر کے ایک ویران کونے میں جھگی نما چائے خانے میں چاروں درویش آمنے سامنے بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد ایک، جو اُن میں ذرا عمر کا بڑا تھا، بولا، ''یارو! یہ عجب شہر ہے کہ شہر والے سو رہے ہیں اور مسافر جاگ رہے ہیں۔''

دوسرا درویش جو عمر میں سب سے چھوٹا تھا، ہنسا، ''یا پھر یہ ہے کہ ہم سو رہے ہیں اور وہ جاگ رہے ہیں۔''

''یہ سوتے جاگتے کا قصہ بھی عجب ہے۔'' تیسرا درویش بولا، ''پہچان ختم ہو جائے تو اس سب کے کوئی معنی نہیں رہتے۔''

دوسرا درویش جو اُن سب میں ذرا سیانا تھا، کھنکھارا پھر کہنے لگا، ''ہم اپنے اپنے آپ کو دریافت کرنے نکلے تھے، لگتا ہے اب انھیں دریافت کرنا پڑے گا۔''

پہلا درویش ہنسا، ''کھدائی کھنڈرات کی ہوتی ہے، لوگوں کی نہیں۔''

''تم نہیں جانتے — لوگ بھی کھنڈر بن جاتے ہیں، وہ صرف دیکھنے میں زندہ ہوتے ہیں۔''

''اس شہر کے لوگوں کے ساتھ بھی شاید یہی معاملہ ہے۔'' چوتھا درویش فکر میں ڈوبا ہوا تھا، ''یہ لوگ خود کو زندہ سمجھتے ہیں لیکن اصل میں کھنڈر ہیں — کھنڈر ہی کھنڈر۔''

''یہ دیکھتے ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتا۔'' تیسرا درویش بڑبڑایا، ''یہ سنتے ہیں لیکن سنائی نہیں دیتا۔''

''آنکھیں اور کان بند ہوں اور پھر بھی دیکھنے اور سننے کا دعویٰ کیا جائے۔'' پہلا درویش کہنے لگا، ''تو پھر یہی ہوتا ہے جو اس شہر کے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''اور ان کے دماغ — '' چوتھا درویش رُک رُک کر بولا، ''ان کے دماغ ان کی خود ساختہ عظمت کے خول میں بند ہیں۔''

''یہ عظمت کا نشہ بھی عجیب چیز ہے۔'' پہلا درویش کہنے لگا، ''مقابلے کی سکت نہ ہو اور عظمت کا نشہ چڑھا ہو تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

بہت دیر سکوت رہا، پھر چوتھا درویش تشویش سے بولا — ''اس شہر کا کیا بنے گا؟''

''جو بننا تھا وہ تو بن چکا۔'' دوسرے درویش نے آہستہ سے کہا۔

''قبر کھد چکی۔'' پہلا درویش خلا میں گھورتے ہوئے بولا، لگتا تھا اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے، ''وقت گورکن ہے، جو تاریخ کے قبرستان میں قبریں تیار رکھتا ہے۔''

وقت کا گورکن ایک تازہ کھدی قبر کے سرہانے کھڑا، اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا، ''یہ کس کی قبر ہے؟''

وہ مسکرایا، غور سے مجھے دیکھا اور بولا، ''یہاں قبریں خود اپنے مردے کا انتخاب کرتی ہیں۔''

''اور تم؟'' میں ڈر سا گیا تھا۔

''میں صرف قبر کھودتا ہوں۔'' وہ پھر مسکرایا، ''مردہ خود ہی یہاں پہنچ جاتا ہے۔''

میں اچھل کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہنسا، خوب ہنسا، ''یہاں آنے والوں کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مر گئے ہیں۔''

ذرا دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولا، ''کئی قوموں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مر چکی ہیں۔ ان کے مردہ وجود سے سڑاند اٹھنے لگتی ہے لیکن وہ سونگھنے کی قوت سے محروم ہو چکی ہوتی ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں بڑبڑایا، ''دوسرے ان کی موت کی تصدیق کر رہے ہوتے ہیں لیکن وہ خود اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔''

رات نے شہر کو اپنے اندھیرے پنجوں میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ آگ ہر شے کو راکھ بنا رہی تھی۔ نیند کے خمار ہی میں جسم جل جل کر خاک ہوئے جا رہے تھے اور تعفن سڑک سڑک، گلی گلی پھیل رہا تھا۔ چاروں درویشوں نے اپنی اپنی ناکوں کو کپڑے سے ڈھانپ لیا تھا۔

شہر کے اس ویران کونے میں جھگی نما اس چائے خانے میں وہ چاروں میز کے گرد بیٹھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''چند لمحوں بعد آگ یہاں تک پہنچ جائے گی۔'' پہلے درویش نے کہا، ''اس لیے ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔''

''افسوس ہم تابوت کو کندھا نہیں دے سکے۔'' چوتھا درویش تاسف سے بولا۔

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ چاروں آگے پیچھے، چپ چاپ، شہر سے نکلنے والے راستے پر ہو لیے۔
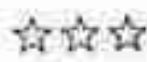
☆☆☆

نجم الحسن رضوی

خواب کے گھر

"تو آج کل تم کیا لکھ رہے ہو؟" کافی کا ایک گھونٹ بھر کے میں نے اکبر سے پوچھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے نظر اٹھا کے دیکھا اور پھر افسردگی سے بولا، "کیا لکھوں یار، میری کہانی کے تو مرکزی کردار ہی کھو گئے ہیں۔"

"کیا؟" میں حیران ہوا، "کہاں کھو گئے ہیں؟"

"لمبی کہانی ہے۔" وہ بولا، "وہ روز گھر سے نکل کے اپنے اپنے کام پر جاتے تھے مگر ایک دن جو گئے تو واپس ہی نہیں آئے۔ بس انھیں ڈھونڈتا رہتا ہوں آج کل۔"

اکبر میرا دوست تھا اور ایک مقبول ہفت روزہ رسالے کا معروف ادیب جس کے ناول اس رسالے میں قسط وار شائع ہوتے تھے مگر اب ادھر کافی دنوں سے اس کی کوئی چیز سامنے نہیں آئی تھی، لہٰذا آج جب اتفاقاً کافی ہاؤس میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے سب سے پہلے اس سے یہی سوال کیا مگر اس کا جواب ایسا تھا کہ میں چکرا کے رہ گیا۔

میں نے پوچھا، "تمھارے دونوں کرداروں کے نام کیا ہیں؟ کچھ ان کا حدودِ اربعہ بتاؤ، ہوسکتا ہے میں ان کی تلاش میں تمھاری کچھ مدد کرسکوں۔ کوتوالِ شہر سے پرانی یاری ہے اپنی۔ وہ ضرور کوئی ترکیب نکالے گا ان تک پہنچنے کی۔ کیا پتا وہ اٹھا لیے گئے ہوں۔ کہیں اغوا برائے تاوان کا معاملہ نہ ہو۔ بعض خفیہ ایجنسیاں بھی بڑی سرگرم ہیں آج کل جو ملک دشمن عناصر کی تلاش میں آتی ہیں مگر بار بار بس عام شہری ان کے ہتھے چڑھتے ہیں۔"

اکبر نے جیب سے رومال نکالا اور منہ پر رکھ کے اتنے زور سے چھینک ماری کہ میز پر رکھی کافی کی پیالیوں میں بھونچال سا آگیا۔ پھر وہ رومال تہ کرکے جیب میں رکھتے ہوئے بولا، "مجھے نہیں لگتا پولیس ان کی تلاش میں ہماری مدد کرسکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ انھیں کسی نے اغوا نہیں کیا، وہ دونوں خود ہی کسی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔ ساحر اور ثمن، میاں بیوی ہیں دونوں۔ اگرچہ میں نے انھیں تخلیق

کیا ہے مگر میں خود ان کی روز روز کی مہم جوئی سے تنگ آ گیا ہوں۔ دونوں ہر روز کسی نئی دنیا کو دریافت کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں، ایسی بے چین روحیں شاید ہی کسی نے دیکھی ہوں۔''

میں نے پوچھا، ''تمھاری تو ان سے خوب بات چیت ہوتی ہوگی۔ تمھیں کوئی تو اندازہ ہوگا کہ ان کے دل میں کیا ہے، کبھی تو وہ تمھیں اپنے راز میں شریک کرتے ہوں گے۔''

اکبر کی پیشانی پر سوچ کی لکیر ابھری۔ وہ چند لمحے چپ رہا، پھر کہنے لگا، ''یہ جو عورت ثمن ہے ناں— بہت خواب دیکھتی ہے، ہر روز نیا خواب، نئی دنیا کا خواب— کہتی تھی، اسے اپنا گھر پسند نہیں، بہت ساری سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں، چھت سے پلاستر جھڑتا رہتا ہے، باورچی خانے میں چٹخے ہوئے برتنوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اب وہ کسی اچھی جگہ اپنا گھر بنائے گی، جہاں بہت سے درخت ہوں اور درختوں میں کوئلیں اور فاختائیں...''

''اور ساحر؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں ساحر— '' اکبر نے پھر خلا میں نگاہیں گاڑ دیں۔ ''وہ بھی عجب سرپھرا مرد ہے۔ کہتا ہے اس سے ٹوٹی پھوٹی، کھانستی کھنکارتی بسوں میں چڑھا نہیں جاتا، وہ اپنی نوکری بھی بدلنا چاہتا ہے، کہتا ہے اسے اپنے باس کے سر پر ہمیشہ دو سینگیں نظر آتی ہیں اور دفتر کے ساتھیوں سے بات نہیں کی جاتی کیوں کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی برائی کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص نے اپنے منہ میں بچھو پال رکھا ہے۔'' اچانک اکبر خاموش ہوگیا، پھر اپنی گھڑی دیکھ کے بولا، ''اچھا اب میں چلتا ہوں، شام کے سات بجنے والے ہیں۔ ثمن کی عادت تھی کہ وہ ہر روز سات بجے تک گھر لوٹ آتی تھی، ہوسکتا ہے، آج...!'' وہ اٹھا اور ہاتھ ملا کے کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔

دوسرے روز میں ناشتے کی میز پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ''تلاش گم شدہ'' کے ایک اشتہار پر نظر پڑی، لکھا تھا، ''ثمن اور ساحر کے نام—! دیکھو تم لوگ جہاں بھی ہو، واپس آجاؤ، میری کہانی نامکمل پڑی ہے۔ میں چاہتا ہوں، آگے جو کچھ بھی لکھوں، تم سے پوچھ کے لکھوں۔ لوٹ آؤ تاکہ تم سے بہت کچھ کہا جائے، بہت کچھ سنا جائے— تمھارا کہانی کار۔''

میں نے اکبر کو فون کیا مگر اس نے فون نہیں اٹھایا اور دیر تک ایک نسوانی آواز اکبر کے شائع ہونے والے ناولوں اور اس کی کہانیوں کے عنوانات دُہراتی رہی اور یہ کہتی رہی کہ اگر زندگی کو جاننا ہو تو یہ کہانیاں پڑھیے جو جھوٹی ہونے کے باوجود سچی ہیں۔ جب دیر تک انتظار کرنے کے باوجود اکبر سے بات نہ ہوسکی تو میں نے فون بند کردیا اور کچھ پرانے رسالے نکال کے ان میں اکبر کے ایک پرانے ناول کی قسطیں پڑھنے لگا۔ مجھے یہ جان کے حیرانی ہوئی کہ اس کے پرانے ناول کے کرداروں کے نام بھی ثمن اور ساحر تھے۔

تقریباً ایک مہینے تک اکبر سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ایک روز وہ اچانک مجھے شہر کی مرکزی شاہراہ پر ایک بس اسٹاپ کے قریب کھڑا نظر آیا۔ وہ ایک عمارت کی بالائی منزل پر لگے ہوئے

بڑے سے نیون سائن کو غور سے دیکھ رہا تھا جس پر رنگین متحرک روشنیوں سے دل کش منظر ترتیب پا رہے تھے— خوب صورت چہرے اور عالی شان عمارتیں۔

میں نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یار اکبر! تم کہاں رہے اتنے دنوں؟" میں نے کہا، "میں اسی طرح تمھاری تلاش میں تھا جیسے تم اپنے کرداروں کی تلاش میں ہو۔ خدا کا شکر ہے تم مل گئے، تمھارے کردار ملے یا نہیں؟"

اکبر ایسے چونکا جیسے سوتے سے جاگا ہو، پھر وہ مجھے دیکھ کے مسکرایا اور بولا، "آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔" ہم دونوں سامنے ہی واقع ایک ایرانی چائے خانے میں چلے گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، اسی دوران ایک بیرا میز صاف کر کے چائے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔

"تم کہاں غائب ہو یار— ان دنوں فون بھی نہیں سنتے۔" میں نے شکایتاً کہا۔ "ہاں، اس نے پیشانی سے بالوں کو ہٹایا۔ "کچھ زیادہ ہی مصروفیت رہی پچھلے دنوں۔" اسی وقت بیرے نے ہمارے سامنے چائے کے کپ اور دوسرے برتن میز پر سجا دیے۔ اکبر نے کیتلی میں چمچا گھمایا، پھر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ اس کے بعد ایک کپ میری طرف سرکا کے بولا، "تم میرے کرداروں کے لیے کیوں پریشان ہو؟"

"پریشان کیوں نہ ہوں بھئی؟" میں نے ہنس کے جواب دیا، "تمھارا ناول جو پڑھنے کو نہیں مل رہا ہے ان دنوں۔" میں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

اکبر اپنی پیالی میں چمچے سے شکر گھولتا رہا۔

"تو—" میں نے سوال کیا، "سمن کو نیا گھر ملا اور ساحر کو نئی ملازمت، نئے ساتھی اور نئے افسر—؟"

"ایک دن کی بات ہے—" اکبر نے کہنا شروع کیا، "سمن واپس آگئی، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ بولی، آج میں نے اپنے خوابوں کا گھر ڈھونڈ لیا ہے۔"

"خوابوں کا گھر؟"

"ہاں بہت خوب صورت گھر ہے۔ اس کے دروازے شیشے کے ہیں اور کھڑکیوں میں پرندوں کی سریلی آوازوں کا اجالا رہتا ہے، ہم جلد ہی وہاں چلے جائیں گے۔"

"اور ساحر کے خوابوں کا کیا بنا؟" میں نے پوچھا۔

اکبر نے کہا، "اس نے بتایا کہ اسے ٹوٹی پھوٹی بسوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی ہے— اور اسے اپنی ڈریم کار ملنے والی ہے— سرخ رنگ کی لمبی سی کار جس کے اگلے حصے پر ایک بڑی سی تتلی اپنے پر پھیلائے بیٹھی ہے— اور وہ اب خود ہی اپنا بوس ہے۔ پھر ان دونوں نے اطلاع دی کہ وہ اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے والے ہیں۔"

میں نے پوچھا، ''ان دونوں کے کوئی اولاد نہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' اکبر نے جواب دیا، ''ایک گول مٹول سا بیٹا ہے ان کا۔ نیلے کنچے جیسی آنکھیں ہیں اس کی۔ وہ کہتے ہیں انھیں اپنے بیٹے کے لیے بہت ساری اچھی اچھی چیزیں جمع کرنی ہیں — کھلونے، خوب صورت بستر اور ولایتی دودھ کے ڈبے۔''

''اچھا!''

''ہاں — اور سمن نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے شان دار مستقبل کے خواب دیکھ رہی ہے، وہ بڑا ہوگا، اسکول جائے گا، اس کے لیے خوب صورت یونی فارم خریدنا ہوگا اور کتابیں اور اچھا سا بستہ۔ سمن کے تو خواب ہی ختم نہیں ہوتے۔''

میں نے کہا، ''یار بڑے عجیب کردار تخلیق کیے ہیں تم نے بھی — ویسے تم نے کبھی یہ کوشش بھی کی کہ ان کے ساتھ جا کے خود اپنی آنکھوں سے ان کے خوابوں کا گھر اور وہ ڈریم کار دیکھتے؟''

اکبر نے جواب دیا، ''کیوں نہیں، میں گیا تھا وہاں — میں نے وہ سب چیزیں وہاں دیکھیں۔''

''ارے —'' میں نے حیرت سے کہا، ''پھر تو بڑے مزے میں رہتے ہوں گے وہ دونوں — ایک دوسرے کے پیار میں مگن — اپنے اپنے کام پر بھی جاتے ہوں گے۔''

اکبر نے کہا، ''ہاں ہاں، ساحر ایک مشہور بینک کا افسر اعلیٰ ہے اور سمن ایک بیوٹی پارلر کی مالک — کہہ رہی تھی جو عورت اس کے پارلر سے بن سنور کے نکلتی ہے، اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔''

''اچھا تو اب تم اپنے نئے ناول کی قسطیں کب شروع کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ناول تو چھپنا بھی شروع ہو چکا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔'' اکبر بولا، ''اس میں نیلے سمندر کے سفید ساحل پر واقع ایک خوب صورت بستی کا بیان ہے۔'' سرخ کھپریل والے گھروں کی قطاریں، پام اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ، چمچماتی گاڑیاں، عمدہ سلے ہوئے سوٹوں میں ملبوس مرد جن کے چہروں پر نفاست سے کیے ہوئے شیو کے سبز حاشیے جگمگاتے ہیں۔ پام پر آئی ہوئی خوب صورت دوشیزائیں، موبائل پر بات کرتے ہوئے شگفتہ چہرے، جھولا جھولتے ہوئے گول مٹول بچے — تم نے پڑھا نہیں میرا ناول؟''

اور میں نے اگلے ہفتہ وار رسالے میں اکبر کا ناول پڑھنا شروع کیا۔ اس باب میں سمن نے بتایا تھا کہ نئی بستی میں آنے سے پہلے وہ کیسی مصیبت زدہ تھی، اسے کیسے بوسیدہ اور خراب کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ روزانہ طویل فاصلے پیدل چل کے طے کرنا پڑتے تھے جس کی وجہ سے اس کے سینڈلوں کی ایڑیاں بار بار گھس جاتی تھیں، نوکری تکلیف دہ تھی اور گھر میں تیل کے چولھے پر کھانا پکاتے ہوئے کتنی ہی بار اس کی ساری کے پلو میں آگ لگ گئی تھی۔

اسی طرح ساحر نے انکشاف کیا تھا کہ اپنے دفتر جانے کے لیے اسے جو پتلون عرصے تک

پہننی پڑتی تھی، اس کی جیبیں پھٹی ہوئی تھیں لیکن چوں کہ اس کے پاس جیب میں رکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا، سو کام چل جاتا تھا۔ اس کا بوس بہت تنگ چڑھا تھا اور بات بات پر تنخواہ کاٹ لینے کی دھمکی دیتا تھا، اگر چہ وہ تنخواہ کاٹتا نہیں تھا مگر اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ مہینے کے آخر میں جب اسے پیسے ملتے تو اسے یہی لگتا کہ آدھی تنخواہ صاحب کے غصے کی نذر ہوگئی ہے۔ گرمیوں میں کمرے کے اندر پنکھا نہ ہونے کی وجہ سے سخت گھٹن ہوتی۔ لہٰذا ان دونوں کو اپنے کپڑے وہاں ہی لگتے۔ اور سردیوں میں ٹھنڈ اتنی زیادہ ہوتی اور لحاف اتنا پتلا کہ خود کو گرم رکھنا مشکل ہوتا، اس لیے وہ ایک دوسرے سے لپٹ کے سوتے۔

ناول کی ایک قسط اسی طرح ختم ہوئی۔ اگلی قسط میں اکبر نے ثمن کے پرانے گھر کا احوال لکھا تھا جس میں صرف ایک کمرہ تھا اور اس کی چھت میں اتنے سوراخ تھے کہ ان سے اتنی وافر روشنی اندر آتی تھی کہ کمرے میں کسی کھڑکی یا روشن دان کی انھیں کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ بارش کے موسم میں ان کے گھر کے سارے لوٹے اور کٹورے چھت ٹپکتے پانی کو ذخیرہ کرنے میں کام آتے۔ اپنے خوابوں کے گھر میں منتقل ہونے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ انھیں پرانے گھر کی مصیبتیں یاد نہ رہی تھیں۔

پھر کئی باب اور چھپے ثمن اور ساحر کے شب و روز کے بارے میں جو خوشیوں کے اجالوں سے منور تھے۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ آخری باب میں ثمن اور ساحر کے بیٹے کی پہلی سال گرہ کی تقریب کا حال بیان ہوگا لیکن اس کے بعد اچانک یہ سلسلہ رُک گیا اور رسالے کے مدیر کی جانب سے قارئین کے لیے یہ اعلان کیا گیا کہ ناول کا آخری باب مصنف کے اچانک بیمار ہوجانے کی وجہ سے شائع ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔ مصنف کو دل کا دورہ پڑا تھا۔

میں نے رسالے کے دفتر کو فون کرکے پتا کیا کہ اکبر کس اسپتال میں زیر علاج ہے۔ پھر میں ایک شام اس کی عیادت کو جا پہنچا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم ان دنوں اپنے دل کی نازبرداری میں مصروف ہو جس کی وجہ سے ناول کے آخری باب کی اشاعت کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ مسکرایا، ''آخری باب میں نے لکھ لیا ہے۔ بس یہاں سے نکلتے ہی نظر ثانی کے بعد چھپائی کے لیے دے دوں گا۔''

میں نے کہا، ''تمھارے پڑھنے والے ثمن اور ساحر کے بیٹے کی پہلی سال گرہ کے جشن کا احوال جاننے کے لیے بے چینی سے تمھاری تحریر کے منتظر ہیں۔''

اچانک اکبر کا منہ لٹک گیا— ''سال گرہ تو نہیں ہوسکی۔'' وہ بولا۔

''کیا؟'' مجھے دھچکا سا لگا، ''تمھیں پتا نہیں ثمن اور ساحر کے کتنے فین بن چکے ہیں۔ وہ ان کے بیٹے کی سال گرہ کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ضرور سننا چاہیں گے۔''

''مگر ایسا ہو نہیں پایا۔'' اکبر نے تاسف سے کہا، ''میں گیا تھا دونوں کی طرف، مگر جانتے ہو کیا ہوا؟''

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا، "وہ ملے نہیں کیا؟"

"ملے، مگر گھپ اندھیرے میں سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ـــ وہ بس اوپر کی طرف تک رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے کالا آسمان جھانک رہا تھا۔"

"وہ کیوں؟" میں حیران تھا۔

"بھئی بجلی جو نہیں تھی۔" اس نے کہا "سب قمقمے اور نیون سائن بجھا دیے گئے تھے۔ بلدیہ نے تمام برقی اشتہاروں کو ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تو ـــ؟" میں نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

اکبر نے برابر کی میز پر سے ایک اخبار اٹھایا اور ایک خبر کی طرف اشارہ کیا جس کے گرد سرخ دائرہ کھنچا ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ بجلی کی کمی پر قابو پانے کے لیے برقی اشتہارات پر پابندی ضروری ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا، "مگر اس سے ممن اور ساحر کا کیا تعلق ہے؟"

اکبر نے آنکھیں بند کرلیں اور کہنے لگا، "وہ دونوں وہیں تو رہتے تھے، اپنے گول سٹول بچے سمیت ـــ بجلی بجھنے سے ان کے خوابوں کے گھر بھی تاریک ہو گئے ہیں۔ میں اب انھیں اندھیرے فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھ آیا ہوں۔ اس کے بعد وہ کہاں جائیں گے، یہ تو پتا نہیں ـــ میرا ناول یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔"

☆☆☆

باقر نقوی

چاندنی

مغربی لندن کے علاقے ارلس کورٹ کی مرکزی شاہراہ پر، ارلس کورٹ ٹیوب اسٹیشن کے بالکل پاس واقع رقص گاہ Mecca Dancing اگرچہ شراب خانہ بھی ہے مگر دن کے وقت وہاں کا منظر رات کے منظر سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ دن میں یہاں کاروباری سوٹ میں ملبوس دفتری کارکن پھرتیلے لنچ اور ہلکی شراب نوشی کے لیے آتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو کسی لڑکی کو پھسلانے کے لیے یا اپنے کاروباری گاہکوں کو دفتر سے باہر دوپہر کے کھانے کے بہانے بات کرنے یہیں لے آتے ہیں۔

برطانیہ میں Mecca کا لفظ ایسے مرکز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کی طرف ہر ایک کی نگاہ ہو۔ شاید اس لیے سعودی حکومت نے مکہ مکرمہ کی انگریزی میں ہجے تبدیل کر کے Makkah کر دی ہے۔

آس پاس ہی، مرکزی شاہراہ پر اور بہت سی دکانیں بھی ہیں۔ کتابوں کی، اخبارات اور ہر طرح کے رسائل کی، تحائف کی، لانڈری، فش اینڈ چپس، سستے کی بھی اور مہنگے ریستوران بھی۔ غرض رات گئے تک وہاں ضرورت کی ہر شے دستیاب ہوتی ہے۔

ڈانس کلب میں رات کے وقت عجیب رنگا رنگ کیفیت ہوتی ہے، گویا کسی نے الہ دین کا چراغ رگڑ کر برآمد ہونے والے جن کو حکم دیا ہو، ''اس جگہ کو پل جھپکنے سے پہلے بہترین رقص گاہ بنا دو۔'' اور وہ جن ''جو حکم مالک!'' کہہ کر ہاہا کرتا ہوا غائب ہو جائے اور اچانک منظر بدل جاتا ہے۔ اس منظر میں یہ شراب خانہ ایسی رقص گاہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس میں چاروں طرف چھلکی ہوئی کہکشاں، کارنسوں میں چھپائے گئے قمقموں سے دھنک کے ساتوں رنگ ابھر کر فضا میں لہراتے، ہر طرف پھیلی ہوئی ایک پاکیزہ سی نیلی روشنی، جو سیاہ کپڑوں میں تو جذب ہو جائے مگر سفید یا ہلکے گندمی رنگ کے لباس پر اس طرح کھلے کہ ان رنگوں کا لباس پہنے چلنے والوں پر لہراتے ہوئے آسیبی ہیولوں کا گمان ہو۔ چاروں طرف سیاہ پردوں سے ڈھکی دیواروں کے اوپر لگے ہوئے رنگ برنگے جلتے بجھتے قمقمے اس طرح جلتے بجھتے ہیں جیسے نوجوانوں کے سرمست دھڑکتے دل۔

دائیں جانب، ہال کے آخری حصے میں ایک بینڈ ہوتا ہے جس کے مختلف سازوں کو سات مختلف

آدمی جھوم جھوم کر زور زور سے بجاتے اور سر دھنتے ہیں۔

ایک طرف بار کاؤنٹر ہے جس کے سامنے بلند قامت اسٹول ہیں جن کے گدّوں پر گہرے سرخ مخمل کا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ بار کے پیچھے ہیڈ بار مین کے ساتھ سیاہ بلاؤز اور گھٹنوں سے کچھ اوپر تک محدود منی اسکرٹ میں ملبوس، سفید براق 'ایپرن' باندھے، پریوں جیسی موہنی صورت والی نازک اندام، کم عمر لڑکیاں ساقی کا کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ لڑکیاں عموماً غیر ملکی طالب علم ہوتی ہیں، اور جز وقتی کام کر کے کچھ کما لیتی ہیں۔

بار کے کاؤنٹر کے اوپر جھل جھل کرتے ہوئے طرح طرح کے خالی جام بڑی سی کنگھی جیسے لکڑی کے بنے ہوئے کنگوروں میں الٹے لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے یوں، کہ شراب نوشی کے بھی کچھ آداب ہیں۔ ہر قسم کی شراب کے لیے مخصوص وضع کے جام استعمال ہوتے ہیں۔ وائن کے لیے ایک لمبی ٹانگ والا بیضوی جام، وسکی کے لیے چھوٹے چھوٹے، مگر موٹے پیندوں والے گلاس، شیمپین کے لیے قیف نما ایک لمبی ٹانگ والا جام، برانڈی کے لیے بڑے سے قمقمے جیسا چھوٹی ٹانگ کا جام وغیرہ۔ کون سی شراب کس کھانے کے ساتھ پی جائے، اس کا بھی ایک الگ نظام ہے۔

رقص گاہ کے دروازے آٹھ بجے شب کھل جاتے ہیں۔ تمام تر دھنک آمیز رنگینیوں اور بے تحاشا چیختی چلاتی موسیقی سے مزین یہ جگہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن کو اور ان کے تھرکتے ہوئے کولھوں اور اونچی ایڑیوں کی حرکت تیز کر دیتی ہے۔ دنیا بھر سے آئی ہوئی نئے خون اور جوانی کی سرشاری سے لبریز نوخیز جوانیاں، لڑکے ہوں یا لڑکیاں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، بغل گیر جوڑے، بھڑک دار لباس پہنے جوق در جوق آنے شروع ہو جاتے ہیں، اور جیسے جیسے رات بھیگتی ہے، خواہ سردی کا موسم ہو یا گرمی کا، جوش بڑھتا جاتا ہے۔ کوئی بھی موسم ہو، یہاں ہمیشہ ایک ہی جیسا سماں ہوتا ہے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب بیٹلز نے مغربی موسیقی کا صدیوں پرانا جبہ و دستار اتار کر اس کو منی اسکرٹ اور بغیر آستینوں کا بلاؤز پہنا دیا تھا۔ 'جاز'، 'سمفنی' اور 'اوپرا' کے رسیا پرانے انگریز پہلے تو 'بے ہنگم موسیقی' پر منہ بناتے تھے مگر اس نئی موسیقی کی تال ہی ایسی ہوتی تھی کہ اچھا خاصا ثقہ اور عمر رسیدہ انسان بھی اپنے جوتے کی نوک کو قابو میں نہ رکھ پاتا۔

ان دنوں ہر نوجوان کی خواب گاہ میں، لڑکی ہو یا لڑکا، بیٹلز کے پوسٹر لگے ہوتے تھے۔ بیٹلز کے گراموفون ریکارڈ خوب بکتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ABBA نامی دو لڑکیوں اور دو لڑکوں پر مشتمل طائفہ موسیقی کی دنیا پر چھا گیا تھا جس کے مشہور گانے 'مماميا' کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ان نئے آنے والوں نے مغربی موسیقی کا ایک بالکل نیا رنگ 'پاپ میوزک' پیش کیا جو آج مغربی موسیقی کی عالمی سلطنت پر راج کر رہا ہے۔

ڈانس ہال میں تقریباً ہر روز آنے والا، ولید آ کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور بار مین جیک کو ہیلو کہہ کر بولا، ''جیک، پلیز مجھے ڈبل وسکی دینا، آن دی راکس۔'' اور اس کی نظروں نے رقص میں جھومتے لڑکے لڑکیوں کا سروے کرنا شروع کر دیا۔

''شیور ولی، ان اے منٹ۔'' بارمین نے اپنے روزانہ کے گاہک کو مسکرا کر جواب دیا۔
ابھی ولید کا جام سامنے آیا ہی تھا کہ اس کا انگریز دوست جان بھی آن بیٹھا۔
''جیک، میرے دوست کے لیے ایک بلڈی میری، پلیز۔ تھینکس۔'' ولید نے بارمین سے درخواست کی۔
''آج کا دن بہت اچھا تھا۔'' جیک نے خالص انگریز کی طرح بات شروع ہی موسم سے کی۔
''ہاں جیک، بہت حسین دن تھا آج۔'' ولید نے خود کار مشین کی طرح فوراً کہا۔
انگریزوں کی بات ہمیشہ موسم سے شاید اس لیے شروع ہوتی ہے کہ جزائر برطانیہ کا موسم ہمہ وقت بدلتا رہتا ہے۔ اور پہلے زمانے میں جب موسم کی پیشین گوئیاں کرنے والے مصنوعی سیارے اور سپر کمپیوٹر نہ تھے تو موسم کی تبدیلی اچانک اور قابلِ توجہ ہوا کرتی تھی جس کا تذکرہ تقریباً ضروری ہوتا تھا۔ کبھی دھوپ، تو کبھی بارش۔ کبھی اولے ہیں تو کبھی پسینا بہانے والی گرمی۔ اب موسم کے تذکرے سے بات کا شروع کرنا ایک رواج بن گیا ہے۔
رات کے دس بجے تک، خاص کر 'ویک اینڈ' کی راتوں میں، پورا ڈانس ہال کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔
نو بجے کے قریب اکبر بھی بار میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں ولید کو تلاش کر رہی تھیں کہ ولید نے پیچھے سے آ کر اس کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آؤ میری جان، اکبر۔ یار تیرے بغیر، نہ جانے کیوں، مزہ نہیں آتا۔ تم نہ پیتے ہو نہ کچھ اور کرتے ہو پھر بھی تمھارے ساتھ ایسی جگہ بھی لطف آتا ہے۔''
''جیک، میرے اس دوست کے لیے ایک ورجن میری، پلیز۔ تھینک یو۔'' ولید نے بارمین سے کہا۔
ولید نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کو ہال میں داخل ہوتی ایک لڑکی نظر آ گئی۔
اس نے فوراً اپنا جام اٹھایا، اکبر کے گھٹنے پر ہلکی سی تھپکی دی اور ''ابھی آیا'' کہہ کر اس لڑکی کی طرف بڑھا۔
لڑکی کے قریب جا کر ولید مسکرایا، ذرا سا جھکا اور اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا ''میں ہوں، ولی۔ کیا میں تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' اور اس نے حسبِ عادت لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔
لڑکی نے ولید کی آنکھوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکائیں اور مسکرا کر کہا ''میں ہوں مونیکا۔''
''فرام؟'' ولید نے سوال کیا۔
''فرام زیورخ۔'' مونیکا نے جواب دیا۔
''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' ولید نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''مجھے بھی۔'' مونیکا نے ولید کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے جواب دیا۔
مونیکا نے محسوس کیا کہ ولید کا ہاتھ اس کے ہاتھ کو ضرورت سے ذرا زیادہ دبا رہا ہے۔ یہ ایک

اشارہ تھا کہ 'مونیکا تم میرے لیے عام لڑکیوں سے زیادہ اہم ہو۔'

ولید نے مسکرا کر لڑکی کی کمر کی جانب ہاتھ بڑھایا، جو اشارہ تھا کہ 'تشریف لائیے۔' اس کے سامنے ایک بار پھر ذرا سا جھکا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بائیں ہاتھ سے اپنی نشست کی جانب اشارہ کیا اور پاس کی کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

مونیکا قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بہت شکریہ۔'' ولید نے مسکرا کر پھر کہا اور اس کو مشروب کی دعوت دی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مونیکا چند دن ہی ہوئے زیورخ سے لندن آئی تھی۔ ولید یہ سب تاڑنے میں بڑا ماہر تھا۔ لڑکی کا ڈانس ہال میں ہچکچا کر داخل ہونا، بار بار ادھر اُدھر دیکھنا ولید کے لیے اشارہ تھا کہ نئی چڑیا ہے اور اس شہر کی نہیں ہے۔ اگر اکیلی ہے تو بہت جلد دوست بن جائے گی۔ مونیکا کو بھی تو دوست چاہیے تھا۔ اس نے ولید کی جانب سے مشروب کی پیش کش قبول کرلی۔

ولید نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور ایک 'بار گرل' یعنی ساقیہ نے قریب آکر مونیکا سے بڑی نزاکت اور تبسم کے ساتھ ذرا جھک کر پوچھا، ''مس آپ کیا پینا پسند کریں گی؟''

لڑکی نے مسکرا کر ولید کی طرف دیکھ کر شکریہ ادا کیا اور آہستہ سے کہا، ''وہائٹ وائن پلیز۔''

ولید کی یوسف جمال شخصیت لڑکیوں کے لیے غضب کی جاذبیت رکھتی ہے۔ تیز گندمی رنگ، قدرے لمبوترا مردانہ چہرہ اور غیر معمولی نقوش کا حامل۔ چھ فٹ کا نوجوان، لباس کے معاملے میں بہت اعلیٰ ذوق والا، سوٹ ہو تو اعلیٰ درجے کا، قمیص ہو کہ ٹائی، ہمیشہ اچھے برانڈ کی ہو اور بہترین رنگوں کے امتزاج والی۔ مگر اس وقت نائٹ کلب میں وہ نارنجی رنگ کی جیکٹ، سفید قمیص اور سیاہ رنگ کا پتلون پہنے ہوئے بڑا شان دار لگ رہا تھا۔

ولید کو سوٹ سے زیادہ بلیزر پسند تھے، جن کے ساتھ پتلون بالکل مخالف رنگ کی ہوتی۔ کوٹ کی جیب میں ہمیشہ میچنگ رومال، چمک دار جوتے، اور مہنگی خوش بو۔ غرض ہر زاویے سے وہ انگریزی زبان کی اصطلاح میں ایک کامیاب 'لیڈی کلر' اور اردو زبان کے اس شعر کے مصداق کہ خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو۔۔۔ یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے۔

اس کی کوبرے جیسی آنکھوں میں جادوئی کیفیت ہے۔ وہ جس کی طرف بھی دیکھتا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا، جس کو ہما شما برداشت نہیں کر پاتے۔ بات کرنے کا انداز بھی تحکمانہ مگر خطرناک مسکراہٹ میں لپٹا ہوتا، گویا بات نہیں کر رہا، حکم دے رہا ہوتا ہے، مگر انداز شائستہ، بدتہذیبی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ تیر جیسی نظریں جس لڑکی پر پڑتیں اس کے لیے جاں بر ہونا مشکل۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے لڑکی اپنی جگہ اسی طرح جم جاتی ہے جیسے رات کے اندھیرے میں کسی ہرن پر شکاری کی سرچ لائٹ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ جم سا جاتا ہے۔ ولید کا معیارِ عشق ہے بھی بہت بلند۔ وہ ہر ایک کو خاطر میں کب لاتا

ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ حسن ہی پر جمتی ہے۔

ولید کی عادت تھی کہ ڈانس ہال میں جاتا تو ہمیشہ بار کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتا۔ سامنے وِسکی کا جام رکھ کر ہر طرف نظر ڈالتا اور جب کوئی لڑکی اس کی نظر میں آ جاتی تو کام شروع ہو جاتا۔ اٹھ کر اس کے پاس جاتا اور نہ جانے کس طرح اس سے بات کرتا، کیا بات کرتا، مگر کم از کم اکبر نے شاید ہی کبھی کسی لڑکی کو انکار کرتے دیکھا ہو۔ ڈرنک اور رقص کے بعد ہر لڑکی کو وہ 'منزل' کی طرف لے جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کچھ کو تو رقص کے بعد ایک آدھ جام کے بعد رخصت کر کے اکبر کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتا، یار چلو، بہت ہو گیا۔ اور وہ دونوں ارلس کورٹ کے ٹیوب اسٹیشن تک ساتھ جا کر جدا ہو جاتے۔ ولید ہمیشہ اکبر کو اسٹیشن تک وداع کرنے جاتا۔

اس شام، مونیکا بھی ہرن کی طرح اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گئی تھی۔

ڈرنک کے دوران کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ولید نے مونیکا کو رقص کی دعوت دی جو اس نے بلاتامل قبول کر لی۔ ولید نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور رقص کے دائرے میں داخل ہو گیا۔

رقص کے دوران ولید آہستہ آہستہ مونیکا سے مسکرا کر اس کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

''مونیکا، تم بہت خوب صورت ہو۔ کیا ساری سوئس لڑکیاں تمھاری ہی طرح خوب صورت ہوتی ہیں؟'' ولید نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ ولید، خوب صورتی تو ہر جوانی میں ہوتی ہے، لڑکی ہو یا لڑکا۔ تم بھی تو کتنے اسمارٹ ہو۔'' مونیکا نے مسکراتے ہوئے ولید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

''ڈارلنگ، تمھارا خاندان کون سی گھڑی بناتا ہے؟'' ولید نے ایک تکا مارا۔

''ارے! تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا خاندان گھڑی سازی کرتا ہے؟ کیا تم غیب کا حال بھی جانتے ہو؟'' مونیکا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔ اور ساتھ ہی کہا، ''ہمارے کارخانے میں 'ویسٹ اینڈ' نام کی مشہور گھڑی بنتی ہے، جو پورے ایشیا میں برآمد کی جاتی ہے۔''

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کلائی مونیکا کے سامنے کر دی، جس پر مشہور زمانہ 'ویسٹ اینڈ' گھڑی ہی بندھی ہوئی تھی، جو اس نے لاہور میں خریدی تھی۔ ''میرے علم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آج تمھاری ملاقات ویسٹ اینڈ گھڑی والی سے ہوگی، سو میں آج یہی گھڑی پہن کر آیا اور تمھارا انتظار ہی کر رہا تھا۔'' ولید نے مسکراتے ہوئے کہا، ایسی مسکراہٹ سے جو مزاح میں بھی ہو سکتی ہو۔

ولید نے سوچا تھا کہ اگر لڑکی گھڑی والی نہ ہوئی تو مذاق میں بات اڑ جائے گی۔

''میں حیران ہوں، ولید۔ تم واقعی کمال کے آدمی ہو۔ میرے بارے میں اور کیا بتا سکتے ہو؟'' مونیکا نے سوالیہ انداز میں حیرت سے ولید کی طرف دیکھا اور پھر کہا، ''کیا تم ہاتھ دیکھنا جانتے ہو؟''

''دیکھ لو ڈارلنگ، میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کیا کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ میں تو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ

اس وقت تم نے کس رنگ کا زیر جامہ پہن رکھا ہے؟ مگر میں تم کو شرمانا نہیں چاہتا، اس لیے مزید کچھ نہیں کہوں گا۔'' ولید نے اپنی فن کاری دکھائی۔ تیر بالکل نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔

''واقعی ولید!۔'' مونیکا نے زیر جامے کا رنگ سننے سے پہلے ہی لجائے ہوئے انداز میں بات کاٹ دی اور بولی، ''اچھا بتاؤ، تمھارا خاندان کیا کرتا ہے؟''

''میرے والدین پاکستان میں جاگیردار ہیں۔ انگریزوں کی دی ہوئی چھوٹی سے جاگیر ہے، بس اتنی چھوٹی سی کہ اس کی حدیں نظر نہیں آتیں۔ یہ خاکسار نوابین میں سے ہے۔'' ولید نے سرخم کرتے ہوئے بڑ ہانکی۔ مونیکا واقعی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ولید کی یہی فن کاری تو ہے جو کام کر جاتی ہے۔ اتنے اعتماد سے بات کرتا ہے کہ اس پر شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سب کچھ نہیں جانتا۔

''تم لندن میں کب سے ہو؟'' مونیکا نے رقص کے دوران پوچھا۔

''میں تو پانچ برس کی عمر سے یہیں کیمبرج کے ہاسٹل میں داخل تھا، تعلیم کے لیے۔'' ولید کا ایک اور فراٹے دار جھوٹ۔

''اوہ۔۔اچھا!'' مونیکا نے بڑے پیار سے اپنا سر ولید کے کاندھے پر ٹکا دیا۔

تھوڑی دیر رقص کے بعد مونیکا نے اجازت چاہی۔

''ایک اور ڈرنک، ڈارلنگ۔'' ولید نے اصرار کیا۔

''نائن ڈانکے۔ اوہ معاف کرنا، میرے منہ سے سوئس زبان کا 'نہیں بس شکریہ' نکل گیا۔ مجھے کچھ کام بھی ہے، بس اب چلتی ہوں۔'' مونیکا نے شائستگی سے انکار کیا۔

مونیکا کو دروازے تک پہنچا کر، اس سے دوسرے دن آنے کا وعدہ لے کر، ولید اکبر کے پاس واپس آیا۔

''معاف کرنا یار، تم کو چھوڑ کر میں اس لڑکی کے پاس چلا گیا تھا۔ مائنڈ تو نہیں کیا۔'' ولید نے اکبر سے کہا۔

''یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ تم کو مطلب کی لڑکی نظر آجائے تو پھر تم کہاں ٹھہرتے ہو۔ کوئی بات نہیں، یار۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''یار، ان معاملات میں دیر نہیں کی جاتی، تم تو سمجھتے ہو نا۔'' ولید نے اکبر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں میں بات چیت ہوتی رہی، جس میں ولید کا دوست جان بھی شریک رہا۔

ولید نے اکبر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''چل یار، بہت ہو گیا، اب گھر چلتے ہیں۔''

اور پھر دونوں ڈانس کلب سے نکل کر اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے۔

مونیکا کے خاندان کا زیورخ میں گھڑیوں کا کارخانہ تھا۔ مال دار خاندان تھا مگر یورپ کے رواج

کے مطابق لڑکے لڑکیاں اٹھارہ برس کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خود کماتے ہیں اور سرکاری خرچے پر، یا پھر اپنے خرچے پر، تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اکثر کچھ عرصے کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک تعلیم حاصل کرنے بھی چلے جاتے ہیں جس سے ان کو نئی زبانیں سیکھنے کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ یورپی لڑکیوں کے لیے لندن بہت جاذبیت رکھتا ہے، کہ وہاں رہ کر انگریزی سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے، مگر اس زمانے میں برطانیہ میں مستقل قیام کے لیے وہاں مقیم کسی لڑکے سے شادی کرنی ہوتی تھی۔

اس لالچ میں بہت سی یورپی لڑکیاں، برطانیہ میں مقیم ایشیائیوں سے شادی کر لیتی تھیں۔ ایشیائیوں ہی سے اس لیے کہ انگریز لڑکے شادی کے جال میں نہیں پھنستے۔ شاید مونیکا بھی ان ہی چکروں میں چند دن قبل ہی لندن آئی تھی۔

ہمیشہ کا کھلنڈرا، گبرو، لمبور یا جوان ولید تقریباً بلا ناغہ یہاں اس طرح موجود ہوتا گویا اس نے ڈانس ہال کا سیزن ٹکٹ خرید رکھا ہو۔ ولید کی طرح روز نہیں، مگر اکبر بھی دل بہلانے کے لیے آجایا کرتا۔ ولید سے اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ ولید بالکل مادر پدر آزاد کردار ہے۔

لاہور میں مقیم، ولید کے والد، حمید چودھری خدا ترس اور تہجد گزار مسلمان، مگر بیٹا غالب کی طرح آدھا مسلمان؛ سؤر نہیں کھاتا، باقی سب کچھ کرتا ہے۔ جب کہ اکبر اس کے بالکل برعکس۔ رقص گاہ میں آتا ضرور ہے مگر اس کے تیل میں کبھی رنگا نہیں۔ ولید کے ہاتھ میں وسکی کا جام تو اکبر کے ہاتھ میں بغیر 'ووڈکا' کی 'ورجن میری' ہوتی تھی۔ ایسی جگہوں پر اگر کوئی صرف پھلوں کا عرق پیتا ہو تو اس کو چیذو سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے شراب نہ پینے والے ٹماٹر کا جوس پیتے ہیں جس پر بلڈی میری کا گمان ہو۔

رقص گاہ کو ولید کی شکار گاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مونیکا جیسی کئی لڑکیاں اس کی دوستی کا شکار ہو کر الگ بھی ہو چکی تھیں۔ یہ صورت ولید کے لیے بہت موزوں تھی۔ ایک کا ہو کر رہنے کے لیے وہ ابھی تیار نہیں تھا — اور اس میں مزہ بھی نہیں تھا۔

حسب وعدہ دوسرے دن مونیکا آئی۔ ولید سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ولید نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور معمول کے مطابق ڈرنک پلایا، اور دونوں رقص میں مشغول ہو گئے۔

گھنٹا بھر رقص کرنے کے بعد ولید نے مونیکا کو کھانے کی دعوت دی اور اس کو لے کر ڈانس ہال سے باہر چلا گیا۔

کچھ اسی قسم کا معمول تھا ولید کا۔ اگر لڑکی پسند بھی ہو اور راضی بھی تو قاضی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

لاہور کے مقابلے میں لندن بہت بڑا شہر ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ لندن میں ہو سکتا ہے لاہور میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ارلس کورٹ اسی انگلستان کا ایک علاقہ ہے جہاں ۱۹۳۰ء کے صنعتی انقلاب سے قبل انگریز اشرافیہ کی اٹھارہ برس سے کم عمر کی لڑکیوں پر غروب آفتاب کے بعد باہر نکلنے پر پابندی ہوا کرتی

تھی۔ دن میں بھی نکلنے کے آداب تھے۔ کنواری لڑکیاں اسکول جاتے وقت ٹخنوں سے اوپر تک کے سفید موزے پہنتی تھیں۔ اسکول یا کالج کے علاوہ کہیں باہر جاتے وقت سفید موزے گھٹنوں تک جاتے تھے۔ یہ پہچان تھی کنوار پن کی۔ وکٹوریائی عہد میں بھی پس پردہ تو ہر طرح کی ''آزادی'' تھی، مگر آنکھوں میں حجاب تھا۔ تب، اشرافیہ میں، شادی کے بغیر علی الاعلان ساتھ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اب صدی کے چھٹے عشرے کے بعد سے پورا مغرب بالکل آزاد ہو چکا ہے۔

اکبر نسبتاً کم حیثیت گھرانے کا فرد تھا۔ اپنی مالی تنگ دستی کی وجہ سے وہ اپنی ایک عزیزہ کے ہاں کرایہ دار مہمان تھا، اس لیے کہ کم آمدنی میں اسی میں گزارا ہو سکتا تھا۔ اس کی مجبوری تھی، مگر اس کا دل بہت چاہتا تھا کہ وہ بھی ارلس کورٹ میں جا رہتا اور ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے مصداق وادِ شجاعت جوانی دیتا۔ ولید کی 'گل کاریاں' اکثر اکبر کو اکساتی تھیں۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے جس میں جسم کے اندر بہتی ہوئی خون کی لہروں میں ہارمون طوفان مچائے رکھتا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ اس نے ہر ذی روح کو بنایا ہی ایسا ہے ورنہ یہ دنیا کیسے آباد رہتی۔

ولید کے والد اور والدہ تقسیم ہند کے وقت ہجرت کر کے لاہور کے محلّے گڑھی شاہو میں مقیم ہو گئے تھے۔ جس گھر میں وہ رہتے تھے وہ کسی ہندو کی چھوڑی ہوئی جائیداد تھی، جو ولید کے والد حمید صاحب کو الاٹ ہو گئی تھی۔

ولید تین بھائی اور ایک بہن میں تیسرے نمبر پر تھا۔ اُس کے والد سرکاری عہدے پر فائض تھے۔ گھر کا ماحول اوسط درجے کے خوش حال گھرانوں جیسا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند۔ عید، بقرعید، محرم، گیارہویں شریف کی نذر و نیاز؛ غرض ایک سادہ، خدا پرست ماحول میں ولید کی تربیت ہوئی تھی۔ مگر وہ بچپن ہی سے کھلنڈرا تھا۔ وحید کے دونوں بڑے بھائی، نوید اور زبید، برطانیہ جا چکے تھے اور شادیاں کر کے وہیں آباد ہو چکے تھے، جب وہاں جانے پر ویزا تھا اور نہ کوئی پابندی۔ دونوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کی کوشش کی تھی مگر اس لیے کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ انھوں نے گوری لڑکیوں سے شادی کر لی تھی اور زندگی کی چکی پیسنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ بہن نفیسہ نے لاہور سے گریجویشن کیا اور راول پنڈی میں مقیم ایک فوجی افسر سے بیاہی گئی۔ وہ اپنے گھر خوش تھی۔

ولید کے والد چودھری حمید صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔ اب ولید ہی ان کے ساتھ رہتا تھا، مگر بھائیوں سے خط کتابت اور فون کے ذریعے رابطہ رہتا تھا۔ اس نے بھی برطانیہ جانے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر جب اس کا وقت آیا تو برطانیہ میں مستقل قیام پر خاصی پابندیاں لگ چکی تھیں۔ اب وہاں مستقل قیام کے لیے 'ورک پرمٹ' یا کسی برطانوی قومیت کے حامل فرد سے شادی کے سوا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ سیاح کی حیثیت سے آنا جانا مشکل نہیں تھا۔

ولید کے برطانیہ جانے کی ضد پر والد نے اس سے کہہ دیا تھا کہ تم ہی ایک پاکستان میں رہ گئے ہو۔ میں تمھیں برطانیہ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم بھی چلے گئے تو ہم میاں بیوی کس کے سہارے رہیں

گے۔ جن کی اتنی اولاد ہو وہ اکیلے رہیں تو کتنے افسوس کی بات ہے۔ ولید بضد تھا کہ وہ برطانیہ ضرور جائے گا۔

ولید بچپن ہی سے بہت چلبلا اور نڈر لڑکا تھا۔ کانونٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ دونوں جگہ مخلوط تعلیم کی وجہ سے لڑکیوں کے قریب آنے کا موقع ملتا تھا۔ کالج کے پیریڈ کے دوران بھی ولید چند لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے چکر میں گھومتا۔ بڑے گھر کے لڑکوں کی صحبت میں ہلکی پھلکی شراب نوشی سے بھی شغف ہو گیا تھا۔ متمول گھرانے کے اس کے ساتھی شکار کے بھی شوقین تھے۔ اکثر موبی پرندوں کے شکار پر جاتے تو ولید بھی ان کے ساتھ جاتا۔

ساتھی لڑکوں کے پاس گاڑیاں تھیں۔ ولید رکشا سے کالج آیا کرتا تھا، اور کڑھتا تھا کہ اس کے پاس گاڑی کیوں نہیں۔ ظاہر ہے کہ ملازمت کے ختم ہونے کے بعد اس کے والد کی پنشن اتنی نہ تھی کہ وہ اس عیاشی کے متحمل ہوتے۔ واپسی پر کوئی نہ کوئی دوست ولید کو گھر تک پہنچا دیا کرتا تھا۔

ایک دن پھر قریبی جھیل پر شکار کا پروگرام بنا۔ ولید اور اس کے کالج کے تین ساتھی دو نالی بندوقیں لے کر قریب کی جھیل میں پرندوں کے شکار کو نکل گئے۔ دوپہر سے غروب آفتاب تک گھات لگائے جھیل کے کنارے بیٹھے رہے۔ کوئی پرندہ ادھر نہ آیا۔ لڑکے بیٹھے بیٹھے اوب چکے تھے۔ سورج بجھانے کی تیاری میں آنکھ مچولیاں کر رہا تھا۔

عاصم نے مشورہ دیا۔ "پرندے تو نہیں آئے، تو کیوں نہ ہم لوگ یوں ہی جھیل میں اُگی جھاڑیوں کی طرف نشانے بازی کریں۔"

ارشد نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور پانی میں اُگی نرکل کی جھاڑیوں کی جانب نشانے بازی طے ہو گئی۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور جھاڑیوں سے گزرتی ہوا سے سیٹی جیسے آوازیں آ رہی تھیں۔

"خواہ مخواہ کارتوس ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ اب اندھیرا بھی ہو چلا ہے، جھاڑیوں کی طرف فائر کرنے میں خطرات ہو سکتے ہیں۔" اقبال نے اس خیال کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

اس عمر میں اگر من میں کچھ سما جائے تو من کسی کی نہیں سنتا۔ تینوں نے اقبال کی رائے نہ مانی اور نرکل کی جھاڑیوں کی طرف جا کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر شست باندھنے اور فائر کرنے کی باری لگائی۔ پہلے عاصم نے، پھر ارشد نے بندوق آزمائی کی۔ اقبال نے معذرت کر لی۔ ولید اناڑی تھا۔ اپنی باری پر اس نے بھی فائر کیا، مگر بندوق کا جھٹکا برداشت نہ کر سکا اور بندوق کی نال کا رخ جھٹکے سے دائیں جانب ذرا فاصلے پر کھڑے عاصم کی طرف ہو گیا۔ اسی گھبراہٹ میں دوسری نال کی لبلبی بھی دب گئی۔ فائر ہو گیا۔ عاصم زمین پر گر پڑا۔

اقبال اور ارشد دونوں عاصم کی طرف دوڑ پڑے۔ عاصم بے سدھ زمین پر پڑا تھا اور اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ بس سانس چل رہا تھا۔ جلدی جلدی تینوں نے مل کر اس کو اٹھایا، گاڑی میں ڈالا۔ ارشد نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی شہر کی طرف بھاگی۔

جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو اقبال نے کہا، "ولید! یار ذرا دیکھو تو گولی کہاں لگی ہے۔" پیٹ

ٹٹولا گیا، سر کا معائنہ کیا گیا، سینے پر زخم کے نشان تلاش کیے گئے۔ ناکامیابی ہوئی۔ اتنے میں ولید کی نظر عاصم کے پیروں کی طرف گئی۔ اس کی پتلوں پر کئی گولیوں کی نشانات نظر آئے۔ ساتھیوں نے پتلون پھاڑ کر دیکھا تو کئی چھرے عاصم کی رانوں میں لگے تھے۔ زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اتنی دیر میں عاصم نے، جو شاید دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا، کراہنا شروع کیا۔

ارشد نے گاڑی چلاتے ہوئے، ولید اور اقبال سے کہا: ''اس کے پتلون کو پھاڑ کر زخموں کو کس کر باندھ دو تاکہ زیادہ خون نہ بہے۔ ہم سیدھے عاصم کو جناح اسپتال لیے چلتے ہیں۔''

اسپتال پہنچ کر ایمرجنسی وارڈ میں گئے۔ اندر جا کر ماجرا بیان کیا۔ دو آدمی اسٹریچر لے کر دوڑے۔ عاصم کو اٹھا کر اندر لے گئے اور اس کے جسم کا معائنہ کیا گیا۔ زخم کاری نہ تھا، اس لیے پٹی باندھ کر زخمی کو ایک طرف ڈال دیا گیا اور پولیس کو خبر کر دی گئی، اس لیے کہ یہ پولیس کیس تھا۔

فوراً ہی عاصم کے گھر والوں کو اطلاع کی گئی اور اس کے والد ہانپتے کانپتے اسپتال پہنچے۔ یہ سن کر کہ عاصم کے زخم کاری نہیں، ان کو اطمینان تو ہوا مگر انھوں نے لڑکوں پر برسنا شروع کر دیا۔

''تم لوگوں نے میرے بیٹے کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔'' جب ان کو پتا چلا کہ ان کا بیٹا ولید کی گولی سے زخمی ہوا ہے تو ولید کی طرف دیکھ کر انھوں نے کہا: ''میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔'' اور پھر وہ اسپتال کے کارندوں سے پولیس کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ ان کو بتایا گیا کہ بس پولیس آنے ہی والی ہے۔

ولید بے حد خوف زدہ تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں ذرا واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔ یہ کہہ وہ اسپتال کے اندر کی طرف چلا گیا۔ بہت دیر ہوئی ولید واپس نہیں آیا۔ عاصم کے والد کو تشویش ہوئی کہ اصل ملزم تو وہی تھا۔ واپس کیوں نہیں آیا۔ انھوں نے شور مچا دیا۔

اسپتال والے واش روموں میں جھانکتے پھرے۔ ولید کا پتا نہیں چلا۔ ایک واش روم کی کھڑکی کھلی پائی گئی اور گمان ہوا کہ ولید کھڑکی کے راستے فرار ہو گیا ہے۔

پولیس کے آنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ چوں کہ عاصم خطرے سے باہر تھا اس لیے اب کوئی ایمرجنسی نہیں تھی۔

پولیس آئی تو حالات قلم بند کیے گئے اور بقیہ دو لڑکوں کے بیان لیے گئے۔ ولید کے بارے میں پولیس کو بتایا گیا کہ وہ لڑکا جس کے فائر سے عاصم زخمی ہوا ہے، فرار ہو گیا ہے۔ پولیس نے اس کا پتا ٹھکانا قلم بند کیا اور مزید تفتیش کے لیے تھانے چلی گئی۔

دہشت زدہ ولید اس خوف سے کہ اس پر قتل کا مقدمہ بن سکتا ہے، فرار ہو کر سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور جو بھی پہلی گاڑی ملی اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی پشاور کی طرف جانے والی تھی۔ ولید اوپر کی ایک سیٹ پر اس طرح لیٹ گیا کہ باہر سے دیکھنے والے کو اس کا چہرہ نظر نہ آئے۔ اسے خوف تھا پکڑے جانے کا۔

پولیس ولید کے گھر پہنچی اور اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ گھر والوں نے پہلے تو وجہ پوچھی۔

پھر جب تفصیل معلوم ہوئی تو حمید چودھری صاحب اپنی کمر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ولید کی والدہ نے، جو دروازے سے لگی سب کچھ سن رہی تھیں، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

حمید صاحب نے پولیس انسپکٹر کو بتایا کہ ولید صبح کو شکار کے لیے گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔

ادھر، علی الصبح ولید اسلام آباد اپنے ماموں کے گھر پہنچا۔ ماموں نے حیرت سے پوچھا، ''کیوں بھئی، خیریت تو ہے نا۔''

ولید نے جلدی جلدی اپنی بپتا سنائی اور وہیں سے والد کو فون کیا۔

''ولید، گھبراؤ نہیں تم واپس لاہور آ جاؤ۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔'' حمید صاحب نے ولید کی ڈھارس بندھاتے ہوئے ولید کو واپس آنے کا مشورہ دیا، اور کہا، ''مسئلہ زیادہ گمبھیر نہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

مگر ولید خوف زدہ تھا۔ نہیں مانا اور کہا، ''میں اسی وقت علاقہ غیر کے راستے کابل جا رہا ہوں۔ ماموں جان سے کچھ رقم لے لی ہے۔ آپ مجھے کم از کم تیس ہزار روپے کابل میں بھجوا دیجیے گا۔ میں وہاں سے پاسپورٹ بنوا کر لندن جانے کی کوشش کروں گا۔'' ولید نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

والد نے بہت سمجھایا مگر ولید نے ایک نہ سنی، اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ حمید صاحب نے مجبور ہو کر ہامی بھر لی، اور ولید سے کہا، ''کابل پہنچتے ہی مجھ کو فون کرنا۔''

پھر انھوں نے روپیوں کا بندوبست کیا اور دوسرے دن شام کو ولید کا ٹیلی فون آنے پر رقم اس کو بھیج کر دی گئی۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب برطانیہ جانے کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہوائی اڈے پر چھ مہینے کا ویزا مل جاتا تھا مگر مستقل قیام کے لیے سخت پابندیاں تھیں۔

ولید نے دوسرے دن کابل میں پاکستانی سفارت خانے جا کر ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے کا گھڑا ہوا قصہ سنایا اور چھینے گئے پاسپورٹ کی جگہ نیا پاسپورٹ بنانے کی درخواست دے دی۔ تفتیش کے بغیر پاسپورٹ بنوانے کے لیے اس نے کچھ رشوت دی اور چند دنوں بعد اس کے ہاتھ میں پاکستانی پاسپورٹ تھا۔

ولید نے لندن کا ٹکٹ خریدا اور ایریانا افغان سے لندن پرواز کر گیا۔

راستے بھر ولید سوچتا رہا کہ لندن کے ہوائی اڈے پر ویزا حاصل کرنے کے لیے کیا قصہ سنانا چاہیے۔

لندن کے ہیتھرو ہوائی اڈے پر پہنچ کر ولید امیگریشن کی قطار میں لگ گیا۔ امیگریشن افسر کے سامنے پہنچنے میں صرف دو آدمی رہ گئے تھے کہ ولید زمین پر گر پڑا جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں۔ مسافر کے گرتے ہی امیگریشن ایریا میں بھگدڑ مچ گئی۔ فوراً ایمبولینس بلائی گئی اور ولید کو ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔ ولید کے ساتھ امیگریشن کا ایک نمائندہ بھی تھا۔ قریبی اسپتال پہنچ کر اس کا معائنہ کیا گیا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ کسی شدید خوف کی وجہ سے اس پر بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ دوا وغیرہ دے کر اس کو واپس ہوائی اڈے پہنچا دیا گیا جہاں اس کو امیگریشن کی حوالات میں رکھا گیا۔ وہیں اس سے سوال جواب بھی کیے گئے۔

اگلے دن کی پیشی پر اور سوال جواب ہوئے۔ ولید نے تفصیل سے بتایا کہ میں سکھر کی ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوں۔ اس کے ساتھ بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا کہ لڑکی والوں کو بھنک لگ گئی۔ انھوں نے مجھے لڑکی سے دور رکھنے کے لیے کاروکاری کا الزام لگا دیا تھا، اور بندوقیں لیے مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میں کسی طرح وہاں سے نکل بھاگا ہوں، ورنہ وہ لوگ مجھ کو جان سے مار دیتے۔ اس بنیاد پر ولید نے ہوم آفس سے پناہ کی درخواست کر دی۔

امیگریشن والوں نے دیکھا کہ یہ شخص اتنی دور سے بغیر کسی سامان کے آیا ہے تو ضرور کوئی گمبھیر مسئلہ رہا ہوگا۔ اس کی رپورٹ بنا کر ہوم آفس کو بھیج دی گئی اور جواب کے آنے تک ولید کو حوالات میں رکھا گیا۔ حوالات میں ہر طرح کی آسائش تھی سوائے آزادی کے۔ اس کے بھائیوں کو خبر ہوئی تو ولید سے ملنے آئے، مگر انھوں نے ہوم آفس والوں کی تفتیش میں حصہ لینے سے اس لیے انکار کر دیا کہ ان کو حالات کا صحیح علم نہیں تھا۔

کچھ دنوں بعد ہوم آفس نے تفتیش مکمل ہونے تک کے لیے ولید کو عارضی قیام کا پروانہ جاری کر دیا، اور اس کو اپنے بھائیوں کے ہاں رہنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

ہوا یوں کہ ولید نے ٹیلی فون کے ذریعے حیدرآباد میں اپنے ایک دوست کی مدد سے جوڑ توڑ لگا کر کسی نہ کسی طرح پولیس رپورٹ بنوا کر لندن منگوائی تھی، جس میں اس کو کاروکاری کے سلسلے میں مفرور دکھایا گیا تھا۔ یہ رپورٹ ہوم آفس کو بھیج دی گئی اور اب ولید ایک طرح سے اس وقت تک آزاد ہو گیا تھا جب تک کہ اس کی طرف سے پناہ کی درخواست کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

پناہ کی درخواستوں میں مہینوں ہی نہیں برسوں لگ جاتے ہیں۔

اس زمانے میں پاکستان اور مسلمان اتنے بدنام نہیں ہوئے تھے۔ انگریز سرکار کو کاروکاری کا اچھی طرح علم تھا، اس لیے ولید بڑی چالاکی سے ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور کئی ماہ، کئی انٹرویو اور طویل تفتیش کے بعد بالآخر اس کو برطانیہ میں مستقل طور پر رہنے کی اجازت مل گئی۔

ولید کا دوست اکبر ایک اوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس نے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنے والد کی معاشی مدد کی خاطر نوکری کر لی اور شام کے وقت پڑھائی جاری رکھی۔ اکبر کا گھرانا مذہبی تھا۔

اکبر کی بھی خواہش تھی کہ وہ تعلیم کے لیے انگلستان جائے۔ اس لیے اس نے اسکول کی تعلیم کے دوران ہی سے ٹیوشن پڑھانے شروع کر دیے تھے۔ اسکول کے بعد ملازمت کی، شام کے کالج میں داخلہ لے لیا اور اتوار کے دن وہ تین ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا۔ اس طرح اس نے اپنے والدین کی مدد بھی کی، تعلیم بھی حاصل کی اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ پس انداز بھی کرتا رہا۔ جب اس نے بی اے کر لیا تو انگلستان میں داخلے کی کوشش کی اور اس طرح وہ بھی لندن پہنچ گیا۔

لندن میں بھی پڑھائی کے دوران اکبر چھوٹے موٹے کام کر لیا کرتا تھا، جس سے اپنے والدین

کی مدد کرتا رہتا تھا۔ اکبر کی ایک بہن تھی روبینہ۔ کوئی بھائی نہیں تھا۔ اور عام خاندانوں کی طرح جب روبینہ نے میٹرک کر لیا تو والدین نے اس کی شادی کر دی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ روبینہ کا سسرال کراچی کے متوسط طبقے کے ایک محلے میں تھا۔ اس کا شوہر پڑھا لکھا، خوش اطوار اور ایک نچلے درجے کا سرکاری افسر تھا۔ روبینہ کی زندگی میں ٹھہراؤ تھا۔

ولید کے والدین بہتر حیثیت کے مالک تھے۔ وہ اس کی تعلیم کے اخراجات کے لیے ہر ماہ رقم بھیجتے تھے۔ اکبر کو یہ عیاشی نصیب نہیں تھی۔ 'مرتا کیا نہ کرتا' کے مصداق جو کچھ میسر تھا اسی پر اکتفا کرتا رہا۔ مگر کالج کے بعد اکبر اور ولید ایک ساتھ ارلس کورٹ جاتے اور تفریح کے بعد اکبر اپنی قیام گاہ چلا جاتا۔

کئی برس یہی سلسلہ چلتا رہا۔ تعلیم کے معاملے میں ولید کچھ زیادہ اچھا نہ تھا مگر اس نے گریجویشن کر لیا تھا۔ اکبر اپنی تعلیم ختم کرتے ہی وطن واپس چلا گیا اور ولید سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اکبر اپنی زندگی کے جھونجال میں گرفتار ہو گیا۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور زندگی کے ان فارمولا ٹائپ مراحل سے گزرا جس سے سب گزرتے رہتے ہیں۔

لندن چھوڑنے کے بعد سے اکبر اور ولید میں کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ وقت کی لہروں پر ہچکولے کھاتا اکبر شادی، بچے، ملازمت، مکان، گاڑی — سارے مراحل سے گزرتا، اتفاقاً، خوش قسمتی سے ایک ایسے دوراہے پر پہنچا جہاں سے ایک راستہ انگلستان کو اور دوسرا وطن ہی میں قیام کی منزلوں کی طرف جاتا تھا۔ اس نے پہلا راستہ اختیار کیا اور اس بار بال بچوں سمیت مستقل قیام کے لیے لندن پہنچ گیا۔ کاروباری مصروفیتوں نے اسے جکڑ لیا۔ کاروبار کے سلسلے میں اکبر کا برطانیہ کے مختلف شہروں میں جانا بھی ضروریات میں شامل تھا۔

ایک دن وہ لیور پول گیا ہوا تھا۔ تین کاروباری انگریز افراد کے ساتھ ایک ایشیائی ریستوراں میں اس کا جانا ہوا۔ انگریز چونکہ ایشیائی کھانے بہت پسند کرتے ہیں، اس لیے جب بھی کسی انڈین ریستوراں میں جائیے، زیادہ انگریز ہی ملتے ہیں۔ لہٰذا، جب بھی اکبر کو کھانا کھانے باہر جانا پڑتا انگریز اس کو گھسیٹ کر انڈین ریستوراں ہی میں لے جاتے۔

ریستوراں میں داخل ہوتے ہی اکبر نے دیکھا کہ ولید وہاں اس طرح ٹہل رہا ہے گویا وہی اس ریستوراں کا مالک ہو۔ اکبر سمجھا کہ اسے مغالطہ ہوا ہے، یہ اور کوئی شخص ہوگا۔ قریب جا کر اکبر نے ہیلو کہا۔ وہ آدمی واقعی ولید ہی تھا اور اکبر کو دیکھتے ہی لپٹ گیا۔ ارے یار، کہاں تھا تو اتنے دنوں۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں دائیں ہاتھ کی دوسری اور تیسری انگلی کے درمیان لگی ہوئی سگرٹ کا، مٹھی بند کر کے دیہاتیوں کی طرح لمبا کش کھینچا۔ بس ولید کی یہی ادا گنواروں جیسی تھی۔

اداکاروں جیسی مخصوص بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا "ارے یار! تم یہاں کیسے؟۔ تم اور لیور پول؟ کب آنا ہوا اور کیسے؟"

بس پھر ولید اور اکبر دونوں ایک میز پر جا بیٹھے اور پورا دبستان کھل گیا۔ ولید نے مزے لے لے

کر اپنی زندگی کی ساری کہانی سنائی۔ ساری 'فتوحات' کی تفصیلات۔ زندگی کی اونچ نیچ، ملازمت، شادی، بچے دولت کے حصول کی تگ و دو کا احوال۔ پھر اس نے اکبر سے لندن کا پتا لیا، فون نمبر لیا۔ پھر بولا، بہت دنوں سے میں خود اکیلا محسوس کر رہا تھا، اچھا ہوا تم آ گئے۔ ہم پھر جوان ہو جائیں گے۔ یار پھر رابطہ ہوگا۔ ابھی تو گاہکوں کی خدمت پر نظر رکھنی ہے۔ واپسی پر اکبر نے اس سے ہاتھ ملایا ہی تھا کہ اس نے خالص پنجابیوں کی طرح کھینچ کر گلے سے لگا لیا، حسب معمول اس نے اکبر کے گلے کے بوسے لیے۔ اور بولا، ''آج جو خوشی مجھے ہوئی ہے اس کو میں ترس گیا تھا۔ پھر ملیں گے تو بتاؤں گا۔''

ولید نے لاہور کے ایک خاندان میں شادی کی۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی قمر آرا لندن پہنچ گئی۔ قمر نہایت دیدہ زیب اور خوش قامت لڑکی تھی۔ بھرا بھرا جسم، ہوئی رنگت، لمبے بال، ہنستی تو گال میں گڑھے پڑتے جو اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتے۔ ولید سے صرف چند انچ ہی کم قد۔ دونوں کی جوڑی قابلِ رشک تھی۔ جہاں وہ دونوں اکٹھے جاتے، دیکھنے والے پلٹ کر ضرور دیکھتے۔

قمر آرا کے والد ایک کامیاب کاروباری تھے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل رہتی تھی، قمر اپنے باپ کی اکیلی اولاد، بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ اس کا خاندان ولید کے خاندان سے کہیں زیادہ حیثیت کا تھا، مگر قمر کے والد چاہتے تھے کہ اس کی بیٹی برطانیہ یا امریکا بیاہ کر جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جوں ہی ولید کا رشتہ دیا گیا، فوراً قبول ہو گیا تھا۔ ولید نے تو اپنے والدین کو پورا اختیار دیا تھا، مگر قمر ولید سے ملے بغیر شادی کے لیے راضی نہیں تھی۔

قمر سے ملاقات کے لیے ولید لاہور آیا۔ ان کی ملاقات قمر کے گھر ہی میں ایک الگ کمرے میں ہوئی۔ ایک دوسرے نے اپنے بارے میں معلومات مہیا کی تھیں۔ ولید نے قمر کو اشارتاً اپنی نوجوانی کی بدمعاشیوں کے بارے میں بھی بتا دیا۔ مگر اس نے پکا وعدہ کیا کہ جس دن ان دونوں کی شادی ہو جائے گی، وہ اپنے سارے سلسلے ختم کر کے ایک اچھا شوہر بن جائے گا۔

شادی کے بعد سے ولید نے اپنا وعدہ پوری طرح نبھایا۔

ولید نے کئی ملازمتیں کیں۔ کچھ کاروبار بھی کیے۔ سب میں اچھی آمدنی ہوتی تھی۔ اس نے مارگیج قرض لے کر اعلیٰ درجے کا مکان خرید لیا اور میاں بیوی ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے۔ ولید کے ہاں یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ولید کی بیوی تو خوش تھی مگر ولید کی خواہش تھی کہ ایک لڑکا بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔ قمر آرا ہرگز راضی نہیں ہوئی۔

شاید قمر آرا کو اپنے حسن پر ناز تھا، وہ جس کو برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ عورت کا حسن تو اس کے شوہر کے لیے ہی ہوتا ہے مگر دنیا کے سامنے وہ اپنے حسن کو اس طرح پیش کرتی ہے جس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حسن کے نکھارنے کے لیے جو کچھ کرتی ہے، صرف شوہر کے لیے نہیں ہوتا، ساری دنیا کے لیے ہوتا ہے۔

قمر نے مانع حمل گولیاں استعمال کرنی شروع کر دیں۔ ولید مخالف تھا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ شخصی

آزادی پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد قمر آرا کی مانع حمل گولیاں اس پر اثر انداز ہونے لگیں۔ ولید اور قمر میں چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔ اکثر تکرار بھی ہوتی۔ ولید کو ہمیشہ ہارنا ہی پڑتا تھا۔ مگر ولید نے اپنی مصروفیات میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔ ٹیلی وژن دیکھنا، کتابیں پڑھنا اور بس۔ اکیلے 'باہر آنا جانا' تو اس نے شادی کے بعد ہی ترک کر دیا تھا۔

قمر کے ساتھ بیس برس تک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد دونوں میں دوری پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ دوری کی بظاہر کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو بیٹیوں کی پیدائش کے بعد جب قمر سن یاس کو پہنچی تو مرد میں اس کی جنسی دلچسپی بالکل ختم ہو گئی۔ اس کے لیے بیٹیاں ہی سب کچھ ہو گئیں اور قمر نے ولید کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

بچیوں کے بڑے ہونے کے بعد سے قمر کا پاکستان آنا جانا زیادہ ہو گیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ قمر بچیوں کو انگلستان کے اثر سے جتنا ممکن ہو دور رکھنا چاہتی تھی۔ جب بھی اسکول کی تعطیل ہوتی، وہ لاہور سدھارتی۔ اور تعطیل کا پورا عرصہ ولید اکیلا گھر میں گزارتا تھا۔ ولید اور قمر میں دوریاں اور بھی بڑھنے لگی تھیں۔ عورت کی ذات ایک شجر کی مثال ہوتی ہے جس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں پورا خاندان سکھی رہتا ہے — مگر قمر آرا نے کبھی شجر کا روپ نہیں دھارا۔

اکبر سے دوبارہ ملاقات کے وقت ولید ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا۔ اکبر سے اس کی ٹیلی فون پر اکثر باتیں ہوتی تھیں، مگر بالمشافہ، تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی۔ اکبر اکثر پوچھتا کہ تمھاری شکاری جبلت کا کیا حال ہے۔ ولید ہنس کر کہتا، "یار تجھے تو پتا ہے، اپنی 'مصروفیات' کا۔ وہ تو سب اسی انداز میں چل رہی تھیں مگر انسان جب ایک سے دو ہو جاتا ہے تو اس کو اپنی رفتار دھیمی کر دینی پڑتی ہے۔ اور پھر عمر بھی تو لگام کھینچتی رہتی ہے۔ یار ملیں گے تو تجھ سے باتیں بھی کرنی ہیں اور کچھ مشورے بھی۔"

چند ہفتوں بعد اکبر کے گھر ولید کا ٹیلی فون آیا۔ دو دن بعد وہ لندن آ رہا تھا۔ ملاقات کا مقام اور وقت طے ہو گیا۔

ایک ریستوران میں اکبر اور ولید دونوں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔ ولید اپنے مخصوص انداز میں 'نغمہ سرا' تھا۔ اس کی باتوں میں ہمیشہ کی طرح مبالغہ بھی محسوس ہو رہا تھا، مگر کہانیاں اتنی دلچسپ اور خون کی روانی تیز کر دینے والی تھیں کہ "وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔"

ولید نے کہا، "یار اکبر، میں آج تک تجھے سمجھ نہیں پایا۔ یا تو تُو بالکل — وہ — ہے یا پھر بڑا مکار ہے۔ میں نے تو تجھ سے کبھی پردہ نہیں رکھا مگر تو ہمیشہ بڑا فرشتہ بنا رہا۔" ولید نے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا، "یار — تو کیسا جوان تھا — اب مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تیری 'گزر' کیسے ہوتی تھی۔ اگر تجھے ضرورت تھی تو مجھے بتانا تھا، میں تیری مدد ضرور کرتا — یا پھر تو اپنی 'شکاریات' کو مجھ سے بھی خفیہ رکھتا ہے — یہ دوستی تو نہ ہوئی یارا!" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں اور پنجابی لغت استعمال کرتے ہوئے اکبر کو غور سے دیکھا۔

اکبر اس کو کیا بتاتا۔ بس اتنا کہہ دینا کافی تھا "میرے دو بچے ہیں۔"

ولید نے کہا "یار تو میڈیسن میں بڑی ورک رکھتا ہے۔۔۔ تو جنسیات کے ماہروں جیسا علم بھی رکھتا ہے۔ ذرا مجھے یہ تو بتا کہ تو میری کچھ مدد کر سکتا ہے؟"

"تجھے مدد کی ضرورت ہو اور میں انکار کروں۔۔۔ یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بتا کیا مسئلہ ہے؟" اکبر نے آگے کی طرف جھک کر کہا۔

ولید نے کہا "یراں! (ولید جب موڈ میں ہوتا تھا تو یار کو 'یراں' کہتا تھا) میں نے اپنی زندگی میں بہاریں ہی بہاریں دیکھی ہیں۔ ہر طرف کلیاں ہی کلیاں، ہر طرف پھول ہی پھول۔۔۔ جس کلی کو چاہا توڑ لیا، جس پھول کو چاہا سونگھا اور پھینک دیا۔۔۔ کسی کو کوٹ کے کالر میں لگا لیا۔۔۔ کسی کو مسل کر پھینک دیا۔ اس کی اتنی لمبی تسلسل ہے کہ سچ پوچھو تو میں سب تسلسل سے بیان بھی نہیں کر سکتا۔ اب میں کبھی کبھی تو یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں نے بہت زیادتیاں کی ہیں۔۔۔ شاید اب مجھے سزا ملنی شروع ہو گئی ہے۔"

اکبر نے قدرے حیرانی سے کہا "سزا؟ بتا تو سہی۔۔۔ کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے کہا "ہوا کچھ زیادہ تو نہیں مگر مجھے آئندہ کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ میں اس دن کے تصور ہی سے لرز جاتا ہوں جب میں 'کسی قابل' نہیں رہوں گا۔۔۔ وہ منزل ابھی تو دھندلی ہے مگر اس کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں۔"

"ولید! یاد رکھو، ہر سفر کی کوئی منزل ہوا کرتی ہے۔ کم از کم اس دنیا میں تو یہی ہوتا ہے۔ سفر کی سب سے آخری منزل ایک ہچکی ہوتی ہے، جو ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن لینی پڑتی ہے۔ اس کے لیے تو تم کو بھی تیار رہنا چاہیے۔"

اکبر سمجھا تھا شاید ولید کو کوئی متعدی بیماری ہو گئی ہے۔۔۔ اور اسے اب اپنا انجام نظر آ رہا ہو گا۔

اکبر نے اپنی کرسی ولید کے قریب کی اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "گھبرا نہیں میرے یار، میں تیرے ساتھ ہوں۔ بول۔۔۔ کیا معاملہ ہے؟"

ولید نے اپنا مسئلہ بیان کیا تو اکبر ایک لمحے کو حیرت زدہ ہوا مگر اسے یک گونہ سکون بھی ہوا۔

"پچھلے چند برسوں سے میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ میری جوانی نے ہچکیاں لینی شروع کر دی ہے۔" ولید نے کہا "میں اس کا قصوروار تیری بھابی قمر آرا بیگم کو ٹھہراتا ہوں۔ اس بدبخت قمر کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مرد اور عورت کی ضرورتوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ جب سے اس کے بچے جوان ہو گئے ہیں وہ بیوی نہیں رہی بہن، بلکہ بڑی بہن، بن گئی ہے۔" اُس نے اپنی بات پر خود ہی فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"واہ، واہ۔ عمر رسیدہ بیوی کے لیے بہن، یا بڑی بہن کی تمثیل کتنی شاعرانہ ہے جس کا جواب نہیں۔" اکبر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بیرے نے دونوں کے سامنے مینو رکھا اور آرڈر کے لیے قلم سنبھالا۔

ولید اور اکبر دونوں نے اپنا اپنا آرڈر لکھوا دیا۔

ولید نے بات کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کیا جہاں کٹ گیا تھا۔ ''جب میری 'ضرورت' ہو تو اخلاقیات پر لیکچر شروع کر دیتی ہے۔ اب بتا میں کیا کروں۔ میں نے شادی کے بعد سے ساری 'خوش کاریاں' چھوڑ دی تھیں۔ اب میرے بچے ہیں، بیوی ہے، اب ان سب کا حق پہلے درجے پر ہے۔ زمانہ ہوا میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ تم سوچو تو میں نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔۔۔ مگر قمر کو کیا معلوم کہ میں بیوی اور بچوں کے لیے کیا قربانی دے رہا ہوں۔''

اکبر کی چوتھی اور پانچویں انگلی کے درمیان دبی ہوئی سگرٹ کی آگ سلگتے سلگتے اس کے جلد تک جا پہنچی تھی اور سگرٹ کی راکھ انگلی کے پیسا ٹاور کی طرح ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی، آخری کش لیا اور ایش ٹرے میں مسل کر سگرٹ بجھا دی۔

ولید پھر بولا۔ ''میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میں ایک عضو معطل ہو کر رہ جاؤں۔۔۔ میں بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ اب میری جوانی میں وہ طنطنہ نہیں رہا، جس پر مجھے گھمنڈ تھا۔''

ولید نے قدرے توقف کیا اور پھر ذرا غصے میں بولا۔ ''تیری بھابی اس معاملے میں یا تو احمق ہے یا سب کچھ جانتے ہوئے مجھے نظر انداز کر رہی ہے۔ اور میں ایک ڈھلان کی طرف سرکتا جا رہا ہوں۔ تو بتا کہ میں کیا کروں؟''

اکبر نے کہا، ''یار اب مجھے کچھ کام کرنے ہیں، اس لیے اس کہانی کو یہیں روک دو۔ کل شام پھر ملاقات ہوگی تو بات آگے بڑھے گی۔ اتنا کہہ کر وہ دونوں ہوٹل سے اٹھ کر چل دیے۔

دوسرے دن ولید نے اکبر کو فون کیا اور دریا کے کنارے ملاقات کا وقت طے ہوا۔

قریبی ریستوران میں چائے کے دوران گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔

اکبر بولا۔ ''تمھارے اب تک کے احوال سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمھارا اصل مسئلہ کیا ہے؟''

''برخوردار ولید سلمہ، ہر تخلیق کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، اور اس کی ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے۔ اس کو اپنی تبدیلیوں کا ادراک ہونا چاہیے۔ اس کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں۔'' اکبر نے ماہرانہ انداز میں کہا۔

''مثال کے طور پر، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی گاڑی (نوجوانی کی ابتدا کے ساتھ) سفر پر نکلتی ہے تو ابتدا میں رینگتی ہے، پھر آہستہ آہستہ اس کی رفتار بڑھتی جاتی ہے۔ مخصوص رفتار پر پہنچ جانے کے بعد اس کی رفتار اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ اس کی منزل قریب نہ ہو۔''

ولید بات کاٹتے ہوئے بولا، ''یار، پھر تو نے اپنی بقراطی شروع کردی۔''

اکبر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے 'بقراطی' جاری رکھی، ''یہی وہ کیفیت ہے جو سب سے اچھی اور سکون بخش ہوتی ہے۔ منزل کی قربت کے ساتھ ساتھ گاڑی کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے، مگر اس میں ٹھہراؤ اور وقار آجاتا ہے۔ یعنی حسبِ خواہش روانی۔ اس لیے کہ سفر کے دوران اس کے تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ کس طرح اور کہاں ٹھہرنا ہے، کس طرح رفتار کم کرنی ہے، اور کس طرح 'منزل' پر پہنچ کر رک جانا ہے۔''

اکبر کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے سبز چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا اور پھر بولا، ''جب تک منزل نہیں آجاتی، گاڑی متحرک رہتی ہے۔ شاید کبھی ایک مختصر قیام ضروری ہو تو رکے گی مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ اور پھر چل پڑے گی۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح جوان رہے گا جیسا کہ وہ ابتدائے بلوغت میں تھا — بلوغت میں تو انسان کی کیفیت بجلی کے بٹن جیسی ہوتی ہے، جس کے دبتے ہی پورا وجود جسم سے 'روشن' ہو جاتا ہے۔''

ولید نے لقمہ دیا، ''تو بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ میں نے بھی یہی کیفیت محسوس کی تھی۔''

اکبر جاری رہا، ''پہلی بار بٹن کے دبنے سے جو جھماکا ہوتا ہے، دوسری بار اس جھماکے میں اتنی ہیجانی کیفیت نہیں ہوتی۔ تیسری بار کیفیت اور کم ہو جاتی ہے — اسی طرح کیفیت کا گراف آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جاتا رہتا ہے — مگر — بٹن دبانے سے روشنی ضرور ہوتی ہے، پوری روشنی، مگر فوراً نہیں، دیر میں، پھر کچھ زیادہ دیر میں پھر کچھ اور زیادہ دیر میں۔ تم اس کیفیت کو نہ پاکر جو پہلی بار — یا ابتدائی دور میں جس سے محظوظ ہوتے تھے — سمجھنے لگتے ہو کہ اب تم وہ تم نہیں رہے جو پہلے تھے — اس میں کوئی شک نہیں کہ گزرے لمحے واپس کبھی نہیں آتے مگر ہر نیا لمحہ ایک نئی مشکل کے ساتھ ساتھ ایک نئی کیفیت بھی لے کر آتا ہے۔''

اکبر کہتا رہا، ''تم نے کبھی اس پہلو سے بھی اپنے مسئلے پر غور کیا ہے کہ نہیں — کہ عورت کی زندگی پینتالیس پچاس کی عمر میں سنِ یاس سے گزر کر بالکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اس کو انگریزی میں change of life بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ تخلیق کے فرائض سے سبک دوش ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی جنسی خواہشیں نہ صرف تقریباً ختم ہو جاتی ہیں بلکہ اس کو مرد کی قربت جسمانی تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ تم سے محبت کرتی ہے تو تم سے بھی توقع رکھتی ہوگی تم بھی اس کی تکلیف کا خیال کرو گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات اچھی خاصی کامیاب ازدواجی زندگی اس مرحلے پر آکر بکھر جایا کرتی ہے۔ شاید اسلام نے اسی وجہ سے دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔''

اکبر نے بیرے کو تازہ چائے کا آرڈر دیا اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔

''یہ تو تھی عورت کی وکالت میں بات۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مرد ہمیشہ مرد رہتا ہے بشرطے کہ مرد کے ساتھ مرد جیسا برتاؤ کیا جاتا رہے، اس کی ہمت شکنی نہ کی جائے۔ شباب کے عالم میں مرد کے خون میں وہ سیّال بہتا ہے جو ایک لمحے میں بھک سے جل اٹھتا ہے۔ قدرت نے انسان کو ایسا ہی بنایا ہے،

مگر عمر کے بڑھنے کے ساتھ بے قراری کی کیفیت کم ہوتی جاتی ہے مگر — انجن کم زور نہیں ہوتا — انجن مزید ہموار ہوتا جاتا ہے۔" اکبر کہتا جا رہا تھا۔

"تمھیں خود بھی احساس ہوا ہوگا کہ پچاس برس کی عمر کے بعد جذبات میں وہ تندی نہیں رہتی جو بلوغت کے ابتدائی دور میں ہوتی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ یہ عمل زیادہ وقت کا طالب ہوتا ہے، اور تمھیں وقت بھی زیادہ ملنے لگتا ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ مغرب میں بہت سی خواتین زیادہ عمر کے مردوں کو نوجوانوں کے مقابلے میں فوقیت دیتی ہیں۔ کبھی سوچا بھی، کیوں؟"

"یار تم نے تو بہت پتے کی بات کہی ہے۔ میں نے بھی بالکل ایسا ہی محسوس کیا ہے۔ تو، یہ تو بڑے مزے کی بات ہوئی نا۔ اب مجھے یاد آیا کہ میری ایک دوست ایلزبتھ نے ایک بار مجھ سے یہی کہا تھا، "ولید پہلے تم لونڈے لپاڑی تھے، تمھارا کھیل کود جلد ختم ہو جاتا تھا مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اب سنجیدہ ہوتے جا رہے ہو اور تمھارے اندر کا ٹھہراؤ، تمھیں زیادہ دلچسپ بناتا جا رہا ہے۔ وِی، یو آر گیٹنگ اولڈر، بٹ وولڈر گولڈن۔" آج تم سے بات کرنے کے بعد ایلزبتھ کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آئی ہے۔" ولید نے درمیان میں لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

ولید نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر، لمبا سانس لیا اور بولا، "چلو، ایک بات تو صاف ہوگئی کہ مجھے فکر کی ضرورت نہیں۔ روز بروز میں زیادہ قیمتی اور گولڈ بنتا جاؤں گا — مگر اس گولڈ کا فائدہ؟"

اکبر نے کہا، "تمھارا بنیادی مسئلہ تو رہے گا۔ اس کا میں کیا حل بتا سکتا ہوں۔ ایک ہی سادہ سا حل ہے کہ تم ایک اور شادی کرلو، مگر پہلی بیوی سے تمھارے اتنے برس کے تعلقات ہیں، میں ان کو توڑنے کی رائے کبھی نہیں دوں گا۔"

اکبر نے دیکھا کہ ولید کے چہرے پر سکون لہریں لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا، پھر اکبر کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اٹھا اور بولا، "میری جان — اب میں چلتا ہوں۔ اب میرا ذہن بالکل صاف ہوگیا ہے۔ دکھ کے، تردد کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ تھینک یو مائی ڈیر — تھینک یو ویری مچ۔"

یہ کہہ کر ولید چلا گیا۔ اکبر کے پاس اس کا اکثر فون آتا۔ ایک بار اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنا ریستوران بیچ رہا ہوں۔ میرے کچھ منصوبے ہیں، ملوں گا تو بتاؤں گا۔

ولید نے برطانیہ چھوڑ کر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار کی ٹھان لی — اور چند ماہ بعد پتا چلا کہ وہ لاہور چلا گیا ہے۔ بیوی بچوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا — ولید تو چاہتا بھی یہی تھا — بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

کچھ دن بعد اکبر کا کراچی جانا ہوگیا — وہ گلشن کی 'پارک ٹاورز' گیا ہوا تھا، وہاں اس کی ولید سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اکبر کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کر لپٹ گیا۔ "واہ یار خوب ملاقات ہوئی۔" وہ بچوں کی طرح کھلکھلاتا ہوا بولا۔

ولید اس شام آئس کریم کھانے آیا ہوا تھا، مگر اکیلا نہیں، اس کے ساتھ ایک بیس بائیس برس کی لڑکی 'چندے آفتاب چندے ماہتاب' بھی، اس کے ساتھ بیٹھی آئس کریم سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اکبر کی استفہامی نظریں اس پر پڑتے ہی ولید نے اکبر سے اس کا تعارف کرایا، "یار — چاندنی سے ملو — یہ میری سیکریٹری ہیں — کاروبار میں میرا ہاتھ بٹاتی ہیں۔"

اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا، "اچھا، تو تمھارا کاروبار شام کے بعد شروع ہوتا ہے، اور وہ بھی اس مال میں؟"

ولید اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور بولا، "یار تو سمجھتا نہیں۔"

چاندنی نے اکبر کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور مسکرا کر اپنی آئس کریم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

چند دن بعد ولید نے اکبر کو فون کیا اور شام کو تھائی ریستوران میں کھانے کی دعوت دی۔ اکبر وہاں پہنچا تو غیر متوقع طور پر ولید اکیلا ہی آیا تھا۔

اکبر نے کہا، "کیا تمھاری سیکریٹری آج ڈیوٹی پر نہیں آئی؟"

ولید نے مسکراتے ہوئے کہا، "آج میں نے تجھے بلایا ہے تیرے اس سوال کا جواب دینے کے لیے جو تو نے پارک ٹاور میں کیا تھا۔"

ولید نے کہا، "میں اب کراچی آ گیا ہوں، اس لیے کہ میں جو کام کر رہا ہوں اس کے لیے یہ شہر زیادہ موزوں ہے۔"

اکبر نے شرارت سے پوچھا، "کیا کراچی لاہور سے زیادہ زرخیز ہو گیا ہے؟"

ولید نے کہا، "نہیں یار یہ بات نہیں، لاہور لاہور ہے، زرخیزی کے معاملے میں لاہور کہیں آگے ہے۔ سچی بات تو وہی ہے جو میں نے کہی ہے۔" پھر بدمعاش مسکراہٹ کے ساتھ خود ہی بولا، "تم کو چاندنی کیسی لگی؟"

اکبر نے کہا، "چاندنی بالکل اسمِ بامسمیٰ ہے — چودھویں کے چاند کی طرح — مگر کیا چاندنی پوری طرح کھل کر چاندنی بن چکی ہے۔ کیا تمھارے مقابلے میں وہ بہت کم عمر نہیں؟ تمھاری عمر اور اس کی عمر میں فرق تو چالیس برس کے لگ بھگ ہوگا۔"

ولید بولا، "ہاں ہے تو — مگر — اس کو دیکھ کر میں پچاس برس پیچھے پہنچ جاتا ہوں — بس کیا بتاؤں یار، پتا نہیں میری کون سی نیکی کام آ گئی ہے کہ اوپر والے نے مجھے اتنا بڑا تحفہ بھیج دیا ہے۔ میں تو اس تحفے کے ملنے پر شکرانہ ادا کرتا رہتا ہوں۔" اور پھر اس نے تفصیل سنانی شروع کی۔

چاندنی واقعی ایک نرم و نوخیز چاندنی جیسی سرور بخش تھی۔ سرو قامت، تیکھے نقوش، چمکتا ہوا رنگ، کمان جیسی بھویں، جھیل جیسی نیلگوں آنکھیں، مسکراتی تو موتی جیسے دانت رقص کرتے محسوس ہوتے، ہنس جیسی چال جس میں بلا کا وقار، کھڑی ہو تو 'ویپنگ ولو' کے درخت کی طرح لہراتے بال۔ ہر لحاظ سے وہ سر سے

پاؤں تک ایک بے مثال جوانی تھی، واقعی ایک تحفہ تھی ــــ اور اکبر سوچنے لگا کہ ولید تو بڑا خوش قسمت ہے کہ اس عمر میں اس کو ایسا تحفہ ملا ہے، مگر پھر خود ہی سوچا ــــ کیا یہ خوش قسمتی مناسب ہے ــــ ولید جس میں الجھ رہا ہے؟

ولید نے بتایا کہ چاندنی برابر والی بلڈنگ میں کام کرتی تھی۔ ''تم تو جانتے ہو کہ لڑکی ــــ اور وہ بھی اس بلا کی خوب صورت لڑکی ــــ ہمیشہ میری کمزوری رہی ہے ــــ شادی کے بعد میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا مگر جو کچھ میں نے تمھیں بتایا تھا، اس کی وجہ سے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اب اپنی الگ راہ متعین کروں گا۔''

''تو کیا تم نے قمر کو طلاق دے دی ہے؟ اگر تم نے ایسا کیا ہے تو بہت برا کیا ہے۔'' اکبر نے اس کے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

ولید نے کہا، ''نہیں یار، میں نے طلاق تو نہیں دی ہے مگر قمر کو اب میری ضرورت نہیں ــــ تو میں کیوں اس قید میں رہوں، جس میں گھل گھل کر میں ایک دن ختم ہو جاؤں گا ــــ یہ مجھے ہرگز منظور نہیں ــــ بیوی کے پاس گھر ہے، پنشن ملتی ہے، بچے کما رہے ہیں ــــ اب میں اس کی معاشی ضرورت نہیں رہ گیا ہوں، اس لیے وہ مجھے اہمیت نہیں دیتی ــــ تو میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں بھی اب اس کو اہمیت نہیں دوں گا ــــ''

ولید نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا، ''ہاں! تو چاندنی مجھ کو بہت اچھی لگتی ــــ آتے جاتے ملاقات ہوتی اور میں اس پر جملے پھینک جاتا۔ پہلے تو وہ غصے سے گھور کر دیکھتی تھی ــــ چند دنوں بعد اس کا غصہ ختم ہو گیا مگر وہ مجھ کو گھور کر دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی ــــ اتنی تبدیلی دیکھ کر میری ہمت بڑھی اور کامیابی کی امید بھی ــــ ایک دن میں نے اس کو دیکھتے ہی فلمی گانے کا ایک مشہور مصرع پڑھ دیا، 'چودھویں کا چاند ہو، یا آفتاب ہو'

چاندنی جھینپ سی گئی ــــ مگر مسکرا کر اس نے سر جھکا لیا۔

...میں دفتر میں جا کر بیٹھ گیا ــــ اپنے کام میں مشغول تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور کسی لڑکی کی آواز سنائی دی، 'میں چاندنی بول رہی ہوں۔ آپ شاعر بھی ہیں کیا؟' ــــ میں اتنا حسین نام اور اتنی مترنم آواز سن کر باغ باغ ہو گیا کہ پتھر پانی ہو رہا ہے ــــ میں نے کہا، 'اچھا تو آپ کا نام چاندنی ہے؟ کیا خوب صورت نام ہے ــــ میں تو بہت کچھ ہوں مگر آپ کو اس سے کیا' ــــ اور چاندنی نے کچھ کہے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا ــــ یار مجھے چاندنی سے اتنی جلد اس ریسپانس کی بالکل توقع نہیں تھی ــــ مگر وہ تو باقاعدہ دلچسپی لینے لگی تھی۔

ایک دن پھر چاندنی کا فون آیا ــــ 'آپ نے پھر کوئی شعر نہیں سنایا'۔

یہ سنتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ــــ اور مجھے ایسا لگا گویا میں اندرس کورٹ پہنچ گیا ہوں ــــ ولید نے کہا۔

میں بھی شعر کہتی ہوں۔ بس اتنا کہہ کر چاندنی نے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔'' ولید نے

کہا۔" میں خوشی میں گنگنانے لگا۔"

"بس اسی طرح دن گزر رہے تھے — اب باقاعدہ سلام دعا بھی ہونے لگی تھی۔" ولید بولا۔ "بس اسی طرح بات آگے بڑھتی رہی۔ ہم کبھی کبھی ایک ساتھ لنچ کے لیے چلے جاتے۔ اور پھر ایک دن چاندنی نے لنچ پر جاتے ہوئے مجھے ایک کاغذ پکڑا دیا — اس پر ایک نظم لکھی ہوئی تھی — نثری نظم — نظم پڑھ کر میں سمجھا کہ وہ میری اٹھکیلیوں کا جواب اٹکھیلی سے دے رہی — میں نے وہ نظم اپنے ایک شاعر دوست کو دکھائی — اس نے نظم پڑھ کر آنکھ ماری — اور بولا، 'تم نے پالا مار لیا ہے شہزادے! لڑکی تمھاری طرف نہ صرف راغب ہے بلکہ اس کے دل میں تمھارے لیے جگہ بن چکی ہے' — اب میری پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔"

اکبر نے ٹوکتے ہوئے محاورہ پورا کر دیا۔ "— اور سر کڑاہی میں — اور یہ نہ بھولنا — کڑاہی میں سر کا ہونا ایک عذاب ہوتا ہے۔"

ولید نے قہقہہ لگایا اور بولا، "اب روزانہ چھیڑ چھاڑ ہونے لگی تھی۔ اس کے فون آتے، میں فون کرتا۔ شعر سنے اور سنائے جاتے — رفتہ رفتہ چاندنی میرے قریب آتی گئی۔"

چاندنی اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ اس کے دو بڑے بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ چاندنی کے والد اکرم علی نے کم عمری میں ہی شادی کر لی تھی، اور جلد جلد بچے ہونے کے باعث اس کی بیوی رخسانہ کی جوانی جلد ڈھل گئی تھی۔ اکرم علی اب بھی پاٹھے جوان تھے۔ اس لیے دونوں میں اکثر تکرار ہوتی رہتی تھی۔ اکرم زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے تھے، جو اُن کی بیوی رخسانہ کو پسند نہ تھا۔

رخسانہ ان عورتوں میں سے تھی جو شوہروں کو اپنی ملکیت سمجھتی ہیں۔ اپنے دروازے پر کھونٹے سے بندھے ہوئے بیل کی مانند، جو مالکن کی اجازت کے بغیر کہیں جا نہیں سکتا۔ سمجھتی ہیں کہ مجھ سے شادی کے بعد اب یہ اور کسی کے کام کا نہیں رہا۔ اور یہ تصور سارے مردوں کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہوتا۔ جو منہ زور ہوتے ہیں وہ رسی تڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ جو بزدل ہوتے ہیں وہ کھونٹے پر بندھے بھوسا کھاتے اور کھیت جوتتے رہتے ہیں۔

اکرم علی ایک کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔ آمدنی کم تھی، اس لیے شام کو ٹیوشن بھی پڑھانے لگے تھے۔ اس میں بھی ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا۔ فالتو آمدنی بھی ہو جاتی تھی، اور گھر سے باہر وقت گزارنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ ان کے پاس تین ٹیوشن تھے، دو لڑکوں کا اور ایک لڑکی کا۔ سب کو وہ ٹیوشن ان ہی کے گھر جا کر پڑھاتے تھے۔

چاندنی سن بلوغت کو پہنچی تو اسے اپنے گھر کے تنازعے کا احساس شروع ہوا۔ وہ اپنی ماں سے بہت قریب تھی۔ باپ سے زیادہ قربت نہیں تھی۔ اکثر سوچتی کہ ابا کیوں اس طرح جھگڑتے رہتے ہیں۔ وہ ابھی چھوٹی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ دونوں کے درمیان نزاع کی بنیاد کیا ہے۔ روز روز کے تنازعے سے چاندنی کو اپنے والد سے اُلجھن ہونے لگی تھی۔ گھر کا ماحول ایسا ہو چلا تھا جس میں بچے گھر سے باہر راہِ فرار ڈھونڈتے

لگتے ہیں۔ جب تک اکرم علی گھر سے باہر رہتے چاندنی کو سکون محسوس ہوتا تھا۔

چاندنی کے بڑے بھائی اسلم علی نے انٹرمیڈیٹ کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ ایک اوسط درجے کی ملازمت کر لی۔ کچھ دن بعد ہی اس کی شادی کر دی گئی اور اس نے بھی زندگی کی چکی پیسنا شروع کر دی تھی۔ اس کی بیوی فوزیہ اچھے گھرانے کی تھی اس لیے وہ سسرال والوں کو "چھٹ بھیے" سمجھ کر خاطر میں نہ لاتی تھی۔ کچھ دنوں تک گزر بسر ہوتی رہی مگر جلد ہی ساس بہو کا روایتی ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ شوہر سے بھی جھگڑے ہوتے مگر اس کی وجہ کسی کو معلوم نہیں تھی۔ روز روز کی داستان کٹ کٹ ہوتی۔

اسلم علی کی پریشانی اتنی بڑھی کہ ایک دن وہ صبح گھر سے دفتر کے لیے نکلا اور پھر واپس نہیں آیا۔ گھر والوں کے کئی دن پریشانی میں گزرے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ دوستوں عزیزوں سے معلومات کی گئی مگر کچھ پتا نہیں چلا۔ چند دنوں بعد اسلم علی کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ وہ دبئی پہنچ گیا ہے اور اب وہ گھر واپس نہیں آئے گا۔ اسلم بہت دنوں سے چپکے چپکے نوکری کی تلاش میں تھا۔ جوں ہی نوکری مل گئی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ بس اتنی سے خبر دے کر اس نے فون بند کر دیا۔ گھر میں رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔

اسلم علی کے غائب ہو جانے سے فوزیہ بہت پریشان تھی۔ گھر میں روز لڑائی ہوتی رہتی۔ وہ ساس کو بیٹے کی بے وفائی کا طعنہ دیتی اور ساس بہو کو الزام دیتی۔ فوزیہ کچھ دن تو ساس سسر پر بار بنی رہی مگر ایک دن وہ اپنے میکے چلی گئی۔

کچھ دنوں بعد راز کھلا کہ شادی سے پہلے ہی فوزیہ کی کسی سے آشنائی تھی اور وہ سلسلہ شادی کے بعد بھی قائم تھا۔ اسلم کو شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دن دفتر سے چھٹی لے کر فوزیہ کا پیچھا کیا اور اس کو غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا۔ اسی لیے دونوں میں چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔ فوزیہ انکار کرتی تھی مگر اسلم اس کی بات ماننے پر تیار نہ تھا اس لیے کہ اس نے ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ دونوں میں ازدواجی قربت بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، اسی لیے اسلم بھاگ نکلا۔ کئی برس تک نہ اس نے گھر سے نہ فوزیہ سے رابطہ کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے کسی ہندو لڑکی سے سلسلہ جنبانی کر لی تھی اور دونوں ایک ساتھ رہنے لگے تھے۔ شادی کی تھی یا نہیں اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

چاندنی کی بڑی بہن مہرین کی شادی ہو گئی اور وہ لاہور چلی گئی۔ شادی اوسط درجے کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اکثر مالی امداد کے لیے گھر فون کرتی مگر یہاں کون سا خزانہ رکھا تھا جو اس کے کام آتا۔ مہرین کے دو بچے ہو گئے تھے مگر اس کی شادی بھی بس یوں ہی لشتم پشتم چل رہی تھی۔ دو سال میں ایک بار آتی تو واپس جانے سے انکار کرتی مگر اس کو روتے ہوئے واپس جانا پڑتا تھا۔ اس کی زندگی بھی کچھ قابل فخر نہ تھی۔

چاندنی یہ سب کچھ ہوتے دیکھتی اور دل ہی دل میں سوچتی کہ میں تو ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنی زندگی کی خود مالک بنوں گی۔ اس کے سامنے کی مثالیں بہت دل شکن تھیں۔ چاندنی کالج جانے لگی تھی۔ ابھی اس نے بی اے پاس بھی نہیں کیا تھا کہ اس کے رشتے کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ مگر کچھ فیصلہ

نہیں ہوا۔ چاندنی سب کچھ سنتی رہتی مگر چوں کہ اس سے کچھ پوچھا نہیں گیا تھا، اس لیے وہ بھی خاموش تھی۔ اس نے اپنے دل میں یہ تہیہ کرلیا تھا کہ اگر اس کی مرضی کے بغیر شادی پر مجبور کیا گیا تو عین نکاح کے وقت وہ صاف انکار کر دے گی، خواہ کچھ بھی ہو۔

بی اے پاس کرنے کے بعد چاندنی نے زور شور سے ملازمت تلاش کرنی شروع کی، تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کی کوشش کرے۔ ساتھ ہی گھر کی چاؤں چاؤں سے بھی نجات ملے۔ چند ماہ بعد چاندنی کو اچھی تنخواہ پر ایک دفتر میں ریسپشنسٹ کی ملازمت مل گئی۔

''ارے! مہر النسا تم یہاں کیسے؟'' ایک روز کالج کی دوست کو اپنے دفتر میں پا کر چاندنی بچوں کی طرح کھل اٹھی۔

''بس تمھاری یاد آئی تو تمھارے گھر گئی تھی۔ پتا چلا کہ تم یہاں کام کرتی ہو۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی ہوں۔'' مہر النسا نے کہا۔

برگر ہاؤس میں آمنے سامنے چاندنی اور مہر النسا بیٹھی ہوئی ہیں۔ پلیٹ میں برگر اور چپس رکھے ہوئے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ مہر النسا بولی، ''چاندنی، میں تمھیں اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں — مجھے تمھاری مدد کی بھی اشد ضرورت ہے۔''

چاندنی نے کہا، ''ضرور — ضرور — بتاؤ بات کیا ہے؟''

مہر النسا نے کہا، ''وعدہ کرو کہ تم اس راز کو ہمیشہ راز ہی رکھوگی — وعدہ کرو۔''

''پکّا وعدہ۔'' چاندنی نے کہا۔

مہر النسا نے سرگوشی میں کہا، ''یار — مجھے — وہ — ہو گیا ہے۔''

چاندنی بولی، ''کیا؟ وہ ہو گیا ہے؟ کچھ بتاؤ بھی تو — کیا ہو گیا ہے؟''

''میں — حاملہ — ہو گئی ہوں۔'' مہر النسا نے لکنت سے کہا۔ چاندنی یہ سن کر سناٹے میں آ گئی۔

''کون تھا — کیسے — کب —؟'' چاندنی نے ایک ساتھ کئی سوال داغ دیے۔

مہر النسا بولی، ''مجھے تمھاری مدد کی اشد ضرورت ہے۔ تمھارے علاوہ میں اور کسی سے سب کچھ نہیں کہہ سکتی — وعدہ کرو کہ تم میری مدد کرو گی۔''

''کیوں نہیں کروں گی — بتاؤ تو سہی —''

مہر النسا نے کہا، ''دس ہزار روپے — اور — ابارشن کا انتظام — میں ایک دن تمھاری پائی پائی لوٹا دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

چاندنی نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، ''کوئی مسئلہ نہیں، انتظام ہو جائے گا، بس چند دن کے اندر۔'' اس نے سوچا کہ دفتر سے ایڈوانس لے لوں گی۔

مہر النسا نے چاندنی کو گلے سے لگا لیا اور شدتِ جذبات سے پھر رو پڑی۔

چاندنی نے اپنے دفتر کے اکاؤنٹ سے دس ہزار روپے ایڈوانس کی درخواست کی۔ دفتر والوں نے انکار کر دیا، اس لیے، چاندنی کی ملازمت ابھی مستقل نہیں ہوئی تھی۔ چاندنی پریشان کہ میں وعدہ کر چکی ہوں۔ اب کیا ہوگا۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد اس نے ولید کی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چاندنی نے ولید کو فون کیا، دس ہزار روپے کی حاجت بیان کی۔ ولید نے، وجہ پوچھے بغیر، بلا تامل وعدہ کر لیا۔

ولید نے حسب وعدہ رقم فراہم کر دی۔ مہر النسا کے ماتھے سے کلنک کا ٹیکا مٹ گیا۔

جب کچھ ہو جانے کے بعد چاندنی نے اس لڑکے کے بارے میں اصرار کیا، جس نے اس کو کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ مہر النسا ٹالتی رہی۔ کبھی کہتی میں بتادوں گی۔ کبھی کہتی چھوڑو جو کچھ ہوا ہو گیا۔ مگر چاندنی بضد رہی۔

چند دن بعد بالآخر مہر النسا نے کہا کہ اب تم سننا ہی چاہتی ہو تو لو سنو: ''ایک صاحب مجھے ٹیوشن پڑھانے آتے تھے۔ عمر رسیدہ تھے مگر بہت ہنس مکھ، دل موہ لینے والے انسان تھے۔ ایک دن جب وہ پڑھانے آئے ہوئے تھے مجھ سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ میں پانی لے کر واپس آ رہی تھی کہ قالین سے میرا پاؤں الجھا اور میں ان پر جا گری۔ انھوں نے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو میری چھاتیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ چند لمحوں کے لیے ہم دونوں جیسے جم سے گئے۔ پہلی بار میرے بدن کو کسی کا ہاتھ لگا تھا——

ماسٹر صاحب نے بہت معذرت کی، مگر ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ یہ حادثہ ان کو بہت اچھا لگا تھا۔ تم ہی بتاؤ، اگر میں حادثاتی طور پر ان کی گود میں جا گری تھی اور ان کے ہاتھ میری چھاتی سے جا لگے تھے، تو انھوں نے اپنے ہاتھ فوراً ہٹا کیوں نہیں لیے تھے؟ مگر سچ بات تو یہ تھی کہ وہ حادثہ مجھے بھی اچھا لگا تھا۔

حادثے کے بعد ماسٹر صاحب اکثر تاسف سے اس حادثے کا ذکر کرتے اور کسی نہ کسی بہانے میرے کاندھوں یا بازوؤں پر ہاتھ ضرور رکھ دیتے۔ میں سب کچھ سمجھ رہی تھی مگر میں بدبخت تھی کہ مجھے اس رومانٹک ٹیوشن میں روز افزوں مزہ آنے لگا تھا۔ میں مسکرا کر ان کی طرف دیکھتی اور وہ میرے بدن کو ہاتھ لگاتے، میں جس پر کوئی اعتراض نہیں کرتی۔

میں ان کے قریب ہوتی چلی گئی۔ ان کے ہاتھوں کا لمس مجھے کسی اور دنیا میں پہنچا دیتا تھا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تمھارے سامنے ہے۔''

چاندنی نے ان صاحب کا نام پوچھا تو مہر النسا نے کہا: ''میں تمھیں ان کا نام نہیں بتا سکتی۔''

ایک دن چاندنی نے مہر النسا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر اسے قسم دی: ''تمھیں میری قسم ہے تم اس آدمی کا نام بتاؤ۔''

مہر النسا نے بھی چاندنی کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر کہا: ''تم بھی قسم کھاؤ کہ تم اس راز میں کسی اور کو شریک نہیں کرو گی۔''

''پکا وعدہ۔'' چاندنی نے کہا۔

پہلے تو تذبذب میں کچھ دیر کے لیے مہرالنسا خاموش رہی۔ پھر اس نے نظریں جھکائے ہوئے ہکلا کر کہا ''اب تم — مجبور کر ہی رہی ہو...تو...لو...سن لو — ان کا نام — ہے — اکرم علی — یعنی تمھارے والد۔''

چاندنی اپنے والد کا نام سن کر جیسے سکتے میں آگئی۔

کچھ دنوں سے چاندنی کے گھر والے اس پر شادی کے لیے زور ڈال رہے تھے۔ پہلے تو یوں ہی شادی کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا، مگر اب اچانک اس میں شدت آتی جا رہی تھی۔ چاندنی ایک خوب صورت اور بھرپور جوان لڑکی بن چکی تھی۔ محلے کے لڑکے اس پر لٹو ہو رہے تھے۔ ان لڑکوں میں تنویر سومرو بھی شامل تھا۔

تنویر ایک بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ محلوں کا رہنے والا بڑی بڑی گاڑیوں میں تیز رفتاری کرنے والا، بالکل ویسا ہی جیسے بگڑے ہوئے امیر زادے ہوا کرتے ہیں۔ رات بھر جاگنا، پارٹیوں میں ناچ کود کرنا، کمپیوٹر پر فضولیات دیکھنا، اور دوپہر تک سونا۔

تنویر بھی چاندنی کے دیوانوں میں شامل تھا۔ آتے جاتے وہ چاندنی کو چھیڑنے کی کوشش کرتا، مگر چاندنی طرح دے جاتی، مسکرا کر گزر جایا کرتی۔ اس انداز نے تنویر کو غلط اشارے دیے۔ پہلے تو تنویر نے چاندنی پر خود ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ اپنی جیپ دیر اس کا پیچھا کرتا۔ اس کو اپنے گاڑی میں بٹھا کر کالج پہنچانے کی پیش کش کرتا، مگر چاندنی اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی تھی، بس مسکرا کر انکار کر دیتی۔ اس لیے کہ سومر کی اٹھان صحیح نہیں تھی۔ دولت کی ریل پیل آدمی کو بے راہ رو کر دیتی ہے۔ وہی حال تنویر کا ہو چکا تھا۔

تنویر نے بہت دنوں تک پابندی سے چاندنی سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ جب اس کو کوئی کامیابی ہوتی نظر نہ آئی، تو اپنے دوستوں سے کہہ کر چاندنی کے والد پر زور ڈلوایا کہ وہ اس سے چاندنی کی شادی کر دیں۔

چاندنی کے والدین نے سوچا کہ اس سے اچھا رشتہ کہاں سے آئے گا۔ مال دولت، عزت شہرت، سب کچھ جھولی میں آگرے گا۔ یہ بھی کہ تنویر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور ہزاروں ایکڑ جائداد کا وارث۔ اس کے والد سیاست میں بھی فعال ہیں۔ سیاست میں شامل خاندان کے لڑکوں کو سیاست اور وزارت کے لیے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ اس طرح یہ بھی ممکن نظر آتا تھا کہ تنویر ایک دن اپنے والد کی سیاسی گدی بھی سنبھال لے گا۔

چاندنی کو اس کے والدین نے بہت سمجھایا، مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ انکار کے ساتھ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر آپ لوگوں نے زبردستی کی کوشش کی تو یا تو میں عین وقت پر نکاح سے انکار کر دوں گی، گھر چھوڑ کر ایسی جگہ چلی جاؤں گی کہ کوئی مجھے پا نہیں سکے گا، یا پھر میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی۔ اس کا کہنا تھا کہ تنویر جیسا بے راہ رو انسان اچھا شوہر نہیں بن سکتا، عیاش ضرور بن سکتا ہے۔

والدین سمجھاتے رہے مگر چاندنی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ لہٰذا اس کے والد رشتہ لانے والوں سے مجبوری ظاہر کر دی تھی۔

ایک صبح جب راستے میں ولید کی چاندنی سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت غم زدہ دکھائی دی۔ اس نے سلام کا جواب بھی نہیں دیا— ولید نے اپنے آپ سے کہا، 'ولید میاں! لگتا ہے کہ تم نے کوئی گڑ بڑ کر دی ہے— اب کسی دن بھی کوئی دھماکا ہونے والا ہے!' پھر یہ بھی خیال آیا کہ میرا اور اس کا کوئی جوڑ بھی نہیں— ہوسکتا ہے کہ یہی خیال اس کے دماغ میں بھی آیا ہو، اور اس نے سوچا ہو کہ اب کسی طرح ان بڑے میاں سے چھٹکارا پایا جائے۔ بس اب چند دنوں کی بات ہے۔

چند دن یہی کیفیت رہی— نہ چاندنی نے کچھ کہا نہ ولید نے بات چھیڑی— اس نے سوچا، بخار اتر جائے گا تو طبیعت بحال ہو جائے گی— ایک دن دفتر ختم ہونے کے وقت ولید کے فون کی گھنٹی بجی۔

''میں چاندنی بول رہی ہوں''— اس نے مریل ہوئی آواز میں کہا۔

ولید کا دل زور سے دھڑکا— اب کیا ہونے والا ہے— ''اس نے کہا، خیریت تو ہے نا؟''

چاندنی بولی، ''میں ایک مشکل میں گرفتار ہوں، کیا آپ مجھے کچھ مشورہ دے سکیں گے؟''

''کیوں نہیں— تمھارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔''

چاندنی آہستہ سے ہنس دی— شام کو ملنے کا وعدہ ہو گیا، اور ولید نے سکھ کا سانس لیا۔

تھائی ریسٹورنٹ میں چاندنی اور ولید کی ملاقات ہوئی۔

''میرے والدین جلد میری شادی کر دینا چاہتے ہیں، مگر میں ابھی تیار نہیں ہوں۔'' چاندنی نے خبر سنائی۔

''مگر چاندنی! شادی تو ایک نہ ایک دن کرنی ہی ہوگی۔ اگر لڑکا اچھا ہے تو کر ڈالو۔'' ولید نے جواب دیا۔

''ولید صاحب، یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ جس آدمی کو میرے لیے منتخب کیا جا رہا ہے میں اس کو کبھی پسند نہیں کر سکوں گی۔ ابو مجھ کو کسی نہ کسی طرح اس کے پلو باندھ کر خود آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس میں لالچ کا بھی کوئی پہلو ہو۔'' اس نے رُک کر سانس لیا، پھر بولی، ''میں بزنس میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں، خود کچھ بننا چاہتی ہوں، مگر ابو کہتے ہیں کہ میں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ بس اب شادی کرو اور اپنے گھر جاؤ۔''

مگر— میں اس پر ہرگز راضی نہیں۔ پھر سوچتی ہوں— کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں؟''

چاندنی سر جھکائے اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھ رہی تھی، گویا وہ اپنی تقدیر کی لکیروں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر ولید کی طرف دیکھا اور کہا، ''ایم بی اے کی بھی فیس لاکھوں روپے ہوتی ہے اور وہ بھی سال بھر کی ایک ساتھ دینی پڑتی ہے۔''

ولید بات کی تہہ تک پہنچ گیا، ''تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''آپ مجھے کیا مشورہ دیں گے۔'' چاندنی نے کہا۔

''مجھے کچھ وقت دو تاکہ میں سوچ کر تمھیں صحیح مشورہ دے سکوں۔'' ولید نے جواب میں کہا۔

ریستوراں آہستہ آہستہ بھرتا جا رہا تھا۔ ولید اور چاندنی کے قریب والی میز پر کچھ نوجوان آکر بیٹھ گئے تھے اور بار بار دونوں کی انمل بے جوڑ جوڑی کو دیکھ رہے تھے اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے تھے۔

چاندنی بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ چونکہ ابھی کھانا ختم نہیں ہوا تھا اس لیے لڑکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے — کھانا جلد ختم کرنے کے بعد چاندنی چلی گئی۔

ولید ریستوراں ہی میں بیٹھا بڑی دیر تک اس مسئلے کی اونچ نیچ پر غور کرتا رہا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آتا کہ اگر میں نے اس کے مسئلے سے لاتعلقی کا اظہار کیا تو اتنی اچھی چڑیا پھر سے اڑ جائے گی۔ پھر یہ بھی خیال آتا کہ مجھے خود غرضی نہیں کرنی چاہیے۔ عقل نے یہ بھی کہا کہ چاندنی ذہین لڑکی ہے، اس کو اس دلدل میں نہیں جانا چاہیے جو اس کے سامنے منہ کھولے کھڑا ہے۔

کئی دن اسی حیص بیص میں گزر گئے۔ چاندنی کا فون بھی نہیں آیا، نہ ولید نے فون کیا۔ بس دونوں جانب سوچ بچار کی کیفیت میں وقت گزرتا گیا۔ کئی دن بعد ولید نے چاندنی کو فون کیا اور شام کو ملنے کے لیے کہا۔

کھانے کا آرڈر دے کر ریستوراں میں دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

ولید نے سکوت توڑ کر کہا، ''چاندنی، اگر تمھاری مکمل مالی معاونت ہو جائے تو؟''

چاندنی نے ذرا چونک کر اور قدرے خوشی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا ''واقعی!''

ولید نے کہا، ''میں نے سوچ لیا ہے کہ ایسے وقت میں مجھے تمھیں سہارا دینا چاہیے۔''

چاندنی بولی، ''میں آپ کی شکر گزار ہوں۔''

ولید نے کہا، ''والدین کا گھر چھوڑ دوگی تو رہوگی کہاں؟''

''میں کسی خاندان کے گھر میں کرایے پر کمرہ لے کر گزارا کروں گی۔'' چاندنی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ بات ہے تو میں یہ مالی ذمے داری اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔'' ولید نے کہا۔

پھر ہچکچاتے ہوئے اس نے مزید کہا، ''رہنے کے لیے تو میرے پاس بھی جگہ ہے، اگر تم پسند کرو تو!''

پہلے تو چاندنی کو جھٹکا سا لگا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے کہا، ''آپ تو اکیلے رہتے ہیں، تو میں کس طرح آپ کے ساتھ رہ سکتی ہوں؟''

ولید نے کہا، ''پورے بنگلے میں نوکروں کے ساتھ ہوں پھر بھی اکیلا رہتا ہوں، دو بیڈ روم خالی ہیں۔ اور میں تمھاری زندگی میں مخل نہیں ہوں گا — باقی مرضی ہے تمھاری — ویسے چاہو تو جگہ دیکھ لو۔''

کچھ توقف کے بعد چاندنی جگہ دیکھنے پر تیار ہو گئی۔ دوسرے دن ولید اس کو گھر دکھانے لے گیا۔

نفاست سے سجایا گیا بنگلہ — اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی — اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ رہنے کے لیے ایسا گھر اس کو مل جائے گا۔ اس نے باورچی خانہ، غسل خانہ، کھانے کا کمرہ

اور دونوں خواب گاہیں دیکھیں۔

مکان دیکھنے کے بعد چاندنی نے کہا، ''میں سوچ کر بتاؤں گی۔''

پھر وہ ٹیکسی منگا کر اپنے گھر چلی گئی۔ کئی دنوں خاموشی رہی۔

آخر ایک دن دفتر میں چاندنی کا فون آیا، ''والید صاحب! کیا کل شام ہم مل سکتے ہیں؟''

ولید نے تھائی ریستوران میں آٹھ بجے کا وقت دے دیا۔

ریستوران میں خاصی چہل پہل تھی۔ وقت کا سختی سے پابند ولید ریستوران پہنچ گیا۔ چاندنی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ ایک گھنٹے انتظار کے بعد ولید نے کھانے کا آرڈر دیا۔

کیا بات ہے، چاندنی نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی ہے۔ آج کیا بات ہوگئی جو وہ وعدے کے مطابق ریستوران نہیں پہنچی؟' ولید سوچ رہا تھا، 'ہو سکتا ہے کہ گھر والوں کو اس کے ارادوں کی بھنک پڑ گئی ہے، اور اس کا راستہ روکا جا رہا ہو؟ مگر اس کے پاس تو موبائل فون ہے مگر وہ بھی بند ہے؟ ہو سکتا ہے کہ بیٹری کام نہ کر رہی ہو؟ اطلاع تو دے سکتی تھی___ خدانخواستہ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا؟'' اسی قسم کے خیالات ولید کو پریشان کر رہے تھے۔ وہ اکیلے ہی کھانا ختم کر کے افسردہ اپنے گھر چلا گیا۔

دوسرے دن چاندنی دفتر بھی نہیں پہنچی۔ اب ولید کی پریشانیاں بڑھ رہی تھیں۔ موبائل پر فون کرتا تو جواب ملتا، ''آپ کا مطلوبہ فون اس وقت بند ہے۔'' اس کے علاوہ چاندنی سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے دفتر والوں سے استفسار مناسب نہیں تھا۔

ولید کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ آج اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی چاندنی کے سحر میں گرفتار ہو چکا ہے، ورنہ ولید جیسا، ماضی کا کھلنڈرا انسان___ اس کو کیا پروا ہوتی۔ تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی!

شام ہوگئی۔ گھر جانے کا وقت آ گیا مگر چاندنی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ولید کو اب یقین ہو چلا تھا کہ گھر والوں نے یا تو چاندنی کو حبس میں رکھا ہوا ہے، اس سے ٹیلی فون چھین لیا گیا ہے اور اس کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں۔ عجیب عجیب سے خیالات ولید کو پریشان کر رہے تھے۔

ولید نے گھر آ کے ٹیلی وژن کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ خبر آ رہی تھی کہ چاندنی نام کی ایک لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ چشم دید گواہوں نے پولیس کو بتایا ہے کہ اس کو صابر نامی ایک لڑکے کے کئی ساتھی مل کر، اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ پولیس اس کی بازیابی کے لیے چھاپے مار رہی ہے۔ ابھی تک اس کا پتا نہیں چلا ہے۔

ولید یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہ وہ کسی مقامی اثر ورسوخ والے کو جانتا تھا اور نہ سامنے آ کر چاندنی کی بدنامی کا باعث بننا چاہتا تھا۔

دوسرے دن صبح اخبار میں بھی چاندنی کے اغوا کی خبر شائع ہوگئی تھی۔ اخبار والوں کا خیال تھا کہ

انوا کرنے والے چاندنی کو اندرون سندھ کسی جگہ لے گئے ہیں، جس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔
ولید سخت پریشان تھا۔ مگر پریشانی کے ازالے کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے دعا کے۔
اسے یقین تھا کہ چاندنی ہمت والی لڑکی ہے، اس کو گزند نہیں پہنچے گی۔

چند دن بعد خبر چھپی کہ چاندنی کو ہندوستان کی سرحد کے قریب کے علاقے سے بازیاب کرا لیا گیا ہے۔ مگر یہ پتا نہیں چلا کہ اغوا کنندگان کے ساتھ کیا ہوا۔ دوسرے دن چاندنی کا پولیس کو دیا ہوا بیان اخبار میں شائع ہوا کہ وہ اپنی مرضی سے تنویر کے ساتھ شکار پر گئی تھی۔ اس نے فون پر اپنے والدین کو بتانے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تنویر اس کا دوست ہے مگر وہ دونوں ابھی تک دوستی ہی کی حد تک ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

ولید سمجھ گیا کہ تنویر کے اثر ورسوخ والے باپ نے بیچ بچاؤ کرا کے تنویر کو قانون سے بچانے کے لیے چاندنی کا بیان شائع کروا دیا ہوگا، ورنہ چاندنی نہ تو ایسی لڑکی ہے اور نہ وہ کبھی اس قسم کے جرم پر پردہ ڈالنے میں معاونت کے لیے تیار ہوگی۔ یقیناً اس میں چاندنی کے والدین بھی شامل ہوں گے، اور جیسا کہ چاندنی نے ایک بار کہا بھی تھا، شاید کچھ لے دے کر معاملہ دبا دیا گیا ہے۔

چند دن بعد چاندنی دفتر آئی۔ اس نے ولید کو فون کیا اور مختصر تفصیل بیان کی۔ ولید نے شام کو کھانے کے لیے مدعو کیا۔ چاندنی طے شدہ وقت پر ریستوراں پہنچ گئی۔ علیک سلیک کے بعد چاندنی نے اپنی بپتا بیان کی۔

''تنویر دفتر آتے وقت روز میرا پیچھا کرتا تھا۔ گاڑی میں بٹھا کر دفتر پہنچانے کے وعدے کرتا، مگر میں اس کو ہمیشہ جھڑک دیتی تھی۔

ایک دن تنویر اور اس کے تین اور ساتھی پستول لیے ہوئے پجیرو پر سوار آئے اور مجھے راستے میں روک لیا۔ جوں ہی میں ان کے قریب پہنچی، انھوں نے عجیب سی خوشبو بھرا رومال میرے منہ پر رکھا اور زبردستی مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے بھاگے۔ راستے میں میرے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور ہاتھ پیر بھی باندھ دیے گئے۔

میں چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد بے ہوش ہو گئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ میرے منہ اور آنکھوں اور کپڑا بندھا ہوا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں کھول دیے گئے تھے۔ مجھے کسی مکان میں رکھا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی ویران جگہ ہو، یا پھر کوئی گاؤں ہو۔''

''ہوش میں آتے ہی تنویر مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے میرے منہ اور آنکھ پر بندھا ہوا کپڑا کھولا، ہاتھ پاؤں کھولے، اور سلام کیا۔ میں نے جواب نہیں دیا اور نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے بار بار مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ غصے میں آ کر بولا، 'چاندنی! تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟' میں نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر چیخ کر بولا، 'تم اس وقت میرے قبضے میں ہو، میں تمھارے ساتھ زبردستی بھی کر سکتا

ہوں!" پھر بھی میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر بولا "اگر تم مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو جاؤ تو تمھیں عزت کے ساتھ آزاد کر دیا جائے گا!"

میں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ تھک ہار کر تنویر چپ چاپ واپس چلا گیا۔ دن میں کئی بار یہی ہوتا رہا۔

دوسرے دن صبح تنویر پھر میرے پاس آیا اور اس نے سلام کیا۔ میں نے حسب معمول جواب نہیں دیا، بس نفرت سے منہ پھیر لیا۔

اس بار تنویر نے جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے بگڑے تیور دیکھے تو للکار کر کہا "تنویر میں مر جاؤں گی مگر تمھاری خواہش کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ میں اپنا دفاع کرنا جانتی ہوں۔ تم وڈیرے سب کو اپنی رعایا سمجھتے ہو۔ مگر اس بار تمھارا پالا کسی عام لڑکی سے نہیں چاندنی سے پڑا ہے۔ اگر مجھے اپنے دفاع میں مرنا پڑا تو مرنے سے پہلے میں تمھارے ساتھ وہ کچھ کر دوں گی کہ تم خود ہی مرجانا پسند کرو گے۔"

ولید نے پوچھا، "تنویر نے تمھارے ساتھ کوئی ہاتھا پائی تو نہیں کی؟"

"نہیں امیری، مگر للکار سن کر وہ خوف زدہ سا ہو کر رک گیا۔ پھر اس نے نرمی سے کہا "تم کسی نہ کسی سے شادی تو کرو گی۔ مجھ میں کیا خرابی ہے، میں تمھیں دنیا کی ہر طرح کی آسائش دوں گا۔ ایسی کہ تم جس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

میں نے موقعے کی نزاکت کے باعث ذرا نرم ہو کر پینترا بدلا "تنویر! اگر تم نے یہ گھناؤنی حرکت نہ کی ہوتی اور اپنے اہلِ خاندان کے ذریعے شریفانہ طریقے سے ہمارے خاندان سے رابطہ کرتے تو تمھاری درخواست پر ہمدردی سے غور ضرور کیا جاتا۔ مگر تم تو سمجھے تھے کہ اپنے جاگیردارانہ رعب سے ہم کو زیر کر لو گے۔ تنویر! کان کھول کر سن لو، اب میرا فیصلہ یہ ہے کہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔"

"تم کو کھانے پینے وغیرہ کی سہولت تھی یا نہیں؟" ولید نے پوچھا۔

"ہر طرح کی سہولتیں موجود تھیں۔ بس باہر نکلنا، یا فون پر کسی سے رابطے کی اجازت نہیں تھی۔"

"تم کتنے دن اس حبس میں رہیں؟" ولید نے سوال کیا

"چار دن تک۔ ہر روز بس وہی مطالبہ دہرایا جاتا۔ میرا جواب بھی وہی ہوتا۔ کبھی سختی سے بات کی جاتی، کبھی نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی۔ میں طے کر چکی تھی کہ اگر میری آبرو ریزی کی کوشش کی گئی تو میں تنویر کو خواجہ سرا میں تبدیل کر دوں گی اور خودکشی کر لوں گی۔ تنویر یا تو ساری عمر پچھتائے گا، یا پھر خودکشی کر لے گا۔"

"چاندنی! میں حیرت زدہ ہوں یہ سب سن کر — تم کتنی ہمت والی لڑکی ہو! اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمھاری رہائی کیسے ہوئی؟" ولید نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تنویر کے والد زبیر سومرو وڈیرے ہونے کے باوجود نرم دل انسان ہیں۔ انھیں خبر ہی نہیں تھی کہ

تنویر کیا کر رہا ہے۔ جب پولیس بیچ میں آ گئی تب ان کو پتا چلا۔ ابو نے بتایا کہ زبیر صاحب خود چل کر ہمارے گھر آئے۔ انھوں نے تنویر کی حرکت پر شرمندگی کا اظہار کیا اور خواہش کی کہ اس مسئلے کو پولیس کے بجائے ہم خود ہی حل کر لیں۔ شاید انھوں نے ابو کو پیسے کی بھی لالچ دی، کچھ رقم بھی دی اور اس معاملے کو غلط فہمی بنا کر داخلِ دفتر کروا دیا گیا۔

ولید نے پوچھا، ''تو کیا تم نے تنویر کو معاف کر دیا ہے؟''

''اس وعدے پر کہ وہ اب میرے ساتھ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ زبیر صاحب اس کو میرے پاس خود لے کر آئے اور اس نے ان کے سامنے مجھ سے معافی مانگ لی تھی۔ تو میں نے بھی اسے معاف کر دیا۔ اچھا ہوا اس سے پہلے کہ وہ جبراً میرے ساتھ کچھ کر بیٹھتا، مسئلہ حل کر لیا گیا۔'' چاندنی نے کہا۔

''اگر وہ تمھارے ساتھ زیادتی کر دیتا تو تم تنہا عورت کیا کر سکتی تھیں؟''

''میں اس دن اس کی مردانگی کا قصہ ہی ختم کر دیتی۔''

ولید نے پوچھا، ''بھلا کیسے؟''

''اس طرح۔'' یہ کہہ کر چاندنی نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک ٹارچ نکال کر ولید کو دکھائی۔

ولید ہنسا اور اس نے کہا، ''کیا یہ لیزر ٹارچ ہے؟''

''نہیں۔'' چاندنی نے کہا۔

''پھر؟'' ولید نے پوچھا۔

''یہ ٹارچ نہیں ہے۔ اس کے اندر دو انچ پھل کا نوکیلا اور تیز چاقو چھپا ہے۔''

پھر چاندنی نے نیچے کی طرف لگے ہوئے ایک لیور کو الٹا گھمایا تو بلب کی جگہ پر، اس میں سے چاقو کا دو انچ لمبا پھل برآمد ہوا۔ اس نے کہا، ''یہ میں اپنی حفاظت کے لیے میں ہمیشہ اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتی ہوں۔''

ولید نے حیرانی سے پوچھا، ''مگر اس کا خیال تمھیں کیسے آیا؟''

چاندنی نے کہا، ''یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے، آپ سن کر کیا کیجیے گا۔''

ولید نے کہا، ''سناؤ، میں ضرور سننا چاہوں گا۔''

چاندنی نے بتانا شروع کیا، ''اک برس پہلے کا واقعہ ہے کہ میں اپنی ایک سہیلی، غزالہ کے گھر اس کی شادی کی پہلی سالگرہ پر مدعو تھی۔ میرے سہیلی کے شوہر عمران سے پہلے بھی میری سرسری ملاقاتیں اور سلام دعا ہو چکی تھی۔ عمران مجھ پر خاصے مہربان ہو رہے تھے۔ اس دعوت میں، یوں ہوا کہ ایک خاتون مہمان کے سینے میں درد اٹھا۔ ایمرجنسی میں عمران کو انھیں اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ جاتے وقت عمران نے غزالہ سے کہا کہ عورت ذات کی بیماری ہے، اس لیے کسی خاتون کو عمران کے ساتھ جانا ہوگا۔ تم تو مہمانوں کی وجہ سے جا نہیں سکتیں تو کیوں نہ چاندنی کو ہمراہ کر دو۔ غزالہ نے مجھ سے درخواست کی۔ میں ساتھ چل دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ خاتون اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے سینے کا درد بہانا تھا۔ دراصل یہ عمران کی چال تھی، جس میں ان کی

دوست خاتون شریک تھیں۔ عمران نے مسکراتے ہوئے گاڑی ایک طرف موڑی اور اپنے ایک دوست کے فلیٹ کی طرف لے چلا۔"

ولید نے پوچھا، "مگر وہ خاتون کون تھیں اور انھوں نے اس سازش میں شرکت کیوں کی؟"

چاندنی نے کہا، "مجھے معلوم نہیں کیوں، مگر عمران کے ارادے خطرناک تھے۔"

وہ دونوں مجھ کو گھسیٹ کر فلیٹ میں لے گئے اور مجھ سے زیادتی کرنی چاہی۔ مگر عین وقت پر عمران کے موبائل فون پر غزالہ کی کال آگئی۔ وہ مہمان خاتون کے بارے میں پوچھ رہی تھی، شاید اس نے کہا ہو کہ کس اسپتال میں ہو، میں بھی آرہی ہوں۔ عمران نے خاتون کی طبیعت کی طرف سے اطمینان دلایا تو اس نے عمران سے بلد گھر واپس آنے کے لیے اصرار کیا ہوگا۔ عمران نے مجبوراً اپنا ارادہ بدلا اور معافی تلافی کے بعد ہم کو واپس لے کر گھر کی طرف چلا۔"

چاندنی کہہ رہی تھی، "گھر پہنچ کر عمران نے غزالہ کو بتایا کہ یہ معمولی گیس کا درد تھا۔ اس لیے کسی علاج کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اس طرح میں اس دن بال بال بچ گئی۔ میں نے غزالہ کے گھر پہنچتے ہی بہانہ کیا کہ میرے گھر سے فون آیا ہے اور مجھے فوراً واپس جانا ہے۔ اور میں اس منحوس عمران سے بچ کر اپنے گھر آگئی۔ اسی دن میں فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنی حفاظت کے لیے ساتھ کچھ رکھا کروں گی۔ اور پھر مجھے یہ چاقو مل گیا۔

میں اپنی حفاظت کے لیے ہینڈ بیگ میں ہمیشہ یہ تیز مگر چھوٹا سا چاقو ضرور رکھتی ہوں۔ اس کو تکیے کے نیچے بھی آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے۔"

اس دن ولید نے چاندنی سے اس کے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں کوئی بات نہیں چھیڑی۔ اس نے چاندنی سے دوسرے دن شام کو پھر ملنے کا وقت طے کیا۔

چاندنی وقت پر پہنچ گئی۔ ولید نے اس سے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں بات نکالی۔

"آپ نے دیکھا کہ میں کن حالات سے گزر رہی ہوں؟ یہی وجہ ہے کہ میں اب کوئی بڑا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔" چاندنی ولید کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"میں اب اس نتیجے پر پہنچ گئی ہوں کہ اپنے اس پروگرام پر عمل شروع کردوں، جس کا آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ مگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟" چاندنی نے بڑے تذبذب سے سوال کیا۔

"ضرور پوچھو۔" ولید نے کہا۔

"ولید صاحب! آپ مجھے کسی جال میں پھانس تو نہیں رہے ہیں؟"

"چاندنی! واقعی اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو بھول جاؤ اس پیش کش کو ـــ تم الگ اور ہم الگ۔" ولید نے کہا۔

دونوں خاموش ہوگئے۔ فضا ایک دم سنجیدہ اور بوجھل ہوگئی تھی۔ دونوں کھانا ختم ہونے کے بعد اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

چند دن کے بعد چاندنی کا فون آیا اور اس نے ولید سے شام کو ملنے کے لیے کہا۔

''ولید صاحب! بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا ہے کہ میں نے ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے، اور میں خود مختار ہوکر اپنی تعلیم بھی جاری رکھوں گی۔ میں خود کماؤں گی اور وہ بوجھ جو آپ لوگ نہیں اٹھا سکتے، میں خود اٹھاؤں گی۔'' چاندنی نے کہا،''میرے والدین یہ غیر متوقع فیصلہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ انھوں نے بہت سمجھایا مگر میں اپنے ارادے پر اٹل رہی۔ میں بہت دن سے اس مسئلے پر غور کر رہی ہوں۔ میرے ذہن میں ایک خیال مجھے بار بار تنگ کر رہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو پوچھوں۔''

''ضرور پوچھو۔ ایسے فیصلے بہت غور و خوض کے بعد کیے جاتے ہیں۔ پوچھو تم کیا پوچھ رہی تھیں۔'' ولید نے چاندنی کی ہمت افزائی کے انداز میں کہا۔

''قبل اس کے کہ میں اتنا بڑا قدم اٹھاؤں، آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟ میں ایک عام قسم کی لڑکی ہوں، تو پھر آپ کی نظرِ کرم کی اصل وجہ کیا ہے؟ کیا آپ صرف میری جوانی کے رس ہی کے خواہاں تو نہیں؟''

''نہیں، چاندنی نہیں! اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارے خیال میں محبت کیا ہوتی ہے؟'' ولید نے جواب دیا

''محبت ہوس بھی ہو سکتی ہے اور خلوص بھی۔'' چاندنی نے کہا،''میری جانب آپ کا کھنچاؤ کیا صرف ہوس ہی تو نہیں ہے؟ آخر میرا آپ کا رشتہ کیا ہے، جوڑ کیا ہے؟''

''...محبت ایک نیک اور خالص انسانی جذبہ بھی ہو سکتی ہے اور حیوانی جبلت بھی جو کسی خوش بو کی طرف کھینچتی ہے___ سچ بات تو یہ ہے کہ میں ان دونوں جذبوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔'' ولید نے جواب میں کہا۔

''تو میرا خیال کچھ غلط تو نہیں تھا؟''

''چاندنی! اس قسم کے نتیجے پر پہنچنے سے پہلے تم میری پوری بات تو سن لو۔'' ولید چاندنی کو ٹوکتے ہوئے بولا۔

''میں سن رہی ہوں۔''

''اگر میری عمر تمھاری عمر سے چند برس زیادہ ہوتی تو یہ مسئلہ بہت آسان ہوتا۔ سیدھا سادہ ہوتا___ جس طرح ایک لڑکا کسی لڑکی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ جو ایک فطری ردِ عمل ہے انسانی زندگی میں۔ معاشرے میں، بالخصوص اس دور میں، یہ ایک عام سی بات ہوتی ہے۔ فریفتگی یا تو ہوس کا روپ اختیار کر لیتی ہے یا پھر روایتی بندھن پر بن جاتی ہے۔''

ولید نے ایک لحظہ توقف کیا۔ جب چاندنی نے کوئی اور سوال نہیں کیا تو وہ پھر بولا،''مگر، چاندنی! ایک بات جو سب سے اہم ہے، وہ یہ ہے کہ میں تم کو پسند بھی کرتا ہوں اور تمھاری مدد بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ولید صاحب! آپ مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہیں کہ میری طرف آپ کی رغبت صرف ہوس کی وجہ سے نہیں ہے؟''

''چاندنی!۔۔۔ یار!۔۔۔ کیا تم زیادہ فلسفہ نہیں بگھار رہی ہو؟ میں اس کے جواب میں آسانی سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''ولید صاحب! محبت؟ اور دو افراد کے درمیان جن کی عمروں میں پینتیس چالیس برس کا فاصلہ ہو؟ برا نہ مانیں تو میں یہ بھی کہوں گی کہ اس جذبے کے ابھرتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا کہ صاف صاف یہ ہوس ہی دکھائی دے گی کہ ہمارے رواج کے خانے میں یہ رشتہ کبھی فٹ نہیں ہوگا۔'' چاندنی نے کہا۔

''سوچا تھا۔ اور خوب غور سے سوچا تھا، مگر سچ تو یہ ہے کہ پہلے پہل میں سفلی جذبات کے زیر اثر تمھاری طرف متوجہ تھا۔ مگر چوں کہ تم نے میرے پیش قدمیوں کا سنجیدگی سے جواب دیا تو مجھ کو بہت غور سے سوچ کر اپنا قدم اٹھانا پڑا۔ اب میرے سامنے تمھاری جوانی کے ساتھ ساتھ تمھاری مشکلیں، اور تمھاری نڈر کوششیں بھی ہیں۔ ولید نے چاندنی کی طرف دیکھا۔'' اور یہ بھی غلط نہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ میں تمھاری توانا شخصیت کو فارمولا رواج کے ذریعے برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے میری محبت میں تمھاری مدد کا جذبہ بھی میں شامل ہو گیا ہے۔''

چاندنی غور سے سنتی رہی۔ کھانا بھی ختم ہو چکا تھا۔ رسمی شکریے کے ساتھ، اور مزید کچھ کہے بغیر وہ اپنے گھر چلی گئی۔

کئی دن پر خموشی رہی۔ ولید سمجھا کہ شاید چاندنی میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی ہے، اور اسی مرحلے پر معاملہ ختم ہوا چاہتا ہے۔

اتوار کی شام گھر کی گھنٹی بجی۔ ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی محترمہ ٹیکسی میں آئی ہوئی ہیں۔ ولید تیزی سے اٹھا اور باہر نکلا۔ ٹیکسی میں چاندنی کو بیٹھے دیکھا۔

ولید چاندنی کی اس طرح اچانک آمد پر خوشی کی حیرتوں میں ڈوب گیا۔

ولید نے دروازہ کھولا اور چاندنی کو گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی ملازم سے کہا کہ بیگم صاحبہ کا سامان اٹھالاؤ اور مہمانوں کے کمرے میں رکھ دو۔ آج سے وہ اسی گھر میں رہیں گی۔۔۔ چاندنی اندر آ گئی، مگر خوف زدہ ہرنی کی طرح ڈرتے ڈرتے۔

آتے ہی اس نے سوال کیا ''ولید صاحب کیا میں یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھوں؟''

''بالکل، سو فی صد'' ولید نے کہا۔

چند دن بعد چاندنی نے نوکری چھوڑ دی، داخلہ لے لیا اور یونی ورسٹی جانے لگی۔ دونوں کی ملاقات ناشتے اور کھانے کی میز پر ہوتی اور صرف رسمی باتیں ہی ہوتیں۔ چاندنی نئے ماحول میں گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا فیصلہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ چاندنی کو معمول پر آنے میں کئی دن لگے۔

چاندنی نے آنے کے بعد ولید کو بتا دیا تھا کہ وہ گھر آنے والے کسی دوست سے ملنے ان لوگوں کے پاس نہیں بیٹھے گی۔ بس سلام دعا کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی جایا کرتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ

ولید کے دوست مفت کی مے خواری کے لیے آجایا کرتے تھے، اور چاندنی شراب نوشی کو پسند نہیں کرتی تھی۔

ولید شام کو گھر آتا تو اس سے ملاقات ہوتی۔ ڈرائیور اس کو پہنچانے اور واپس لانے جاتا، باورچی کھانا تیار کرتا، صفائی کرنے والا صفائی کرتا۔ اور زندگی معمول کے مطابق چلنے لگی۔ کئی مہینے اس طرح گزر گئے۔ ولید سوچتا کہ پہلے تو یہ میری معشوقہ تھی، مگر اب یہ میری پناہ میں آگئی ہے مگر اس کا کھلنڈرا مزاج اس کو بانہوں میں بھر لینے کو چاہتا تھا۔ ولید نے بڑی مشکل سے اپنی فطرت کو قابو میں رکھا۔ وہ خود سے کہتا تھا کہ جب تک یہ خود کوئی قدم آگے نہیں بڑھاتی، میں اس سے دور ہی رہوں گا، مگر دل تھا کہ مانتا نہ تھا۔ دن گزرتے جاتے لیکن چاندنی کی طرف ایسی کسی پیش رفت کے کوئی آثار تک نہ دکھائی دے رہے تھے۔ ولید اداس ہوتا جاتا تھا۔

ایک دن ولید پر اداسی کے گھنے بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں جا کر وھسکی کی بوتل نکالی۔ ایک کے بعد دوسرا، اس طرح کئی جام چڑھائے، اور اپنے کمرے میں فراقیہ اور حزنیہ غزلوں کے کیسٹ لگا دیے۔ آواز اتنی تیز کر دی کہ دنیا کی کوئی اور آواز کانوں میں نہ پڑ سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ [illegible]

''میں اندر آسکتی ہوں؟'' چاندنی نے سوال کیا

''آپ کو اندر آنے کی اجازت کی ضرورت نہیں، مگر آپ کیوں آنا چاہتی ہیں؟'' ولید نے بہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

چاندنی بغیر کچھ کہے اندر آکر بستر کے کنارے بیٹھ گئی اور بولی، ''آپ اتنی شراب کیوں پی رہے ہیں؟''

''سب کچھ بھول جانے کے لیے۔'' ولید نے جواب میں کہا۔

''ولید صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں؟'' چاندنی نے ولید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

کوئی جواب دیے بغیر ولید نے جام اٹھایا ہی تھا کہ چاندنی نے ہاتھ پکڑ لیا اور جام کو الٹ دیا۔ وھسکی اس کے کپڑوں پر گر گئی تھی۔

''اب میں آپ کو پینے نہیں دوں گی۔'' چاندنی نے ذرا تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تم بھی تو شراب ہو چاندنی، تو کیا میں تم کو بھی چھوڑ دوں یا شراب کے بدلے تمھیں پینا شروع کر دوں؟'' ولید نشے میں بہکتے ہوئے بولا۔

چاندنی اک دم اچھل کر بستر سے دور کھڑی ہو گئی۔

ولید نشے ہی کے عالم میں بولا، ''چاندنی میں بدکردار ضرور ہوں مگر بدمعاش نہیں۔ تم مجھ سے خوف نہ کھاؤ، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تمھیں چھوؤں گا بھی نہیں، کبھی نہیں، جب تک تم مجھے خود دعوت نہیں دو گی۔''

یہ سن کر چاندنی کمرے سے باہر چلی گئی مگر اپنے ساتھ وھسکی کی بوتل بھی لیتی گئی۔

گھر کے ملازموں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ پہلے تو وہ سب سمجھے تھے کہ یہ بھی کوئی کال گرل ہو گی۔ چند دن اپنی بہار دکھلا کر چلی جائے گی، مگر ان کو چاندنی کا مستقل ہوتا ہوا اضافہ کھل رہا تھا۔ ان

کی آزادی میں فرق آ رہا تھا، اس لیے کہ چاندنی نے پورے گھر کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ایک سگھڑ خاتون خانہ کی طرح چاندنی نے گھر کو بدل کر رکھ دیا۔ صبح ناشتے سے رات کے کھانے تک وہ ہر چیز کا خیال رکھتی جیسے کہ اب وہی گھر کی مالکن ہو۔ ولید یہ سب دیکھ کر حیران بھی تھا اور خوش بھی۔

چاندنی شام کو اکثر ولید کی خواب گاہ میں آ جاتی اور بستر کے کنارے بیٹھ جاتی۔ ولید نے شراب کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی تھی۔ ہنسی مذاق ہوتا مگر دونوں اس سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ ولید ڈرنے والا آدمی نہیں تھا، مگر وہ بڑھا بھی نہیں۔ اس کے اندرون میں ایک آگ تھی جو بھڑک رہی تھی، جس کے بجھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ جوانی میں ولید جس قسم کا انسان رہا تھا، اس کیفیت میں آ جاتا تو دلہن کی ایک رات گزر جاتی، چاندنی غصے میں گھر چھوڑ کر چلی بھی جاتی تب بھی ولید گھاٹے میں نہیں رہتا۔ مگر اب وہ مختلف قسم کا انسان ہے، اس نے زبان دی ہے، وعدہ کیا ہے تو وہ اس کو کیسے توڑ سکتا ہے۔ بس انتظار۔ انتظار اور انتظار۔ ولید کو یقین تھا ایک دن آئے گا، جب یہ انتظار ختم ہو جائے گا۔ مگر وہ چاندنی کے اعتبار کو مسمار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ولید نے ایک دن چاندنی سے کہا، ''چاندنی، ہمارے گھر میں ہر طرح کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے مگر میرے دل کے اندھیرے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔'' چاندنی نے ولید کی طرف غور سے دیکھا۔ کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر تھوڑی دیر میں واپس آئی اور بولی، ''ولید صاحب، میں کچھ دن بعد آپ کو اس کا جواب دوں گی۔''

کئی ہفتے بالکل خاموش گزر گئے۔ ولید بھی خاموش اور چاندنی بھی خاموش۔ ایک دن چاندنی ولید کی خواب گاہ میں آئی، حسب معمول بستر کے کنارے بیٹھ گئی اور بڑے وقار سے ولید سے مخاطب ہوئی، ''ولید صاحب میں نے بہت غور و فکر کے بعد فیصلہ کر لیا ہے۔''

ولید کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے امتحان کا نتیجہ نکلتے وقت یا کسی مقدمے کا فیصلہ صادر ہوتے وقت ہوتا ہے۔

چاندنی بولی، ''ولید صاحب اگر میں عام قسم کی لڑکی ہوتی تو میں آپ کے جال میں بہت پہلے پھنس چکی ہوتی مگر میں عام قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے گھر کی تباہی کے تمام آثار دیکھے ہیں، ان پر غور کیا اور ان سے سبق حاصل کیا ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری عمر میں فرق کی وجہ سے میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور ایسی شادی آپ کے لیے بھی مناسب نہیں ہوگی۔''

''مگر میں آپ سے بے انتہا محبت کرنے لگی ہوں۔ میں آپ کی محبت اور آپ کے احسانات کی قدردان بھی ہوں، تو ہمیں اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا ہوگا۔''

ولید نے کہا، ''چاندنی! میں کیا حل بتاؤں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمھارے دل میں کیا ہے؟''

چاندنی بولی، ''میرا دل تو آپ کی محبت سے لبالب بھرا ہوا ہے، کہ اس میں اور کچھ سما ہی نہیں سکتا۔''

ولید بولا، ''تو پھر حل کیا ہے؟''

چاندنی نے کہا، ''شادی کے بغیر تو میں آپ کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دوں گی۔''

''پاگل ہو گئی ہو چاندنی! شادی تمھارے لیے ہرگز مناسب نہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں تو کسی صورت میں تمھیں قبول کرلوں گا۔ شادی کے بغیر بھی تو ہمارے تعلقات ہو سکتے ہیں؟'' ولید نے کہا۔

چاندنی ایک دم کھڑی ہو گئی، ''ولید صاحب! کیا اسی لیے آپ نے مجھے پناہ دی تھی، یا یوں کہیے کہ رجھایا تھا؟ میں تو یہ سمجھ کر آ گئی تھی کہ آپ میرا ہاتھ پکڑیں گے، اور مجھے سہارا دیں گے۔ مگر آپ کے دل میں تو بس یہی دھن ہے کہ میں کسی بھی طرح آپ کی جھولی میں گر جاؤں۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو چاندنی۔'' ولید نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر پسپائی اختیار کی۔

''ولید صاحب! میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں آپ کی ہوس کا نشانہ بن جاؤں۔ اگر آپ نے مجھ پر زیادہ زور دیا تو میں آپ کا گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔ رہنے کے لیے جگہ کی کوئی کمی نہیں۔ رہی آپ کی مالی معاونت، تو اللہ کارساز ہے۔''

''چاندنی! تم خواہ مخواہ ایک ذرا سی بات کو طول دے رہی ہو۔ میں نے وعدہ کیا ہے، تم میری امان میں ہو۔ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔''

''ولید صاحب! میں اپنے گھٹے ہوئے معاشرے سے ٹکرانے کے لیے تیار ہوں۔ اپنے باپ کی عمر کے مرد سے شادی کر لینا کوئی آسان بات نہیں، مگر میں یہ بھی کر گزروں گی، اس خیال سے کہ عورت اپنے آپ کو مجبور نہ سمجھے۔ عورت کو اپنے فیصلے خود کرنے چاہییں۔'' چاندنی نے جذباتی ہو کر کہا۔

''اچھا بھئی اچھا، اگر تم راضی ہو تو ہم خفیہ شادی ہی کر لیتے ہیں۔ کیوں نہ ہم خود ہی نکاح پڑھ لیں۔ اس کی شرع میں کہاں ممانعت ہے؟''

''نہیں ولید صاحب! خفیہ شادی کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم معاشرے سے خوف زدہ ہیں۔ میں نے کہا ہے ناکہ میں آپ کی محبت میں معاشرے سے ٹکرانے کو تیار ہوں۔''

''چاندنی میں نے بھی اس مسئلے پر کئی دن غور بھی کیا ہے اور مطالعہ بھی کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مذہب کے ٹھیکے داروں نے مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اتنا مسخ کر دیا ہے کہ اس میں فطری تقاضوں کے آسان حل کے لیے راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ نکاح صرف مرد اور عورت کی رضامندی کا نام ہے۔ رضامندی بالکل آسان ہے۔ اس کے لیے نہ جبہ و دستار کی ضرورت ہے نہ دھوم دھڑکے کی۔ جب میرا نکاح ہوا تھا اس میں کیا ہوا تھا۔'' ولید نے خواب آگیں لہجے میں کہا:

''مولوی صاحب لڑکی کے پاس گئے ہوں گے اور انھوں نے اردو زبان ہی میں کہا ہوگا، 'فلاں ابن فلاں کے ساتھ اتنے مہر کے عوض تمھیں نکاح قبول ہے؟' لڑکی نے جواب دیا ہوگا 'ہاں'۔ یہ سوال انھوں نے تین بار دہرایا ہوگا، جس کی شرعی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آئے اور یہی سوال مجھ

سے کیا تھا۔ میرے مثبت جواب بعد انھوں نے نکاح کا خطبہ پڑھا تھا جو سنت ہے، واجب نہیں۔ یعنی مسنون خطبے کے بغیر بھی نکاح صحیح ہوتا ہے۔ نکاح کے لیے تو کسی گواہ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو کچھ کارروائی ہوتی ہے وہ دنیاوی قوانین کی ضرورت کے پیش نظر کی جاتی ہے۔ بس اتنا سا کام ہے جس کو اتنا بڑا بنا دیا گیا ہے۔ تو پھر کسی مولوی کی کیا ضرورت۔ کیوں نہ ہم دونوں آپس میں خود نکاح پڑھ لیں۔ اللہ اس کا گواہ ہوگا۔'' ولید نے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے، مگر ولید صاحب میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس طرح کے نکاح کو دنیا نکاح نہیں مانتی۔ اور اس کا سب سے بڑا نشانہ ہمیشہ عورت ہی ہوتی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آئے دن کاروکاری کے الزام میں زیادہ تر عورت ہی ماری جاتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ مرد سری معاشرہ ہے۔ اگر ہم نے اس طرح نکاح کیا تو ہمارے ہونے والی اولاد ناجائز کہلائے گی۔ میں مجبور ہوں کہ میں اس قسم کے ازدواج کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اگر آپ نے زبردستی کی کوشش کی تو میں فوراً گھر سے باہر نکل جاؤں گی۔''

''نہیں چاندنی! کیا تم مجھے اتنا بزدل اور گرا ہوا سمجھتی ہو۔ عورت کے ساتھ زبردستی کرنا دنیا کی سب سے بڑی بزدلی ہوتی ہے۔ میں کچھ بھی ہوں مگر بزدل نہیں۔''

چاندنی بغیر کچھ کہے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ولید حیرت سے ٹکٹکی باندھے چاندنی کو جاتے دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد چاندنی ولید کے کمرے میں واپس آئی۔

چاندنی پھر بولی، ''میں گنہگار نہیں ہونا چاہتی اس لیے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں کو باقاعدہ نکاح کرنا ہوگا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ جب میں کسی اور سے شادی کرنا چاہوں تو آپ مجھے طلاق دے دیں گے۔''

ولید نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چاندنی نے پھر خود ہی کہا، ''مجھے یقین ہے کہ آپ جیسا فراخ دل انسان ایسا ہی کرے گا۔''

چاندنی نے ولید کی دل شکنی کے خیال سے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''ہم دونوں کی عمر کے بڑے فرق کی وجہ سے میں نے یہ کچھ کہا ہے، آپ برا نہ مانیے گا۔''

ولید نے کہا، ''نہیں، نہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہماری شادی عجیب شادی لگے گی۔ میں خود بھی اس سے مطمئن نہیں ہوں گا۔''

اب رات ہو چلی تھی، اس لیے ولید اور چاندنی دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

دوسرے دن ولید نے اس مسئلے کو پھر چھیڑا۔

''چاندنی، تو پھر ہمارا نکاح کیسے ہوگا، کہاں ہوگا اور کس کی گواہی میں ہوگا؟ اس شہر میں بھی ہو سکتا ہے مگر بہتر یہی ہوگا کہ ہم کسی اور شہر جا کر، جہاں سب ہمارے لیے اجنبی ہوں، نکاح کی رسم ادا کر لیں۔'' ولید

نے مشورہ دیا۔

چاندنی نے کہا،" ولید صاحب، اس سلسلے میں اکبر ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ وہ آپ کا جانی دوست ہے، اس سے مشورہ کیوں نہ کر لیا جائے۔"

پھر یہ طے ہوا کہ اکبر کو بلا کر سارا معاملہ بیان کیا جائے، اس کی رائے بھی لی جائے، اور مدد بھی، اگر وہ راضی ہو جائے۔

دوسرے دن اکبر کے سامنے سارا مسئلہ رکھا گیا، اور اس کی رائے لی گئی۔

اکبر نے کہا،" یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تم لوگ کسی دن بھی میرے ساتھ حیدر آباد چلو۔ میرے ایک عزیز وہاں رہتے ہیں۔ ان کے گھر یہ انتظام ہو جائے گا۔ یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔"

چاندنی اور ولید نے سکون کا سانس لیا اور اکبر سے کہا،" ہم چند دن اور سوچ لیتے ہیں پھر تمھیں زحمت دیں گے۔"

" زحمت! یہ زحمت کیسے ہوئی۔ میرے لیے تو خوشی کی بات ہوگی۔" اکبر نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

ایک دن گیارہ بجے رات کو ولید کے گھر پر فون کی گھنٹی بجی۔ ولید نے فون اٹھایا تو لندن سے قمر بول رہی تھی۔

اچھا ہوا تھا کہ ولید نے چاندنی کو ٹیلی فون اٹھانے کی ممانعت کر رکھی تھی۔

قمر نے بڑی محبت کے لہجے میں ولید سے پوچھا،" آپ کیسے ہیں؟"

قمر کے غیر متوقع فون پر ولید سمجھا تھا کہ شاید اس کو چاندنی کی ہوا لگ گئی ہے، اور اب رونا دھونا شروع ہو جائے گا مگر وہ تو بالکل ہی مصالحانہ موڈ میں تھی،" ولید! — اب تو آپ مجھے فون تک نہیں کرتے — میں کچھ بھی ہوں مگر آپ کی بیٹیاں تو آپ کا خون ہیں — کیا آپ کو ان کی یاد بھی نہیں ستاتی؟ آپ جو کچھ بھی کرتے ہوں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں مگر ہمیں رابطے میں تو رہنا چاہیے!" قمر نے لجاجت کے ساتھ کہا۔

ولید نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اور قمر کہتی رہی" آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ سات برس کی شادی کے بعد آپ کی بیٹی کے ہاں چاندنی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

یہ سن کر ولید ہڑ بڑا گیا۔ اس کے منہ سے بدحواسی میں بس اچھا — ہاں — ہوں — ہی نکلا تھا کہ قمر نے کہا،" آپ کی نواسی بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔ اور ہم نے اس کا نام چاندنی رکھا ہے۔"

ولید کا پورا جسم کانپ اٹھا — ہاتھ سے ٹیلی فون کا ریسیور چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے کان بجنے لگے — جیسے توتلی آواز میں کوئی بچی کہہ رہی ہو، نانا ابو — آپ کب آئیں گے؟

صبح ہوتے ہی ولید نے ڈرتے ڈرتے چاندنی کو یہ خبر سنائی۔ وہ سمجھا تھا کہ چاندنی سن کر رو پڑے گی۔ مگر چاندنی تو خوشی سے اچھل پڑی۔ اس پر اور بھی کہ نواسی کا نام بھی چاندنی رکھا گیا ہے۔ چاندنی

کے نام میں کتنا حسن ہے، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

چاندنی نے فوراً کہا،"ولید، اب آپ جلد سے جلد لندن جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔"

دوسرے دن ہی چاندنی نے ولید کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست کیا اور بڑی محبت سے بچی کے لیے خوب صورت کپڑے اور کھلونے خرید کر لے آئی۔

دس گھنٹے جہاز کے سفر کے دوران ولید چاندنی کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ لندن کا دو ہفتے کا قیام بھی بہت مصروفیت کا رہا۔

بیٹی، نواسی اور بیوی سب کے ساتھ مصروفیت کے باوجود شعور اور لاشعور دونوں میں ایک جنگ جاری تھی۔ ایک کہتا تھا جو کچھ ہو رہا ہے شرعی اعتبار سے ٹھیک ہو رہا ہے۔ حالات اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب کہ دوسرا کہتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اخلاقی اعتبار سے مناسب نہیں۔ تم نے اگر ایک چالیس برس کم عمر کی لڑکی سے شادی کی تو تم کو لذتیں ضرور نصیب ہوں گی مگر تمھارا معاشرہ اس کو قبول نہیں کرے گا۔ اور آگے چل کر شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اگر تم کبھی اپنی نئی بیوی کو ساتھ لے کر کسی تفریحی مقام پر گئے تو کیا لوگ تمھیں حیرت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے؟ تمھیں یاد نہیں کہ ایک بار تم چاندنی کے ساتھ ساحلِ سمندر پر آئس کریم کھانے چلے گئے تھے، اور تمھیں لوگوں نے کن نظروں سے چھلنی کیا تھا؟

کیا تمھیں اپنے وہ جملے یاد ہیں جو تم نے ایک بار اپنے ایک دوست سے شکایتاً کہے تھے، "یار، میں چاندنی کو لے کر باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ اتنی کم عمر اور میں سفید بالوں والا آدمی۔ ہمارا معاشرہ بھی کتنا غلیظ ہے۔ اگر میرے ساتھ کوئی جوان لڑکی جا رہی ہے تو وہ میری بیوی نہیں ہو سکتی تو، بیٹی تو ہو سکتی ہے، بہو ہو سکتی ہے مگر یہ — ہمارے لوگ — پلٹ پلٹ کر اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگتی ہے۔ مغربی 'بدکار' دنیا میں تو کوئی بھی اس طرح پلٹ پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ ہمارے ملک کا معاشرہ! — توبہ توبہ —

اس میں شک نہیں کہ ایسے مناظر مغرب میں بہت نظر آتے ہیں مگر وہ دنیا ہی اور ہے۔ برطانیہ ہو یا کوئی اور بھی مغربی ملک، وہاں سب مادر پدر آزاد ہیں، مگر اس برصغیر میں کیا اتنی آزادی میسر ہے؟ ولید کا ضمیر بار بار سوال کرتا جا رہا تھا۔

کیا تمھیں اپنے بچپنے کے حکیم مشرف علی یاد نہیں جنھوں نے ستر کی عمر میں اٹھارہ برس کی لڑکی سے شادی کی تھی تو سارے علاقے کے لیے ایک داستانوی موضوع بن گئے تھے؟

دو ہفتے اپنی پیاری نواسی چاندنی سے کھیل کر ولید واپس کراچی لوٹ رہا تھا۔ قمر آرا کا رویہ بھی بدلا ہوا تھا۔ ایک بار پھر جہاز میں دس گھنٹے اس کے شعور اور لاشعور نے ولید کے دماغ میں الجھے ہوئے خیالات کا ویسا ہی طوفان برپا کر دیا۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اب اسے پیش قدمی جاری رکھنی چاہیے یا باعزت پسپائی اختیار کر لینی چاہیے۔

واپسی پر ولید کو لینے چاندنی ہوائی اڈے پر خود بھی آئی تھی۔ چاندنی نے ہوائی اڈے پر ہی ولید سے نواسی کی تصویر مانگی۔ ولید نے اپنے کیمرے کے اسکرین پر تصویر دکھائی۔ جذبات سے مغلوب چاندنی نے چاندنی جونیئر کی تصویر کو کیمرے کی اسکرین پر ہی بار بار چوما۔ چاندنی، اپنی ہونے والی ہم نام نواسی کو دیکھ کر واقعی بہت خوش تھی۔ مگر اس نے قمر آرا کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

رات کو کھانے کی میز پر چاندنی نے اپنے مستقبل کے منصوبے کا مسئلہ چھیڑا۔

''میں چند دنوں کاروباری معاملات میں مصروف رہوں گا۔ ذرا ان سے فراغت ہوجائے تو اکبر کو بلا کر بات کریں گے۔'' ولید نے جواب دیا۔ دراصل وہ اپنے الجھے ہوئے خیالات سے ابھی تک باہر نکل نہیں پایا تھا۔

ہفتوں اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ چاندنی اپنی تعلیم میں مگن تھی، اور ولید اپنے کاروبار میں۔ پھر ایک دن اکبر کو بلایا گیا اور نکاح کے مسئلے پر بات شروع ہوئی۔ جب سارا منصوبہ بن گیا اور تاریخ کے تعین تک بات پہنچی تو ولید نے کہا: ''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ایک اور مسئلہ درپیش ہے، پہلے اس پر بات کیوں نہ کر لی جائے۔''

چاندنی سوالیہ نشان بن کر ولید کی طرف متوجہ ہوئی۔

ولید نے اپنا گلا صاف کیا اور نظریں جھکا کر ٹھہر ٹھہر کر بولا، ''چاندنی ڈیئر، میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں، اور کرتا رہوں گا، مگر افسوس کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔''

آخری جملہ چاندنی پر ایک بم کی طرح گرا۔

ایک ہی آن میں اس نے سوچنا شروع کر دیا:

شاید شادی کے بغیر ہی ولید مجھ سے مستفید ہونے چاہتا ہے؟

شاید وہ اب اپنی چاندنی کے پاس واپس جانا چاہتا ہے؟

شاید اس کے دل میں قمر آرا کی محبت پھر سے جاگ اٹھی ہے؟

اب میری تعلیم کا کیا ہوگا۔ میرے منصوبوں کا کیا ہوگا؟

تھوڑی دیر تک ولید اور چاندنی دونوں گم صم رہے، جیسے وہ کسی کے تعزیتی جلسے میں بیٹھے ہوں۔

اکبر بھی اس اچانک موڑ پر حیران ہوا۔ وہ سر جھکائے فرش پر بچھے قالین کے نقوش اور رنگوں میں الجھا رہا۔

پھر ولید خود ہی گویا ہوا، ''چاندنی! تم نے پوچھا نہیں کہ اچانک میری محبت جھاگ کی طرح کیوں بیٹھ گئی ہے۔''

چاندنی نے سر اٹھا کر ولید کی طرف غور سے دیکھا اور کہا، ''میرے پاس آپ کے سوال کا کوئی جواب نہیں۔''

ولید نے آہستہ آہستہ کہنا شروع، ''میں اب بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں۔ میں تمھاری تعلیم کے

منصوبے کو ختم نہیں ہونے دوں گا، اور جب تک تم چاہو اسی طرح اس گھر میں رہ سکتی ہو۔ تم بالکل اسی طرح محفوظ رہو گی گویا تم اپنے باپ کے گھر میں ہو۔ مگر میں شادی نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں چاندنی۔''

چاندنی حیران پریشان ایک ٹک ولید کو دیکھ رہی تھی اور گم صم تھی۔

ایک لمحے کے بعد چاندنی نے ولید سے مخاطب ہو کر کہا، ''ولید صاحب، یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''چاندنی! تمھاری حیرانی بجا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر جذبات کو پرے رکھ کر کئی بار سوچا ہے۔ اب مجھے اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ تم سے شادی کرنا میرے لیے لطف کا باعث تو ہو گا، مگر تم ذرا سوچو کہ تمھارے ساتھ کیا یہ زیادتی نہیں ہو گی؟ میں خود غرضی نہیں کر سکتا۔۔۔ نہیں کر سکتا۔۔۔ نہیں کر سکتا۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آب دیدہ ہو گیا۔

''مگر ولید صاحب، کیا آپ نے اتنے دنوں مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا تھا؟ کیا آپ میرے جذبات سے نہیں کھیلے؟ کیا آپ مجھے ایک کھلونا سمجھتے ہیں کہ جب جی چاہا دل بہلا یا، جب جی چاہا توڑ کر پھینک دیا؟'' چاندنی تلخ لہجے میں کہتی گئی۔

''چاندنی! واقعی میں تم سے شرمندہ ہوں۔ سوائے اس کے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں اس بات پر خوش ضرور ہوں کہ میں تمھاری زندگی کی بربادی کے گناہ سے بچ گیا ہوں۔''

''مگر آپ نے سوچا نہیں کہ اب میرا کیا ہو گا؟'' چاندنی نے پلٹ کر ذرا غصے سے کہا۔

''چاندنی تم ابھی غصے میں ہو۔ اس وقت میں بات کو یہیں پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بات ہو گی۔''

''نہیں! ولید صاحب آج اور اسی وقت فیصلہ ہو گا۔ اب میں مزید کرب میں مبتلا رہنا نہیں چاہتی۔'' چاندنی نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

چاندنی کا نرم لہجہ دیکھ کر ولید کو کچھ سکون ہوا۔ اس نے چاندنی سے کہا، ''میں نے نہ صرف اس مسئلے پر بہت سوچا ہے بلکہ اس کا ایک حل بھی میرے ذہن میں ہے، بشرطیکہ تم اس پر راضی ہو۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' چاندنی نے ولید کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم تنویر سومرو سے شادی...

یہ کہہ کر ولید نے دوسرا دھماکا کر دیا۔

چاندنی نے ولید کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا، ''کیا کہا آپ نے؟ مجھے اس منحوس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ تنویر؟ نہیں، ہرگز نہیں۔''

ولید کو چاندنی سے اسی کی توقع تھی اس لیے وہ مسکرایا اور بولا، ''چاندنی! تنویر نے جو کچھ تمھارے ساتھ کیا تھا وہ غیر شریفانہ ہی نہیں، ظالمانہ بھی تھا، اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس نے محبت کی دیوانگی میں وہ کچھ کر ڈالا جو اس کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس بات کو اس وقت یہیں پر ختم کر دینا چاہیے۔

اس موضوع پر اب بعد میں بات ہوگی۔"
اتنا کہہ کر ولید نے اکبر ہاتھ تھاما اور اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ چاندنی بھی پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
چند دن بعد پھر اکبر، ولید اور چاندنی اکٹھے ہوئے۔
"چاندنی! امید ہے کہ تم اس وقت ٹھنڈے دل سے میری بات سنوگی، غصہ نہیں کروگی۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ ہوگا تمھاری مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔" ولید نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔
ولید نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر بولا "لندن سے واپسی کے فوراً بعد جب میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا، تو میں نے اکبر سے مشورہ کیا تھا۔ اکبر نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ پھر بہت سوچ بچار کے بعد ہم دونوں نے تمھاری اجازت کے بغیر تنویر سے رابطہ کیا تھا۔ ہم تنویر سے مل چکے ہیں۔ اور جب ہم نے اس کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگا تھا۔ اس نے بار بار کہا تھا کہ وہ بہت شرمندہ ہے اور اپنی شرمندگی کو منانے کے لیے چاندنی کو اتنی محبت دے گا کہ وہ خود حیران ہو جائے گی۔" "میں اس سے مل کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ واقعی تم سے محبت کرتا ہے۔" ولید نے کہا۔ اس نے مسکراتے ہوئے چاندنی کو دیکھا اور بولا "پھر ہم لوگ تنویر کے والد، زبیر سومرو کے پاس گئے تھے۔ ہم نے ان کے سامنے سارا مسئلہ بیان کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھتے ہوں تو تنویر سے بات کریں۔ اگر تنویر چاندنی سے شریفانہ طریقے سے اپنے کیے پر دوبارہ شرمندگی کا اظہار کر دے اور آپ اس کے ضامن ہوں تو امید ہے کہ ہم لوگ چاندنی کو منالیں گے۔"
چاندنی ہکا بکا ولید کو دیکھ رہی تھی۔
زبیر سومرو صاحب ہماری بات سن کر خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تنویر سے بات بھی کروں گا اور ضرورت ہوئی تو میں خود چاندنی سے مل کر اس رشتے کو جوڑنے پر راضی ہوں۔ آپ لوگ اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کیجیے۔" ولید کہہ رہا تھا، اور اس دوران خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔
اکبر نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا، "چاندنی! تنویر نے بے وقوفی کی تھی مگر اس نے تو تم سے بھی اور تمھارے والد سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ اور جہاں تک ہم نے محسوس کیا ہے، وہ اب بھی واقعی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تو پھر اس میں کیا قباحت ہے؟"
"تم اگر اس کو معاف کر دو تو یہ تمھاری بڑائی بھی ہوگی، اور تم کو ایک چاہنے والا شوہر بھی مل جائے گا۔ ذرا سوچو تو کہ تمھارے سارے مسائل ایک آن میں حل ہو جائیں گے۔ سوچو تو سہی۔" ولید نے اکبر کی بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔
چاندنی بغیر کچھ کہے، سر جھکائے، افسردہ، اپنے کمرے میں چلی گئی۔
چند دن بعد ولید نے چاندنی کی اجازت سے زبیر سومرو صاحب اور تنویر کو اپنے گھر کھانے کی

دعوت دی۔

''چاندنی تمھارا مجھ پر احسان ہوگا اگر آج تم میری عزت رکھ لو۔'' ولید نے لجاجت سے ساتھ کہا۔

سر شام تنویر اور زبیر سومرو، اکبر کے ساتھ ولید کے گھر آئے۔ ولید کے ہاتھ میں سرخ گلاب کا ایک بڑا سا گل دستہ تھا۔

تنویر نے چاندنی کے آتے ہی بڑھ کر اس کو گل دستہ پیش کیا۔

''چاندنی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے دل سے معاف کر دو گی۔'' تنویر نے اپنی نظریں جھکائے ہوئے لجاجت سے کہا۔

''بیٹی، اس احمق کی حرکت پر میں بھی بہت شرمندہ ہوں۔ ویسے میں تمھیں بتاؤں، یہ لڑکا ایسا نہیں ہے۔ میں اس کا باپ ہوں اور اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم اس کی طرف سے دل صاف کر لو۔'' تنویر کے والد نے آگے بڑھ کر چاندنی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

چاندنی نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھک لیا، اور سر جھکا کر رونے لگی۔

زبیر سومرو نے بڑھ کر اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔

☆☆☆☆

نصیر ترابی

تیرے عشق نچایا

نصیر ترابی شاعر کی حیثیت سے عصری ادبی منظرنامے میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ اردو غزل کی تہذیبی روایت اور اس کے رچاؤ سبھاؤ نے ان کے یہاں تخلیق اور پیش کش دونوں ہی سطحوں پر اظہار کیا ہے۔ اُن کا شعری مجموعہ ''عکس فریادی'' فروری ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تو تغزل کے پارکھوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ یہ فیضانِ غزل کی جلوہ آرائی تھی اور ساتھ ساتھ غزل گو کے ہنر اور اسلوب کی پذیرائی بھی۔ بعد ازاں یار لوگ اُن کے دوسرے مجموعے کی راہ دیکھنے لگے اور اب تک دیکھتے ہیں۔ نصیر ترابی نے پہلا مجموعہ شائع کرانے میں کون سی عجلت سے کام لیا تھا کہ دوسرے کی آمد میں تاخیر کی شکایت اُن سے کی جائے۔ گزشتہ برس یہی دن تھے کہ اُن سے پہلے فون پر بات ہوئی اور بعد کو ملاقات ہوئی۔ زیرِ نظر تحریر سننے کا بہانہ بن گیا۔ سن کر محسوس ہوا کہ انھوں نے افسانہ و افسوں کے داستانوی عناصر کو خوب برتا ہے اور جی لگا کر کہانی کاڑھی ہے۔ اردو افسانہ صوفی کے کردار سے ناآشنا نہیں بلکہ اُس نے اس کردار کو متعدد جہتوں میں جانا اور پہچانا ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ نصیر ترابی نے بابا بلھے شاہ کی بابت چلی آتی اس روایت/ حکایت کو جس جذبی لحے میں بیان کیا ہے، انھوں نے کہانی کو کچھ اور ہی مان دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو وہ اس نوع کی دوسری حکایات پر اک ذرا توجہ کریں، کچھ اور قصوں میں رنگ بھریں۔ انھوں نے یہ افسانہ ''مکالمہ'' کے قارئین کی نذر گزارا، ہم خوش ہوئے اور اب اس امانت کو آگے بڑھا کر سبک دوش ہوئے۔

بابا بلھے شا کا تعلق قصور کے سادات گھرانے سے تھا۔ اُن کے پیرو مرشد حضرت شاہ عنایت قادری، لاہوری تھے۔ جن کی نسبی نسبت آرائیں قبیلے سے تھی۔ بلھے شاہ اپنے مرشد کی زیارت اور پابوسی کو ہر دوسرے تیسرے روز بے وقتے بھی لاہور نکل جایا کرتے تھے۔ بلھے شاہ کے کنبے کو سید ہونے کے ناتے کسی غیر سے یہ مریدی روگ انتہائی ناگفتنی تھا۔ اس بابت کنبے والوں اور بلھے شاہ کے مابین روزمرہ

رویوں میں دھڑلے سے رسا کشی جاری تھی۔ ایک دن بلھے شاہ شدید انتشار کی آزاری میں تھے۔ قصور سے لاہور کی سمت یہ نیت باندھ کر چل پڑے کہ آج مرشد کی صلاح سے آئے دن کی گھریلو کھٹ کھٹ کا جھمیلا اب چٹ پٹ ہو جانا چاہیے۔ ادھر کو یا اُدھر کو۔ بلھے شاہ لاہور آئے۔ مرشد کے دروازے پر پہنچے۔ دستکی ہوئے۔ اندر سے مرشد نے قدرے اُونچی آواز میں پوچھا، بھلا کون؟ بلھے شاہ نے جواب دیا، سرکار میں ہوں بلھے۔ مرشد نے فی الفور کہا، اب تو بلھے نہیں رہا۔ بھلے ہو گیا، جا بھلکڑ جا کہیں اور کو جا، تیرے لیے یاں کوئی پچھایا نہیں رہی۔ مرشد کی اس پذیرائی سے بلھے شاہ پر بن آئی۔ تلوے تلے کی زمین سنک گئی۔ رو رو کر نڈھال ہو رہے۔ بہت دیر بعد جب دھیرے دھیرے آپے میں آئے تو مرشد کو منانے کی ٹھان کر اُٹھ بیٹھے۔ بلھے شاہ کی طبیعت کچھ ایسی اُکھڑ چکی تھی گویا سارا ریشم ہی اُدھڑ چکا تھا۔ وہ اپنے گھر یعنی قصور واپس لوٹ کر جانا بھی یکسر بھول چکے تھے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی خاک پھانکنے میں لگ لیے اور گردشوں کو سنوارنے میں اپنے شب و روز کم کسی کے الاؤ میں جھونک دیے۔

اُس دور کا یہ طور تھا کہ لاہور کی ہر نئی نویلی طوائف مجرا بیتوں کے سامنے مجرے کی پیشہ وارانہ پہل کرنے سے پہلے، پہلی بار حضرت شاہ عنایت آرائیں کی چوکھٹ پر خیر و برکت کی غرض سے رقص کی حاضری بجا کرتی تھی۔ جس دوران بلھے شاہ مرشد کو رام کرنے کی سوچ بچار میں بے حال و بے چال تھے انھیں ناگاہ رقص کی حاضری والی یہ رسم یاد آگئی۔ بلھے شاہ خوشی سے اُبل پڑے، روتے رہے اور جھومتے رہے۔ اسی اُدھیڑ بن کی ہواؤں میں انھیں پر لگ گئے۔ پہلی اُڑان میں لاہور کی ہیرا منڈی کے اُفق میں اُتر گئے۔ نوکری چاکری کے لیے جان کھپاتے رہے۔ جوتیاں چٹخاتے رہے لیکن بلھے شاہ کی جانب کسی کوٹھے کے دریچے نے اپنا رُخ نہیں کیا، کسی دروازے نے اپنے سائے آغوش کشا نہیں کیے۔ ہیرا منڈی کی بے اعتنائی اور کج ادائی سے دل گرفتہ ہو کر بلھے شاہ دلّی کی طرف نکل لیے۔ جس گھڑی بلھے شاہ دلّی کے نیلم بازار میں وارد ہوئے، سورج سوا نیزے پر تھا۔ حلوائیوں، قصائیوں، پنساریوں اور پنواڑیوں سے ملاقے کی ہر کنچن طوائف کے کوائف کی پوچھا پاچھی کرتے کراتے آخر کار بلھے شاہ دلّی کے دل زدوں کی ایک آدمرد، زلیخا جان بنارس والی کے کوٹھے پر جا پہنچے۔

دروازے کی زنجیر کھڑکائی۔ اندر سے آواز آئی، ارے یہ کون مُوا، نامراد آ گیا ناوقت، ٹوٹ کر جواب دیا، ایک پامال و خستہ حال۔

باندی نے دروازہ کھولا اور جھپاک سے اُلٹے پاؤں زلیخا جان کی ماں خانم جی کو خبر کر آئی۔ ''کوئی میلا کچیلا سا مسکین آیا ہے۔'' یہ سن کر خانم خلوت سے نکلی اور دروازے کی آڑ میں آ گئی۔ بلھے شاہ کی خستہ حالی اور آشفتہ روزی دیکھی۔ ترس کھا کر اندر بلا لیا۔ وہ بوجھل قدموں سے خانم کے پیچھے ہو لیے اور دیوان خانے کی نشستی چوکیوں سے پرے ہٹ کر نیچے بیٹھ رہے۔ ٹھنڈائی سے آؤ بھگت کے بعد خانم نے ضرورت دریافت کی۔ بلھے شاہ بولے، ''مالکن! تیری خدا خوفی کو اور بھاگ لگے تو مجھ محتاج کو اپنے

ہاں نوکر رکھ لے، تیرا بڑا احسان ہووے گا۔'' بلھے شاہ کی دعا گوئی اور برجستہ خوئی خانم کو فرما گئی۔ نرماہٹ سے پوچھا، ''کیسی نوکری؟'' کہا، ''یہی جھاڑو صفائی، برتن دھلائی، اوپری کام کاج اور اناج کی چھانٹ وغیرہ۔''

خانم بولی، ''تنخواہ کیا لوگے؟'' بولے، ''حاشا وکلا، دمڑی کوڑی کچھ نہیں، صرف دو وقت کے دسترخوان کی بچی کھچی روٹی اور چٹنی۔ ہاں مگر شرط کڑی یہ ہووے گی کہ جب زلیخا جان مجرا رچایا کرے گی تو میں بھی ایک کونے کھدرے میں ٹک لیا کروں گا۔'' خانم کو بلھے شاہ کی یہ سادہ لوحی لڑ گئی اور اس تنخواہ کم خواہ میں بجز وارفتگی ایسی ویسی کوئی قباحت بھی نظر نہیں آئی۔ خانم رضامند ہوگئی۔ بلھے شاہ نوکر رکھ لیے گئے اور کوٹھے کی متعلقہ نفری سے رسمی تعارف کے بعد اُن سب کے بابا سائیں بھی ہوگئے۔ معمول کے مطابق اب وہ روزانہ تڑکے اٹھ جاتے، جھاڑو اور جھاڑن کرتے، برتن کپڑا دھوتے، بازار سے بازاری لاتے، سہ پہر کچھ دیر کو اونگھاتے سستاتے، جب شام کو نہا چکتی، بلھے شاہ کوئی دوسرے بلھے شاہ ہوجاتے، مجرے کے سجاؤ سے پہلے سارے کام کاج بڑے ڈھنگ اور بڑی ترتنگ سے نمٹاتے، چراغ دانوں کو اکساتے، دالان کے فانوس جلاتے، لوبان اور صندل کی دھونی رچاتے، طاقچوں میں گلاب اور موتیا کے تھال جماتے، اجلی چاندنی پر مخملی گاؤ تکیے لگاتے، منڈل کی بیٹھک میں دائیں بائیں دستی پنکھے، خاص دان اور اگال دان پھیلاتے۔ مجرائیوں کی تواضع داری کو کبھی ستو کبھی امرودی شیرہ بناتے اور حقے گرماتے، سب سے آخر کو خانم کی مسند بچھاتے اور نقشین پان دان کے لوازمات سجاتے۔

جب سارے کام نمٹا چکتے، تب بلھے شاہ لپ جھپ آرائشی اطاق میں جاتے۔ مشاطہ کے ہاتھوں زلیخا جان کا سنورنا اور روپ بھرنا جھوم جھوم کر دیکھتے، خوش باش ہوتے اور زلیخا جان کی طرف پنکھیا جھلتے رہتے۔ زیر لب چشم بد دور، چشم بد دور بڑبڑاتے اور باہر انگنائی میں نکل پڑتے۔

عشا کے لگ بھگ گھنٹا بھر بعد، سازندوں کا طائفہ زربافت کی دوپلی اور صدری زیب کیے بڑے بانکپن سے آگے پیچھے ایک قطار میں برآمد ہوتا۔ نشست گاہ میں خس اور اگر کی خوش بو چھک جاتی، طائفے کا ہر نفر مجرائیوں کے سامنے پہلے کورنش بجالاتا اور غالیچوں پر ایک سجاؤ سے جماؤ کرتا۔ پھر اپنے ساز و سامان کا تال میل اور کساؤ کرتا۔ اس سازگاری کے بعد زلیخا جان کی پیشوائی میں سازوں اور طبلے کی تعاقبی مہارتوں کا دکھاؤ کرتا۔

دفعتاً طبلے کی چلت تھاپ پر گھنگرو چھنکاتی، بل کھاتی، بھاؤ دکھاتی، لجاتی، چلمنی حجاب سے چہرہ چھپاتی اور شانوں سے چندری گھٹاتی بڑھاتی، ایک گوشے کی اوٹ سے زلیخا جان رقص کے فرش پر آتی۔ بے ساختہ آفرین آفرین کی کھنک سے محفل پھڑک جاتی۔ مجرا شروع اور رنگ طلوع ہوجاتا۔ اسی اثنا، بلھے شاہ زردوزی کی پچ گوشیہ پہنے اور کملی اوڑھے دبے پاؤں آتے اور ایک کونا پکڑ بیٹھ جاتے۔ رقص کے ہنگام کبھی کھلکھلاتے کبھی ٹپاٹپ آنسو بہاتے اور اپنے دامن کو تسلا بناتے۔ یہ من بھاوَنی ریت ضرورتی ناغوں کے سوا تقریباً سال بھر تک بے ٹوک چلتی رہی۔

راتوں میں ایک رات، چڑھتے چاند کی رات، زلیخا جان کو کسی رجواڑے کے ہاں مجرے کے لیے جانا تھا لیکن ناگزیری کچھ ایسی آئی کہ محفل سے چار دن پہلے بستر سے اُس کی پیٹھ لگ گئی۔ بخار کیا تھا، ایک پھانس پڑ گئی۔ دلی کے نامی گرامی حاذق حکیم میر عالم بلوائے گئے۔ مفرحات اور عرقیات سے دوا دارو ہوتی رہی لیکن زلیخا جان بے سدھ بدھ اوندھی پڑی رہی۔ خانم کو بدنظری اور سفلیات کا دھڑکا تھا تو اتارے کے لیے کسی اتارو کی ڈھونڈ پڑی۔ کارندے کھوج کھاج کر چاندنی چوک سے ایک تعویذیے لے آئے۔ ہر قسم کی نظر اتاری گئی۔ ہر طرح کا صدقہ اتارا گیا۔ پنج سورے کا ورد دم ہوا۔ یٰسین کا پانی چھڑکا گیا لیکن زلیخا جان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ زلیخا جان کی بیماری کا اطراف کی ہم جولیوں اور دیگر کوٹھے والیوں کا تمسخر لگ گیا۔ خانم نے اس آون جاون کو اپنے لیے مہلت کا وقفہ جانا۔ سہ پہری تھی۔ چل چلاؤ اور ڈھلاؤ کی طرف جاتی ہوئی سہ پہری۔ دھوپ ابھی دیواروں کے سایے میں اپنی پناہ تلاش رہی تھی۔ خانم ہڑبڑا کر میں کوٹھے سے نیچے اتری۔ چوک کے اڈے پر آئی۔ واپسی کا تانگا پکڑا اور ایلی بستی نظام الدین نکل گئی۔ بستی پہنچی تو ہو ہو کی دھمک اور دھنک دیکھ کر بجھی بجھائی سی خانم کی آنچ کچھ لہلہا گئی۔ خانقت کا وہ ریلا اور میلا تھا کہ بس چل چلاؤ چل۔ درگاہ کی سائی میں خانم کو زرا زور آزمائی سے داخل ہونا پڑا۔

درگاہ کے اندرون پہنچ کر اردواجا سب سے پہلے امیر خسرو کے واں حاضری لگائی۔ سلام ہدیہ کیا اور اپنی گزران سنائی۔ خسرو سے سلطان جی کی خدمت میں باریابی کی خاطر اپنا سفارشی ہو جانے کے لیے گزارش ہوتی رہی اور بعض جھلملاتی رہی۔ خسرو بھی آخر مرشد کی تیور کسوٹی تھے، حمایت کرنے پہ درپردہ مائل ہو گئے۔ خانم وقتا بحال ہوئی۔

خسرو کی خسروی سے اجازتی ہو کر خانم جس دم سلطان جی کی دہلیز پر آئی تو واں نوچندی جمعرات کی بارات آ چکی تھی۔ چارسو عرض گزاروں کے غول تھے، ایک غلغلہ تھا۔ ہر کوئی امیر خسرو کی طرح اپنی چھاپ تلک کی فریاد میں مگن تھا۔ خانم سیاہ کامدانی برقعے میں گمی سمائی، سرکتے سرکتے سلطان جی کے قریب جا پہنچی۔ جڑ جواڑ جا پہنچی تو اپنا ماتھا جھروکے سے لگائے کچھ کھسر پھسر کرتی رہی۔ شاید سلطان جی ناراضی تھے۔ خانم کھسکتی کھسکتی پائنتی میں آ گئی۔ سلطان جی کو مناتے مناتے سسکیانے اور ہچکیانے لگی۔ پھر توبہ تلا کرتے کرتے ہلکان ہو گئی۔ جب سلطان جی کی توجہ سے خانم کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو وہ حضرت کی منظوری سے رخصت لے کر آستانے سے باہر چلی آئی۔ چلتے چلتے لنگر خانے کے بٹوارے سے کچھ بٹورا اور گھر کو سدھار گئی۔

بیعانے کے ہر جانے اور بڑی سرکار سے وعدہ خلافی کی پاداش اور بجھتان کے اندیشوں پر خانم اور سازندوں سبھی کے توتے اڑ چکے تھے۔ سب کو اس خلل نے گھیر رکھا تھا کہ رجواڑوں کے ہاں ناگہانی کا بھی کوئی اِلا نہیں ہوتا۔ کوئی حیل حجت نہیں ہوتی۔ غرض وعدے کی تلوار نیام سے نکل کر سروں پر آ گئی۔ زلیخا جان پلکیں تو پسار چکی تھی لیکن ابھی اُس کے لیے ایڑی زمین پر رکھنا دوبھر تھا، بہت لاغری تھی۔

بلھے شاہ احوال کی ہانڈی کا اُبلنا بھانپ چکے تھے۔ پوچھنے لگے، خانم آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے، گھر میں نحوست کی چہل پہل کیوں ہو رہی ہے؟ خانم نے پہلے تو ایک ٹھنڈی آہ بھری، پھر اپنی افتاد بیان کی تو بلھے شاہ نے خانم کو بڑے دلاسے دیے، بڑی تسلی دی، ہولے سے بولے، ارے خانم! چنتا مت کر، ایسی کوئی گھمبیرتا نہیں، اوپر والا بڑا کارساز ہے۔ ایسا کر زلیخا جان کا گھاگرا چولی، زیور اور اس کے گھنگرو مجھے پہنا دے، میں اس کے بدلے ہو آؤں گا۔ پھر دیکھیو چھما چھم۔ یہ سن کر خانم کسی سوچ میں اٹک گئی اور ایک گہری چپ سادھ لی۔ وار چوک جانے کی وحشت میں بلھے شاہ فوری ساجتی ہو گئے۔ رو دھو کر اللہ اور اس کے پیارے حبیبؐ کے ہاتھ اپنی مراد سونپنے کی التجا کی۔ التجا کا دباؤ بڑھا۔ پنجتن کی قسموں سے جوڑے واسطے بڑھے، آخر آخر خانم نیم دھیمے پسیج گئی۔

خانم کا لکنت آمیز اشارہ پاتے ہی بلھے شاہ لپک جھپک تیاری میں جت گئے۔ چولی گھاگرا چڑھایا، مسّی کاجل لگایا، بندیا لگائی، جھومر اٹکایا، چمک چمک کرتا گلوبند اور بازوبند پہنا، جھمکے اور کنگن پہنے۔ چندر مالا پہنی، گجرے باندھے، ایسا بناؤ سنگار کیا کہ بس خدا کی پناہ۔ زلیخا جان کی مشاطہ بھی، خانم بھی اور سازندے بھی سب کے سب ہکا بکا رہ گئے، دست بستہ ہو گئے۔

پالکی آئی اور بلھے شاہ پالکی میں سوار ہو کر زلیخا جان کے بھیس میں رجواڑے کی حویلی پہنچ گئے۔ محفل انتظاری تھی۔ بلھے شاہ گھونگھٹ نکالے، گھاگھرا سنبھالے، ٹھمکتے ٹھمکاتے، خراماں خراماں رقص کے چبوترے پر آئے۔ مجرے کے مہمان امرا اور رؤسا نے زلیخا جان سمجھ کر اشرفیوں کے نذرانے گزارے۔ بلھے شاہ نے تسلیمات کے نخروں سے محفل کی بے قراری کا خیر مقدم کیا۔ میرِ محفل، راجا صاحب ساجن پور کے دستِ مبارک کی اذنیہ جنبش سے مجرے کی بسم اللہ ہوئی۔ بلھے شاہ نے رقص کیا اور کلیان ٹھاٹ پر ایسا رقص کیا کہ ساری محفل داد و دہش سے بے خود ہو کر جھومتی رہی، گھومتی رہی۔ گجر سے ذرا کچھ پہلے جب محفل بے چراغ ہوئی تو کسی کو ہوا تک نہ لگی کہ کون آیا اور کون گیا۔

بلھے شاہ رجواڑے کے ہاں سے پالا مار آئے۔ کوٹھے کی تھان پر لوٹ کر آتے ہی مبارکیوں نے دھوم اٹھائی۔ خانم شکر مندی میں پہلے ہی خاصی خم ہو چکی تھی۔ زلیخا جان نے ہلچل سنی تو بستر سے اٹھ کر دوڑی اور سرخوشی میں بلھے شاہ سے لپٹ گئی۔ بلھے شاہ نے زلیخا جان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ آب دیدہ ہوئے۔ پھلنے پھولنے کی ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھر کچھ خیال آیا تو مسکرا کر کہنے لگے، لو بیٹو!! اب تو ہمرا تمرا 'گھنگرو شریک' رشتہ بھی ہو وئی گیا۔

خانم نے اس گھنگرو شریک رشتے کی سلامی نذر کی۔ شرینی تقسیم ہوئی، سب کا منہ میٹھا کیا گیا۔ اسی شور شرابے کے بیچ بلھے شاہ چپ چپاتے سے اٹھے اور اپنے حجرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد باہر آئے تو زلیخا جان کا چولا، زیور اور گھنگرو پھولوں میں لپیٹ لپاٹ کر لے آئے اور خانم کے قدموں میں رکھ کر بولے بس خانم، بس ہمرا تو کام ہو وئی چکا۔ اب تو چھٹی کر دے اپنی نوکری سے ہمری۔ یہ سنتے ہی

خانم بلک اٹھی۔ بولی، ارے بابا سائیں، آخر ہم سے ایسی بھی کیا گستاخی سرزد ہوگئی۔ بلھے شاہ تڑپ کر بولے، نہیں للہ نہیں، ہرگز ایسی کوئی کھوٹ کپٹ نہیں، زلیخا جان کے سر کی قسم، کسی سے کوئی گلہ تک نہیں مجھ کو۔ تیرے نمک کی مار پڑے خانم، اگر میرا دل تیری طرف سے میلا ہو۔ سچ پوچھ تو بات صرف اتنی ہے کہ اب میرے سینے میں لاہور کی کھینچ میری سانس لپیٹ رہی ہے۔ لاہور مجھے بڑی للک سے آواز دے رہا ہے۔ کبریائی کی بڑائی کو اپنے اور میرے درمیان حکم سمجھ۔ یقین کر کہ تیرے اور زلیخا جان کے احسانوں کی بھر مار کا رتی بھر صلہ سردست مجھ نصیبوں جلے کے پلے میں سوائے شکریے کے چند لفظی ٹھیکروں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں البتہ زندگی رہی اور لاہور نے میری بات رکھ لی تو کوسوں دور بیٹھ کر بھی اپنی دعاؤں کی گڑگڑاہٹ سے تیرا اور زلیخا جان کا قرض تا عمر چکاتا رہوں گا۔ یہ سن کر خانم کی ہچکی بندھ گئی۔ زلیخا جان سسکاری بھرنے لگی۔ سازندے ڈہائی اور دو ہتڑ کے ہوگئے۔ سبھوں نے بلک بلک کر بلھے شاہ کی منت سماجت کی۔ ہر طرح کی لالچ دی۔ بہتیری خوشامد کی، بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن بلھے شاہ کو نہ رکنا تھا نہ رکے۔ رسّی تڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

لاہور کے آسمان پر ابھی دو وقتوں کے بغل گیر ہونے میں کچھ اور وقت حائل تھا کہ بلھے شاہ اپنے مرشد کے دروازے پر پورے سال بھر بعد آن کھڑے ہوئے اور رقص آغاز کیا۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا

گھنگھرو کی والہانہ ڈہرائی تہرائی اور دھمال کی مستانہ دھما دھم سے اڑوس پڑوس کے در و دیوار بھی ہلنے لگے۔ حضرت شاہ عنایت آرائیں بے حواس باہر نکل آئے۔ جوں ہی بلھے شاہ پر ان کی نظر پڑی۔ زار و زار دھاڑنے لگے، بلھے شاہ نے جب مرشد کا یہ حال دیکھا تو چکرا گئے۔ جہاں کھڑے تھے وہیں ڈھیر ہوگئے۔

حضرت شاہ عنایت آرائیں نے دوڑ کر بلھے شاہ کو اٹھایا۔ بانہوں میں جکڑا اور اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ دونوں دھارم دھار رو رہے تھے اور دور دور تک چاروں طرف ہُو حق ہُو حق کی آواز فضا میں رقص کر رہی تھی۔

از کجا می آئید...

درگاہوں کی داسی، ممتاز گلوکارہ عابدہ پروین نے نشریہ کار عبدالشکور بیدل (مرحوم) کے حوالے سے مجھے یہ روایت سنائی تھی۔ بابا بلھے شاہ سے منسوب اس مصدقہ روایت کو ایک خیالی تعلق سے حکایتاً رقم کیا گیا ہے۔

☆☆☆

سلمیٰ اعوان

او غزّہ کے بچّو

دن جمعے کا تھا، جگہ شہر دمشق کی قدیم ترین 'دمشق سیٹیڈیل' (Damascus Citadel) تھی، جہاں اُس اُموی خلیفہ ولید بن عبدالمالک کا شاہ کار اُمیہ مسجد ہے۔ عین سامنے جس کے وہ ساحۃ المسکیہ کا میدان قدامت کی فسوں خیزی لیے قلب ونظر کو حیرت زدہ کرتا ہے۔ آج تیسرا دن تھا۔ میں ہر روز دمشق کے محلوں، عجائب گھر اور اُس کے کوچہ و بازار میں گھومتی پھرتی یہاں آجاتی۔

پہلے دن ہی اس کی سحر انگیزی نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ کینا کے درخت تلے بیٹھی خوش گوار ہواؤں سے لطف اندوز ہوتی۔ کبھی اپنے دائیں ہاتھ نوادرات کی دکان کے چوبارے کی آبنوسی کھڑکیوں کو دیکھتی جن کی چوبی کندہ کاری ایسی گتھی ہوئی تھی کہ نگاہیں اُن میں اٹک اٹک جاتیں۔ سامنے دمشق کے مشہور حمیدیہ بازار کے اختتامیہ حصے پر بنے حداد (Hadad) ٹیمپل کے کالم ٹوٹ پھوٹ اور خستگی کا شکار ہونے کے باوجود نظروں کو لبھاتے تھے۔ پشت پر اُمیہ مسجد کا پندرہ سولہ فٹ اونچا دروازہ، بلند و بالا دیواریں اور اس کے تین مختلف اسٹائل کے بنے مینار اس کی عظمت کے گواہ تھے۔

اس دن میری نگاہیں پتھر کے فرش سے پھسلتی کھجور کے صدیوں پرانے درخت کی جھالروں سے آنکھ مٹکا کرتی، پھڑ پھڑاتے کبوتروں کی اُڑان میں الجھتی، اُس لڑکی سے جا ٹکرائی تھیں جو خوب صورت تو ضرور تھی پر ایسی نہیں جیسا شامی حسن ہوتا ہے کہ بندے کو جکڑ لیتا ہے۔

سادے سے سفید سوتی اسکارف سے ڈھانپے سر کے نیچے چہرہ دھوپ میں تمتما سا رہا تھا۔ لونگ اسکرٹ ٹخنوں کو چھوتا تھا۔ وہ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے جیسے گھسیٹ سی رہی تھی، وہ سوفی صد یورپی نظر آتا تھا۔

جمعے کی پہلی اذان ہو چکی تھی۔ چبوترے سے اُتر کر میں میدان میں مسجد کے دروازے کی سمت رواں تھی جب اُس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا:

''مردوں کے لیے مسجد جانے کا کون سا راستہ ہے؟''

''یہی جو تمھارے سامنے ہے۔''

جب وہ دونوں باب برید سے گزر رہے تھے، میں اُن کے پیچھے تھی۔ لڑکا مردانے حصے کی طرف بڑھنے لگا تو لڑکی نے انگریزی میں اُس سے کہا تھا "نماز کے بعد ایک دو گھنٹے آرام کر لینا۔"

"اب وضو کے لیے کدھر جانا ہے؟" جیسا سوال کرتی وہ میرے ساتھ ہولی۔

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے میری نظروں کا بھٹکاؤ تو بس لمحوں کا ہی تھا۔ میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے بائیں ہاتھ کی بلند و بالا دیواروں پر آرٹ کے نظرت سے متعلق صدیوں قدیمی شاہ کاروں پر نظریں ڈالے بغیر آگے بڑھ جاتی۔ دارالخزانہ جیسے شاہ کار سے آنکھیں چرا کر اپنا راستہ ناپتی۔ سچی بات ہے، یہ تو سراسر اُس کی توہین تھی اور صحن میں بنا چوکور مینار بھی ہرگز دیکھے بغیر گزر جانے والا نہ تھا۔

میں خود پر لگنے والے اس اعتراض کو سننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ گزشتہ تین دنوں سے ہر روز ان کے نظاموں سے محظوظ ہو رہی تھیں، اب کیا انھیں گھول کر پی جانا تھا۔

بھئی سچی بات ہے، میں بھی اپنی بھوک اور حریصانہ نظروں کے ہاتھوں مجبور ہوں جو اس آنکھ مٹکے سے باز رہ ہی نہیں سکتیں۔ جب گردن سیدھی کی، لڑکی غائب تھی۔

"ارے!"

بھونچکی سی ہو کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ چکر کھا کر پشت اور سامنے نگاہ کی۔ لڑکی تو کہیں نہیں تھی۔ آنکھوں کو گھماتے میں نے تأسف سے پھر اردگرد کا یوں جائزہ لیا کہ جیسے وہ لڑکی تو نہیں، سوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ میں پہنی بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی گر گئی ہے۔

لڑکی کہانی تھی۔ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے راستہ پوچھتی تھی، وہ سوفی صد یورپین تھا۔ جھلاتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

کیسی بےحس لڑکی تھی۔ پہلی بار اس نادر تاریخی ورثے میں داخل ہوئی اور پل بھر کے لیے رُک کر کسی چیز پر نظر نہیں ڈالی۔ کچھ سوچا بھی نہیں کہاں سجدہ کرنے آئی ہے، وہ زمانوں قرنوں سے جائے عبادت تھی، آرمینیوں، رومیوں، عیسائیوں اور اب مسلمانوں کی۔ یہ تاریخ کے کتنے بےشمار باب کھولتی ہے۔ اُس نے کسی کو بھی کھولنے یا پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

چشمہ کا حوض تو ابھی بھی سامنے موجود تھا۔

اب افسوس اور جھلاہٹ کا فائدہ۔ کہانی تو مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔ سست قدموں سے وضو والے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں بھی دھیان وضو میں کم اور لڑکی میں زیادہ رہا۔

ابھی تو خطبہ جاری تھا۔ سامنے والے حصے کی طرف بڑھنے لگی کہ چلو وہاں سجدہ بھی ہوگا اور نظارہ بھی۔ مسجد کا وسیع و عریض پختہ صحن تنور بنا ہوا تھا۔ چھاؤں والے حصوں میں عورتیں پھسکڑے مارے بیٹھی تھیں۔ ذرا اُن سے بچتے دھیان سے آگے بڑھتی تھی کہ کسی کا ہاتھ کسی کی انگلی پاؤں کے نیچے آ گئی تو سیاپا پڑ جائے گا۔ تبھی کسی نے عبا کھینچی۔ پلٹ کر دیکھا تو بند دروازے کے آگے بنے پوڈے پر لڑکی بیٹھی تھی۔

خوشی سے نہال ہوجانے والا معاملہ ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہی اُسے اپنی کیفیات سے آگاہ کیا۔

''سوری، دراصل ایک خاتون پر مجھے سلفت (Sulfit) فلسطین میں اپنی ہمسائی کا گمان گزرا تھا۔ بھاگی تھی کہ اُسے پکڑ لوں کہیں ہجوم میں ادھر اُدھر نہ ہوجائے۔ پروائے حسرت وہ تو کوئی لبنانی نکلی۔''

تو وہ فلسطین سے ہے اور وہ لڑکا کون تھا؟

اندیشے سر سر کرتے لہجے میں دوڑتے چلے آئے تھے۔

لڑکی تو بڑی میٹھی سی اور بڑی بے بی سی دکھتی ہے۔ ہائے اللہ، کوئی رولے غولے والا چکر تو نہیں۔

بس کر، ووئی مولوان۔

ایسی پھنکار کے باوجود پوچھ ہی لیا۔ لڑکا کون تھا؟

''میرا شوہر ہے۔'' چلو اطمینان تو ہوا، پر سوال پھر ہوگیا کہ وہ تو یورپین لگتا ہے۔

''ہاں نا، برٹش ہے، اسلام قبول کیا ہے اُس نے۔''

یونہی جیسے ہاتھ کو بے اختیار ہی تھام کر چوم لیا۔ دھان پان سی لڑکی نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اوپر سے ترقی پسندی کی جتنی بھی ڈانگیں ماروں، اندر سے مسلمانیت پھر بھی پلہ مار جاتی ہے۔

نماز کے لیے عورتیں صف بندی میں مصروف ہوئیں تو میں اُس کا ہاتھ تھام کر باب جیرون میں داخل ہوئی۔ یہیں قریب ہی مشہد الحسین ہے۔ روایت ہے کہ عالی امام حسین کا سر مبارک یہاں دفن ہے؟

لڑکی نے چلتے چلتے رُک کر پوچھا تھا، سنا ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا روضۂ مبارک بھی یہیں ہے۔

''ہاں محراب کے پاس ہی ہے۔ پچی کاری کا بڑا خوب صورت کام ہے اُس پر۔''

فرش خوب صورت دبیز قالینوں سے ڈھپے ہوئے تھے جن پر ساتھ ساتھ ہم کھڑے ہوگئے۔ کسر فرض پڑھ کر میں نے پشت دیوار سے ٹکا کر اُسے دیکھا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ دعا کے لیے اُٹھے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اُس کا سارا وجود اوپر والے کے قدموں میں کسی طلب کے لیے گویا مجسم تھا۔ چہرہ جیسے حزن و یاس کی بارش میں بھیگ رہا تھا۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔ میرا دل تڑپ سا گیا۔ اس دید میں اپنائیت اور محبت تھی۔ میں نے اُسے بانہوں کے کلاوے میں بھر کر اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چاہا کہ وہ میرے سامنے کھل جائے۔

پرس کھول کر اُس نے ایک پوسٹ کارڈ نکالا، میرے سامنے کیا۔ میں نے دیکھا تھا، سفید اور سبز رنگوں میں چند لکیریں جن کی بظاہر صورت کسی راکٹ جیسی، جو زمین کے سینے کو چھیدنے جا رہی ہو۔

''غور سے دیکھیے۔'' جیسی بات پر اوپر لکھا ہوا پڑھا تو معلوم ہوا فلسطین کا نقشہ ہے۔ ۱۹۴۶ء سے جب برطانیہ اور اس کے حواریوں نے اس پورے علاقے کی بندر بانٹ کی، بائیس ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ ان ٹکڑوں کو نئے ملکوں کے نام دیے۔ اور باقی بچنے والے اس ٹوٹے کو اپنے پاس رکھا اور:

A land without a people for a people without a land.

کارڈ الا اپنے والوں کو یہ تحفہ دیا۔

۱۹۴۶ء میں فلسطینیوں کی اس سرزمین میں بنی اسرائیل کی یہ ناہنجار اولاد محدود تھی۔ مغربی اور مشرقی کناروں کے تھوڑے سے حصے پر چاولوں کے دانوں کی طرح بکھری ہوئی۔ آخری نقشہ ۲۰۰۵ء کا تھا۔ ایک ہزار سال سے اس زمین کے باسی اُس کی جگہ لے بیٹھے تھے۔

فلسطین ایک المیہ، ایک گہرا دکھ، عربوں کے سینوں میں پلتا ہوا ایک ناسور۔

کارڈ میرے ہاتھوں میں تھا۔ یوں ہی اس کی پشت کو دیکھ بیٹھی۔ بڑی موہ لینے والی لکھائی تھی۔ انگریزی میں لکھے گئے یہ اشعار کیسے دل چیر گئے تھے۔

If only our enemies would read our letters twice or three times, apologize to the butterfly for their game of fire.

اُس نے سرک کر میری طرف اپنی پشت دیوار سے لگائی۔ ایک لمبی سانس نکالی اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرے دادا کا گھر حیفہ میں تھا۔ حجاز ریلوے اسٹیشن کے پاس۔ حیفہ بحیرۂ روم کے شمالی کنارے پر صدیوں پرانا تاریخی شہر ہے۔ یہاں سے ٹرین ہمارے مقدس شہروں مکہ اور مدینہ کو براستہ دمشق جاتی تھی۔ زائرین کے لیے عثمانیوں کا بنایا ہوا ریلوے اسٹیشن۔ اب تو ظالموں نے اُس کا نام ہی بدل دیا ہے۔ حیفہ مشرقی اسٹیشن رکھ کر میوزیم بنا دیا ہے۔

میرے بچپن اور جوانی کی یادیں سلفت (Salfit) شہر کی قصباتی جگہ حارث کے گلی کوچوں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے والد ڈاکٹر ابوموسیٰ بزاز بیروت کی امریکن یونی ورسٹی کے تعلیم یافتہ جن کا بچپن اور جوانی حیفہ میں گزری تھی۔ یہ وہ دن تھے جب غریب فلسطینیوں سے بنجر زمین خریدی جاتی یا ان کے شکستہ حال گھروں کا مہنگے داموں سودا کیا جاتا۔ غریب لوگ پیسے زیادہ ملنے پر خوش ہوتے۔ اس کے پیچھے جو مقاصد کام کر رہے تھے، اُس کا تو اُنھیں شعور اور ادراک ہی نہیں تھا۔ کہیں کہیں زور زبردستی ہوتی۔ یوں بڑی بڑی خوب صورت کالونیاں بنتی جاتیں اور باہر سے یہودیوں کو لا کر بسایا جاتا۔ باہر کی دنیا اس صیہونی پروپیگنڈے کے شور غل سے متاثر تھی کہ فلسطین کی سرزمین ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے جو وہاں جتنی زمین چاہے خریدے۔ رہے عرب، نرے کھوتے کے کھوتے۔ جاہل، اُجڈ اور بے شعوری قوم۔

میرے والد کی کلاس فیلو یائل یہودی ہونے کے باوجود ان باتوں پر بہت جلتی کڑھتی تھی۔ یائل جرمن نژاد تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ حیفہ کی جرمن کالونی میں رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے شہر بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شہروں کو غریب فلسطینیوں سے پاک کرنے کا عمل زور پکڑ گیا۔ مہاجروں کے کیمپوں میں روز افزوں اضافہ، اُن کی زمینوں پر شاندار پلازے، کوٹھیاں اور صنعتی یونٹ تعمیر ہوتے گئے۔ فلسطینیوں کی جھونپڑیوں میں خوف ناک پھیلاؤ آ گیا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب میرے والد کو حیفہ چھوڑ کر حارث آنا پڑا۔ پر کہیں ایک دُکھ کی لہر اُن کے اندر سے اٹھتی تھی۔ اُنھیں اپنا باغ یاد آتا۔ اُس میں اُگے سنگتروں کے پیڑ یاد آتے۔ بحیرۂ روم کا ساحل، اپنا

گھر، اس کی گلیاں بہت وقت وہ مضطرب رہے۔

میری دادی کے لیے حیفہ چھوڑنا گویا موت کو گلے لگانے جیسا تجربہ تھا۔

کبھی ہجرت کا زہر بھرا گھونٹ بھرا ہے؟ اس نے سسکاری بھری۔

میں نے دہل کر اُسے دیکھا۔ میں خود تو اس تجربے سے نہیں گزری تھی کہ تقسیم ہند پر بہت کم سن تھی، مگر آنے والے بہت برسوں اس عملی مشاہدے سے گزری کہ میری دادی ہمہ وقت تیار ہی بیٹھی رہتی تھی کہ بس دلیں واپس جانا ہے۔ کمروں کو اس نے تالے کب لگائے تھے۔ وہ تو بہ امر مجبوری لوگوں کے اصرار پر باہر نکلی تھی۔

''لوگ تو باؤلے ہوگئے تھے۔ کوئی اپنا گھر بھی یوں چھوڑتا ہے۔ چلو دو چار دن بعد آجائیں گے۔''

میری ماں چولھے کے پاس بیٹھی راکھ پھرولتے ہوئے مدتوں دیس اور اس کی گلیوں کو یاد کرتی اور دیس کے ناسٹلجیا سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

سابق مشرقی پاکستان میں شمالی ہند سے ہجرت کرکے آنے والی میری بہت سی دوستوں کے والدین اور خود وہ ۱۹۷۱ء کے الم ناک حادثے کے بعد جس ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں، اُن کی تو میں خود چشم دید گواہ تھی۔ تو مجھے اُس کی دادی کے جذبات سمجھ آتے تھے۔ اُس کے گھر کا آنگن بہت کشادہ تھا۔ دمشق، حلب اور فلسطین کے معززین کے گھروں جیسا جن کی دیواروں پر چڑھی انگور کی بیلوں پر منوں پھل لگتا تھا۔ سنگترے کے بوٹے جب منوں وزنی بوجھ سے جھک جھک پڑتے تو اُس کی آنکھیں انہیں دیکھ دیکھ کر ہیروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتیں۔ صحن کے عین درمیان کنواں تھا۔ بڑے بھاری شہتیروں والے کمرے تھے جن شہتیروں پر اُس نے میرے دادا سے ضد کرکے گل کاری کروائی تھی اور جو بہت خوب صورت لگتے تھے۔ وہ باؤلی سی آنکھوں میں آنسوؤں کے کٹورے بھرے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتی تھی۔ لمبی لمبی محرابی جھروکوں والی بالکونیاں دیکھتی تھی۔

''دیکھو تو، اس کمرے میں میرا چچا مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی ٹھہرتا ہے۔ یہ کمرہ تو اُس کے لیے مخصوص ہے۔''

اُسے اپنی زمین پر زیتون کے باغوں کی فکر تھی۔ وہ بھیڑ بکریوں کے لیے ہلکان ہو ہو جاتی تھی۔

وہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی، پر اپنے چچا کے گھر آنے پر معززینِ حیفہ کے ساتھ بیٹھک میں ان کی جو نشستیں جمتیں اور وہ شوق و محبت سے کھانے اور قہوے کی سروس خود بھاگ بھاگ کر کرتی تو ایسے میں اُن کی باتیں سنتے سنتے وہ بہت بالغ ہوگئی تھی۔

ترکوں کے فضیحتے کرتی۔ مسلمان تھے، پر کیسے مسلمان؟ ہمیں اپنی محکوم رعایا بنا کر رکھا اور ہمیشہ نظر انداز کیا۔ آخری عثمانی سلطان کے لتے لیتی کہ جس نے اُس مردود بارن ایڈمنڈ رتھس چائلڈ کو فلسطین میں ایک یہودی آبادی کی آبادکاری کی اجازت دی تھی۔ سارا معاملہ تو یہیں گڑبڑ ہوگیا تھا۔ تم مجھے سر اندر

کرنے دو، بیٹھنے اور لیٹنے کی جگہ میں خود بنالوں گا۔ وہ اونٹ اور خیمے کی کہانی سنانا شروع ہوجاتی۔

تب دھیرے سے میرے والد انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہجرت کا عمل صدیوں قرنوں سے ہے۔ ایک مسلک، ایک عقیدے کے لوگ پرانی جگہوں پر اپنی آبادیاں بھی بنا لیتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ غلط ہے کہ آپ اس حد تک چلے جائیں کہ مالکوں کو نکال باہر پھینکیں۔ پھر ان کی زمینیں چھین لیں اور انھیں اپنی ہی سرزمین پر قیدی بنا دیں۔

تب لعن طعن کے گولے برطانیہ اور اس کے حواریوں پر برسنے لگتے۔ شریف مکہ پر طوفانی یلغار ہوتی۔ ارے وہ پاسبانِ حرم تھا کہ ڈاکو— ہماری قیمت وصول کی۔ ہمیں سکوں کے عوض بیچ ڈالا۔

میرے والد چپ چاپ اُن کی باتیں سنتے رہتے۔ وہ اُن کے جذبات سمجھتے تھے، پر انھیں مزید دکھ سے بچانے کے لیے ہونٹوں کو سیے رکھتے۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کے دل کی ہر دھڑکن نظار قبانی کے شعروں کے ساتھ دھڑکتی اور اُن کے خون کی گردش تیز اور تیز تر ہوتی جاتی۔

''میں دہشت گردی کا حامی ہوں
اگر یہ مجھے روس، رومانیہ، پولینڈ اور ہنگری سے آئے مہاجروں سے بچا سکے
یہ مہاجر فلسطین میں آ بسے
انھوں نے القدس کے مینار، اقصیٰ کے دروازے اور محرابیں چرا لیں
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
جب تک نیو ورلڈ آرڈر میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
اُن کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
میں دہشت گردی کا حامی ہوں!''

تب اُن کی آنکھیں بھر آتیں۔ دائیں ہاتھ کی پوروں سے انھیں صاف کرتے ہوئے، وہ وہاں سے اُٹھ جاتے۔

اور گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ حیفہ کی زمین پر بس فلسطینیوں کا خال خال کوئی گھر رہ گیا اور یہی وہ دن تھے جب میرا باپ حیفہ چھوڑنے کو کہتا تھا اور میری دادی کو ہول آتے تھے۔

''آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ بشیت اور یپنی میں آپ کے کتنے رشتے دار اور دوسرے لوگ تھے۔ کیا ہوا؟ سارا علاقہ مسمار کر دیا گیا۔ عالی شان گھر بنے اور یورپ کے ملکوں سے اسرائیلی آئے اور قابض ہو گئے۔ مہربانی کریں، ابھی گھر کے دام مل رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اس سے بھی جائیں۔''

وہ چھم چھم روتی تھی۔ اُس کا کلیجا منہ کو آتا تھا اور رُندھے گلے سے کہتی تھی، ''کہاں جانا ہے؟ اچھا تو چلو نظارت میں جا بستے ہیں۔''

اُن کی بیٹی نظارت کے پرانے شہر میں العبید مسجد کے پاس مارکیٹ والے علاقے میں رہتی تھی۔

میرے والد چپ تھے۔ فیصلہ کرنے میں بہت سوچ بچار کے بعد قدم اُٹھانے والے۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ سمجھتے تھے کہ گرجاؤں، مناستریوں اور شیتنی گاگوں سے سجا یہ قدیم شہر آنے والے وقتوں میں اسرائیل کی ظالمانہ گرفت میں ہوگا۔

تو پھر عکا چلتے ہیں۔ میری دادی نے آہ بھری تھی۔

عکا کے لیے میرے والد رضامند تھے۔ پانچ ہزار سال کے تہذیبی ورثے کا مالک بہت خوب صورت عکا۔ مغرب اور مشرق کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی شہر میں دیکھنے کو ملے جیسا یہاں تھا۔ آرٹ اور مذہب کے امتزاج سے گندھا ہوا۔ دنیا کی بہت ساری تہذیبوں اور ثقافتوں کی باقیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔ قلعوں، گرجاؤں، مسجدوں، مندروں سے بھرا ہوا شہر جو اپنے قدیم جنگ جوؤں، اپنے معماروں اور اپنی گزشتہ شان و شوکت کی کہانیاں سناتا ہے۔

مگر پتا نہیں کیوں، انھوں نے سلفت کو ترجیح دی۔

وہ ڈاکٹر تھے، ہم درد اور غم گسار سے، وہ نہ دیکھتے کہ ان کا مریض عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان۔

نئی جگہ بسنے کا واویلا تو اپنی جگہ تھا۔ پر وہ حادثہ تو جیسے اُن کی جان پر گزر گیا — جون کے تپتے دنوں کا حادثہ۔ جائے نماز پر ہی بیٹھے بیٹھے آنسوؤں کی مالا پروتی جاتیں۔ کبھی شدید غصے سے لرزتی آواز اور کبھی غم میں ڈوبے لہجے میں میرے والد کو آواز دیتے ہوئے کہتی چلی جاتیں:

''سنتے ہو ابو موسیٰ! ان مصریوں کو چوڑیاں کیوں نہیں دے آتے۔ ارے ایسے بزدل، انھوں نے بٹا لگا دیا عربوں کی روایات کو۔ بھاگنے میں گھوڑوں کو بھی مات دے دی۔ نہر سوئز تک سارا سینائی دے دیا۔ کس آرام سے اُن کی جھولی میں ڈال دیا۔ شام اور اس اردن کو بھی ڈوب مرنا چاہیے۔ آج گولان کی پہاڑیاں چھینی ہیں، کل دمشق پر ہاتھ ڈالیں گے۔ یروشلم تو گیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات کے رکھوالے بھی وہ ہوئے۔ ارے ابھی پتا نہیں کیا کیا دیکھنا ہے؟''

پھر آہ وزاری بڑھ جاتی۔ جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے کہیں آنسوؤں کے دھاروں میں بہتی آوازیں دیتیں، ''ابو موسیٰ کہاں ہو؟ ارے جاؤ نکلو۔ دیکھو تو جنھیں دیس نکالا دیا ہے، وہ کس حال میں ہیں؟ جیتے ہیں یا مر گئے۔ ان ظالموں نے بڑی گولہ باری کی ہوگی۔ توپ بندوقوں نے ان کے کلیجے چھلنی کر دیے ہوں گے۔ ارے ڈاکٹر ہو تم — جاؤ ان کے زخموں پر مرہم رکھو۔ ارے ابو موسیٰ! اب اللہ کی مصلحتوں کو میں کیا نام دوں۔ تجھے ان دو لڑکیوں کی جگہ دو بیٹے دے دیتا تو کیا تھا، میں ان کے ہاتھوں میں بندوقیں نہ سہی، پتھر پکڑا دیتی۔ ارے ایک دو کے ہی سر پھوڑ دیتے۔''

ہماری والدہ اُس وقت ان کے قریب ہی کہیں موجود ہوتیں۔ میری بڑی دونوں بہنیں چھوٹی چھوٹی سی، اُن کے جائے نماز پر آگے پیچھے دادی کی باتوں کی کاٹ سے بے نیاز چکر کاٹتی رہتیں۔

ایسے دکھ بھرے بہت سے لمحوں میں اُنھیں قطعی یاد نہ رہتا کہ اُن کا بڑا سعادت مند بیٹا اُنھیں بتا کر ہی اردن کے کیمپوں میں گیا ہے۔

تاریخ کا کتنا بڑا جبر — ہزاروں فلسطینی بے گھر ہو گئے۔ اُن کی بڑی تعداد شام اور اردن کے مہاجر کیمپوں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔

اب فلسطین کا ہر گھر ماتم کدہ ہے۔ ہوا کرے، عرب اور مغربی دنیا کو اس سے کیا۔

اور ایسے ہی دنوں میں میرے بڑے ماموں ہمارے گھر آئے اور ہماری دادی کے پاس بیٹھ کر انھوں نے نزار قبانی کی وہ نظم انھیں سنائی تھی جو شاعر کے ہونٹوں سے نکلتے ہی تند و تیز ہواؤں کے جھکڑوں کی طرح عرب دنیا میں پھیل گئی تھی۔ میری بہنیں مجھے بتایا کرتی تھیں کہ وہ نظم دادی کے ساتھ ساتھ انھیں بھی زبانی یاد ہو گئی تھی۔

کوئی ایک بار تھوڑی، میری دادی بار بار اُن اشعار کا ورد مقدس آیات کی طرح کرتیں:

''جان کی امان پا سکتا تو سلطان سے کہتا

سلطان آپ دو جنگیں ہار چکے ہیں، آپ نسل نو سے کٹ چکے ہیں، دشمن ہمارے خون سے ہولی کھیل گیا

عرب بچو، مستقبل کو بتا دو تم ہماری زنجیریں توڑ دو گے، عرب بچو، ساون کے قطرو، تم ہی وہ نسل ہو جو شکست پر غالب آئے گی

غزہ کے بچو اپنی جنگ جاری رکھو

ہم مردہ اور بے گور ہیں

ان اطفال سنگ نے ہماری عباؤں پر سیاہی انڈیل دی ہے

او غزہ کے دیوانو!''

وہ جب یہ اشعار پڑھتیں تو میری بہنوں کی طرف دیکھتیں:

''کاش یہ لڑکے ہوتے۔''

میرے والد مہینوں بعد آئے، کم زور، نڈھال، شکستہ، ٹوٹے پھوٹے سے۔ کیمپوں کی حالت زار، اسپتالوں میں نیپام بموں سے جھلسے ہوئے بے کس اور لاچار فلسطینی۔ متاثرین تک پہنچنے کی راہوں میں حائل رکاوٹیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کا اغوا اور اُن کا اور عام لوگوں کا قتل عام۔

فلسطینیوں کو اپنی یہ لڑائی خود لڑنی ہے۔ کوئی عرب ملک اُن کی امید نہیں۔ کوئی اُن کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔ سب اپنے اپنے مفادات کے لیے بکے ہوئے ہیں۔

بستر مرگ پر بھی میری دادی فلسطین کے لیے معجزوں کی منتظر رہیں۔ کسی صلاح الدین ایوبی کے اُٹھ کھڑے ہونے کی دعائیں کرتی کرتی قبر میں اتر گئیں۔

بیٹا تو میرے باپ کے شاید مقدر میں نہ تھا۔ تیسری لڑکی میری صورت میں گھر اور آ گئی۔ گھر تین لڑکیوں سے بھر گیا۔ جب ہوش سنبھالا، میری بہنیں قاہرہ پڑھنے جا چکی تھیں۔ بیروت تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

اپنی بہنوں کے ساتھ میں دیر بعد شامل ہوئی تھی۔

وقت کے ساتھ ہتھکنڈے کن ذلیلانہ حربوں پر اُتر رہے تھے۔ ہمیں اس کا احساس ہر پھیرے پر ہوتا تھا۔ ہم تینوں بہنیں جب بھی گھر آتیں، جگہ جگہ ہماری گاڑی روکی جاتی۔ جا بجا چیک پوسٹوں پر ہمارے کاغذات چیک ہوتے۔ میری بڑی بہنیں جز بز ہوتیں۔ اُن کی پیشانیوں پر پڑے بل آج سمجھ آتے ہیں۔ فوجیوں کی نگاہوں کا گرسنہ انداز کا مفہوم تب نہیں، آج میرا خون کھولاتا ہے۔

مار دھاڑ، بے دخلی اور ہماری زندگی اجیرن کرنے کا ہر حربہ اپنایا جا رہا تھا۔ کنکریٹ کی دیواریں، برقی باڑھیں، آبزرویشن ٹاور، خندقیں، سرنگیں اور پرمٹ سسٹم ــــ کیا کیا نہیں ہمارے لیے کیا گیا۔

وہ باغ، وہ زمینیں جو کبھی فلسطینیوں کی تھیں، اب اُن پر وہ قابض تھے۔ بے چارے فلسطینی پھل اُن سے خریدتے اور سڑکوں کے کنارے پر کھڑے ہو کر انھیں بیچتے۔ اُن کی settlements پر دیہاڑی دار مزدور بن کر کام کرتے۔ مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے پر جانے کے لیے سویرے سویرے لائنوں میں کھڑے ہو جاتے۔ پرمٹ سسٹم جیسے تکلیف دہ مرحلوں سے گزرتے۔

وہ دن بھی میں اپنی یادداشتوں سے کبھی نہیں نکال سکتی۔ میں اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تھا، وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ غزہ کے جنوب مشرقی علاقے "زیتون" میں رہنے والی اُن کی بے حد پیاری پھوپھی کی بیٹی اسرائیلی بمباری سے شہید ہو گئی تھی۔ اسرائیلی طیاروں نے بمباری کی تھی۔ میزائل ان کے گھر گرا تھا۔ ان کے دو کم سن پوتے اور وہ خود شہید ہو گئی تھیں۔

تعزیت کے لیے بھی بہت دنوں بعد جا سکے کہ محاصرہ طول پکڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر ابو موسیٰ بزاز دو بیٹیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ سب سے بڑی ڈاکٹر لائیلا انگلینڈ تھی، نمبر ۲ یسریٰ، میری پھوپھی کے گھر نظارت میں، تیسری میں یعنی آرینا اب اس مرحلے سے گزر رہی تھی۔ میری زندگی میں ڈاکٹر بشار البشر کا آنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر بشار البشر فلسطینی تھا، مگر پرائمری کے بعد آئرلینڈ اپنے چچا کے پاس چلا گیا تھا۔ وہیں اُس نے میڈیکل کیا۔

گو وہ باہر رہا مگر فلسطین اُس کے وجود کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا تھا۔ وہ جب بھی آتا، حالات کے تیور دیکھ کر کڑھتا، پیچ و تاب کھاتا اور اپنا خون جلاتا اور پھر دور نزدیک جگہ جگہ پھرتا۔ لوگوں کو دیکھتا، انھیں چیک کرتا، دوائیاں دیتا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے اس اُجڑے پجڑے محکوم و مجبور وطن آ گیا۔ مسیحائی کا تحفہ اُسے قدرت نے انعام کی صورت دیا تھا۔ عجیب سی بات تھی، وہ قرونِ وسطیٰ کے طبیبوں کی طرح مریض کو لٹا کر اُس کا سر سے پاؤں تک معائنہ کرتا۔ اور یہ کیسی حیران کن ناقابلِ یقین بات تھی کہ جوں ہی اس کے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں بیمار کے اعضا چیک کرتے کرتے اس کے پاؤں کی انگلیوں تک پہنچتیں، مریض ہاتھ جوڑے اُس کے سامنے مجسم ہو جاتا۔ نہ کوئی ایکس رے، نہ کوئی رپورٹ، نہ کوئی ٹیسٹ۔

اُس کی اس عجیب و غریب سی خوبی نے اُسے قرب و جوار میں خاصا مشہور کر دیا تھا۔

ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔

میں سو کر اٹھی۔ میرے سر اور گردن میں ایسا شدید درد تھا کہ چیخیں نکلتی تھیں۔ نہ صرف میرے والد بلکہ چند دوسرے ڈاکٹروں نے بھی چیک کیا۔ ابھی ٹیسٹوں کا مرحلہ جاری تھا، جب اتفاق سے یشار ابشر، حارث میرے والد سے ملنے آگئے۔ انھوں نے صرف پانچ سے چھ منٹ کے معائنے میں بتا دیا کہ اسے مینجائٹس ہوگیا ہے۔ فوری تشخیص اور علاج نے مجھے نئی زندگی دی تھی اور میں ڈاکٹر کی عاشق ہوگئی تھی۔

میری اس وابستگی کا اظہار میرے والد کی زبان سے ہوا اور یشار کی عنایت کہ اس نے اسے پذیرائی دی۔

گھر کی آخری اور بے حد لاڈلی بیٹی کی شادی جس انداز میں ہوئی، وہ داستان بھی دل دہلانے والی تھی۔

اندرون وطن عزیزوں کے علاوہ بیرون ملک سے بھی رشتے کے چاچے، ماموں، بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا کٹھ ہوا تھا۔ اس رنگ رنگیلی فضا کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ جب مغربی کنارے کی شمالی پہاڑیوں کے دامن میں اسرائیلیوں کی آتمار (Itamar) نامی settlement میں فوگل (Fogel) فیملی کے پانچ افراد کے ان کی خواب گاہوں میں چاقوؤں سے قتل ہوجانے کی خبر آئی۔

اسرائیلی ملٹری اور سیکورٹی سروسز نے بغیر تحقیق کے ملحقہ فلسطینی گاؤں آوارتا (Awarta) پر چڑھائی کردی۔ نوجوان لڑکوں کی گرفتاریاں، گھروں کی تلاشی، سامان کی توڑ پھوڑ، چند گھنٹوں میں حشر نشر ہوگیا۔

یشار کا بڑا بھائی اور اس کے تین بیٹے بھی اسی چکر میں دھر لیے گئے۔ وہ شادی میں شرکت کے لیے تیاریوں میں تھے جب یہ قیامت ٹوٹی۔ نابلوس میں کرفیو لگ گیا تھا، بارات کیسے آتی۔ آنسو میرے گالوں پر بہتے تھے۔

اور میں اپنی بہنوں سے کہتی تھی، میری شادی پر ہی سب ہونا تھا۔

ابا کے اسرائیلی دوستوں سے رابطے، بھاگ دوڑ، فلسطینی ممبر اور سب سے بڑھ کر انکل یوری ایوزری سابق ممبر اسرائیلی پارلیمنٹ کی کاوشیں رنگ لائیں۔ انکل یوری ایوزری اسرائیل میں رہتے ہوئے، سیاست دان ہوتے ہوئے، حق سچ کا علم اٹھائے رکھتے ہیں۔ ظلم و جبر پر بولتے اور لکھتے رہتے ہیں اور فلسطینیوں کے حقوق اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کی حمایت میں ہمیشہ آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

لڑکے بارات میں پھر بھی شامل نہ ہوسکے کہ وہ تو زیر حراست تھے۔ بے چاروں کے کہیں فنگر پرنٹ، کہیں ڈی این اے ٹیسٹ ہورہے تھے۔

یہ شادی نہیں تھی، فرض کی ادائی تھی۔ میں نے میک اپ نہیں کیا، کپڑے نہیں پہنے۔ بس اسی حالت میں گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

مہینوں میں اس دکھ سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ یشار مجھے سمجھاتا اور دل داری کرتا نہ تھکتا تھا اور میں کہتی تھی، ''کم زور ہونا کتنا بڑا جرم ہے۔''

یشار نابلوس کے رفیدیہ اسپتال سے منسلک تھا۔ ایک دن کوئی دو بجے گھر آیا۔ میرے ہاں دوسرا بچہ متوقع تھا۔ کھانا تیار نہیں تھا۔

''کچھ کھانے کو۔'' اس کے انداز میں ہمیشہ دھیما پن ہوتا۔

میں نے ذرا سے تامل، ذرا سے تاسف سے اپنی خرابی طبیعت کا بتایا۔

''چلو چھوڑو۔ 'زاطر' تو ہے نا، اُسے ہی لے آؤ۔''

میں نے میز پر خبض، زیتون اور زاطر سجا دیا۔

زاطر ہمارے مڈل ایسٹ میں بہت کھایا جاتا ہے۔ ہربل اور تلوں کا آمیزہ جسے زیتون سے ملا کر روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

ابھی اُس نے نوالے کو زیتون میں ڈبو کر اُسے زاطر میں لتھیڑنے کے لیے نکالا ہی تھا کہ باہر کسی جیپ کے رُکنے اور پھر بیل بجنے کی آواز آئی۔

میں دوسرے کمرے میں چلی آئی۔

خادمہ نے مجھے بتایا کہ اسرائیلی فوجی ہیں۔

میرا دل دھک سے ہوا۔ اُسی سے پتا چلا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔

اندر کیا ہو رہا تھا؟ میرا دل سینے میں پھڑ پھڑاتا تھا۔

دیر بعد دروازہ کھلا۔ آنے والے جیپ میں بیٹھے اور چلے گئے۔ یشار اندر آیا۔ مجھے فق بیٹھے دیکھا، سینے سے لگایا اور بولا، ''حد ہوگئی ہے، نارمل ہو جاؤ۔ لگتا ہے تمھارا دل جیسے ابھی اندر سے سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔'' اور جب میں نے کچھ جاننے کی کوشش کی، اُس نے رسان سے کہا، ''میں ڈاکٹر ہوں۔''

میرا اصرار حد سے بڑھا۔ اُس نے کہا، ''مریض اگر اپنی بیماری کو راز میں رکھنے کا متمنی ہے تو ڈاکٹر کو اختیار نہیں کہ وہ اس کا پردہ فاش کرے۔''

پر میری حد سے بڑھی ضد پر بالآخر اُسے بتانا پڑا۔

آنے والوں میں سے ایک اسرائیلی فضائیہ کا پائلٹ مسٹر پیری یاتم تھا، دوسرا اُس کا دوست۔ اُس پائلٹ کے ساتھ ایک گمبھیر مسئلہ ہوگیا۔ جوں ہی وہ کسی مشن پر جانے کے لیے جہاز اُڑا کر فضا میں لاتا، اُس کے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ وہ اپنی بیماری ملٹری اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میڈیکل گراؤنڈ پر فوراً ایکشن ہوکر سارا کیریئر داؤ پر لگ جانا تھا۔ یشار کے بارے میں سنا تھا، علاج کے لیے آیا تھا۔

اس کی پریشان کن بیماری نے صحت یاب ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں لیا تھا۔ یشار کا معتقد ہوگیا۔ اسرائیلی افسروں میں اُس کی مسیحائی کا اچھا خاصا پرچار ہوا۔

یشار بے باک تھا۔ سچی بات کہنے سے اس کے منہ کو کوئی مصلحت روک نہیں سکتی تھی۔ ایک بار نہیں، کئی

بار وہ اسرائیلیوں اور لیبر پارٹی کے ارکان سے اُلجھا تھا کہ وہ پریشانی بن گئے ہیں۔ کل جو اُن کے ساتھ ہوا تھا، وہ فلسطینیوں کو لوٹا رہے ہیں۔ اس کا انجام جانتے ہو، بہت خوف ناک ہوگا۔ مت بھولو، یہ سب جو بظاہر نظر آتا ہے اور جو تمھارے غلبے اور اقتدار کا شو آف ہے، ایک دن تمھیں پاتال میں پھینک دے گا۔ ابھی بھی وقت ہے۔ کیا یہاں ایسی دو فلسطینی ریاستیں نہیں بن سکتی ہیں جو امن اور آشتی سے رہ سکیں۔

کچھ لوگ اگر اُس کی ایسی باتوں پر خار کھاتے تھے تو وہیں چند ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ مگر یہ ٹھیک سمجھنے والے تو آٹے میں نمک برابر تھے اور جو اُس سے نفرت کرتے تھے، بالآخر وہ اُسے زمین کا رزق بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ تو ذرا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی معقول بہانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر میں کمرے میں تھی۔ یشار چھت پر تھا۔

موسم میں کچھ خنکی تھی۔ پتا نہیں میرا دل کیوں گھبرایا۔ میں نے ٹی وی کھولا، دو تین چینل بدلے۔ فلسطین کی بہت سریلی گلوکارہ خاتم الحجر، محمود درویش کی امر ہوجانے والی نظم گا رہی تھی:

''جیلیں بہت خوب صورت ہیں باہر کی دنیا کے باغوں سے

ہم سے ہمارا وطن ہے اور وطن سے ہم ہیں

ہماری جنم بھومی، ہمارے اجداد کی، ہمارے بچوں کی، ہماری جنت

آؤ کہ ہم اپنے دشمنوں کو کبوتر کی غٹرغوں سنائیں

اگر وہ سننا چاہیں

آؤ کہ انھیں سپاہیوں کے ہیلمٹوں پر پھول اُگانا سکھائیں

اگر وہ سیکھنا چاہیں'

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ روتے روتے جانے کب سوگئی۔ بس شور غوغا سے آنکھ کھل گئی تھی۔ ساتھ کی چھت پر سوتا سارا خاندان ان کی وحشت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ یشار خون میں نہایا ہوا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں کا کہنا تھا کہ چند شر پسندوں نے اُن پر گولیاں چلائی تھیں۔ ان کے تعاقب اور فائرنگ پر جوابی کارروائی میں یہ سب ہوگیا۔ اور جب وہ پائلٹ تعزیت کے لیے آئے، میں نے کہا تھا:

''مجھے بتاؤ میرے بچے بڑے ہوکر تم لوگوں سے انتقام نہیں لیں گے؟ ان کی پور پور میں جس نفرت کے بیج آج تم لوگ بو رہے ہو، یہ کل فصل کی صورت میں پروان چڑھیں گے۔''

یاتم نے شرمندگی سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ میری طرف دیکھا اور بولا:

''شاید آپ نہیں جانتیں، میں اسرائیلی ہوتے ہوئے بھی دوسرے درجے کا شہری ہوں کیوں کہ میرا تعلق Sephardic Jews سے ہے جو اگرچہ عبرانی جانتے ہیں مگر ہسپانوی النسل ہیں جو کیتھولک عیسائیوں کے اسپین پر قبضے کے بعد اُن کے ظلم وستم اور اپنا مذہب نہ تبدیل کرنے کے جرم میں ہجرتوں

کے مسافر بنا دیے گئے۔ جائے پناہ ملی تو کہاں؟ مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں عراق تک اور بلغاریہ سے لے کر جنوب میں سوڈان تک ـــ مسلم دنیا ہمارا ٹھکانا بنی۔''

اُس کے اندر سے دکھ اور یاس میں لپٹی بڑی لمبی آہ نکلی تھی، ''ان کا تکبر، ان کا غرور اور ان کا ظلم انھیں ایک دن لے ڈوبے گا۔''

اُس نے سر جھکا لیا تھا۔

نظارت میں رہنے والی اپنی بہن کی جھولی میں اپنے دونوں بیٹے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا، ''اپنے بیٹوں کے ساتھ انھیں بھی پال لینا۔ میں باہر جاتی ہوں تاکہ ان کے لیے بندوقوں اور پستولوں کا بندوبست کرسکوں۔''

''دیکھو، یاد رکھنا اگر بندوقیں نہ ملیں تو پتھر اور ڈنڈے ضرور پکڑا دینا۔ مزاحمت کی تاریخ تو ضرور مرتب ہوگی۔''

رہا یہ ٹونی کلف، اب ابراہیم ـــ یہ تو یوں ہی پیچھے پڑ گیا تھا۔ محبت کرنے لگ گیا تھا۔ میرے پاس کیا تھا؟ اسلام سے متاثر تھا۔ میرے پیار میں اُلجھا تو سرتاپا اس چلن میں ڈوب گیا۔ شادی کے لیے جب اصرار بڑھا، میں نے شرط رکھ دی کہ اگر تم سے میرے لڑکے ہوئے تو میں انھیں فلسطین بھیج دوں گی۔ اُسے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ دو بیٹے ہیں۔ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔''

وہ رُک گئی تھی۔ چند لمحوں تک خلا میں دیکھتی رہی، پھر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں جذبات کا طوفان اُمڈا ہوا تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر قبل میں صلاح الدین ایوبی کے مزار پر تھی۔''

دنیا کے تہذیبی تصادم کے بھی کتنے جبر ہیں جو تاریخ کے سینے میں درج ہیں۔ ایک اُس اوچھے فرانسیسی جرنیل جنرل گورو کا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر مالِ غنیمت کے طور پر فرانس کو ملنے والے ملک شام کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے دمشق میں داخلے پر سب سے پہلا کام اُس کا یہاں صلاح الدین کے مزار پر آنے، قبر پر کھڑے ہونے اور اپنی آواز کی پوری شدت سے چلا کر کہنے کا تھا۔

''صلاح الدین سنتے ہو ـــ ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔ دیکھو، ہم نے سبز ہلالی پرچم کو سرنگوں کر دیا ہے۔ صلیب ایک بار پھر اپنے عروج پر ہے۔''

آنسو بہاتے ہوئے میں نے پوچھا تھا:

''تم نے یہ سب سنا اور چپ رہے؟ صلاح الدین بہت آرام کرلیا ہے تم نے، اب اُٹھ جاؤ۔ صدی بیت گئی ہے۔ فلسطین کے بیٹے اور بیٹیاں بہت بے آبرو ہوگئی ہیں۔''

☆☆☆

طاہرہ اقبال

روشن دان

صغریٰ حیران رہ گئی۔ اپنوں کے رویے حالات کے چاک پر ایسی گھڑتیں بھی تبدیل کر لیتے ہیں کیا؟ ابھی ابھی جو اُس کے گرد بین ڈالتی اور اُسے پلوتے دیتی ہوئی باہر نکلی تھی، وہ اُس کی اپنی ماں تھی جو اُسے بیٹوں کی طرح باسی روٹی کے ساتھ کھانے کو دہی کا پاؤ بھر دیتی اور چپڑی ہوئی روٹیوں کے چھابے میں سے سب سے نچلی روٹی نکال کر اُس کی چنگیر میں رکھتی۔ کہ بر تولیری کا پچھلا تھن بھرا چھوڑ آتی اور بھابیوں سے آنکھ بچا کر اُسے اشارہ کرتی، "جا دھاریں لے لے۔" اسی لیے تو اس کے گالوں سے مکھن تار چھٹتے۔ آنکھوں سے چکنی چکنی لو پھوٹتی جیسے دیسی گھی کے چراغ جلتے ہوں۔ کلائیوں پر ملائی سی ملی ہوتی جس میں شہد گھلا ہو اور بالوں کی چمک میں دیے جھلملاتے۔ اڑوس پڑوس والیاں ناک کی پھنگ پر شہادت کی پور رکھ کر م خوردہ دانتوں پر چادر کا پلو کھینچتیں۔

"ہائے نی بیٹوں کی طرح پال رہی ہے، جیسے اسی نے ہل پنجالی اٹھانی ہو۔"

آج یہی ماں ابھی ابھی اس پر ایسے جھپٹی تھی جیسے پرانے شمشان گھاٹ پر تاریک راتوں میں گھومتی خوب صورت عورتیں بھولے بھٹکے راہی کو دیکھ کر یک دم چڑیل بن جاتی ہیں۔ صغریٰ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اپنی سیاہ چادر کی بکل میں سمٹ کر کس بل میں اتر جائے۔ کوئی تو گوکھڑا ہو جس میں وہ تیلا کھائے چپنی جیسے وجود کو بند کر دے اور جسے دیوڑ چر جائے۔

گاؤں کی تاریخ میں ایسی دو چار مٹیاریں ہی ہوئی ہوں گی جو سن کے بوٹے کی کیسری چھمکوں کی طرح ساری فصلوں میں الگ لہراتی نظر آتیں اور نرمے کی عنابی گندی جیسے لب جب وا ہوتے تو لوحن بریم اور کبھی پھولوں کی کٹوریوں میں سے مدھو مکھیاں گھونٹ بھرتی، کڑیالے سانپ قدموں کے نشانات پر لہریے بناتے اور سپیرے راہوں میں بین بجاتے پھرتے۔

وہ سیانے جو ہوا کی تاثیر سے موسم کا پتا بتاتے ہیں، ستاروں کے طلوع سے پانی کی باریوں کا تعین کرتے ہیں اور فصل کی اٹھان سے باردانے کا تخمینہ لگاتے ہیں، وہ کانوں کان خبر دیتے پھر رہے تھے کہ

بہت جلد اس ڈھوک کی مٹی انسانی خون سے سیراب ہونے والی ہے۔

صغریٰ کسی وٹ، بنے سے گزرتی تو پیاسی گردمورنی سی پیلیں ڈالتی۔ نرمے کماد کے اونچے لمبے بوٹے جھن جھن جھانجھریں بجاتے۔ مکئی کے بھٹے پردوں میں سے چھپ چھپ جھانکتے اور بال بکھیرے دھمالیں ڈالتے، جیسے اُس کے وجود سے کئی ہنگامے پھوٹ پڑے ہوں۔ صغریٰ اور محتاط ہوگئی۔ یوں چلتی کہ چاپ پیاسی مٹی چوس لے جائے لیکن پیر جتنا ہولا پڑتا مٹی کا سانس اُتنا ہی گھٹتا، نگاہیں جس قدر جھکاتی آنکھیں اُتنی ہی چیرویں ہو جاتی۔ آنچل جتنا کستی خطوط اُتنے ہی تیکھے ہوجاتے۔ اب صغریٰ بے چاری خود کو کہاں چھپالے جائے کہ اُس کے وجود سے کوئی حادثہ نہ پھوٹ سکے۔ لیکن سیانوں کا خیال تھا کہ وہ کئی حادثات اپنے وجود کے اندر اٹھائے پھرتی ہے۔ بس ذرا ٹکرانے کو کوئی آسمان درکار ہے۔ یہ پیشین گوئیاں کرنے والے بزرگ ایسی کالی زبان والے تھے کہ آج ایک قتل صغریٰ کے نام آخر لگ ہی گیا۔ اب اس چیڑ کے منہ والے اکرموکو اس کے وجود میں پلنے والے کسی حادثے نے تو نہیں کہلا بھیجا تھا کہ وہ ریڈیو ہاتھ میں پکڑے ''ذرا رُخ نوں ایدھر موڑ'' گاتا بجاتا ہوا، اُس کے پیچھے پیچھے دو مربعے کے پندھ تک کھرے پہ کھرا دھرتا چلا آئے۔ اُس نے بتیرا اپنی رفتار کبھی بڑھائی کبھی کم کی کہ کم بخت آگے نکل جائے یا پھر پیچھے رہ جائے لیکن وہ جو مہینوں سے اُس کی راہ میں بیٹھا ٹھنڈی آہوں کی بین بجایا کرتا، آج اس جوگن کے پیچھے پیچھے لہریا ناگ سا لہرانے لگا۔ جب صغریٰ غصے سے مڑ کر کھڑی ہوئی تو اُس نے ایسا فحش مذاق کیا کہ صغریٰ کی چیخ نکل گئی۔ اس نسوانی چیخ کے منتظر بہت سے کان اردگرد کی پیلیوں میں بہت دنوں سے پورے قد کے ساتھ کھڑے تھے۔ سب یوں لپکے کہ پل بھر میں قتل کے سارے سامان اکٹھے ہوگئے۔

چار مربعوں کے فاصلے پر کھیتوں کو پانی باندھتے ہوئے صغریٰ کے بھائی حمید تک کانوں کان اڑتی ہوئی جب خبر پہنچی تو یوں پہنچی کہ کتوں کے لڑکے نے صغریٰ کی بانہہ پکڑی اور قریبی کماد میں گھسیٹ کر لے گیا۔ حمید قدِ آدم فصلوں کو جھکڑ سا چیرتا ہوا جھوٹا! سا جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو اکرما بھاگ چکا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی اصغر صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش میں ہونق سا صغریٰ کے سامنے کھڑا تھا۔ حمید کا درانتی والا ہاتھ اک ہیجانی نعرے کے ساتھ فضا میں بلند ہوا اور اصغرے کا سر گردن سے اڑ کر قریبی کھال میں یوں جا گرا جیسے نرمے کی ٹہنی سے گوکھڑا ٹوٹ کر گرتا ہے، جیسے کماد کی پوری ٹوکے سے ٹکراتی ہے۔ کھال کے پانی میں لہو کی دھاریاں چل نکلیں جو بنا سر والے گردن کے نرگٹ میں سے ابلتی تھیں جیسے کوئی موگھا ٹوٹ گیا ہو کہ نہر کا بند کھل گیا ہو۔

اس وقت اصغرے کی لاش نمبردار کے ڈیرے پر رکھی تھی۔ سر گردن سے جوڑ دیا گیا تھا لیکن تڑپتی ہوئی نسیں ابھی تازہ خون کے گرم گرم گھونٹ اگل رہی تھیں اور چارپائی کے نیچے نسواری مٹی کیچڑ بن رہی تھی اور جتوں کی عورتیں میت کے گرداگرد چادریں سروں سے باندھے شہادت کی انگلیاں فضا میں لہراتی ماتم کرتے ہوئے قاتل کو نہیں قتل کی وجہ کو بینوں کے ٹکلوں میں پرو رہی تھیں۔

''ہائے نی یہ گوری چڑیل ہمارے ویرے کا لہو پینے کے لیے کیا جنی تھی۔ ہائے نی تیری نشیلی آنکھوں کے پیالوں میں مرچیں گھوٹ دوں، ہائے نی تیرے لمبے قد کو ٹاہلی سے لٹکا کر پھانسی دوں۔''

قاتل و مقتول کی لواحقین عورتیں کم از کم اس نکتے پر متفق تھیں کہ قتل کی اصل جڑ دراصل صغریٰ ہے۔

مقتول کی بہن بین اٹھاتی، ''ہائے نی تو نے گورے رنگ سے پنڈ کی گلیوں میں فساد مچایا اور میرے ویرے کا قتل کروایا...''

قاتل کی بہن جوابی بین دیتی۔

''ہائے نی! میں نے تیرے گورے بوتھے پر تیزاب کیوں نہ پھینک دیا...''

گاؤں کے دیگر آنگنوں سے اٹھنے والے بینوں کا ہدف بھی موئی صغریٰ کی مٹ میلی حسین جوانی تھی۔

مقتول کی رشتے دار فضا میں دونوں ہاتھ لہراتیں، ''ہائے نی کچیاں پہلے یار بناتی ہیں پھر قتل کرواتی ہیں...''

قاتل کی ماں جوابی بین میں اپنا سینہ دوہتڑوں سے کوٹ ڈالتی۔

''مجھے پتا ہوتا ہائے پتا ہوتا میں پیدا ہوتی کا گلا گھونٹ دیتی، ہائے سپنی کو اپنی چھاتیوں سے دودھ کبھی نہ پلاتی، ہائے دودھ مکھن کھلا کر کبھی نہ پالتی۔'' مقتول کی بہن ماتھا پیٹتی۔

''ہائے پتا ہوتا، ہائے مجھے پتا ہوتا، اس کا حسن میرے ویرے پر موت بن کر گرنا ہے تو میں اس کا منہ لید پھوسی سے لیپ دیتی...''

قاتل کی بیوی اپنی دونوں رانوں پر تاڑ تاڑ چانٹے مارتی۔

''ہائے نی میں تیرا کلیجا چبا جاؤں، تیرے زہری ہونٹوں میں نمک کھور ڈالوں ہائے نی میں تیرے...''

صغریٰ اگلی کوٹھری میں سیاہ چادر میں خود کو یوں لپیٹے ہوئے تھی جیسے اپنے حسن و جوانی کی لعنت کو پنڈ میں باندھ کر دور کسی ویرانے میں پھینکنے کو پوٹلی بنا رکھا ہو۔ بس میں نہیں ورنہ اپنی پور پور کاٹ چھانٹ کر کسی گھڑے میں ڈال راوی میں بہا آتی۔ وہ خود بھی اپنے حسن و جوانی کی اتنی ہی دشمن تھی جتنی کہ باہر گاؤں بھر میں اُسے کوستی ہوئی عورتیں جو مقتول کے گھر اس کا سیاپا کرنے کے بعد اسے یوں دیکھنے چلی آتیں، گویا اب تک اُس کی جون بدل گئی ہوگی۔ کوٹھا بھڑ ولوں، مکئی جوار کی بوریوں کی اُمس سے بھرا تھا۔ کوٹھے کی ایک نکڑ میں چٹی کے پڑوں میں مرچوں کے بیج دھنسے تھے جن کی کڑواہٹ ناک گلے کو چڑھ رہی تھی۔

صغریٰ اس کوٹھری کے پنجرے میں لہولہو بہتی تھی، جب بغلی روشن دان پر انگلی کی دستک ہوئی اور طاق کھل گئی۔ اندھیری کوٹھری میں سورج کی کرنوں کا جالا سا ابھرا اور ترچھا ہو کر چٹی کے پڑوں سے جڑ گیا جس کے پتھریلے دندانوں میں مرچوں کا سفوف جما تھا—— وہ میر حسن تھا۔

''اُٹھ صغریٰ نکل چل، ٹیکسی پچھوارے کھڑی ہے۔''

صغریٰ اٹھی، اُسے اس موئے حسن و جوانی کی پنڈ کو کہیں تو پھینکنا تھا کیوں نہ میر حسن کے

کندھوں پر لا دوے کہ لے جا جس کوڑے دان میں چاہے جا پھینک دے۔ لیکن کوٹھڑی جیسی تاریک اور راز داں تھی، سورج اتنا ہی روشن اور ننگا ننگا تھا۔ روشن دان میں رکھا ہوا پیر کھسک گیا۔ اپنے وجود کے اس فتنے کو ٹھکانے لگانے کا حق بھی اسے حاصل نہیں تھا۔ سزا کے انتخاب میں مجرم کی پسندیدگی کا کوئی اختیار نہیں ہوا کرتا۔

''اٹھ صغریٰ، میں تجھے بتا رہا ہوں تو ماری جائے گی، تیرے گھر والے خود تیری موت کا سودا کریں گے۔''

موت کا خوف صغریٰ کی ہڈیوں میں سینگ سا بن کر اٹھا، کھسکا ہوا پیر پھر طاق میں پڑا سورج کے پھلکے آنکھوں کو چندھیا گئے۔ سورج زمین نہیں ہے کہ اپنے سینے میں راز کو چھپا رکھے۔

''چل ہمت کر، دیر نہ کر، آج اپنا پرایا سب تیرے ویری ہیں، اٹھ صغریٰ اٹھ...'' آج ساری دنیا اس کے سراپے کی ویری تھی۔ اب اس نے تو رب سے نہیں کہا تھا کہ اس کا قد پھلا ہی کی پھنگوں سے ملا دے اور گالوں میں زرد دانے بھر دے کہ آج اس ناکردہ جرم میں وہ اپنے وجود کی پنڈ کو بابل کے ویڑھے سے چوری کے سایے میں خود رخصت کرے، پیر پھر طاق سے نیچے کھسکا۔

''مائے نی میں کہنوں آکھاں، درد وچھوڑے دا حال نی''

''ماواں دھیاں انج ملیاں چارے کندھاں نے چوبارے دیاں ہلیاں۔'' ہائے کیا وہ اس سیاہ چادر میں گناہوں کی پوٹ لپیٹ رخصت ہو جائے گی اور وہ لال جوڑے کا چاؤ... بابل کے ویڑھے کے وچھوڑے کے گیت اُس کے کلیجے میں سولیں چبھو گئے۔ پیر اتنے وزنی ہو گئے کہ روشن دان کا سوراخ چھوٹا پڑ گیا۔

''صغریٰ دیر نہ کر، ٹائم تھوڑا ہے۔''

میر حسن اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہا، لیکن سورج کی چندھیا دینے والی روشنی اُسے پسپا کر گئی۔ یہ سورج اتنا ننگا اتنا اتھلا کیوں ہے۔ پل بھر میں ہر کسی کی مٹھی میں اتر آتا ہے۔ باہر ہو ہو کار مچی۔ پولیس ملزموں کو ہتھکڑیاں لگا کر لے جا رہی تھی۔ مقتول کی رشتے دار عورتوں کی نسبت کہیں شدت کے ساتھ خود صغریٰ کے خاندان کی عورتیں دو ہتڑوں سے سینہ اور رانیں کوٹتی، اُس کی چارپائی کے گرداگرد ماتم کرتی تھیں۔ کھلی طاقی بند ہو گئی تھی اور میر حسن باہر ہی کہیں ننگے سورج میں لپٹ گیا تھا۔ تبھی گاؤں کی خونی فضاؤں میں سے صغریٰ اور میر حسن کے عشق کا قصہ یوں اٹھا، جیسے شام پڑے تنوروں کے سینے سے دھواں اٹھتا ہے جیسے چرواہوں کی واپسی پر کچی سڑکوں پر دھول اٹھ کر دھمال ڈالتی ہے۔ حالاں کہ صغریٰ کا میر حسن سے اتنا سا ہی تعلق تھا کہ اُسے دیکھ کر جب پورے گاؤں کے مرد ڈیلے نکال کر ہونٹوں کے اوپر دھر لیتے تو صغریٰ کا جی چاہتا کہ ان میں تکلے پرو کر اوپر سوت کی اٹیاں لپیٹ دے۔ ایک میر حسن ہی تھا کہ جس کی آنکھوں میں سے چھنتا سنہری تار سا صغریٰ کے دل کی چرخی سے جڑ جاتا۔ اُس کا جی کرتا کہ وہ پونی پونی لمبے لمبے دھاگے کاتتی چلی جائے۔ پیروں تلے زمین بھر بھر ہو جاتی۔ وہ قدم اٹھانا چاہتی تو اُسے زور لگانا پڑتا، جیسے اُس کی چال اپنے ہی ارادے سے بغاوت کر گئی ہو۔

صغریٰ نے اناج کی اُمس بھری اندھی کوٹھڑی یوں خود پر لپیٹ لی جیسے وہ میر حسن کے بچے کی ماں بننے والی ہو، اور ناجائز پیٹ چھپائے نہ چھپتا ہو۔ وہ قطعتوں مہینوں کے تکلوں اور سولوں میں پروئی گاؤں بھر کی سرگرمی کی مرکز تھی، جیسے گاؤں کی خشک اجاڑ زندگی میں اصغرے کے خون نے گرم گرم آبیاری کر دی ہو، جس میں میر حسن اور صغریٰ کے عشق کی فصل لہلہاتی ہو۔ جکلوں نے کتھا کہی، چوپالوں میں مقال آئی، چرواہوں نے گیت الاپے، عورتوں نے قصے گھڑے۔

اگلی تفتیش کے لیے جب پولیس گاؤں پہنچی تو اے ایس پی خود ہم راہ تھا جس نے آتے ہی مدعا پیش کرنے کا حکم دیا۔ یعنی وہ عورت جو قتل کا باعث بنی، تفتیش کا آغاز اُسی سے ہونا تھا۔

اُن دنوں ماگھ کا پالا ہر شے کو سکیڑ رہا تھا۔ درختوں کے پتے زرد تھے۔ کیکروں کے تنوں کے سیاہ چھال اکھڑ رہے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے دن اوکاں کے کھکھلوں میں گو ہ لومڑ سروں سے چڑے پڑے تھے اور گندم کے انگوری پودے کہرے کی برف میں کملا گئے تھے۔ صغریٰ ساری رضائیوں میں لپٹی جب نمبر دار کے ڈیرے پر پہنچی تو عورتوں نے ماتھے پیٹے اور بکلوں میں منہ چھپا کر چیخیں کھینچیں۔

''ہائے ایسی کلکیں مائیں جنتے ہی گل گھونٹو کیوں نہیں دے دیتیں۔ ہائے بستیوں میں فساد مچانے اور بیٹے قتل کروانے کو کیوں پال لیتی ہیں۔''

مردوں نے پگڑیوں کے لڑ سے آنکھیں ڈھانپ لیں جیسے اس گناہ کی پوٹ پر نظر پڑ گئی تو نگاہیں گنہ گار ہو جائیں گی۔ چرواہوں نے گیت الاپے:

صغراں چڑھی کچہری مرداں نے منہ ڈھک لے
صغراں دتیاں گواہیاں تے وکیلاں دے منہ پھر گئے

جب پولیس افسر نے صغریٰ سے ننگے ننگے سوال پوچھنے شروع کیے تو صغریٰ کے باپ اور دیگر رشتے دار مردوں کی کھردری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں جیسے صغریٰ کا بھاڑا سا قد کپڑوں سے باہر نکل آیا ہو اور گاؤں کے زرد اتے پولیس والوں کی ہتھیلیوں پر جھڑ گئے ہوں۔ ہر ایک نے یوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں جیسے اُس کے زہری حسن کو مسل مسل میل بنا کر پھینک رہے ہوں۔

نمبر دار صغریٰ کے باپ کو ایک طرف لے گیا اور کان میں کہا، ''جب تک لڑکی یہ بیان نہیں دیتی کہ اصغرے نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا، کیس ہمارے حق میں نہ جائے گا۔''

یہ دس ایکڑ کا جٹ زمیں دار پہلے تھرایا، زہری ناگ سا پھنکارا جس کے زہر والی تھیلی پیر کے ہاتھ میں تھی۔ کنڈل کھا کر نرخرے سے جو آواز نکلی وہ شوکار جیسی لرزہ خیز تھی۔

''لیکن چودھری جی! ایسا نہیں ہوا، اور پھر پولیس ڈاکٹری رپورٹ بھی تو مانگے گی جب کہ لڑکی اللہ کے فضل سے کنج کنواری ہے۔''

''رپورٹ کی تم فکر نہ کرو MS سے اپنی دوستی پرانی ہے بس تم بیان دلاؤ۔''

تالیوں کی خشک پھلیاں کھن کھن شاخوں سے اڑ کر کسانوں کی سفید پگڑیوں میں کھلکھلانے لگیں۔ چراہوں کی سانگلوں نے سارے درخت بچھ دیے تھے۔ گندم کے پودوں کی نوکیلی زبانیں تیز ہواؤں میں لہرانے لگیں۔

صغریٰ کے دادا نے صغریٰ کے باپ کے چہرے سے جھڑتے تیلے کو اپنی بوڑھی آنکھوں میں بھگویا اور سفید پگڑی کے لڑ میں کھانسا۔

''چودھری جی! یہ بے عزتی ہم سے برداشت نہ ہوگی، چاہے لڑکا پھاہے لگ جائے... ہاں تم ان سے صلح کی بات کرو۔ دس ایکڑ میں سے دو ایکڑ ہم عزت کی میل سمجھ کر انھیں دے دیں گے۔ بک کر بھی تو مقدمے پر لگ ہی جانے ہیں نا...''

پھاگن چیت کے جھولے پورے گاؤں کا چہرہ گرد کی تہوں سے ڈھک گئے تھے۔ مرد پنچایت میں بیٹھے تھے۔ بل خاموش تھے اور ٹیوب دو جی کے کانوں سے چپکی تھیں۔ چودھری نے تھانے دار کے حضور انتہائی ادب سے درخواست گزاری۔

''جناب والا! فریقین صلح کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس لیے لڑکی کو گھر جانے کی اجازت دی جائے۔''

سپاہیوں کی فورس سمیت اے ایس آئی نے صغریٰ پر یک بارگی تفتیشی نگاہیں ڈالیں جو ملی دلی چادر کی بکل میں سے سورج سی پھوٹی پڑتی تھی اور پھولوں بھری بیل کی طرح کسی سہارے سے لپٹنے کو ڈھیے چلی جا رہی تھی۔ اے ایس پی کا جی چاہا، اسے ابھی نقص امن کی شق کے تحت تھانا صدر کی حوالات میں بند کرنے کے آرڈر جاری کردے کیوں کہ مقامی حوالات اس کی شاخوں اور پھولوں کے پھیلاؤ کے سامنے کم پڑ جائے گی۔

بھوکے مویشی منہ اٹھا کر ڈکرانے لگے تھے جنھیں آج چارہ ڈالنے کی بھی کسی کو فرصت نہ ملی تھی۔

بچے ماؤں کی خشک چھاتیاں چوستے جنھیں صبح سے اب تک تنور تپا کر روٹیاں لگانے کی ہوش بھی نہ پھری تھی۔

مرغیاں گند پھرولتی تھیں، انھیں کسی نے بھورے نہ ڈالے تھے۔ پورا گاؤں کسی ان دیکھے طوفان کے انتظار میں دم سادھے تھا۔

مقتول کا باپ بان کی چارپائی سے اٹھا تو تماشائیوں کی فصیل چار قدم مزید آگے بڑھ آئی۔

''تھانے دار صاحب! یہ اپنی پوری زمین بھی ہمارے نام کردیں تو بھی میں اپنے بچے کے سر کی قیمت وصول نہ کروں گا...''

اکرما یک بارگی تاچیں جھاڑتا اٹھا اور لگا میں تڑا منہ زور گھوڑا سا بھیڑ میں گھسا۔

''جاؤ جاؤ، اپنے اپنے گھروں کو جاؤ، یہاں کیا مداری لگا ہے...''

وہ دھکے مار مار لوگوں کو بھگانے اور اُن کے پیچھے دوڑنے بھاگنے لگا۔

''تھانے دار جی! ہم صلح کے لیے تیار ہیں لیکن ہماری شرطیں کچھ اور ہیں۔''

پیچھے ہٹنے والے پھر دیوار بنا کر جم گئے۔

صغریٰ نے اکرمے کے عزائم کو چادر کی اوٹ میں سے بھانپا۔

"یہ آج میرا ہمدرد کیسے بن گیا..."

کتے روڑیوں پر گند سونگھتے تھے۔ گدھ رات کے مرے ہوئے ڈھور پر نیچی اڑانیں بھرتے تھے جن کے وحشی پروں سے سورج بھرا آسمان سیاہ پڑ گیا تھا۔

چودھری نے صغریٰ کو گھر لے جانے کا اشارہ دیا۔ اُس کے خاندان کی عورتیں صغریٰ کی پنڈ کو میلی چادر میں پوٹلی سی لپیٹ واپس سمیت لائیں اور کسی اطلاع کے انتظار میں بیٹھ ڈھک ڈھک بجنے لگیں۔ صغریٰ اناج کی اُمس بھری کوٹھڑی میں پھر اکیلی تھی۔ باہر صحن میں عورتوں کی ٹولیاں بکلوں میں سرگوشیاں لپیٹے اک دوجی میں گھس رہی تھیں۔ صغریٰ کی بھابی کوٹھڑی میں آئی تو اُسے حیرت ہوئی کہ نہ اُس نے صغریٰ کو بینوں میں بلویا نہ ہی اُس کے گرد ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر دوہتڑوں سے سینہ کوٹا۔ گڑ کی بھیلیاں پلو میں بھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اُس کی رفتار میں کامیابی کا جوش بھرا تھا۔ اب اُس کی چھوٹی بہن چودہ پندرہ برس کی زرینہ کوٹھڑی میں آئی اور ڈھیر سے چائے کے کپ پرچھتی سے اتار کر لے گئی۔ یعنی گھر آنے والی عورتوں کو چائے پلائی جا رہی تھی لیکن صغریٰ کو اس ضیافت میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا گیا تھا اور نہ ہی وہ زرینہ سے کچھ پوچھ سکی تھی کیوں کہ اصغرے کے قتل کے بعد سے آج تک اُس کے گھر کی عورتوں نے اُس سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ وہیں کوٹھڑی میں صبح و شام اُس کے سامنے روٹی کا چھابا پھینک جاتیں، جیسے اُس کی زنجیر کھل گئی تو وہ اُنھیں کاٹ کھائے گی۔ باہر عورتوں کی سرگوشیوں میں لڑکیوں کی ہنسی کی کھنک تھی، جیسے کوری جھنجھریاں بھرتی ہوں کہ رنگ بدلتے سنوں کے آبو بھنتے ہوں۔ صغریٰ محسوس کر رہی تھی کہ گھر کی فضا میں اک خوش گوار تبدیلی آ رہی ہے۔ اُس کا جی چاہا اس تبدیلی میں اُسے بھی قبول کر لیا جائے۔ وہ بھی دنوں کی تنہائی، دھتکار، نفرت اور لعنت ملامت اور جرم کے احساس کو سب میں گھل مل کر اتار پھینکے، منوں منہ بوجھ تلے سے نکل کر باہر ہلکی سی ہو جائے۔ وہ بھی کورے گھڑے کا پانی پیے اور آدھ بھنے آبو کھائے۔ تبھی کوٹھڑی کی پچھلی طاقی پر بجنے والی انگلی کی دستک میں اک عجب بیگانیت تھی۔

"اٹھو صغریٰ اٹھو۔ آج مرنہ کرو ورنہ یک لخت جائیں گے۔"

میر حسن ایک بدرنگ سی چادر اٹھائے صغریٰ کی پوٹ کو سمیٹنے آیا تھا۔ صغریٰ کے وجود کا کھلیان جھکڑوں کی زد میں بکھرنے لگا۔ وہ حوصلے کی گرہ لگا اُسے باندھتی روشن دان سے ساز سماز کرتا لوگیت کا چابک سا برستا، "لوگ کیا کہیں گے۔"

"تھی ہی بدکار، اسی لیے تو قتل کروایا اور خود منہ کالا کر گئی۔"

میر حسن اُسے اکساتا رہا۔ کوٹھڑی سے باہر نکلنے کے واحد راستے روشن دان پر اُس نے بار بار پیر رکھا، ہر بار سورج کا لال بھبھوکا چہرہ واپس پلٹا دیتا۔ میر حسن کا ہاتھ اسے باہر کھینچنے کو روشن دان سے لٹکا رہ گیا۔ اُس سے پھر دیر ہو گئی۔ عورتیں لال گوٹے والا دوپٹہ اٹھائے بین کی لے میں سہاگ کے گیت گاتی ہوئی

کوٹھڑی میں بھر آئیں۔

ہو سانولی تیرے مغز پراندا
بھلا ہو سانولی رب رانجھے نوں آندا
ہو سانولی تیرے بوہے تے جنڈ اے
بھلا ہو سانولی رانجھا مست ملنگ اے

لال عروسی دوپٹے میں لپٹی صغریٰ کی پوٹ جب پنچایت کے رُوبرو پیش ہوئی تو نکاح خواں کئی آیتیں پڑھ چکا تھا اور گاؤں بھر کے مرد دعائے خیر کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ دھول بھری گلیوں کو رولیٹ کتوں نے پنجوں سے کرید ڈالا تھا جو کت پر آئی کتیا کے پیچھے لگے تھے۔ کتیا کھالے، بنے، دیواریں، کوٹھے ناپتی اپنے وجود میں اُگ آئی ثموکی آگ سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مولوی نے آیات قرآنی مکمل کرنے کے بعد چودھری سے سوال کیا۔

''چودھری جی! صغریٰ دختر اللہ داد جٹ کس کے عقد میں جائے گی؟'' اس سوال کا جواب صرف پنچایت کے مدعیان کے پاس تھا۔ تاوان میں بھری گئی عورت کے لواحقین کا اب اُس کے مستقبل سے کوئی سروکار نہ تھا۔

پتھر ڈھیلے مارتے والے بچوں سے بچنے کے لیے کتیا تنور کے گھورے میں کود گئی تھی۔ بدن راکھ میں دھنسائے اپنے ہی وجود میں سے نکلتی آتش میں بھسم ہوتی تھی اور زہریلے مواد کو ہانپتی ہوئی اپنی ہی زبان سے چاٹتی تھی۔

مقتول کے باپ سے بڑھ کر نکاح خواں کی داڑھی ہوئی۔ ایک بالشت اور ایک مٹھی داڑھی میں سفید اور سیاہ بالوں کے لیریے بنے تھے۔ سیاہ اور سفید دھاریوں والا صافہ پٹوں کو سمیٹے تھا۔ گے مدینے والے سرمے کی دھاریوں نے لال ڈوروں والی آنکھوں کا جلالی رنگ تیز کر دیا تھا اور صفاچٹ مونچھوں والے لبوں سے آیات قرآنی کا ورد جاری تھا۔

''مولبی جی! آپ کو تو پتا ہے میں پچھلے آٹھ مہینے سے رنڈوا مجرد ہوں اور دوسرے نکاح کی خواہش رکھتا ہوں اور نکاح سنت نبوی ﷺ ہے۔''

تنور کے گھورے میں پناہ لینے والی کتیا کے پیچھے کئی کتوں نے چھلانگیں لگا دی تھیں اور اب باہر نہ نکل پا رہے تھے۔ بچوں نے ڈھیلوں پتھروں سے تنور بھر دیا تھا۔ تنور کی مالکن نے گالیاں بکتے جھکتے ہوئے کڈنیاں مار مار انھیں باہر نکالا۔ تنور پلید ہو گیا تھا۔ لوس کی مٹھ بھر تنور کی اندرونی سطح پر مارنے لگی اور کلمہ پڑھ پڑھ پھونکنے لگی۔

ابھی ابھی اکرما گھر سے تلے والا کھسا اور کلف لگا کرتا پہن کر پنچایت میں پہنچا تھا اور پھنکارتا ہوا غیر متعلقہ افراد پر شوکرانے لگا، وہ دس پندرہ قدم چاروں اطراف تماشائیوں کے پیچھے بھاگا اور انھیں دور

دھکیل آیا۔ کُت والی کتیا کے پیچھے لگے کتوں کے جھرمٹ بھاگتے ہانپتے پنچایت میں گھسے چارپائیوں کے نیچے گھریں گھسیڑ گھسیڑ پنجوں سے مٹی اڑانے لگے۔

''دُر دُر دفع۔''

لوگوں نے ڈھیلے روڑے اٹھا اٹھا کر پٹخے۔ بچوں نے قہقہے لگائے۔ سب سے برق رفتار کتے نے اپنے ہی بدن کی مجبوری سے بے بس کتیا کو جکڑ لیا، وہ اُسے گھسیٹ رہا تھا اور گاؤں بھر کے بچے انھیں ٹھڈے، لاتیں، ٹھُڈے مارتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے لیکن تمام تر دھتکار اور مارکوٹ کے باوجود ایک دوجے سے الگ ہونا اب اُن دونوں کے بس میں نہ رہا تھا۔

اکرما ہنکارنے اور تھوکنے لگا، آواز نرگٹ سے ٹکراتی مونچھوں سے الجھی۔

''مولی جی! آپ خود سمجھ دار ہو جوڑ میرا ہے۔ نکاح میرا ہوگا۔ ایک پچاس سال کے بوڑھے کا اک اٹھارہ سال کی صحت مند لڑکی سے نکاح دونوں کے ساتھ زیادتی ہے.. شرع اس کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ خود دینِ اسلام کی باتیں جانتے ہو مولی جی..''

نکاح خواں نے ٹخنوں تک چڑھے پائینچے مزید اوپر کھینچے جو کتوں کی اڑائی دھول سے ناپاک ہو رہے تھے۔

اکرے نے اپنی ہم دردانہ منطق کی پنچایت کے اراکین سے داد چاہی، جو معاملے کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گئے تھے اور کسی بھی صورت اپنی کئی روز کی محنت کو ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ مسئلہ تو جھگڑے کا پُرامن تصفیہ تھا۔ تاوان میں بھری گئی بانہہ کے حقوق کا مسئلہ نہ تھا۔

چودھری نے باپ بیٹے دونوں کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا بجھایا لیکن باپ بیٹے کے درمیان تیکھی نگاہوں، چڑھی تیوریوں، گھرکیو اور گرم جملوں میں ملکیت کا جھگڑا برپا ہو گیا۔

جھکڑ دھول سے ترنگل بھر بھر سفید صافوں اور اکڑی ہوئی مونچھوں پر بچھانے لگے، کتے روڑیوں پر لوٹتے رہے اور جو کے مویشی اپنے ہی فضلے کو سونگھنے اور چاٹنے لگے اور کاگے کھیہ پھرولتے رہے۔

چودھری کی چارپائی کی بغل میں بچی زمین پر بیٹھی صغریٰ کو دھرتی کے اندر موج زن سارے پانیوں، ساری یخ بستگیوں، تاریکیوں نے کسی گہرے کھوہ میں منجمد کر دیا تھا۔ جوڑ جوڑ کو کافور چڑھ رہا تھا۔ برف کی سلیں پگھل رہی تھیں جو اب پور پور لہو میں جم گئی تھیں۔

چودھری نے پنچایت کی ناکامی کے تصور سے گلا کھنکار کر گھرکا۔

''جس طرح مردے کو مٹی کے حوالے کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح جھگڑے والی عورت کے نکاح میں بھی دیر نہیں ہونی چاہیے..''

تبھی اکرے کے باپ نے پگڑی اتار کر جھاڑی۔ کئی زرد ہرے پتے اُڑے اور مویشیوں کی کھرلیوں میں ٹِک گئے۔ رات کے مردہ ڈھور سے گدھ حرام چونچیں بھر دیوانہ وار گاؤں کی فضاؤں میں

منڈلانے لگے۔ سورج دھندلا گیا۔

''سرکار، اصغرے کا خون اتنا سستا نہیں ہے کہ ہم اسے اتنا سولا معاف کردیں، ہمیں ایک نہیں دو بانہیں چاہئیں۔'' جھگڑوں کے چابک سائیں سائیں گلیوں میں برسے اور روڑ کیلئے مویشیوں کے بالوں میں الجھ گئے، جن کی خشک جلد کو کوے ٹھونگتے تھے۔ تماشائیوں کا دائرہ ایک دو قدم اور آگے کھسک آیا، نوعمر لڑکے بھیڑ کا دھکا کھا کر منہ کے بل گرے۔ اکرمے نے اٹھ کر اُن پر ٹھڈوں کی بارش کردی۔

صغریٰ کے خاندان کے مردوں میں اس ناانصافی پر شور مچا اور پنچائیت چھوڑ کر اٹھنے لگے۔ ثالث اس نئے تقاضے پر ہڑبڑا گئے۔ تماش بین مزید قتل و غارت کے تصور سے پُر جوش ہو ڈھوکوں بھنیوں پر خبر سنانے کو چلے۔ صغریٰ کی نسوں رگوں میں برف کا کانچ تیز دھار ہوگیا۔ سر پر دھری گنہ گار وجود کی پنڈ اتنی وزنی ہوگئی کہ زمین دھنستی چلی گئی۔

صغریٰ کی ماں نے بین الاپا۔

''مائیں بیٹیاں بیٹوں پر وارنے کے لیے جنتی ہیں، جہاں ایک گئی وہاں دوسری بھی واری... ہائے میرا حمید... ہائے حمید جھپٹ کر نہ آئے تو میں مرتی ہوں...''

صغریٰ کی بھابی نے بین کا سرا جوڑا۔

''شام پڑنے سے پہلے حمید جھپٹ کر گھر نہ پہنچے تو میں تیل چھڑک جل مروں... ہائے اس موئی کے کرتوں کی میں کیوں بھگتوں...''

مجمع چھٹتے چھٹتے پھر اکٹھا ہوگیا۔ مردوں کے بیچ جھگڑا ابھی جاری تھا کہ صغریٰ کی ماں اپنی چھوٹی بیٹی زرینہ کو لال دوپٹہ اوڑھا پنچائیت میں لے آئی۔ پنچائیت پھر سج گئی، فیصلے کی سانگل مردوں کے ہاتھ سے نکل کر عورتوں کی بکل میں چلی گئی تھی۔

گاؤں کے بزرگ اپنی کامیابی پر خوش تھے کہ گاؤں کی پیاسی مٹی خون کی سیرابی سے بچ گئی اور صغریٰ کا فتنہ بھی ٹھکانے لگا۔ زرینہ کے ساتھ تھوڑی زیادتی ضرور ہوئی لیکن خون کا جھگڑا مٹانے کو اگر اُس کی کم عمری کام آگئی تو کیا برا۔

گاؤں بھر کی عورتوں نے سکون کا ہوکارا بھرا۔ اب اُن کے مرد محفوظ ہوں گے اور اپنی توانائیاں گلیوں کی نکڑوں میں انتظار کی آنکھیں، بن کر ضائع کرنے کی بجائے کھیتوں میں پسینا بنا کر بہائیں گے۔

بچوں نے پتھر ڈھیلے مار مار کر کتیا کو کتے کی گرفت سے چھڑا دیا تھا۔ اب وہ اپنے زخمی وجود کو بھٹی کے گھورے میں سینک رہی تھی اور ناکام کتے ایک دوسرے پر بھونک بھونک تھک گئے تھے، اڑوڑی میں تھوتھنیاں دھنسائے اونگھ رہے تھے۔ گیہوں کا ناڑ خشک ہوگیا تھا اور اس میں درانتی پڑنے والی تھی۔

وہی رات صغریٰ پر ایسے پڑی جیسے اصغرے کی گردن کٹنے کے بعد تادیر اُس کے بدن کی پور پور تڑپتی پھڑکتی رہی تھی۔ ہر عضو باری باری مرا تھا۔ پہلے پیر زرد ہوئے، پھر ٹانگیں بے جان ہوئیں، پھر دھڑ کی

جان نکلی۔ آخر کٹے ہوئے نرخرے سے لہو کے فوارے کے ساتھ آخری تڑپ پھڑک گھنگھک کی آواز کے ساتھ بے حس ہو گئی تھی، وہ بھی رات بھر آدھ کٹی گردن کے ساتھ اگرے کے تیز بھالوں کی زد میں رہی۔ وہ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ اپنی بے عزتی اور نفرت کا انتقام اُس کے بدن کی نوچ کھسوٹ سے چکا رہا تھا۔ ہر ہر عضو پر پل پل حملہ آور ہوتا تھا۔

''یہ آنکھیں یہی شربت کے پیالے آنکھیں مجھے پیاسا رکھتے اور میر حسن پر چھلک چھلک پڑتے، آج یہ میرے اختیار میں ہیں۔ چاہے ان میں ہونٹوں کے تکلے پرو دوں کہ ہاتھ ڈال ڈیلے باہر کھینچ نکالوں۔''

''یہ ہونٹ جو مجھ پر تھوکتے اور میر حسن پر کلیاں بن بن کر کھلتے، آج چاہوں تو انہیں کھسوٹ کر مسل پھینکوں۔ یہ ناگن مُٹ جو مجھے زہر بن بن ڈستی اور میر حسن کی بین پر مست ہو لہراتی۔ چاہوں تو حلق سے پکڑ کر چک پھیریاں دوں اور زہر کی تھیلیاں کاٹ پھینکوں۔''

اصغرے کی بہنیں بھابیاں انتقام کی اس آسودگی کی منتظر تھیں۔ جب صغریٰ کے حسن کے منبری ناک کی پھنگلی اُدھڑ جائے گی، جب آنکھوں کے روغنی پیالے نیر بہا بہا کر بے نور گڑھے ہو جائیں گے، جب بدن کے شاداب نشیب و فراز تپ دق کی سولی پر چڑھ کر مسمار ہو جائیں گے تو پھر اصغرے کا خون بہا وصول ہو جائے گا۔

گیہوں کے کھیتوں میں بھریاں جم رہی تھیں۔ چھولیا رنگ بدل رہا تھا۔ عورتیں تنوروں کو نئے منہ لگاتی تھیں اور کورے تنوروں میں لوسن کی ساول مل مل کر اُن کی سطح ہموار اور گی بنا رہی تھیں۔ راجباہ کے پانیوں کے سینے سے گرم آہوں جیسی بھاپ اٹھنے لگی تھی اور واڑی بیٹھے کسان رانتیوں کی دھاریں تیز کروا رہے تھے۔ انھی بدلتے موسموں کی حدت میں صغریٰ شب بھر اگرے کی تلیوں سے زخمی ہوتی تو دن بھر زرینہ کی نوچ کھسوٹ میں رہتی۔ یہ پندرہ برس کی لڑکی لپک جھپک اُس کی ساس کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ وہ بوڑھے شوہر کی تو خدمت گزار ہوی بن گئی لیکن اس زیادتی کا بدلہ صغریٰ سے چکانے لگی۔ اُسے چولھے چوکے دودھ سالن کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ گز کی بھیلی نکالتی تو دونوں بازو لہراتی زبان کا لٹھ ساڑ ساڑ برساتی۔

''اری پلید گندی، ہر ویلے ایک ہی کام اور نہانا کہیں مہینے بعد۔ کم ذات، خبر جو کسی کھانے کی شے کو پلید کیا.....''

اُس کے حلق میں سے نکلتی دھاڑ میں جیسے اُس کی کم سنی کے ارمانوں کا چھید چھید لہو ٹپکتا ہو، جیسے زرینہ کے نہانے کی باریاں بھی صغریٰ نے اُچک لی ہوں۔

دھاڑے میں لپٹا سسرا نو عمر بیوی سے تنی توانائی کشید کرتا اور وجود کی بوسیدگی میں کھانستا۔

''زرینہ میری جان! کیوں سر کھپاتی ہے اس گندی سے.... تو گری دے کر بھیج اسے باڑے میں، گوبا پھوس ہو نجے اسی قابل ہے۔ روٹی آٹے کو ہاتھ نہ لگانے دینا پلید کو۔''

جیسے اُس کے بھر بھرے بدن میں صغریٰ نے ہی خمیر ملا دیا ہو اور اب وہ نو عمر بیوی کے امتحان

میں ناکامی کی ذمے داری صغریٰ کی نفرت میں کھوج رہا ہو۔

پرلے اوٹے سے بڑی نند ہراہرا پھنکارتی۔

''اوٹے میں پیر نہ رکھنے دیا کرنا پاک کو، گھر سے رزق کی برکت اٹھ جائے گی۔''

زرینہ اپنے جنتے کھیلنے کے دن ایک چھلانگ میں ناپتی، اٹھارہ ایکڑ کی زمین دارنی بن گئی تھی اور گاؤں کی عورتیں اُسے چھوٹی چودھرانی کہنے لگی تھیں۔

اناج، چھنی، دودھ، گھی کی مالک شوہر کی لاڈلی۔ اپنی سوتیلی بیٹیوں کی چھوٹی بہن اکرے کا چھوٹا بھائی زرینہ سے سال دو سال بڑا ہونے کے باوجود اُسے ماں جی کہنے لگا تھا اور صغریٰ کو صغریٰ کہہ کر بلاتا تھا۔ خود اُس کے وجود میں سوئی عمر کو پختگی اور سنجیدگی نے ایڑ لگا دی تھی۔ وہ چادر کی بکل مارے ریڑ کے کی دستیاں ہلاتی وڈ وڈیری پچاس سالہ شوہر سے بس ایک قدم ہی پیچھے رہ گئی تھی۔ اپنے ماں بننے کی خبر گاؤں بھر میں یوں نشر کی جیسے پچاس سالہ لاولد شوہر کو منتوں مرادوں کے بعد صاحب اولاد ہونے کی خوش خبری دی ہو۔ یہ اٹھارہ ایکڑ کا پچاس سالہ زمین دار اپنی پندرہ سولہ برس کی دُلھن کے سامنے یوں دھنسا پھنسا رہتا، جیسے بیٹے کے خون کے عوض اُسے نہ خریدا ہو بلکہ خود فروخت ہو گیا ہو۔ وہ جتنی بھرپور ہوتی چلی جا رہی تھی، وہ اتنا ہی کم زور اور بوڑھا، جیسے وہ اسی کے خون سے پھل پھول رہی ہو۔ شہر کے بڑے اسپتال میں اٹھارہ ایکڑ کا وارث پیدا کیا تو چالیس ہزار کا خرچہ ہوا اور دس ہزار کی پورے شریکے برادری کی دعوت کی گئی۔ لڑکے کی شباہت بالکل باپ پر گئی تھی۔ زرینہ اُسے صغریٰ سے چھپا چھپا کر رکھتی جیسے اُس کی نظر پڑ گئی تو اٹھارہ ایکڑ کی زمین داری لاوارث رہ جائے گی۔ بچے کو گود میں چھپائے حکموں، گھرکیوں اور طعنوں کے لٹھ سے اُسے رگیدتی رہتی۔

''کم ذات پتیلے کے تلے پر کالک چھوڑ دی، تیرے اپنے منہ پر جو ملی ہے یہ کالک... سارا گھٹا اڑا کر چودھری عبداللہ پر ڈال دیا۔ غریب سوتے میں بلک بلک کر رویا۔ اری تجھے کیا، پورے خاندان کی عزت پر جو گھٹا ڈال آئی ہے...''

صغریٰ طنبورے سا بڑھتا ہوا پیٹ چھپائے زرینہ کے احکامات کی بجا آوری میں ہانپتی، جیسے یہ پیٹ بھی اکرے کا نہ ہو، میر حسن کا بھلیکھا پڑ گیا ہو جس نے اُس کا سارا وجود ناجائز کر دیا ہو جسے اس گاؤں کی مٹی قبولنے کو تیار ہی نہ تھی۔ وہ میر حسن کے طعنوں میں پور پور پروئی گئی تھی۔ وہ اُس کے ساتھ بھاگ جاتی تو شاید یوں اس میں رچ بس نہ پاتی۔ جتنا گاؤں والوں نے میر حسن کے نام کو اُس کی نس نس میں طعن وطنز کے نشتر لگا لگا گھول دیا تھا۔ بعض اوقات تو اُسے اکرا بھی میر حسن لگنے لگتا۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھتی تو ہڑ بڑا کر اکرے کو پرے دھکیل دیتی تو وہ زیادہ شدت سے اُس پر حملہ آور ہوتا۔

''کیوں، یار کا بھلیکھا پڑا تھا جو تجھے روشن دان سے نکالنے آیا تھا'' وہ ایک ایک عضو پر یوں ٹوٹ ٹوٹ کر پڑتا جیسے اُس کے وجود کے نشیب و فراز میں میر حسن گھسا بیٹھا ہو اور وہ اُس کے قدموں کے نشانات کو چن چن کر کوٹ پھانٹ رہا ہو، لیکن جن دھاڑتا رہتا، ''نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا'' جن والی

عورت عامل کی مار کھا کھا کر ادھ موئی ہو جاتی لیکن جن نہ نکل پاتا۔

صغریٰ کے سروٹے جیسے بال جنڈ کی جٹائیں بن بکھر گئے۔ نرمے کی گدی جیسے لب خشک کھوکھریوں سے بدرنگ ہو گئے جن کے سینے میں پھپھی گرنڈ ہو جاتی ہے۔

گاؤں کی عورتوں کو عجب آسودگی کا جھولا سا ملتا۔ "ہائے نی میرا عبد الرحمٰن جیوان جوگا، راتوں کو اٹھ اٹھ دہائی دیتا۔ اس کے سروٹے جیسے بال مجھے پھاہی دیتے ہیں، آٹھوں پہر اسی کا چہرہ نظروں میں رہتا ہے۔ لگتا ہے دانتوں کی لڑیاں زہر کے قطرے بن بن مجھ پر ٹپکتے ہیں۔"

"ہائے سوہاں بی بی! میرے اسلم کو تو مالیخولیا ہو گیا۔ سوتے میں بھی صغراں صغراں پکارتا نراسودائی..."

"ہائے نی میرا بندہ... کھتری نے ایسا جادو ڈالا، شام پڑے منہ سر لپیٹ سوتا بن جاتا نہ مجھے دیکھے نہ بلائے ہائے نی نراجوگی..." "اللہ نے سنی ہائے اللہ پاک نے انصاف کیا، گھل گھل کے مرتی ہے۔"

"اڑیو، کہاں گئے وہ سونا رنگے گال اور ہیرے کی کنی سے نین..."

"ہائے نی اپنے لشکاروں سے سارا سارا ہمیں سواہ کرتی، آج آپ سواہ ہو گلیوں میں اڑتی ہے... ہائے چندری... ہائے چندری..."

عورتوں نے گھٹنوں پر تاڑ تاڑ ہتھیلیاں ماریں۔

صغریٰ نے بچی کو یوں جنم دیا جیسے دن پورے ہونے کا بس انتظار ہی کر رہی تھی۔ دائی ابھی چوکھٹ پر پہنچی تھی کہ رونے کی آواز اس نے باہر ہی سن لی۔ نازا کا منہ کوورانتی لینے ڈھارے کو پلٹی کہ صغریٰ پر جن آ گیا۔ وہ بچی پر یوں حملہ آور ہوئی جیسے اگر ماں اس پر پل پل کے پڑتا تھا۔

بچی کی ناف کھینچتے ہوئے چڑیل سی چیختی تھی۔

"ناں، تجھے اس گندی دنیا میں آنے کی اتنی جلدی کیا تھی۔ پیٹ میں نہ مری تو پیدا ہوتے تو مر جاتی۔ اس کھتی دنیا کا تجھے کیا دیکھنا جو میں نے نہ دیکھا..."

دائی نے صغریٰ کے جن کو چارپائی سے پیچھے دھکیلا۔ ادھ موئی بچی کو پرانے کپڑے کی دھجی میں لپیٹا۔ بچی صغریٰ کا کوئی نقش بھی چھوڑ کر نہ آئی تھی۔ پورے گاؤں میں ہوک سی پڑی۔ عورتوں نے اک دوجی کے پیچھے دیے۔

"اڑیو، دیہاڑے گنواک اور قتل کے، بچا کے رکھوتی اپنے لال بچی ڈنک مارنے کو پیدا ہوتی..."

زرینہ چادر میں ڈھک ڈھک بیٹے کو دودھ پلاتی۔

"ہائے نی کہیں چڑیل کی نظر ہی نہ لگ جائے۔ بدبخت کے دودھ بھی نہ اترا۔ اڑیو، میرے تو پوری مٹھیں جتنا حوانا ہے..."

وہ دودھ کی دھاریں گیہوں رنگے، پیٹ پر نچوڑتی، عورتیں بکلوں میں کریڑی زرہ دانت چھپا کھڑ کھڑ ہنستیں۔

''اڑیو، دودھ کہاں زہر ہوگا قاتلی کے تھنوں میں، پر سنپولی کہاں مرے۔''

اکرے نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا اور کہیں کو نکل گیا۔ نری صغریٰ، جیسے اکرے کا تو کوئی حصہ ہی نہ ڈالا ہو، جیسے ماں کی طرح بیٹی نے بھی اسے دھتکار دیا ہو۔ وہ دنوں میر حسن کی شبیہ گلیوں، بھکوں میں ڈھونڈتا پھرا اور اُس روز لوٹ کے آیا جس روز لڑکی کی موت کی خبر ملی۔

بچی صغریٰ کی نفرتوں اور اکرے کے شبے کے بوجھ کو نہ جھیل سکی، چوتھے پانچویں روز نرے کی گڈی سی مرجھا گئی۔ ماؤں نے نوسولود بیٹوں کو سینے سے چمٹا سکھ کا سانس لیا۔

''ہائے نی، اللہ نے انصاف کیا، نر بچے کٹنی سے بچائے۔''

صغریٰ بچی کی میت سے لپٹ کر یوں ٹوٹ کر روئی کہ سارے گاؤں کی عورتوں کے جگر پھٹ گئے۔ برس بھر کے جمع سارے آنسو، سارے بین، دکھ کرودھ، دھتکار، نفرتیں جیسے حلق پھاڑ یک بارگی باہر اُبل پڑے ہوں۔ عورتوں نے بین اٹھایا۔

''ہائے نی، آپ لیکھوں سڑی کو ڈولی چڑھنا نصیب نہ ہوا، بچی کی ڈولی سجا رہی ہے۔ آپ دُلھن بننا منظور نہ ہوا، بچی کو گوٹے تلے میں سجا دُلھن بنا رہی ہے۔ ہائے نی اپنی ریجھاں اتار رہی ہے۔''

بچی کا میت بینوں، دھاڑوں، آہوں، کراہوں میں سجا، یوں اٹھوایا کہ اصغرے کا جنازہ بھی ایسے شان دار ماتم کے جلو میں نہ اٹھا تھا۔ اصغرے کی تو ماں نہ تھی کہ جوان بیٹے کے ماتم کی ڈھول گلیوں میں پھرولتی پھرتی لیکن صغریٰ بچی کے غم میں گھلتے گھلتے تانت سی رہ گئی جیسے سَن کی خشک چھمک سے ریشہ اُدھیڑ لیا گیا ہو۔ جو زرد پھولوں کے گچھوں سے کبھی لدی لٹکتی تھی، لیکن اب جلانے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ تنور میں جھونکو تو دھواں چھوڑ دے، چولھے میں ڈالو تو بھڑک مچا دے۔

یہ صغریٰ کی نحوست تھی کہ زرینہ کی بددعا، اُس کے بعد گاؤں میں پیدا ہونے والی ہر لڑکی، دوسرے چوتھے روز مر جاتی لیکن لڑکے جیتے رہتے۔ مُلّا نے چلّے کاٹے، پیروں نے تعویذ لکھے، عاملوں نے حساب لگایا، بزرگوں نے دعائیں مانگیں لیکن کوئی شیطانی نقش تھا جو بڑا سخت تھا۔ ہر بچی کی میت پر صغریٰ بینوں کے سوز پر یوں پورے گاؤں کو رُلا رُلا آنسوؤں میں بہا دیتی کہ ایسا تو جوان بیٹوں کی موت پر مائیں بھی کبھی نہ رو پائی تھیں۔ دنوں ان ننھی منی قبروں کو جنگلی پھولوں اور سبز کونپلوں سے سجاتی اور پانی کا چھڑکاؤ کرتی رہتی جیسے ان ذرا ذرا قبروں کی مجاور ہو۔

یہ تو لوگوں کو بہت بعد میں احساس ہوا کہ صغریٰ ہر اُس گھر جاتی ہے جہاں کوئی لڑکی جنم لیتی ہے لیکن لڑکوں والے گھر چھوڑ جاتی ہے اور جہاں جاتی ہے، منحوس کے واپس آتے ہی لڑکی کی حالت بگڑنے لگتی ہے۔ چھل پیری کا سایہ ہے کہ کوئی زہر کی چنگی پکھا آتی ہے۔

لوگ زچہ بچہ کو اُس کے سایے سے بچانے لگے۔ پیٹھ پیچھے چاہے وہ چڑیل جادوگرنی، ڈائن سہی لیکن جس گلی سے گزر جاتی، عورتیں راہ چھوڑ دیتیں اور کلمہ شریف کا ورد کرتیں اور یوں ڈرتیں جیسے یہ صغریٰ نہ ہو،

اس گاؤں پر کوئی بھاری وقت آیا ہو، پتا نہیں کب پتھروں کی بارش شروع ہو جائے اور اُن کے بچے مرنے لگیں۔

میر حسن کے ہاں بچی ہوئی تو اُس کی بیوی نے خاص خیال رکھا کہ کہیں عورتوں میں مل کر صغریٰ بچی دیکھنے کے بہانے چلی نہ آئے۔ رات بار بار ٹٹول کر کنڈی دیکھتی، کہیں کھلی تو نہیں رہ گئی۔ سینے سے چمٹا بچی کی سانسیں محسوس کرتی۔ دن بھر آنکھ نہ جھپکتی کہیں ہونی نہ آجائے۔

لیکن ایک اندھیری رات جب سوکھا سڑا ہاتھ روشن دان کی جھیت میں سے اندر لہرایا تو میر حسن کی بیوی بے خبر سو رہی تھی۔ اُسے تو احساس ہی نہ ہوا کہ کب سوئی ہوئی بچی کے نرخرے میں بھاری انگوٹھا دھنسا اور میر حسن نے تاریکی کی اوٹ میں سے اتنی طاقت سے کلائی پکڑی کہ ہاتھ کی حرکت ڈھیلی پڑ گئی۔ صغریٰ کا جن میر حسن سے بھڑ گیا۔

''اسے مر جانے دے، کیا لینا اس نے جی کر اس گندی دنیا سے جو میں نے نہ لیا... مر جانے دے اسے...''

میر حسن نے دونوں ہاتھوں کی گرفت سے صغریٰ کے جن کو بوتل میں بند کر دیا، وہ بھڑتے بھڑتے ڈھیلی پڑ گئی۔

''میں جانتا تھا تو ضرور آئے گی... میں جانتا تھا تو چڑیل بھی ہے، تیرے اندر جن بھی آتا ہے، تجھ پر بدروحوں کا سایہ بھی ہے اور تو گاؤں میں کسی بچی کو جیتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں کئی روز سے تیرے انتظار میں جاگ رہا تھا...''

صغریٰ پیپ بھرے پھوڑے کی طرح پھٹ گئی۔ کھرنڈ اینٹوں کے فرش پر آنسوؤں کا لہو اور پیپ درد چھوڑتے لوتھڑوں کی طرح بہنے لگا۔

میر حسن نے کمرے کی طاق کھول دی۔ یخ ہوا کا جھونکا صغریٰ کے مواد بھرے وجود پر تلوار سا برسا۔

''صغریٰ، جس ہاتھ بھر کے روشن دان کو تو نہ ناپ سکی، اس امید پر اسے جینے دے کہ وہ روشن دان اس کے لیے پورا کھلا ہوگا، ورنہ اپنے ہی وجود میں کھولتے پیپ بھرے مواد کے زہر سے تو مر جائے گی۔''

صغریٰ تاریک روشن دان کے قدموں میں اندھی پڑی تھی۔ اُس کے اندر پیپ بھرے مواد کا سیلابی ریلا آنکھوں اور حلق کے سارے بند توڑتا بہہ نکلا تھا اور خالی خولی وجود کھرنڈ اینٹوں کے فرش پر پڑا رہ گیا تھا۔

فیروز عالم

آج کی مریم

ہوائی جہاز نے نیچے اترنے کے لیے بائیں طرف مڑ کر جھکنا شروع کیا۔
میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ نیچے دور دور تک شکاگو کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں جیسے زمین پر کسی نے نہایت ترتیب سے روشنیوں کا جال سا بچھا دیا ہو۔ سوچا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ بہت سال پہلے جب میں نے پہلی دفعہ شکاگو شہر کی روشنیاں جان ہنکاک کی ننانوے منزلہ گیلری سے دیکھی تھیں، اس وقت بھی یہ اسی قدر تاب ناک اور متاثر کن تھیں۔ بالکل ایسا ہی منظر تھا۔ ہاں میں بدل گیا تھا۔ اٹھائیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا تھا اور میری شخصیت اور چہرے مہرے میں اس قدر تبدیلی آگئی تھی کہ وہ لوگ جنھوں نے مجھے اس عرصے میں نہیں دیکھا تھا، شاید مجھے پہچان بھی نہ پائیں، وہ لوگ — کون تھے وہ لوگ؟ میرے ذہن میں ماضی سے وابستہ کتنے ہی چہرے ابھرے، پھر جیسے ایک چہرے کے نقوش ان تمام چہروں میں واضح ہو کر میرے ذہن کے بند دریچوں پر دستک دینے لگے۔ وہ دریچے جو میں نے اٹھائیس سال پہلے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے تھے، مگر آج ایسا لگ رہا تھا کہ یادوں کے تیز جھکڑ شاید ان دریچوں کو کھلوا کر ہی چھوڑیں گے۔ میرے دل میں تنہائی اور اکیلے پن کی ایک ٹیس سی اٹھی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک شام کی یاد میرے ہونٹوں پر یاس بھری مسکراہٹ بن کر کھل اٹھی۔

یونی ورسٹی آف شکاگو کی اسٹوڈنٹ کیفے ٹیریا میں دونوں ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے لیے میں جیسے ہی پلٹا، کوئی مجھ سے تیزی سے ٹکرایا اور میرا تمام کھانا زمین پر گر گیا۔ میں نے کچھ حیرانی اور غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ سردیوں کے اوور سائز جیکٹ، سر پر اسکیموز جیسا ہڈ، بڑی بڑی گہری بھوری آنکھیں اور گالوں پر تیز سرد ہوا کی وجہ سے جیسے دہکتے ہوئے شعلے۔ کچھ شرمندہ، کچھ خجل اور کچھ حیرانی سے، ''معاف کرنا میں کچھ جلدی میں تھی۔'' اس نے کہا۔ ''ہاں وہ تو تم تھیں ہی۔'' میں نے ذرا تلخی سے کہا۔ اس نے میری تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے ایک بار پھر معافی مانگی اور پھر تلافی کے طور پر میرے لیے کھانا خرید کر مجھے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مروتاً اس کی دعوت قبول کر کے میں اس کے ساتھ شیشے کی ایک بہت بڑی کھڑکی

کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ گیا۔ باہر برف گرنی شروع ہوگئی تھی۔ شیشے اور چنار کے درخت ٹنڈ منڈ ہو چکے تھے۔ برف باری اور دھند میں یونی ورسٹی کیمپس کی پرانی اور گوتھک طرز کی عمارتیں کسی قدیم یورپین ولیج کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ جینی تھیالوجی میں ریسرچ کر رہی تھی اور اس کا کنبہ وسکانسن کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتا تھا۔ چھوٹی سی یہ حادثاتی ملاقات ہمارے درمیان دوستی کی ابتدا بن گئی۔

میں اُن دنوں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یونی ورسٹی آف شکاگو آیا ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب امریکا میں پاکستانیوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ کبھی کبھار ہی کوئی اپنا ہم وطن نظر آتا تھا۔ میں نے چند ہی ماہ پہلے اپنا ملک اور اپنے عزیز و اقارب چھوڑے تھے، اس لیے میں اداس اور تنہا تھا۔ پھر سردی، شدید برف باری اور تیز و تند اور کاٹتی ہوئی ہوا کی وجہ سے سڑکوں پر دور دور تک ویرانیوں کا راج ہوتا تھا۔ ایسے میں جب میں اسپتال میں ایک سخت اور لمبا دن گزار کر اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آتا تو ایک خنک اور وحشت ناک تنہائی میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ میرے پاس شام گزارنے کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ ہوتا کہ میں گھنٹوں اپنی کھڑکی میں کھڑا باہر کے ویران اور برف پوش منظر کو تکتا رہوں۔ زندگی کے ان اداس اور تنہا لمحوں میں جب جینی میری زندگی میں داخل ہوئی تو ایسا لگا جیسے مجھے ایک سہارا مل گیا ہو جیسے کسی نے گرتے کو تھام لیا ہو۔ جینی نے میری اداس اور تاریک زندگی میں ایک دیا روشن کر دیا تھا۔

جینی انتہائی ذہین اور بے حد حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے مسائل، میرے حالات اور میرے جذبات کو سمجھتی تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ میں اپنوں، اپنے ماحول اور اپنے کلچر سے ہزاروں میل دور ہوں۔ وہ ہر لمحہ میری ہمت بڑھاتی، دل جوئی کرتی اور میرے لیے جذباتی سہارا بن جاتی۔ اس کو میری ہر چیز کا خیال تھا۔ جب میں طویل اور ایک بے رونق شام کو اپنے تنہا اپارٹمنٹ میں اداس ہو رہا ہوتا، اچانک اس کا فون آ جاتا۔ وہ کہتی کہ مجھے احساس تھا کہ تم اکیلے اداس ہو رہے ہو گے، سوچا فون پر ہی تمھاری شام کی اداسی کو کچھ دور کر دوں۔ وہ میری ضروریات کا مجھ سے پوچھے بغیر خیال رکھتی۔ ایک دفعہ اس نے ضد کر کے اپنے اپارٹمنٹ میں ناشتے پر مدعو کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ٹیڑھے میڑھے پراٹھے رکھے ہیں۔ کچھ شرمندہ سی، کچھ جذباتی سی۔ مجھ سے کہنے لگی، تمھیں بہت پسند ہیں نا! میں نے تمھارے کھانوں کی کتاب خریدی ہے۔ اب وہ کبھی میرے لیے "بھنا گوشت" یعنی بھنا گوشت کا تجربہ کر رہی ہے تو کبھی سموسے بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کبھی میرے لیے وسکانسن کا خالص پنیر لا رہی ہے تو کبھی گل دستے سجا رہی ہے۔ میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا کہ اس دنیا میں کوئی صرف میرے لیے اتنا کچھ کرتا ہے یعنی میں بھی کسی کے لیے اتنا اہم ہوں۔ میں ایک خاص مسرت سے سرشار تھا۔ جیسے زندگی سچ مچ جینے کے قابل ہوگئی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ ہم دونوں میں مکمل طور پر ذہنی ہم آہنگی تھی۔ ہم مختلف موضوعات پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ شکاگو کی آرٹ گیلریوں کے چکر لگاتے، تھیٹر سے لطف اٹھاتے۔ کانسرٹ سننے جاتے اور جھیل مشی گن پر کشتی رانی کرتے۔ جینی میری لمبی لمبی باتیں جن میں میرے ملک کی، میرے ماحول کی اور میرے مذہب کی

کہانیاں ہوتیں، بڑے انہماک سے سنتی۔ ایسے میں اس کے بھورے بالوں کی ایک لٹ اس کے بائیں رخسار پر جھول رہی ہوتی اور اس کی آنکھیں اور گہری ہو جاتیں۔ اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا ایسا جذبہ موج زن نظر آتا کہ اس کی شدت سے میں خود ایک لمحے کو ڈر سا جاتا۔

یوں تو ہم جذباتی اور ذہنی طور پر بے حد قریب تھے مگر میں نے جینی اور اپنے درمیان ایک فاصلہ ہمیشہ برقرار رکھا تھا۔ میں اس حقیقت سے مکمل طور پر واقف تھا کہ کلچر، مذہب، ماحول اور وطنیت کے اس قدر شدید فاصلے ہمارے درمیان حائل ہیں کہ ہم کبھی بھی ایک نہیں ہو پائیں گے اور اگر حالات یا وقتی جذبات کے تحت ایسا ہو بھی گیا تو یہ رشتہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ اپنے ضمیر کو صاف رکھنے کے لیے میں نے جینی کو ہمیشہ اس سے آگاہ کیے رکھا تھا کہ میں امریکا میں عارضی طور پر ہوں اور اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے واپس پاکستان چلا جاؤں۔ وہ کہتی، تمھاری دوستی اور رفاقت کے جو لمحات مجھے میسر ہیں، میں مستقبل کی فکر کیے بغیر صرف ان سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ تمھارے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ میری زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ ہے اور میں ہمیشہ اسے اپنا سرمایۂ حیات سمجھوں گی۔ کئی سال تیزی سے گزر گئے۔ ہم ایک دوسرے کی رفاقت کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اس کے بغیر مجھے ہر چیز سونی لگتی تھی۔

میرا تین سالہ کورس مکمل ہونے والا تھا اور وہ گریجویشن پر مجھے ایک بڑا تحفہ دینے والی تھی۔ سردیاں ختم ہو کر موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ برف پگھل چکی تھی اور جھیل مشی گن کے کنارے میلوں تک قطار میں لگے سیب، ناشپاتی اور چیری کے درختوں پر گلابی اور عنابی شگوفوں نے ایک آگ سی لگا دی تھی۔ میں جھیل کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔ سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا اور اس کا بڑا سا چمکیلا تھال جھیل مشی گن کے اُس پار جیسے ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں امی کا خط صبح کی خنک اور دھیمی ہوا میں آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ میں انتہائی الجھن میں گرفتار تھا۔ انھوں نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا تھا کہ میں گریجویشن کے فوراً بعد کراچی واپس لوٹ آؤں گا۔ میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت کرتا تھا بلکہ ان کی پرستش کرتا تھا۔ میں ان کی واحد اولاد تھا، جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد جس جاں فشانی سے انھوں نے مجھے پالا تھا، جیسی تربیت انھوں نے میری کی تھی، زندگی کی جو اعلیٰ قدریں انھوں نے مجھے سکھائی تھیں، ترقی اور کامیابیوں کی جو لگن انھوں نے مجھ میں جگائی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میرا اس بات پر پختہ یقین ہو گیا تھا کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، انھی کی وجہ سے ہوں۔

مجھے زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنا تھا۔ جینی جسے اب میں روح کی گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا اور جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اس تمام کائنات میں اگر کوئی مجھے سراہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی مجھے چاہتا ہے تو وہ جینی ہے۔ مگر کیا جینی سے میری شادی امی کو ناقابلِ برداشت اذیت نہیں پہنچائے گی؟ میں نے اس مسئلے پر کئی زاویوں سے غور کیا۔ جینی سے شادی کرنے کے بعد مجھے ہمیشہ کے لیے امریکا میں رہنا پڑے گا۔ امی سے میں نے پاکستان لوٹنے کا وعدہ کیا تھا، یہ ان سے وعدہ خلافی ہوگی۔ شاید وہ میری خوشی کی

خاطر مجھے اجازت بھی دے دیں مگر اس سے ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ جینی میرے ساتھ پاکستان جانے پر تیار ہے لیکن اس کا ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہنا عملی طور پر سخت مشکل ہوگا۔ میں امی کے خیالات سے واقف تھا، وہ وطن چھوڑ کر امریکا آ کر رہنے پر تیار نہیں ہو سکتیں۔ ان تمام پہلوؤں کو سوچتے ہوئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں جینی سے تعلقات منقطع کر کے ہمیشہ کے لیے پاکستان چلا جاؤں۔ امریکا کو بھول جاؤں اور ان لمحات کو بھول جاؤں جو میں نے یہاں گزارے تھے۔ وقت ہر درد کا مرہم ہے، میں بھی اس کہانی کو بھول جاؤں گا اور پاکستان اور اس کے ماحول میں گم ہو جاؤں گا۔

مشی گن ایونیو کے دونوں جانب قطار میں لگے اسٹریٹ لیمپس میں موم شمعوں جیسے بلب روشن ہو چکے تھے۔ ان کے دونوں طرف لٹکتی باسکٹیں پھولوں سے لدی تھیں اور واٹر ٹاور پلازا کی بوتیک شاپس میں روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ میرے پاس ہی کھڑی ایک لڑکی امریکا کے قدیم لباس، لمبی اسکرٹ اور سر پر جھالر نما ٹوپی پہنے پھول بیچ رہی تھی۔

کبھی کبھی دو تنومند سفید گھوڑوں کی بگھی تفریح کرنے والوں کو سیر کرانے کی غرض سے میرے سامنے سے گزر جاتی تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں یہ منظر نہایت سحر انگیز لگ رہا تھا اور میں جینی کا انتظار کر رہا تھا۔

موسم بہار، شام کا گلابی ملگجا اندھیرا اور رومان پرور ماحول—— جب وہ آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار حدت جذبات سے سرخ ہو رہے تھے، سانس پھولا ہوا تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئی تھیں۔ میں نے اسے بلاتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ آج میں اس سے ایک خاص بات کہنے والا ہوں۔ ہم مال کے اندر شیشے کی لفٹ کے پاس جہاں بہت سے گملوں کے درمیان فوارے سے پانی اہل رہا تھا، ایک چھوٹی سی کافی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ کافی ختم ہونے کے بعد میں نے بہت مختصر الفاظ میں اسے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کے چہرے سے جیسے آندھی کا ایک تیز جھکڑ ٹکرایا ہو۔ جیسے اس لمحے میں نے اس کی ساری تازگی، ساری شگفتگی چھین لی ہو۔ انسانوں کے غم، ان کے جذبات، ان کے احساسات ایک ہی ہوتے ہیں، صرف زبانیں مختلف ہوتی ہیں۔ وہ جیسے ایک لمحے کو لرز گئی مگر فوراً ہی سنبھلی اور میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی، ”مجھے معلوم تھا—— اپنے آپ کو مجرم نہ سمجھو، تم نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا تھا کہ ہمارا ملاپ ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی اگر میں یہ کہوں کہ مجھے دکھ نہیں ہوا تو یہ جھوٹ ہوگا۔“ میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور اس میں ہلکی سی کپکپاہٹ بھی تھی۔ وہ بار بار آنکھیں جھپک رہی تھی، شاید آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تین مہینے بعد میں پاکستان میں بیٹھا تھا۔ امریکا چھوڑنے سے پہلے مجھے شکاگو میں ڈاکٹری کی بہت اچھی آفرز تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر شخص گرین کارڈ کی کوششیں کر رہا تھا مگر میں نے ہر چیز سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی اور پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ فیصلہ بھی کہ اب کبھی واپس امریکا نہیں آؤں گا۔

کراچی میں مجھے ایک اچھی ملازمت مل گئی اور کچھ ہی ماہ بعد میری پریکٹس بھی خوب چل نکلی۔ میں نے زندگی کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے

امی کے کہنے پر ایک مکمل طور پر ان دیکھی اور ان جانی لڑکی سے شادی پر رضامندی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ ہماری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ سیما ایک پڑھی لکھی اور درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والی مشرقی لڑکی تھی۔ شاید اس کی سب سے بڑی خوبی یا یوں کہیں کہ واحد خوبی جس سے امی متاثر ہوئی تھیں، اس کا حسن تھا۔ میں نے اس رشتے کو نہایت خلوص دل سے قبول کیا تھا اور ماضی کو فراموش کر دیا تھا۔ میں نے سیما کو نہ صرف پورے خلوص سے اپنا لیا تھا بلکہ یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ میں دنیا کی تمام خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دوں گا۔ میں یہ جانتا تھا کہ پیار لینے کے لیے پیار دینا پڑتا ہے۔ مگر شروع ہی سے مجھے احساس ہوا کہ جیسے سیما مجھ سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ بعض دفعہ اس کا برتاؤ میرے ساتھ انتہائی سرد مہری لیے ہوتا۔ میں اس کا ہاتھ تھامتا تو وہ جیسے ایک بے جان سا سرد ہاتھ میرے حوالے کر دیتی۔ میں گرم جوشی سے اسے کوئی قصہ سناتا یا اپنے دل کی کوئی بات اسے سنا رہا ہوتا تو وہ کہیں دور اپنے خیالوں میں گم رہتی۔ میں جب اس کے ہونٹوں، آنکھوں اور اس کے بالوں کی تعریف کرتا تو وہ جیسے بجھ سی جاتی۔ مجھے کئی بار اس کا احساس ہوا کہ کسی نے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو میرے حوالے کر دیا ہے۔ میرا دل بجھ کر رہ گیا اور میں عجیب طرح کی تنہائی محسوس کرنے لگا۔

دو سال جیسے تیسے گزر گئے۔ اس اثنا میں ہمارا بیٹا عماد بھی پیدا ہو چکا تھا، لیکن عماد کی پیدائش کے بعد تو دوریاں اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ سیما کو نہ تو میرے کام سے دل چسپی تھی، نہ میرے اوقات کار سے اسے کوئی سروکار تھا۔ شام کو میں گھر آتا تو وہ ٹی وی پر پروگرام دیکھ رہی ہوتی اور صبح کو جب میں اسپتال جاتا تو وہ اپنے بستر پر پڑی سو رہی ہوتی۔ میرے دل کی ویرانیاں اور بڑھ گئیں۔ شاید مجھ میں تو یہ ہمت بھی نہیں ہوتی مگر یہ ہمت بھی اسی نے کی اور مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم دو اجنبی ہیں اور یہ کہ اس نے تمام عمر جس آئیڈیل کی پرستش کی ہے، میں وہ نہیں۔ وہ کوشش کرنے پر بھی اپنے دل کو میری جانب مائل نہیں کر پاتی۔ اس کی نظر میں زندگی مختصر اور قیمتی تھی اور وہ آنے والی زندگی میں اپنی مرضی کے رنگ بھرنا چاہتی ہے — اور پھر ہم فوراً ہی الگ ہو گئے۔ اس نے مجھ پر یہ کرم ضرور کیا تھا کہ عماد سے ملنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ دراصل عماد شکل وصورت اور شخصیت میں میری تصویر تھا اور ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ آج میں شکاگو بھی اپنی قسم توڑ کر اس لیے واپس آ رہا تھا کہ آئندہ ہفتے میرا بیٹا عماد نارتھ ویسٹرن یونی ورسٹی سے گریجویشن کر رہا تھا۔

جہاز کے پہیوں کے زمین سے ٹکرانے سے جو جھٹکا لگا تو اس نے مجھے چونکا دیا۔ میرے خیالوں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ شکاگو آ چکا تھا۔

پورا ہفتہ بڑی مصروفیت میں گزرا مگر میں جینی کا خیال ذہن سے نہ نکال سکا۔ مصروفیت ختم ہوتے ہی میں نے جینی کی تلاش شروع کر دی۔ معلوم ہوا وہ ریاست وسکانسن کے ایک چھوٹے سے شمالی گاؤں یوکلیئر میں ذہنی طور پر معذور بچوں کو پڑھاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا اور اس کے ساتھ ایک خوش گوار حیرت بھی ہوئی

کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ بیتے کی سہ پہر جذبات سے بوجھل اور ان جانے وسوسوں سے خوف زدہ میں یوکیلیٹر کے راستے پر گام زن تھا۔ کچھ گھنٹوں بعد جب میں نے اپنی کار سرخ تراشے ہوئے پتھروں سے بنی ایک قدیم چرچ نما عمارت کے سامنے روکی تو شاہ راہ کے دونوں جانب لگے چنار کے درخت خزاں کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ زمین زرد و زرد ٹوٹے ہوئے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے سرخی مائل ہو چکے تھے۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوسرے لمحے وہ سامنے کھڑی تھی مگر — مگر میں اسے دیکھ کر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک راہباؤں کے لباس میں تھی۔ اس نے مجھے اندر بلایا۔ آتش دان میں لپکتے ہوئے شعلوں کے سامنے بیٹھے ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے جانے کے بعد وہ شدید تالم سے گزری۔ کئی سال علاج اور نیک سیرت فادر پیٹرک کے سہارے نے اسے دوسری زندگی دی۔ اب وہ بہت پرسکون ہے۔ زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

میں اس سے جو کچھ کہنے یا مانگنے آیا تھا، وہ اب ممکن نہیں تھا۔ میں نے بہت دیر کر دی تھی۔ اب کچھ کہنے کو نہ تھا۔ میں اس سے کچھ کہے بنا واپسی کے لیے اٹھا۔ مجھے شکاگو پہنچنا تھا اور راستے میں بارش کا بھی امکان تھا۔ جب میں اس کے اپارٹمنٹ سے نکل کر کار کی جانب جا رہا تھا تو اس کا ہیولہ دروازے کے فریم میں کھڑا ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے بی بی مریم کی تصویر فریم میں جڑ دی ہو۔ میں نے کار گھمائی اور اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے اس کی گلی سے نکل گیا۔ شاید مجھ میں اس کے خلوص، اس کی پاکیزہ محبت اور اس کی عظمت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

☆☆☆

علی اکبر ناطق

متولّی

آغا نجف کی اچانک موت نے مہر النسا خانم کو مفلوج کر کے رکھ دیا — یعنی جو دس ہزار کا مشاہرہ حویلی سے آتا تھا، اب اس کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ اُدھر لاکھ سمجھانے پر بھی شرف النسا کسی اور کی رکھیل بننے سے انکاری تھی، اور خود وہ اس عمر میں دھندا کرنے سے رہی جب کہ ثمینہ کی عمر ابھی اس قابل نہیں تھی کہ اس کی نتھ کھلوائی جاتی۔ پھر اُس نے پچھلے دس سال سے کسی اور سے واسطہ بھی تو نہ رکھا کہ کوئی اُس کی پرسش کو آتا۔ کہنے کو تو پینتیس سال سے اسی ہیرا منڈی میں اُس کا کوٹھا تھا مگر ایرے غیرے کو منہ لگانا تو ایک طرف کسی دلال سے بھی تعلق نہ کیا۔ یہاں تک کہ مجلس، ماتم داری اور منت و وظائف کی تمام رسوم بجائے محلے کے امام باڑے کے مرکزی امام بارگاہ میں جا کر ادا کرتی۔ دراصل مہرو خانم کی نظر میں وہ تصویریں پھرتی تھیں جب وہ اپنی ماں کے ساتھ فیض آباد سے یہاں آئی تھی اور شاہی محلے میں اُن کا کوٹھا گویا ایک دربار تھا جہاں ایک سے بڑھ کر ایک، بیسیوں رنڈیاں اُن کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھیں۔ ہر وقت رقص و آواز کا سامان اور آٹھ پہر رونقیں تھیں۔ اگرچہ فیض آباد کی طرح یہاں نواب نہ تھے مگر مہرو کی ماں خورشید آرا اب بھی اپنے ہاں کم نسب اور ذلیل کو پھٹکنے نہ دیتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے ہاں آنے والا نواب نہیں تو نہ سہی کم سے کم شرفا میں تو ہو۔ مگر خورشید آرا کے مرنے کے بعد تو ایسی منحوس ہوا چلی کہ محلہ صرف لُچوں لفنگوں کا اڈا بن کے رہ گیا۔ حکومت نے ایسے قانون بنائے کہ شرفا نے آنا بند کر دیا۔ البتہ آغا نجف، کہ پرانے ملنے والوں میں تھا جو ایک طرح سے مہرو خانم کا داماد بھی تھا، اُس نے آخری دم تک ساتھ نبھایا۔ وہ خود تو نہ آتا تھا مگر دس ہزار ماہانہ بھیجتا رہا۔ اب جب کہ آغا نجف کا سہارا بھی نہ رہا تو اس کی نشانی خادم حسین کی کفالت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کوئی چھ مہینے تو اسی حالت میں گزرے لیکن کب تک؟ جب جمع شدہ سرمایہ آخری سانسیں لینے لگا تو مہر النسا خانم نے کوٹھے کے باہر پان سگریٹ کا کھوکھا لگا لیا اور کتھا چونا بیچنے لگی۔ چند دنوں میں کھوکھا چل نکلا اور دن میں دو چار سو آنے لگے۔ یوں یہ فکر تو کسی حد تک کم ہوئی مگر وہ خادم حسین کے حال سے تشویش میں گھلنے لگی جو ابھی تین ہی سال کا تھا۔ اسے ثمینہ کی تو کوئی ایسی فکر نہ تھی کہ وقت آنے پر جیسے وہ نقش نین بنا رہی

تھی، سو آدمی اس کے لیے تیار ہو جاتے لیکن وہ سمجھتی تھی کہ خادم حسین نواب کا لڑکا ہے، اسے محلے میں نہیں رہنا چاہیے۔ اسی شش و پنج میں ایک سال اور نکل گیا۔ ایک دن اُس نے خادم حسین کو شرف النسا کی گود میں کھیلتے دیکھا تو اُس کا جی بھر آیا اور وہ یہ سوچ کر کُڑھنے لگی کہ ایسا چاند کا ٹکڑا محلے کے شہدوں اور لفنگوں میں کیوں کر زندگی کاٹے گا۔ بالآخر اُس نے شرف النسا سے کہا، ''جس قدر جلد ہو سکے لڑکے کو رنڈیوں کی صحبت سے دور کر دو۔ آج چھوکرے کی عمر ہی کیا ہے۔ ہوش لینے سے پہلے محلے سے ہٹا دو گی تو پلٹ کر نہ آئے گا۔''

''لیکن کہاں بھیجوں؟ یہاں تو دور دور تک کسی شریف زادے سے تعلق نہیں۔ البتہ آغا نجف زندہ ہوتے تو ضرور لے جاتے کہ خون کا کچھ تو خیال ہوتا ہے۔'' شرف النسا نے فکر مندی سے جواب دیا۔

''مگر یہاں محلے میں ضرور خراب ہوگا۔'' شرف النسا کی ماں نے دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا، ''ایک سے ایک بدمعاش رنڈی بیٹھی ہے۔ مسیں بھیگنے سے پہلے ہی لونڈے کو چاٹ لیں گی۔ دیکھ تو کیسے ہاتھ پاؤں نکال رہا ہے اور پھر میں تو کسی طرح نہ چاہوں گی کہ لڑکا محلے کے رذیلوں میں اٹھے بیٹھے۔''

''مگر کہاں بھیجوں؟ کوئی ٹھکانا بھی تو ہو۔'' شرف النسا اُکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے ایک جگہ سوچی ہے۔'' مہر النسا نزدیک ہو کر کہنے لگی، ''سید صادق تقی ہے نا، مرکزی حسینیہ امام بارگاہ کا متولی۔ لڑکے کو اُس کی کفالت میں دے دیتے ہیں۔ خرچ چپکے سے بھیجتے رہیں گے۔ وہیں سے مکتب میں جائے اور وہیں رہے۔ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوگی۔ خود ہم بھی کم ہی واسطہ رکھیں گی۔ سیدزادوں اور شریفوں میں رہے گا تو دنیا کی عزت اور دین کی دولت دونوں پائے گا۔''

''مگر اماں!'' شرف النسا بولنے لگی، پھر گویا دل ہی دل میں اپنی ماں کی عقل کو داد دیتے ہوئے چپ کر گئی۔ پھر اچانک تردد سے بولی، ''مگر اماں سید صادق کیوں کر ایک رنڈی کے بیٹے کو لے گا؟ اس کے تو جنموں میں بھی رنڈیوں سے واسطہ نہیں۔ ایسا فرشتہ سیرت اور شب بیدار کیسے ہمارے پاپ کا ذمہ اُٹھائے گا؟ پھر خادم ابھی چار ہی سال کا تو ہے۔ وہ تو اس کی ناک پونچھنے سے رہا۔''

''تو فکر نہ کر۔'' مہر النسا فیصلہ کن لہجے میں بولی، ''سید تقی سے بات میں کروں گی۔ ہماری تو جو قسمت میں لکھا تھا بھوگ لیا، پر میں لڑکے کو ذلیل نہ ہونے دوں گی اور پھر اسی عمر میں یہ یہاں سے نکلے تو اچھا ہے۔''

☆

گزشتہ سال اس کڑاکے کی سردی پڑی کہ ہر شے سُکڑ کے رہ گئی۔ مہرو خانم جو رات گئے تک کھوکھے پر بیٹھتی تھی، اسی سردی سے نمونیے میں گرفتار ہوگئی۔ لاکھ دوا دارو کیے مگر افاقہ نہ ہوا۔ اگرچہ وہ ساٹھ سے اوپر نہ تھی مگر عمر کے اس حصے میں تھی جہاں دواؤں کے ساتھ دعاؤں کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ قبول نہ ہوئیں اور مہرو خانم دس دن کے اندر ہی قضا ہوگئی۔ اس اچانک موت نے شرف النسا کو ہلا کے رکھ دیا مگر اُس نے چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو بحال کیا اور کھوکھے کے کام کو سنبھال کر گھر چلانے کا بندوبست کر لیا۔ وہ خود تو کھوکھے پر بیٹھنے لگی جب کہ گھر کی دیکھ بھال ثمینہ کے حوالے کر دی۔ کئی مہینے اسی طرح معاملہ

چلتا رہا، اس کے ساتھ ساتھ ثمینہ کی دل چسپیاں بھی بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ مہرو خانم کو مرے ابھی سال نہ ہوا تھا کہ اُس نے پر نکالنے شروع کر دیے۔ شرف النسا کے لاکھ سمجھانے پر بھی تانک جھانک سے نہ رُکی بلکہ کچھ دنوں سے تو سرِ عام رنڈیوں کی صحبت پکڑ لی۔ شرف النسا نے یہ حالت دیکھی تو فکر میں پڑی۔ فوراً کبیر دلال سے رابطہ کر کے سردار جہانگیر احمد کے ساتھ تین لاکھ کے عوض گانٹھ دی۔ سردار جہانگیر احمد ثمینہ کو اپنی زمینوں پر تونگی لے گیا جہاں اُس کے بے شمار باغات تھے۔ اول تین ماہ تک تو ثمینہ کو اپنا کوٹھا یاد آتا رہا لیکن اب آہستہ آہستہ جہانگیر کی ناز برداریوں سے وہ اس جگہ کی عادی ہو گئی پھر اُسے کچھ اور اُمید بھی بندھ گئی تھی کہ شاید جہانگیر اُس سے شادی کر لے اور یہ ہو بھی جاتا کہ قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اُنھی دنوں جہانگیر احمد کی ماں کو کسی طرح خبر ہو گئی کہ لاڈلے میاں نے گھر سے بالا بالا رنڈی رکھی ہوئی ہے۔ وہ اُنھی قدموں تونگی پہنچی اور ثمینہ کو میڈھیوں سے پکڑ کر دروازے سے باہر کر دیا۔ جہانگیر نے اُف تک نہ کی۔ حالاں کہ ثمینہ کے پیٹ میں اُس کا چار ماہ کا بچہ ہو چکا تھا، جسے اُس نے شادی کی اُمید پر جننے کا سوچا تھا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ثمینہ بار بار جہانگیر احمد کا منہ دیکھتی رہی کہ شاید ماں کو کھری کھری سنا دے مگر جہانگیر تو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا اپنی ماں کے آگے، جیسے کل کا بچہ ہو۔ ثمینہ نے یہ حالت دیکھی تو دونوں کو کوسنے دینے لگی۔ اس نے ایسے مرد کہاں دیکھے تھے۔ بالآخر تین حرف بھیج کر کوٹھے پر آ گئی۔ ایک دو مہینے تو اُسے یہ اُمید رہی کہ شاید جہانگیر رابطہ کرے لیکن جب اُدھر سے کسی نے خبر نہ لی تو اس نے دھندا کرنے کی ٹھان لی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ پیٹ کا بچہ اب چھ مہینے کا ہو چکا تھا لہٰذا مایوس ہو کر کوٹھے کے کام میں شرف النسا کا ہاتھ بٹانے لگی اور دن گزرتے گئے۔

لڑکا پیدا ہوا تو ثمینہ نے اپنے کام کا آغاز کر دیا، اگر چہ رکھیل بنانے کو سیکڑوں تیار تھے لیکن اب وہ مستقل کسی کی ہو کے رہنے کو راضی نہ تھی۔ لہٰذا آلاتِ رباب سے گرد جھاڑ کر ایک سلیقے سے دھندا شروع کر دیا۔ پھر تو چند ہی ماہ میں دُور دُور بات نکل گئی اور محلے میں ایک قسم کی جان آ گئی۔

☆

ایسی عزاداری تو لوگوں نے اپنی ہوش میں دیکھی نہ تھی۔ خادم نے انتظامات کچھ ایسے ڈھب سے کیے کہ ہر آدمی واہ واہ کر کے رہ گیا۔ عزاداروں کے لیے شامیانوں اور سبیلوں کا انتظام، ماتمیوں اور زنجیر زنوں کے لیے فرسٹ ایڈ سے لے کر مکمل میڈیکل سنٹر کا قیام اور چاق چوبند حفاظتی دستے کی عمل داری، ہر کام میں ایک سلیقہ تھا۔ اس کے علاوہ پہلی دفعہ پولیس انتظامیہ سے مل کر مرکزی امام باڑے سے لے کر گول چوک تک کا تمام رستہ دو طرفہ زنجیروں سے باندھ دیا گیا تاکہ جلوس اور ماتمیوں کو کوئی بیرونی رکاوٹ پیش نہ آئے اور وہ خطرے سے دُور رہیں۔ اگر چہ آمدنی سابقہ سے زیادہ نہ تھی مگر حسنِ انتظام ایسا تھا کہ کسی کو شکایت کی گنجائش نہ ہوئی۔ اُنھیں پیسوں میں ملک کے نام ور ذاکرین، سوز خواں اور نوحہ خواں بلوائے گئے۔ عوام الناس کے لیے دودھ کی سبیلوں کا اہتمام الگ تھا۔ خیر یہ سب تو ایک طرف، اس دفعہ لوگوں نے بھی وہ جوش و خروش دکھایا گویا

پورا شہر اثنا عشری ہوگیا ہو۔ عزاداروں کا ایسا جم غفیر پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ دسویں کو زنجیر زنی اور کوئلوں پہ ماتم تو ایسا ہوا کہ کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ جس شخص نے پہلے کبھی بغلوں سے ہاتھ نہ نکالے تھے، اب وہ بھی سینہ کوبی کرتے نظر آئے۔ ہر ایک کا خیال تھا، یہ سب اسی وجہ سے ہوا کہ انتظام اب کے خادم کے ہاتھ میں تھا۔ یوں تو ہر شخص سید صادق کی وفات کے بعد خادم سے مشورے کے بغیر امام باڑے یا عزاداری کے متعلق کوئی کام نہ کرتا تھا مگر یہ اہمیت اعجاز رضوی کی شہادت پر اور بڑھ گئی۔ جب خادم نے اپنی جان پر کھیل کر قاتلوں کا پیچھا کیا اور ایک کو مار گرایا۔ اس عمل میں اس کی اپنی ٹانگ بھی زخمی ہوگئی جس کی وجہ سے مہینا بھر ہسپتال میں رہا۔ اور اس دوران کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو خادم کے لیے فکر مند نہ ہوا ہو۔ سادات و غیر سادات سب نے اس کی صحت یابی کے لیے دعا کی اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ صحت مند ہو کر آیا تو ہر ایک کو بے پناہ خوشی ہوئی اور اس صلے میں کوثر شاہ نے عزاداری کے انتظامات اُسے سونپ دیے۔ جس کا نتیجہ توقع سے زیادہ اچھا نکلا۔ ذاکر جیسے ہی مصائب کی طرف پلٹتا سب سے پہلے اسی کا بین اٹھتا اور اس قدر روتا کہ امام باڑے کے در و دیوار لرز لرز اٹھتے۔ ہر نماز کے وقت رائفل لے کر دروازے پر بیٹھ جاتا اور جب تک ایک بھی فرد نماز میں ہوتا، محافظت نہ چھوڑتا۔ امام باڑے سے ملحقہ کمرہ اس کے جینے مرنے کا سامان تھا۔ چوں کہ ہوش اسی کمرے میں سنبھالے تھے، لہٰذا ایک قسم کا وہ اُس کا اپنا گھر تھا اور کبھی یہ گمان بھی نہ رہا کہ یہ جگہ امام باڑے کی ہے۔ کمیٹی نے خادم حسین کا ماہانہ آٹھ ہزار مشاہرہ مقرر کر دیا جو اس سے پہلے سید صادق تقی کو ملتا تھا۔ دوسرا کام کمیٹی نے یہ کیا کہ وہ خادم کی شادی کے بارے میں بھی صلاح مشورے کرنے لگے اور جب اس کی خبر شرف النسا کو ہوئی تو وہ سجدے میں گر پڑی۔ خادم حسین کو اگرچہ کسی سبب سے یہ معلوم تھا کہ اُس کا سلسلہ ہیرا منڈی سے ہے مگر اُس نے کبھی شرف النسا کے ساتھ اس طرح کی بات نہ کی تھی اور نہ ہی شرف النسا نے اس موضوع کو کبھی چھیڑا۔ ماں بیٹے کے درمیان گویا ایک خاموش سمجھوتا تھا۔ البتہ ہر ماہ اپنی ماں کو اُن آٹھ میں سے چار ہزار باقاعدگی سے دیتا تھا۔ خادم اپنی خالہ کی عزت بھی ویسے ہی کرتا جیسے شرف النسا خانم کی کرتا۔ اُسے شاید اُن کے دھندوں سے کوئی غرض نہ تھی، بلکہ ہر طرف سے بے نیاز ایک ہی دھن تھی کہ امام مظلوم کی عزاداری اب کے کیسے زور شور سے کی جائے۔ وہ ہمیشہ انھیں ذرائع پر غور کرتا جو عزاداری سے متعلق ہوتے۔ خاص کر ذوالجناح کو سجانے اور زیور سے آراستہ کرنے میں تو ایسا جگر کو خون کرتا کہ عزاداروں کو بھی رشک آنے لگا تھا۔ اُس نے اپنی تنخواہ کا ایک حصہ ذوالجناح کے زیورات کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ اگرچہ عشرے کے روز ذوالجناح کی باگ پکڑ کر چلنے کی اُسے بہت حسرت تھی لیکن یہ کسی سید کا کام ہوتا تھا پھر بھی ہر حالت میں ذوالجناح کے ساتھ ساتھ چلتا۔ الغرض خادم کے بارے میں یہ طے تھا کہ اُسے سوائے عزاداری کے کسی سے کچھ غرض نہیں تھی۔

☆

نعمان سے اُس کا تعلق پچھلے سولہ سال سے تھا۔ جب اُس کی خالہ امام بارگاہ کی زیارت کرنے

آتی تو وہ اُس کی گود میں ہوتا۔ علم کو بوسہ دیتے وقت گود سے اُتارتی تو سیدھا خادم کی طرف بھاگا چلا آتا اور پھر خادم گھنٹوں اُس سے کھیلتا، کھلاتا اور چہلیں کرتا۔ نعمان کے خط وخال ایسے تھے کہ کوئی بھی دیکھ کر پیار کیے بنا نہ رہتا۔ تیکھے تیکھے نقوش ماں کی عین چغلی کھاتے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ رنڈی کا بچہ ہے۔ لڑکپن میں داخل ہوا تو دن میں ایک مرتبہ ضرور امام باڑے کا چکر لگاتا اور خادم کے پاس گھنٹوں وقت گزارتا۔ امام باڑہ اس کے اسکول کے رستے میں پڑتا تھا۔ لہٰذا آتے جاتے امام بارگاہ دوسرا گھر ہوگیا۔ اب نعمان انتظامی معاملات میں خادم کا بہت کچھ ہاتھ بھی بٹانے لگا تھا۔ جس کا فائدہ تو بہر حال تمام کو یکساں تھا۔ علاوہ ان باتوں کے سادات اور دیگر شیعہ حضرات کے لڑکے جو نعمان کے ہم عمر تھے، اُس کے اس طرح سے دوست بن گئے کہ یہ بھی اُسی طبقے کا حصہ بن گیا جس کا اٹھائیس سال پہلے خادم بنا تھا اور کسی کو خیال بھی نہ رہا کہ نعمان کی ماں دھندا کرنے والی ہے۔ البتہ نعمان میں ایک بات خادم سے الگ تھی، وہ لڑکیوں کے ساتھ کھلنے ملنے کی کوشش ضرور کرتا۔ حتیٰ کہ ایام عزا میں بھی اِدھر اُدھر تاکنے سے باز نہ آتا۔ جس کی وجہ سے خادم نے اُسے بہت دفعہ ڈانٹا بھی۔ وہ اس کی ان حرکات سے خوف زدہ تھا مگر نعمان کے اندر کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ظاہر کیے بغیر نہ رہتا۔ اب میٹرک کے بعد نعمان کی ماں نے اسے کالج میں داخل کرایا تو اس نے نیا گل کھلایا۔

اصل میں نزہت سے اس کی عشق بازی تو پچھلے چھ ماہ سے جاری تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکا تھا بھی طرح دار، کسی بھی لڑکی کا گرفتار ہوجانا دُور نہیں تھا۔ وہ کتابیں بغل میں داب جیسے ہی ہیرا منڈی سے کالج کے لیے نکلتا اور ٹھنڈی سڑک پر آتا تو دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا۔ اوّل اشارے ہوئے، پھر رقعے چھینکے جانے لگے اور اب بات ملاقاتوں تک آگئی تھی۔ لیکن دوسری طرف زمانہ سویا تھوڑا ہی تھا۔ اردگرد ہل چل ہونے لگی۔ آوارہ اور تلنگوں نے کان کھڑے کر لیے اور جب تحقیق سے بات کھلی کہ لڑکا کنجروں کا ہے تو اور بھی بھونچال آگیا۔ عزت نے پے در پے جوش کھائے۔ نعوذ باللہ، لاحول ولا کے آوازے بلند ہوئے۔ شرفا نے توبہ توبہ کی اور اس عذاب کو روکنے کے منصوبے ہونے لگے۔ نوجوان مرکزی اصلاحی کمیٹی کے سیکرٹری جنرل عبدالصمد کے ہاں پہنچے اور معاملہ زیر بحث آگیا۔

ایک: بھائی عبدالصمد غضب ہوگیا۔

دوسرا: جی، اب کے بھی اللہ عذاب نہ بھیجے تو پھر پتا نہیں کیا راز ہے؟

تیسرا: راز کیا ہونا ہے۔ اللہ ہماری غیرت کو آزما رہا ہے۔

چوتھا: دیکھو تو سہی، حرام زادہ ایک تو کنجر ہے اور اُوپر سے شیعہ بھی۔ رفیق بھائی! میں نے اُسے ہمیشہ امام باڑے میں دیکھا ہے۔

تیسرا: دیکھا ہے سے کیا مطلب؟ پورا کافر شیعہ ہے اور کنجر تو وہ ہے ہی۔

پہلا: اور اس نزہت بے غیرت کو دیکھو۔ اس کو یہی حرامی عشق لڑانے کو ملا تھا۔ اللہ قسم، پورے شہر میں سنّی

مسلمانوں کی ناک کٹوا دی۔ میرا بس چلے تو تیزاب میں غوطے دوں۔
عبدالصمد: بھائیو! یہ عورت ذات کی کوئی غیرت ویرت نہیں ہوتی۔ کہیں بھی پھسل گئی، پھسل گئی۔ غیرت تو مردوں کا خاصہ ہے اور وہ اللہ کے فضل سے ہم میں ہے۔ جبھی تو اس کا سدباب کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔
دوسرا: یہاں سنّی لڑکا ایک سے ایک پڑا ہے۔ کمینی کو یہ کنجر اور شیعہ ملا تھا؟
عبدالصمد: بھائی، اب ان باتوں کو جانے دو اور کوئی اقدام کرو۔ میرا خیال ہے لڑکی کے والد کو خبردار کرتے ہیں۔
چوتھا: اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بھی بے غیرت ہے۔ اور پھر دوسری بات تو یہ ہے کہ اس نومی کو سزا ابھی تو دینی ہے جو اب تک یہ عیاشیاں کر چکا ہے۔
دوسرا: پھر اب کیا کیا جائے؟ ناک تو کٹ گئی کوئی ایسا کام کریں جو پورا پورا بدلہ ہو جائے۔
عبدالصمد: دیکھو بھائی، ہم یہ لڑائی دو محاذوں پر لڑیں گے۔ ایک پر تم سب اور دوسری پر میں۔ پہلی لڑائی تم لڑو گے۔ دوسری میں لڑوں گا۔

اور پھر عبدالصمد نے سب کو ہر بات تفصیل سے سمجھا کر رخصت کر دیا اور خود اہلِ سنت کے مرکزی صدر مولانا عبدالباری کی طرف چل دیا۔ دوسرے دن سب نے اپنے اپنے کام کو ذہن میں رکھا اور صبح ہی چمن زار چوک پر اکٹھے ہو گئے۔

دیکھ انعام، آج یہ بچ کے نہ نکلے، تُو شریف کو اپنے ساتھ لے کر بوائز کالج کے گیٹ نمبر دو پر کھڑا ہو جا۔ ہمایوں، صابر کے ساتھ ٹھنڈی سڑک والی کینٹین پر رستہ داب لے۔ میں اور نوید یہیں آموں کے نیچے تحرا لگاتے ہیں۔ بس یہ تین ہی راستے نومی کنجر کے بھاگ نکلنے کے ہیں۔ رفیق تالیے نے دوسرے ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے کمر سے ہنٹر کھول لیا اور اسے ہلکے ہلکے گھمانے لگا۔

رفیق تالیے کی ہدایات پر انتہائی پھرتی سے عمل کیا گیا اور سب اپنے اپنے ہنٹر، بیلٹ اور چاقو نکال کر تیز آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ دوسری طرف نومی اس تمام منصوبہ بندی سے بے خبر کمپنی باغ میں برگد تلے انتظار کاٹ رہا تھا۔ آج اس کی نزہت کے ساتھ تیسری ملاقات تھی جو اپنی جذباتی حدوں کی طرف راستہ نکال رہی تھی۔ نزہت کے ان دنوں پیپرز ہو رہے تھے، لہٰذا اُس نے ساڑھے بارہ بجے پیپر سے فراغت کے فوراً بعد کمپنی باغ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا اور یہ لمحے نعمان کے لیے الانتظار اَشدّ مِنَ الموت کے مصداق بہت بھاری تھے۔ تھوڑی دیر نزہت کے رومال کو سونگھنے اور چومنے کے بعد اس نے اسے پینٹ کی جیب میں دوبارہ ڈال لیا اور ناخن کٹر نکال کر برگد کے تنے پر حروف کھودنے میں مصروف ہو گیا مگر لحہ لحہ بعد اس کی نگاہیں کمپنی باغ کے مشرقی گیٹ کی طرف اُٹھ جاتیں۔ وقت جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، دل کی دھڑکن تیز ہوئی جاتی تھی۔ اسی بے دھیانی میں کٹر کی نوک اس کی انگلی میں چبھ گئی اور وہ ایک سی کی آواز نکال کر رہ گیا۔ اسی لمحے اس نے نیلا پیرہن گیٹ کے اندر داخل ہوتے دیکھا تو انگلی کا درد بھول گیا۔ پھر تھوڑے ہی وقت میں دونوں آم کے پیڑ تلے باہم ہو گئے اور رومان کی لے چلنے لگی۔ آہستہ آہستہ نعمان کا سر نزہت کی گود

میں اس طرح جا پڑا گویا بے ہوشی کی دوا کھائی ہو۔ اور نزہت کی پتلی، لمبی اور نرم انگلیاں اُس کے بالوں میں ہلکے ہلکے چلنے لگیں۔ چہار جانب سے بے خبر وہ اسی سرور کے مزے لے رہے تھے کہ بلوہ ہو گیا اور ایک زور کا ہنٹر نعمان کی دائیں ٹانگ پر لگا۔ اسے ایک دم گویا بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ رفیق تالیے نے نزہت کا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا۔ نعمان نے آٹھ سات غنڈوں کو یوں چھری کانٹے سے لیس دیکھا تو چکرا گیا۔ اس نے ایسی بلائیں پہلے کہاں دیکھی تھیں مگر پھر جلد ہی سنبھلا اور اچانک دائیں جانب کے مشرقی گیٹ کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ لڑکوں کو اس سے ایسی توقع نہ تھی کہ یوں رنگے ہاتھوں پکڑا جانے کے بعد بھی بھاگ کھڑا ہوگا۔ آپا دھاپی میں سب پیچھے بھاگے اور پکڑو بھاگو کا شور بلند ہونے لگا۔ دوپہر ایک بجے کا عالم تھا اور کمپنی باغ میں آگے پیچھے دوڑیں تھیں۔ اردگرد کے لوگ تماشے کو رک رک پڑے۔ مگر نعمان یہ جا وہ جا گیٹ پار کر کے جنوبی سمت سے ٹھنڈی سڑک کو کاٹتا ہوا عطر والوں کی گلی میں جا نکلا لیکن وہ بھی کب پیچھا چھوڑنے والے تھے، برابر چڑھتے گئے۔ ادھر نعمان نے غوطہ کھایا کہ سیدھا کرچن روڈ سے ہوتا ہوا سید باقر شاہ کے مکان کو اُلٹے ہاتھ رکھ کر بھاگا اور حسینیہ امام باڑے کی گلی میں آ گیا۔ اُدھر سب لڑکے چاقوؤں سمیت پیچھے تھے اور خدا جانے رستے میں کیسے کیسے نعرے لگاتے آئے کہ امام باڑے تک آتے آتے پیچھا کرنے والے پچاسوں میں ہو گئے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا امام باڑے میں آ پناہ لی۔ خادم دروازے پر بیٹھا ظہرین ادا کرنے والے نمازیوں کا پہرہ دے رہا تھا۔ فوراً معاملے کی نزاکت کو بھانپ گیا اور دروازے پر مزید مستعد ہو گیا۔ اُن میں سے کسی نے اندر آنے کی جرأت تو نہ کی، البتہ نعرے لگانے شروع کر دیے اور نعروں میں ایسے ایسے لفظ بولنے لگے کہ معاملہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ خادم نے جب بڑھتے ہوئے شور اور ہجوم کو دیکھا تو دروازہ بند کر دیا اور نعمان کو زیارات کے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ باہر دروازے پر نعروں اور ہجوم کا مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ نمازیوں کو اصل صورت حال کا توفی الوقت ادراک نہ ہوا، البتہ بڑھتے ہوئے شور اور ہنگامے سے بوکھلا گئے اور جلدی جلدی نماز سے فارغ ہو کر حقیقت کا پتا لگانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں پولیس آ گئی جب کہ مجمع سیکڑوں میں جمع ہو کر خدا جانے کیا کیا نعرے لگا رہا تھا جس کی نمائندگی مولانا عبدالباری اور عبدالصمد کر رہے تھے۔

معاملہ انتہائی نازک صورت حال اختیار کرتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے شیعہ سنی فساد کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ پولیس نے یہ صورت دیکھی تو فی الفور طاقت اور آنسو گیس کا استعمال کرتے ہوئے مجمعے کو منتشر کر دیا اور معاملے پر کنٹرول حاصل کر کے اصل صورت کا جائزہ لینے لگے۔ حتیٰ کہ تین گھنٹے کی مسلسل کوششوں کے بعد ساری بات کھل کر سامنے آ گئی، البتہ اتنی سی تبدیلی کے ساتھ کہ نعمان کنجر ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو کالج آتے جاتے تنگ کرتا تھا اور بیہودہ مذاق کر کے اسے دق کرتا تھا۔ آج سرِعام اس کے ساتھ زبردستی کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اُسی لمحے چند لوگ پہنچ گئے۔ وہ جب نعمان کو پکڑنے لگے تو اس نے آ کر امام باڑے میں پناہ لے لی اور خادم نے اسے کمرۂ زیارات میں چھپا دیا۔ خیر، شام کے وقت ایس پی صاحب نے سرکردہ

شیعہ سنی افراد پر مشتمل ایک امن کمیٹی قائم کی اور حشا تک غیر مشروط طور پر معاملے کو رفع دفع کروا کے ایک دوسرے کے گلے ملوا دیا۔ اس طرح یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا اور بات آگے بڑھنے سے رک گئی۔ مگر دوسرے ہی دن ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی لیکن یہ کمیٹی صرف اور صرف معزز شیعہ افراد پر مشتمل تھی جسے ہنگامی طور پر کوثر شاہ نے قائم کیا تاکہ اس بدنامی کا سدِباب کیا جاسکے۔ کمیٹی کا اجلاس امام باڑے سے ملحقہ عین اُسی کمرے میں ہوا جو امام باڑے کے متولیوں کے رہنے کے لیے مخصوص تھا۔ سید تقی کے بعد جس میں اب خادم حسین رہتا تھا۔ اجلاس میں موجود تمام افراد کا تعلق عمر کے اس حصے سے تھا جہاں قریب جذبات کا گزر نہیں ہوتا اور کسی بھی نوجوان کو شامل نہ کیا گیا تاکہ کسی قسم کی اشتعال انگیزی نہ ہو۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر سید نذیر حسین نے سکوت توڑا اور کوثر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، شاہ جی سانس تو پہلے ہی اوکھلی میں چلتی ہے۔ اب یہ نیا قصہ ہماری ساکھ کو جو دھکا دے گیا، اس کی کوئی تلافی نہیں۔ سارے شہر میں گویا امام باڑا بدنام ہوگیا۔

مرزا صاحب: میں نے تو پہلے ہی کئی دفعہ کہا تھا کہ ان کنجروں سے رابطہ نہ رکھو لیکن یہاں تو ہر آدمی بقراط بنا ہے اور ہر چھوٹا بڑا انسانیت کے نغمے گانے لگتا ہے۔

سید شمس الحسن: مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اس چھوکرے کو ایسا کرتب کر کے امام باڑے میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اپنا رنڈی خانہ دور تھا، اُدھر بھاگ جاتا۔ اب ہر ایک یہی بھونکے گا کہ امام باڑہ تو اصل میں لفنگوں کا اڈا ہے اور یہاں کنجر پناہ لیتے ہیں۔

سید نذیر حسین: مجھے تو پہلے دن سے ہی اس لونڈے کے اطوار ٹھیک نہیں لگتے تھے اور اگر سچ پوچھو تو اس پورے قضیے کا ذمے دار نعمان نہیں خادم ہے۔ جو اوّل روز سے اسے چھوٹ دیتا رہا اور دن رات امام باڑے کو اس کا گھر بنا دیا۔

علی رضا: اس طرح تو پہلا قصور وار سید صادق آقی تھا جس نے خادم کو جگہ دی۔

سید شمس الحسن: میاں علی! آپ تو ہمیشہ اُلٹی بانکتے ہیں یعنی اب یہاں سید تقی کہاں سے آگیا۔ کیا اُس کا یہ گناہ تھا کہ اُس نے ایک رنڈی کے بیٹے کو انسان بنانے کی کوشش کی۔

سید علی حسین: شاہ صاحب، انسان پھر انسان ہے۔ غلطی ہر ایک سے ہو جاتی ہے۔ اُس کی سابقہ خدمات کو بھی نظر میں رکھو۔ اس معاملے میں خادم کا کیا قصور ہے؟ بے چارہ تیس سال سے سب کی خدمت میں مصروف رہا۔

سید نذیر حسین: میاں تم بیٹھے رہو۔ تمھیں نہیں پتا؟ یہ اُسی کا خالہ زاد ہے۔ کنجروں کی حمایت پہلے دن سے ہی تمھاری سرشت میں ہے۔ فرض کیا خادم اسے پناہ نہ دیتا تو کیا یہ بدنامی ہوتی۔ اور پھر غضب یہ کیا کہ کمرۂ زیارات میں چھپا دیا۔ لاحول ولا یعنی پاک جگہ پر نطفۂ حرام کو بند کر دیا۔ رہی خدمت کی بات؟ تو ہم پر کیا احسان کیا؟ مولا حسین کی عزاداری کی ہے۔

اس اچانک یاد دہانی نے کہ "نعمان کو دراصل کمرۂ زیارات میں چھپایا گیا" گویا جلتی پر تیل کا

کام کیا۔ ایک دم سناٹا چھا گیا، سب کے چہرے سرخ ہو گئے اور غصے سے کانپنے لگے۔ بعضوں کے چہروں پر سیاہی پھیل گئی گویا کسی عذاب کی نوید سنا دی ہو۔ کچھ دل ہی دل میں استغفار پڑھنے لگے اور مدافعت میں بولنے والی تمام زبانیں گنگ ہو گئیں۔

یعنی نعمان کو متبرکات کے درمیان چھپا دیا؟ حرام زادے کو؟ تم سب پر غازی پاک کا غضب نازل ہو۔ ابھی تک تم اسی فکر میں ہو کہ اب کرنا کیا ہے؟ آغا فیروز الحسن غصے سے کانپنے لگا۔ اس حرافہ کے بچے کی تو بوٹیاں نوچ دینی چاہئیں، بس نکالو، ابھی نکالو ان دونوں کو۔ اب میں ان کو ایک آنکھ نہیں دیکھنا چاہتا۔

سید کوثر شاہ (جو بڑی دیر سے خموش بیٹھا تھا، تحمل سے پہلو بدل کے بولا): دیکھو بھائی، قصہ تو یہ ہے کہ یہ ایک بڑا نامناسب کام ہوا ہے اور پورے شہر میں شیعہ کی بدنامی ہوئی ہے۔ جس میں میرا خیال ہے خادم اور نعمان برابر کے ذمے دار ہیں یعنی غلطی تو ہر ایک سے ہو جاتی ہے مگر اس طرح امام باڑے کی عزت کو داؤ پر لگانا واقعی گھناؤنا جرم ہے۔ لہٰذا اب آپ کوئی حتمی رائے دے کر فیصلہ کر دیں تاکہ آئندہ کے لیے کوئی سد باب ہو سکے۔

حاجی نذیر حسین: میری تو ایک رائے ہے کہ کوے کو دودھ سے سو سال نہلاؤ، وہ کالا ہی رہے گا۔ ان لیے اپنی عزت بچاؤ۔

اس طرح چار گھنٹے کے مسلسل صلاح مشورے سے کمیٹی نے ایک فیصلہ کر دیا جس پر تمام شیعہ معززین اور شرفا کے دستخط ثبت ہو گئے۔ اور اسی وقت خادم حسین کو بلا کر فیصلہ سنا دیا گیا۔ اُسے بتایا گیا کہ آئندہ اُسے مرکزی امام باڑے میں رہنے اور سادات و شرفا سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں۔ واپس اپنی ماں کے کوٹھے پر چلا جائے۔

جب خادم حسین چابیاں کوثر شاہ کے حوالے کر کے امام باڑے سے نکلا تو اُسے ایسے لگا جیسے اُس پر عذاب نازل ہو چکا ہے۔ شرف النسا کے کوٹھے پر پہنچا تو ایک بار یہ سوچ کر رُک گیا کہ اُسے تو ہیرا منڈی میں رہنے کے آداب ہی نہیں معلوم۔ تھوڑی دیر خالی الذہن کھڑا رہا، پھر بھاری قدموں سے آہستہ آہستہ کوٹھے میں داخل ہو گیا اور اپنا سر شرف النسا خانم کی گود میں رکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

☆☆☆

فیروز عابد

بستی کی ایک اُداس کہانی

دھوپ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

چار دنوں کی مسلسل بارش کے بعد اب جو دھوپ نکلی تو محلے کے بچے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ گھر کی عورتوں نے موقعے کو غنیمت جانا اور جلدی جلدی الگنی پر کپڑے پسارنے لگیں۔

جب گھروں کے آنگن میں جگہ نہیں بچی تو باہر محلے کے تنگ راستے میں ایک مکان سے دوسرے مکان پر پھیلے بجلی کے پلاسٹک پائپ، کیبل ٹی وی کے تار اور ٹیلی فون کے تاروں پر لگھی (لمبی لکڑی) سے کپڑے پسارنے لگیں۔

چار دنوں کی مسلسل بارش نے مجھے بھی قیدی بنا دیا تھا۔ صبح کے معمولات میں فرق آ گیا تھا۔

آج میں نے بازار کا تھیلا لیا اور ملنے جلنے والوں سے سلام دعا کرتا حسب عادت پہلے الیکٹرک بکس کے پاس جا کر میٹر ریڈنگ کی کہ ان چار دنوں میں کتنی بجلی صرف ہوئی، گوشت کی دکان پر گوشت کی قیمت دے ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کے وائر پر بیٹھے کوّے نے گل میاں پر بیٹ کر دی۔ انھوں نے کوّے کو گالی دی۔ تب ہی چھوٹو قصائی نے کہا،''سر پر بیٹ کرتا تو آپ بادشاہ بن جاتے۔'' گل میاں نے اس طرح مذاق بننے پر چھوٹو بھی کو ایک سڑی سی گالی دی۔ میں آہستہ سے کھسک آیا۔ مودی کی دکان جا کر سامان لکھوایا، دودھ والے کے پاس جا کر دودھ اور دہی کے پیسے دیے اور مٹھائی والے سے جلیبی خریدی۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے دودھ سے بھرے ٹفن کو تھاما، مودی کی دکان سے سامان سے بھرا تھیلا لیا اور پاؤ روٹی والے کے یہاں سے پوتے کے لیے کوارٹر روٹی، دودھ کے دو پیکٹ لیے اور گھر آ کر رین واٹر پائپ میں اٹکے تین اخبارات نکالے اور کمرے میں آ گیا۔ بازار کا تھیلا رکھ کر اخبار کی سرخیاں پڑھنے لگا۔ اتنے میں باہر شور غل کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازوں کا زور بڑھتا گیا۔

''کیا ہوا جگدیش؟'' میں نے برآمدے سے مہندر داس کے بیٹے کو آواز دی۔

''ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کاکا— شاید قصائی بستی کی طرف کچھ ہوا ہے۔ شاید دلت

لوگوں سے جھگڑا ہوا ہے... کوئی مرا بھی ہے۔''

یعنی فساد ہو گیا ہے۔ مگر ایسا کیسے ہوا اب کل ہی تو غیر منظم لفاف اور چمڑے کے کاریگر، جن کا تعلق دونوں فرقوں سے ہے، اپنے پی ایف کا فارم انجمن اسکول میں سر جوڑ کر بھر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو ان کا پاس بک بھی مل گیا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ پھر یہ کیا ہو گیا؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور ہی بات ہے، میں خود ہی دیکھتا ہوں۔

''کہاں جا رہے ہیں، پتا نہیں کیا ہوا ہوگا۔ کیوں بھیڑ بھاڑ میں جا رہے ہیں۔'' بیوی نے کہا۔

''جانتی تو ہو لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ ہوتی ہے تکرار اور اسے فساد کہہ دیتے ہیں اور پھر واقعی فساد ہو جاتا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں آخر بات کیا ہے؟'' قصائی بستی پہنچا تو معلوم ہوا، یہاں ہریجن کوارٹر میں شاید کچھ ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے معلوم نہیں۔ ہاں دو بچوں کے مرنے کی افواہ پھیلی ہوئی ہے۔

''افواہ ہے۔ یعنی صحیح علم آپ لوگوں کو نہیں؟''

''چچا معلوم نہیں کیا ہوا— پولیس آگئی ہے، کونسلر بھی ہیں۔ ادھر جانے سے ڈر لگتا ہے۔ پولیس نے فسادی مان کر پکڑ لیا تو ہمارے بال بچوں کا کیا ہوگا؟''

میں نے اس نوجوان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چہرے کی معصومیت پر خوف کی تہہ جمی تھی۔

میں نے بھیڑ سے معذرت چاہتے ہوئے آہستہ آہستہ ہریجن کوارٹر کی طرف قدم بڑھائے۔ پولیس لوگوں کو روک رہی تھی۔ کوارٹرز کے مین گیٹ کے اندر داخل ہونا منع تھا۔ اسی درمیان کونسلر نے مجھے دیکھ لیا۔

''آیئے! ماسٹر صاحب آیئے...''

پولیس والوں نے مجھے جانے دیا۔

''کیا ہوا...؟''

''ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہے... اتنا ضرور ہے تین چھوٹے لڑکے یہی کوئی سات آٹھ سال کے ہریجن کوارٹر سے لگے اسکول پر مرے پڑے ہیں۔ پولیس اور فائر بریگیڈ والے دیکھ رہے ہیں۔''

''فائر بریگیڈ...؟ کیا آگ لگی تھی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں—! کسی نے گھبراہٹ میں فائر بریگیڈ کو بھی اطلاع دے دی تھی۔''

ہم لوگ اسی طرح بہت دیر کھڑے رہے... بھیڑ کی آواز کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کی نظریں کبھی اسکول کی چھت کی طرف اٹھتیں اور کبھی ہریجن کوارٹر کے مین گیٹ کی طرف۔

اسی درمیان ایم ایل اے بھی آگئے۔ ''کیا ہوا دیدی— کیا ہوا ماسٹر صاحب؟'' ابھی ان کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کوارٹرز کے مین گیٹ سے پولیس والے اور فائر بریگیڈ کے کچھ لوگ نکلے۔ پولیس والوں نے ایک ساتھ ایم ایل اے کو سیلوٹ کیا اور کہا، ''سر! کیا آپ اندر چلیں گے— مگر اندر

بہت گرمی، گندگی اور گھٹن ہے— راستے غلاظت سے بھرے ہیں۔"

"جو بھی ہو، جانا تو پڑے گا— آخر بات کیا ہے۔ اس طرح لڑکے کیسے مر جائیں گے۔ ایسا کیسے ہوا، کیوں ہوا— اس کا حل نکالنا پڑے گا۔"

آپ لوگ بھی آئیے۔ انھوں نے مجھ سے اور کونسلر سے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"ایک ذرا سی غلطی... ایک ذرا سی بے احتیاطی نے تین بچوں کی جان لے لی۔ ایک بچے کے ہاتھ میں ساڑی کا دامن ہے، ایک کے ہاتھ میں ٹوٹی کمان والی پتنگ اور ایک الٹا پڑا ہے۔ فائر بریگیڈ کے آفیسر انچارج نے بتایا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"ہریجن کوارٹرز کے اوپر ہائی والٹیج کا ننگا تار ہے جس سے ویپر لیمپ کا کنکشن ہے۔ نیچے کوارٹر سے لکھی کے ذریعے ساڑیوں کو سوکھنے کے لیے ڈالا گیا تھا۔"

"مگر اسکول کی عمارت کے مین گیٹ پر تو تالا ہے، یہ بچے وہاں کیسے گئے؟"

ایم ایل اے اور آفیسر انچارج کے درمیان گفتگو چل رہی تھی۔ میں شاید دس برس پہلے ساتی جاگرن کمیٹی کی طرف سے کوارٹرز کے طویل وعریض احاطے میں گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ان گنت کمرے اور آنے جانے کے لیے کہیں دو فیت اور کہیں تین فیت کا گلیارہ نما راستہ مگر لوگوں کی اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ آج جب اندر داخل ہوا تو دلتوں کے کوارٹرز والی اس تنگ بستی کو بکری چھتری کی طرح آدمیوں سے ٹھسا ٹھس بھرا پایا، جیسے آدمی نہ ہوں، جیسے بکری ہی ہوں۔

ابھی میں پچھلے دنوں کو یاد کر ہی رہا تھا کہ کانوں نے ٹوٹتی گفتگو کے سلسلے کو جوڑ دیا۔ "عورتیں ہمیشہ اسی طرح لگھے کے ذریعے اسکول کے کنارے گلیارے سے بھیگے کپڑے پسارتی ہیں۔ کئی روز کی بارش کے بعد عورتوں نے کپڑے پسارے، بچوں نے پتنگ بازی شروع کی— ایک پتنگ کہیں سے کٹ کر آئی— گروہ کی شکل میں لڑکے اند آئے۔ ان لوگوں کے منع کرنے کے باوجود ان میں سے تین لڑکے اس طرف سے کسی طرح اسکول کی عمارت پر چڑھ گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا کوئی نہیں جانتا— بس تینوں لڑکوں کی عجیب وغریب دردناک چیخیں ابھریں اور ڈوبتی چلی گئیں— کوارٹرز کے محافظ نے کہا کہ مسلسل برسات کی وجہ سے جگہ جگہ چھت پر پانی جمع تھا۔ تینوں نے پتنگ کو نکالنے کی کوشش کی ہوگی۔ شاید کوئی ترکیب لگا کر ساڑیوں تک وہ لوگ پہنچ گئے اور پھر بھیگی چھت، بھیگی ساڑی اور ننگے ہائی وولٹیج کے الیکٹرک تار نے ان کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا— "فائر بریگیڈ کے افسر نے کہا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک کے بعد ایک کر کے کئی منظر گزر گئے۔۔ اس نوجوان کا چہرہ بھی سامنے آگیا، جس کی معصومیت پر خوف اور ڈر کی پرچھائیاں تھیں۔ ابھی تک لاشیں اوپر سے

اتاری نہیں گئی ہیں۔

کوئی نہیں جانتا یہ بچے کس کے ہیں — ہریجن کوارٹرز کے سامنے مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی والی قصائی بستی اور دلت بستی ہے۔

یہ بچے کس کے ہیں —؟

چیخ پکار ہر طرف ہے — بہت ساری مائیں اپنے بچوں کو ڈھونڈ رہی ہیں مگر...

چھت پر تو تین لاشیں ہیں۔

''کس بدنصیب کے بچے ہیں —'' ایک آواز ابھری... دکھ اور درد کے سایے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

''جلدی سے لاشوں کے نیچے لانے کا انتظام کیجیے۔'' ایم ایل اے نے فائر بریگیڈ والوں سے کہا اور باہر آکر ایک پان کی دُکان کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ کل کی طرح آج بھی انجمن اسکول میں پی ایف کے فارم کی خانہ پری، چمڑے، لفاف، سائیکل وین والے اور جلد سازی کرنے والے ہندو اور مسلمان مزدوروں کو کرنی تھی۔ مگر سارے دم سادے ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔

آخر کس کے بچے ہیں —؟

ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس ملی جلی آبادی والی بستیوں میں ایک ایسی اداسی تھی، جس کا کوئی رنگ نہ تھا۔ ہندو اور مسلمان سب ایک ہی جگہ جمع تھے۔

اس طرح بچے مر جائیں گے۔

کئی گھنٹوں کے لیے دونوں فرقوں کی مشترک اداسی ایک نئے باب کا اشاریہ بن گئی تھی۔

''معصوم بچے مرے ہیں، چاہے وہ کسی کے بھی ہوں۔'' دُکھنی دائی بار بار اس جملے کو دُہرا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ ان محلوں کے زیادہ تر بچے اسی کے ہاتھوں تو جنمے ہیں۔ دُکھنی دائی شاید یہی سوچ کر اور زور زور سے رونے لگی تھی۔ اس کے آنسوؤں کے تار جیسے میری آنکھوں میں جالے بن رہے تھے۔ میں آنکھیں ملتے ملتے جائے حادثہ سے اپنے محلے کی طرف لوٹنے لگا۔ گلی گلی تیز قدموں سے گزر رہا تھا کہ خدا کی اس بستی میں گلیاں ہی ہیں اور ان گلیوں ہی بھر آسمان۔ کوئی سڑک نہیں۔

میں نے آنکھوں کا ملنا بند کیا، کھلی آنکھوں سے آسماں تاکنے کی کوشش کی مگر آسمان...؟

کہیں کپڑے، کہیں تار... کہیں کپڑے، کہیں تار۔

گھر پہنچ کر لڑکھڑاتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔

کچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

ان تاروں کے شاک نے تین معصوموں کی جان لی۔ ہم کیبل ٹی وی، بجلی اور فون کے تاروں کے جال میں ہیں۔ ہم سے ہمارا آسمان چھنتا چلا جا رہا ہے۔

لیٹے لیٹے میں نے ماں کی تصویر کی طرف دیکھا۔ ''آپ کے زمانے میں تو یہ حال نہیں تھا نا؟''

''یہ بچے پتنگ اڑانا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟'' اچانک پشت سے میری بیوی کی آواز ابھری۔

اس دکھ اور بدحواسی میں بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''چھین لو اپنے پوتے اور نواسے سے پتنگ —''

دوسری صبح حسبِ معمول تاروں کے جال پر پیارے پیارے کپڑے ہم پر خندہ زن تھے۔ وشوکرما پوجا کی آمد کی خوشی میں پتنگ کی دکان میں لڑکوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

نوبیل امن

مارٹن لوتھر کنگ / باقر نقوی

اعلانِ تجلیل

بہت زیادہ برس نہیں گزرے ہیں کہ مارٹن لوتھر کنگ کا نام دنیا بھر میں مشہور ہو گیا ہے۔ نو برس قبل، ریاست الاباما کے شہر 'مانٹ گومری' میں نیگرو عوام کے رہنما کی حیثیت سے انھوں نے سفید فام افراد کے ساتھ برابری کی بنیاد پر عوامی ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کے حق کے لیے تحریک شروع کی تھی۔

مگر اس لیے نہیں کہ انھوں نے ایک نسلی اقلیت کی برابری کی جدوجہد کی رہنمائی کی تھی، جس کی وجہ سے مارٹن لوتھر کنگ کو شہرت ملی۔ ایسا تو بہت سے لوگوں نے کیا ہے اور ان لوگوں کے نام بھلا دیے گئے ہیں۔

لوتھر کنگ کا نام باقی رہے گا کہ انھوں نے جس انداز سے جدوجہد چلائی ہے اور جن الفاظ سے انھوں نے بنی نوع انسان کو مخاطب کیا تھا، وہ الفاظ ان کی شخصیت کی پہچان بن گئے:

''جو بھی تمھارے داہنے رخسار پر طمانچہ مارے، اس کو بایاں رخسار بھی پیش کر دو!''

دسمبر ۱۹۵۵ء میں پچاس ہزار سیاہ فام باشندوں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور فتح پائی۔ یہ تو ابتدا تھی۔ اس وقت مارٹن لوتھر کنگ کی عمر صرف چھبیس برس تھی۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھے، اس کے باوجود پختہ کار ہو چکے تھے۔

اُن کے والد ایک پادری ہیں، جنھوں نے کسی کی مدد کے بغیر اپنی زندگی بنائی اور اپنے بچوں کو اچھا گھریلو ماحول فراہم کیا جس میں ان کو نسلی منافرت کی ذلت سے بچانے کی کوشش کی۔ رنگ دار جلد کے عوام کی ترقی کی قومی انجمن کے رُکن، اور ایک عام شہری کی حیثیت سے، وہ شہری حقوق کی تحریکوں میں شریک رہے اور ان کے بچے بھی انھی کے نقشِ قدم پر چلے۔ کم سنی ہی میں مارٹن لوتھر کنگ کو افراد اور کمیونٹی کے ساتھ کی جانے والی معاشی ناہمواری کا ادراک ہو گیا تھا۔

بچپن ہی سے ان کے ذہن پر اس کے اَن مٹ نقوش مرتسم ہو گئے تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں جس سے ثابت ہو سکے کہ کم سنی ہی میں انھوں نے سیاہ فام افراد کے حقوق کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

طالب علمی کے دور میں ان کا زیادہ وقت شمالی ریاستوں میں گزرا، جہاں اگرچہ قوانین ویسی نسلی تفریق برتنے کی اجازت نہیں دیتے تھے جیسی کہ انھیں جنوب میں جھیلنی پڑتی تھی، مگر روزانہ کی زندگی میں سفید اور سیاہ فام اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی شمالی ریاستوں میں رہن سہن، خصوصاً یونی ورسٹی کا معاشرتی ماحول تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ باسٹن یونی ورسٹی میں، جہاں سے انھوں نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، ان کی ملاقات 'کوریٹا اسکاٹ' سے ہوئی تھی جو موسیقی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ وہ ان ہی کی ریاست الاباما کے ایک اوسط درجے کے سیاہ فام خاندان کی فرد تھیں، جو جنوب ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

شادی کے بعد اس نوجوان جوڑے کو ایک فیصلہ کرنا تھا: وہ شمال ہی میں رہیں جہاں زندگی کے لیے زیادہ تحفظ اور بہتر ماحول میسر تھا، یا وہ جنوب واپس چلے جائیں؟ انھوں نے جنوب واپس جانے کا فیصلہ کیا جہاں مارٹن لوتھر کنگ کو 'مانٹ گومری' میں Baptist پادری کا عہدہ مل گیا تھا۔

ان کی زندگی ایسی سوسائٹی میں گزری جہاں سیاہ فام اور سفید فام کے درمیان ایک کڑی باڑ موجود تھی۔ اس سے بدتر یہ بات تھی کہ سیاہ فام کمیونٹی خود آپس ہی میں بٹی ہوئی تھی۔ اس کے رہنما پیکار میں رہتے اور ہر درجے کے لوگ اپنے تعلیم یافتہ ارکان کی بے حسی سے نالاں تھے۔ ان کی مردہ دلی کی وجہ سے بہت کم لوگ سیاہ فام افراد کی ترقی کے کاموں میں دل چسپی لیتے تھے۔ اکثریت بالکل لاپروا تھی، اور وہ جنھیں کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا، جو تھوڑا بہت انھیں میسر تھا، اس کے چھن جانے کے خوف میں مبتلا رہتے تھے۔

جیسا کہ مارٹن لوتھر کنگ کو معلوم ہوا، سیاہ فام پادریوں کو اپنی کمیونٹی کے سماجی مسائل کی کوئی پروا نہیں تھی: بہتوں کی رائے یہ تھی کہ مذہبی رہنماؤں کو عوام کی سماجی اور معاشی بہتری کے لیے کام کرنے والی لامذہب تحریکوں سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ انجیل کا پرچار کریں اور انسانی دماغوں کو آسمانی (مذہبی) معاملات پر مرتکز رکھیں۔

۱۹۵۵ء کی ابتدا میں مختلف سیاہ فام گروہوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ مارٹن لوتھر کنگ کا کہنا تھا کہ ''سیاہ فام کمیونٹی کی المناک تفریق کسی ربانی معجزے ہی سے دور ہو سکے گی۔''

وہ مانٹ گومری کے حالات کی جو تصویر کشی کرتے ہیں، وہ کسی طرح بھی امید افزا نہیں؛ ۱۹۵۴ء کے آخر میں بھی سیاہ فام افراد نے اپنے موجودہ رتبے کو ایک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا تھا، اور کسی نے بھی عملی طور پر اس نظام کی مخالفت نہیں کی تھی۔ مانٹ گومری ایک پُرامن شہر تھا۔ مگر اوپری سطح کے نیچے بے چینی سلگ رہی تھی۔ کچھ سیاہ فام پادری، اپنے خطبوں اور ذاتی رویوں سے سیاہ فام کی برابری کے مسائل کے چیمپین بنے ہوئے تھے، جس نے بہتوں کو تازہ اعتماد اور ہمت دی تھی۔

پھر ۵ردسمبر ۱۹۵۵ء کا بائیکاٹ ہوا۔

ایسا لگتا تھا جیسے یہ بائیکاٹ محض ایک اتفاق کا نتیجہ تھا۔ ظاہرہ وجہ تو ایک بس میں اپنی نشست ایک سفید فام کو دینے سے انکار کی وجہ سے مسز 'روزا پارکس' کی گرفتاری تھی۔ وہ بس میں سیاہ فام افراد کے لیے

مخصوص حصے کی ایک نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں، جو سفید فام افراد کے لیے مخصوص حصے سے ملحق تھا اور وہ حصہ بھر چکا تھا۔

مسز پارکس کی گرفتاری نے نہ صرف عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی، بلکہ ان کو راست اقدام پر اکسایا، جو اس وجہ سے ہوا تھا کہ مارٹن لوتھر کنگ کو سیاہ فام افراد کے لیے انسانی حقوق کی تحریک میں مرکزیت ملنے والی تھی۔

انھوں نے اپنی کتاب Stride toward Freedom میں لکھا ہے کہ صرف بس کا تنازعہ ہی نہیں بلکہ ۵ر دسمبر کا بائیکاٹ شروع ہونے کے بعد، ان کو ادارے کا صدر نشین چن لیا گیا تھا تا کہ وہ تحریک کو آگے بڑھائیں۔

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ انتخاب ان کے لیے حیرت کا باعث تھا: اگر ان کو سوچنے کا موقع دیا جاتا تو غالباً وہ انکار کر دیتے۔ جب ۴ر دسمبر کو ان سے کہا گیا تو انھوں نے مدد کی تھی، مگر وہ سمجھنے لگے تھے کہ عیسائیت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اس تحریک کی ابتدا اخلاقی طور پر صحیح تھی۔ تب انھیں ڈیوڈ تھوریو کا مضمون ''شہری نافرمانی'' یاد آیا جسے انھوں نے اپنے ابتدائی دنوں میں پڑھا تھا اور جس نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ ان کو تھوریو کے مضمون کا ایک جملہ یاد آ گیا: ''ہم اب کسی شیطانی نظام کی مدد نہیں کر سکتے۔''

مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے کہ بائیکاٹ کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اتوار ۴ر دسمبر کی شام تک انھیں یقین تھا کہ ساٹھ فی صد نیگرو اس سے اتفاق کریں گے، اور یہ کافی حد تک کامیاب ہوگا۔

۵ر دسمبر کی صبح، جب ایک بس کے بعد دوسری بس، بغیر کسی نیگرو مسافر کے گزری تو انھیں احساس ہوا کہ بائیکاٹ صد فی صد کامیاب ثابت ہوا ہے۔

مگر آخری فتح حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لیے کہ ابھی تک کسی نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ تحریک ''تشدد کا بدلہ تشدد سے نہیں لیا جائے گا'' کے نعرے کے مطابق چلائی جائے گی۔ مارٹن لوتھر کنگ نے ۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہزاروں افراد سے مخاطب ہو کر یہ پیغام دیا تھا۔ ان کے مطابق انھوں نے ایسی فیصلہ کن تقریر پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے:

''ہم نے اکثر اپنے سفید فام بھائیوں کو یہ احساس دلایا ہے کہ ہم سے جو سلوک کیا جاتا ہے ہم اس سے مطمئن ہیں۔ مگر آج رات ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں اس برداشت سے بچایا جائے جو ہمیں آزادی اور انصاف سے کم کسی چیز پر صبر کرنے پر تیار کرتی ہے۔

مگر ہمارا طریقۂ کار ترغیب کا ہوگا، جبر کا نہیں۔ ہم اپنے لوگوں سے صرف اتنا کہیں گے کہ 'اپنے ضمیر کو اپنا رہنما بناؤ' ہمارے قدم عیسائی تعلیمات کے اصولوں کی رہنمائی میں ہی اٹھیں گے، ایک بار پھر ہمیں یسوع مسیح کے الفاظ سننے ہوں گے جو صدیوں سے فضاؤں میں گونج رہے ہیں:

''اپنے دشمن سے محبت کرو، جو تمھارے لیے بددعا کرے اس کے لیے برکت کی دعا کرو، اور

ان سب کے لیے بھی دعا کرو جو تمھیں کینہ پروری سے استعمال کریں۔''

آخر میں انھوں نے کہا:

''تم جی داری سے احتجاج کروگے مگر وقار اور عیسائی محبت کے ساتھ، [تاکہ] جب تاریخ لکھی جائے تو تاریخ دانوں کو یہ کہنا پڑ جائے 'کیا عظیم لوگ تھے ـــ وہ سیاہ فام لوگ، جنھوں نے ہماری تہذیب کی رگوں میں وقار کے نئے معنی داخل کر دیے ہیں۔' یہ ہمارے لیے چیلنج ہے اور یہی ہماری زبردست ذمے داری ہے۔''

یہ نعرہ تھا ہی ایسا کہ سننے والوں کے دلوں میں اُتر گیا۔ جیسا خود مارٹن لوتھر نے کہا، یہ مانٹ گومری کے لیے ایک تاریخی لمحہ تھا۔

ان کے الفاظ نے نیگرو اکثریت کو انسانی حقوق کی جدوجہد پر آمادہ کر دیا۔ پورے جنوب میں، اس نعرے کے جذبے سے مست ہوکر، لوگوں نے سیاہ فام اور سفید فام کے درمیان، ریستورانوں، دکانوں، اسکولوں، عوامی پارکوں اور کھیل کے میدانوں میں نسلی تفریق کے خلاف دھاوا بول دیا۔

ایسی زبردست حمایت کیسے ممکن ہوئی؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اس مضبوط پوزیشن پر نظر کرنی پڑے گی جو نیگرو عوام میں مذہبی رہنماؤں کو حاصل ہے۔ فرصت کے اوقات میں گرجا گھر ہی ان کی آخری پناہ گاہیں ہوتی ہیں؛ یہیں، اپنی روزانہ کی مشکلات کے باوجود ان کی شخصیتیں ارفع ہوجاتی ہیں ـــ اُن اپیلوں پر ہی عمل نہیں ہوتا جو کہتی ہیں کہ بغیر اسلحے کے جنگ لڑو، اس لیے کہ سیاہ فام افراد میں مذہب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔

کانگریس میں منظور کیے گئے قوانین اور امریکی عدالتِ عالیہ میں دیے گئے فیصلوں کے باوجود، یہ جدوجہد کہیں بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی، اس لیے کہ ان قوانین اور فیصلوں کے ساتھ تخریب کاری کی گئی تھی، جیسا کہ ۱۹۵۵ء کے بعد ہونے والے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔

تخریب کاری اور قید و بند کے باوجود نیگرو عوام نے اپنی تہتی جدوجہد جاری رکھی۔ شاید ہی کبھی انھوں نے اُن اصولوں کے خلاف 'تشدد کا بدلہ تشدد' سے کام لیا جو اُن کے لیے بنائے گئے تھے، حالاں کہ ہمارے نزدیک فوری ردِعمل ہونا لابدی تھا۔ ہم ان نوجوان طالب علم افراد کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جو ریستورانوں میں سفید فام کے لیے مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے تھے؟ ان کو کھانا نہیں دیا گیا، مگر وہ بیٹھے رہے۔ سفید فام لڑکوں نے ان کی ہنسی اڑائی، توہین کی اور جلتی ہوئی سگریٹ سے ان کی گردنوں کو داغا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کے پاس وہ طاقت تھی جو صرف یقین ہی دے سکتا ہے: یقین کہ وہ اپنے ایک حق کے لیے لڑ رہے ہیں اور ان کی جدوجہد ضرور کامیاب ہوگی، اس لیے کہ وہ پُرامن طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔

مارٹن لوتھر کنگ کا یقین سب سے پہلے تو یسوع مسیح کی تعلیمات میں پیوست ہے، مگر کوئی بھی پوری طرح ان کو سمجھ نہیں سکتا، جب تک کہ اُسے یہ علم نہ ہو کہ وہ ماضی اور حال کے عظیم دانش وروں کے خیالات کے زیرِ اثر ہیں۔ ان کو مہاتما گاندھی نے بہت متاثر کیا ہے، جن کی مثال نے انھیں قائل کیا ہے کہ

اسلحے کے بغیر بھی جدوجہد کامیاب ہوسکتی ہے۔ گاندھی کو پڑھنے سے پہلے، وہ تقریباً اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ یسوع مسیح کی تعلیمات پر صرف افراد کے بارے میں عمل کیا جاسکتا ہے؛ مگر گاندھی کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ "تاریخ میں گاندھی غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے یسوع مسیح کی محبت کے اخلاق کو محض افراد کے درمیان باہمی عمل کی سطح سے بلند کر کے ایک طاقت ور اور موثر سماجی قوت بنا دیا تھا۔"

گاندھی کی تعلیمات میں انھیں ان سوالوں کے جوابات مل گئے تھے جو کافی عرصے سے انھیں پریشان کر رہے تھے: معاشرتی اصلاحات کے لیے انسان کو کیا کچھ کرنا ہوتا ہے؟

وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ "مجھے پتا چلا کہ گاندھی کا عدم تشدد تحریک کا فلسفہ ہی اخلاقی اور عملی اعتبار سے جبر کے شکار انسانوں کی جدوجہد آزادی حاصل کرنے کے لیے درست طریقہ ہے۔"

مارٹن لوتھر کنگ پر ہر سمت سے یلغار ہوئی ہے۔ سب سے بڑی یلغار وہ مزاحمت تھی جو سفید فام شدت پسندوں کی طرف سے درپیش تھی۔ اعتدال پسند سفید فام اور خود ان کی نسل کے لوگوں کا بھی خیال تھا کہ وہ بہت تیز چل رہے ہیں، کہ ان کو انتظار کرنا چاہیے اور انھیں وقت کو اپنی مخالفتوں کو کم زور کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

آٹھ پادریوں نے اپنے ایک کھلے خط میں اس پہلو اور دوسرے پہلوؤں کی طرف ان کو متوجہ کیا تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ نے ۱۹۶۳ء میں برمنگھم جیل سے اپنے ایک خط میں ان الزامات کا جواب دیا تھا۔ میں اس خط کی کچھ سطور پیش کرنا چاہوں گا:

"حقیقت یہ ہے کہ وقت خود غیر جانب دار ہوتا ہے — انسانی ترقی کبھی ناگزیریت کے پہیوں پر چل کر نہیں آتی۔ یہ انسانوں کی ان تھک کوششوں سے آتی ہے، جو خدا کے ساتھ مل کر کام کرنے پر تیار ہوتے ہیں، اور اس محنت کے بغیر وقت خود سماجی جمود کی قوتوں کا اتحادی بن جاتا ہے۔"

اس الزام کے جواب میں جو اُن پر لگایا تھا، انھوں نے کہا:

"آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ مذاکرات ہونے چاہییں۔ دراصل راست اقدام کا مقصد ہی یہی ہے۔ عدم تشدد کا راست اقدام، ایسے تناؤ کو اپنانا چاہتا ہے کہ ایک کمیونٹی جس نے مذاکرات سے بار بار انکار کیا ہے، موضوع کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جائے۔"

وہ اُن لوگوں کو یاد دلاتے ہیں کہ نیگرو عوام کو انسانی حقوق کے سلسلے میں قانونی طریقے سے بار بار کوشش کرنے اور تشدد اختیار کیے بغیر ایک بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ جب ان سے جدوجہد کے دوران قانون شکنی کے بارے میں دوبارہ پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا:

"دو طرح کے قوانین ہوتے ہیں: منصفانہ اور غیر منصفانہ۔ غیر منصفانہ قانون ایک ضابطہ ہوتا ہے جو اخلاقی قانون کے مطابق نہیں ہوتا —

غیر منصفانہ قانون ایک ضابطہ ہوتا جو اقلیتی گروہ کو عددی اور طاقت ور اکثریتی گروہ کی فرماں برداری

پر مجبور کرتا ہے، مگر خود اکثریتی گروہ اس کو اپنے اوپر لاگو نہیں کرتا۔

جو ایک غیر منصفانہ قانون توڑتا ہے، اُس کو اس عمل کو کھلے اور محبت کے انداز میں کرنا اور سزا کو قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

مارٹن لوتھر کنگ نے کلیسا کی بھی خبر لی۔ مانٹ گومری کے بس کے تنازعے کے دوران انھیں توقع تھی کہ پادری اور یہودی رہنما ربی، کے پکّے ساتھی ہوں گے۔ مگر ان کو بہت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سب کے سب، ہمت ور ہونے سے زیادہ محتاط رہے اور سن کر دینے والی حفاظت اور کلیسا کے نقشین رنگین شیشوں کے پیچھے خاموش بیٹھے رہے تھے۔''

سفید فام کلیسا کے نمائندوں سے مارٹن لوتھر کنگ کی مایوسی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں، اس لیے کہ عیسائی تعلیمات کی سب سے پہلی تعلیم یہی تھی کہ ''تم اپنے پڑوسی سے محبت کرو گے۔''

تفریق کے خلاف جنگ میں اگر فتح ہوئی تب بھی معاشیاتی میدان اور سماجی ملاپ میں نسلی تعصب تو جاری رہے گا۔ ایک حقیقت پسند ہونے کے ناتے مارٹن لوتھر کنگ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنی کتاب Strength to Love میں وہ لکھتے ہیں:

''عدالت کے احکام اور وفاقی ایجنسیاں عدم تفریق میں تو بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں، مگر عدم تفریق صرف ایک جزوی، اگرچہ ضروری، قدم ہے، اس ہدف کی طرف جو ہم بالآخر حاصل کرنا چاہتے ہیں، یعنی عام، مگر خالص گروہوں کے مابین اور باہمی رہن سہن۔

مگر کسی عمل کو بھی آدمیوں کے دل اور روح کو چھونا چاہیے تاکہ وہ روحانی طور پر قریب آئیں، اس لیے کہ یہ فطری بھی ہے اور صحیح بھی۔''

سچے پڑوسیوں کے مابین حقیقی انضمام اُسی وقت ہو سکے گا جب ان فرائض کو دلی طور پر قبول کیا جائے جن کو قانونی طور پر لاگو نہ کیا جا سکتا ہو۔

مارٹن لوتھر کنگ کی نہتی جدوجہد ان کے اپنے ملک میں چلائی گئی ہے؛ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ''صدیوں پرانا، روایتی اور بے رحم تنازعہ اب اپنے حل کے قریب آپہنچا ہے۔''

کیا یہ ممکن ہے کہ وہ راستہ جو انھوں نے اور ان کے عوام نے اپنے لیے متعین کیا ہے، دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی امید کی روشنی پھیلائے، ایسی امید جو نسلوں، قوموں اور سیاسی نظاموں کے درمیان کے تنازعات کو سلجھا سکتی ہے، نہ آگ سے اور نہ تلوار سے، بلکہ ایک سچی برادرانہ محبت سے؟

کیا ہمارے شاعر Arnulf Overland کے الفاظ سچ ہو سکیں گے؟

''نہتے صرف ابدی منبعوں پر ہی اعتبار کر سکتے ہیں۔ صرف روح ہی فتح دلاتی ہے۔''

یہ (الفاظ)، ایک بے واسطہ اور نامعلوم خواب کی مانند محسوس ہوتے ہیں: مگر خواب کے بغیر اور خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کیے بغیر زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں۔

آج کا انسان جوہری بم کا حامل ہے اور وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے اسلحے اور فوجی ساز و سامان کو ایک طرف رکھ کر اس پیغام کو سنیں جو مارٹن لوتھر کنگ نے اپنی امن کی جدوجہد کے دوران اپنی نسل کی جانب سے ہمیں دیا ہے۔ لوتھر کنگ اپنے ملک کی سرحدوں سے پرے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''پہلے سے کہیں زیادہ، میرے دوست، تمام نسلوں اور قوموں کے آدمی، آج پڑوسی ہوتے ہوئے بھی چیلنج کیے جا رہے ہیں — اب ہم زیادہ عرصے تک ایک دوسرے سے الگ رہنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسی غلطی کبھی اخلاقی ناکامی کہلاتی تھی؛ آج یہ ہمیں آفاقی خودکشی کی طرف لے جائے گی —

اگر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ بنی نوع انسان کو باقی رہنے کا حق ہے، تو ہمیں جنگ اور تباہی کا متبادل تلاش کرنا ہوگا۔ خلائی جہازوں اور میزائلوں کے ہمارے دور میں دو ہی راستے ہیں: عدم تشدد کا راستہ یا عدم وجود کا راستہ۔''

اگرچہ مارٹن لوتھر کنگ خود کسی بین الاقوامی تنازعے میں ملوث نہیں، مگر ان کی اپنی جدوجہد امن، مندر سے بجائے جانے والے ناقوس کی آواز کی مانند ہے۔

وہ مغربی دنیا کے پہلے شخص ہیں جس نے دکھا دیا ہے کہ بغیر تشدد کے بھی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ جدوجہد کے دوران برادرانہ محبت کو ایک حقیقت بنانے میں بھی انھوں نے پہل کی ہے اور ان کا یہ پیغام تمام آدمیوں، تمام قوموں اور تمام نسلوں کے لیے ہے۔

آج ہم مارٹن لوتھر کنگ کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں، جو کبھی جدوجہد پر اپنے عقیدے سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے، جنھوں نے اپنے عقیدے کی خاطر دکھ جھیلے ہیں، کئی بار قید ہوئے، ان کا گھر بموں کا نشانہ بنا ہے، ان کی اپنی اور ان کے خاندان کی زندگیاں ختم کرنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں ہیں، پھر بھی ان کا عزم لڑکھڑایا نہیں ہے۔

ناروے کی پارلیمان کی نوبیل کمیٹی نے امن کے اس بہادر داعی کو ۱۹۶۴ء کا امن انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

خطبہ — امن اور انصاف کی جستجو

ناروے کی پارلیمان کی نوبیل کمیٹی کے شکریے کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ میں اپنا خطبہ شروع کروں، جس نے اتنے بڑے اعزاز سے مجھ کو اور ریاست ہائے متحدہ میں شہری آزادی کی تحریک کو نوازا ہے۔ انسان کی زندگی میں اکثر اوقات تکمیل و اتمام کے ایسے ناقابلِ بیان لمحات آتے ہیں جن کی تشریح ان علامتوں کے ذریعے نہیں کی جا سکتی جن کو الفاظ کہتے ہیں۔ ان کے معنی کا اظہار دل کی ناقابلِ سماعت زبان کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا ہی لمحہ ہے جس کا اس وقت مجھے تجربہ ہو رہا ہے۔ میں اس اعلیٰ اور دل خوش کن لمحے سے

تنہا ہی نہیں بلکہ عدم تشدد کے تمام پیروکاروں کی طرف سے محظوظ ہو رہا ہوں، جو نسلی نا انصافی کے بے درد پشتے کے خلاف بڑی ہمت سے کام کر رہے ہیں، اور اس عمل کے ذریعے جنھوں نے اپنی انسانی قدر کے نئے تخمینے متعین کر دیے۔ ان میں سے بہت سے نوجوان بھی ہیں اور مہذب بھی۔ بقیہ بڑی عمر کے اور عام درجے کے افراد ہیں۔ ان کی اکثریت مفلس اور غیر تعلیم یافتہ ہے۔ مگر سب ایک خاموش عقیدے کے ساتھ اس بات پر متحد ہیں کہ ذلت کی تفریق کو قبول کرنے سے بہتر ہے کہ وقار کے ساتھ دکھ سہ لیے جائیں۔ یہی آزادی کی جدوجہد کے حقیقی ہیرو ہیں: یہ شریف لوگ ہیں، میں جن کی جانب سے نوبیل امن کا یہ انعام قبول کر رہا ہوں۔

اس شام میں اس تاریخی اور بلند و بالا شہ نشین کو اس تکلیف دہ مسئلے پر بات کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں جو آج بنی نوع انسان کو درپیش ہے۔ جدید دور کا انسان اس پوری دنیا کو مستقبل کی پُرجلال دہلیز پر لے آیا ہے۔ وہ سائنسی کامیابیوں کی حیرت انگیز بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔ اس نے مشینیں بنائی ہیں جو سوچتی ہیں، اور ایسے اوزار بنا لیے ہیں جو ستاروں کے درمیان خلاؤں کے ناقابلِ عبور علاقوں میں جھانک سکتے ہیں۔ اس نے سمندروں کو پار کرنے کے لیے عظیم الجثہ پل اور آسمانوں کو بوسہ دینے کے لیے دیوقامت عمارات تعمیر کر لی ہیں۔ اس کے ہوائی جہازوں اور خلائی جہازوں نے طویل فاصلوں کو مختصر کر دیا ہے، وقت کو زنجیر کر دیا ہے اور کرۂ ہوائی میں شاہراہیں تعمیر کر دی ہیں۔ یہ جدید انسان کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کی چندھیا دینے والی تصویر ہے۔

پھر بھی، سائنس اور ٹکنالوجی میں ایسی نظر فریب چھلانگ، اور مستقبل میں بہت سی آنے والی غیر محدود چھلانگوں کے باوجود، کچھ بنیادی شے ہے جو ابھی ہاتھ نہیں لگی ہے۔ جذبے کا ایک قسم کا افلاس ہے جو ہماری سائنسی اور تکنیکی بہتات کے تاب دار تقابل کے بیچ حائل ہے۔ مادی اعتبار سے ہم جتنے زیادہ متمول ہیں، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اتنے ہی زیادہ قلاش ہیں۔ ہم نے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا اور مچھلی کی طرح سمندر میں تیرنا سیکھ لیا ہے مگر ہم بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہنے کا سادہ ترین فن نہیں سیکھ سکے ہیں۔

ہر آدمی، اندرونی اور بیرونی، دو دائروں میں رہتا ہے۔ ہمارا اندرون روحانی دائرے کا آخری سرا ہوتا ہے جس کا اظہار فن، ادب، اخلاقیات اور مذہب میں ہوتا ہے۔ ہمارا بیرون پرزوں، تکنیک، کارزار اور اوزاریات کی پیچیدگی ہے جس کے ذریعے ہم زندہ رہتے ہیں۔ آج ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اندرون کو بیرون میں گم ہو جانے دیا ہے۔ ہم وہ کام کرتے ہیں جن کے ذریعے اُس سرے کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جن کے لیے ہم زندہ رہتے ہیں۔ جدید دور کی زندگی کو شاعر Thoreau کے کمال نے کتنی خوب صورتی سے چند لفظوں کے اپنے مقولے میں سمو دیا ہے "Improved means to an unimproved end"۔ یہی ہماری سب سے بڑی پریشانی ہے، یہی آسیبی مسئلہ ہے جو انسان پر ہمہ وقت سوار رہتا ہے۔ آج اگر ہمیں اس جال سے نکلنا ہے تو ہمیں اپنی اخلاقی اور روحانی ''کاہلی'' کو نکال باہر کرنا ہوگا۔ بڑھی ہوئی مادی طاقتیں بڑھتے ہوئے خطرات کا باعث ہوتی ہیں، اگر ساتھ ہی ساتھ روحانیت میں بھی متناسب ترقی نہیں ہوتی۔ جب

انسانی فطرت کا "بیرون" اس کے "اندرون" پر حاوی ہو جاتا تو دنیا پر گہرے طوفانی بادل چھانے لگتے ہیں۔

روحانی اور اخلاقی کاہلی کا مسئلہ، جو انسان کا سب سے اہم وسوسہ بنا ہوا ہے، تین بڑے مسائل میں اپنا اظہار کرتا ہے جو واپس بچہ بن جانے کی انسانی اخلاقی خواہش سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سارے مسائل اگرچہ تنہا اور الگ نظر آتے ہیں، مگر آپس میں اس طرح پیوستہ ہوتے ہیں کہ ان کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ میری مراد نسلی ناانصافی، افلاس اور جنگ سے ہے۔

اس مرحلے پر میں پہلے جس مسئلے کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، وہ ہے نسلی ناانصافی۔ نسلی ناانصافی کی شیطنت کو دور کرنے کی جدوجہد ہی ہمارے وقت کی بہت ساری کوششوں میں سے ایک، اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کے نیگرو عوام کی موجودہ انگڑائی آزادی اور انسانی برابری "ابھی" اور "اسی وقت" کی بنیاد پر ہونے والے ایک گہرے جذباتی عزم کی پیداوار ہے۔ ایک زاویے سے ریاست ہائے متحدہ میں شروع ہونے والی شہری حقوق کی جدوجہد ایک مظہر ہے جس کو امریکی تاریخ کی روشنی میں سمجھا جانا اور موجودہ امریکی حالات کے تناظر میں اس سے نمٹا جانا چاہیے۔ مگر دوسرے زاویے اور زیادہ اہم درجے سے، آج جو کچھ امریکا میں ہو رہا ہے وہ نسبتاً دنیا میں ہونے والے واقعات کا ایک مختصر جز ہے۔

فلسفی 'الفریڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ' کا قول ہے کہ "ہم ایسے وقت میں زندہ ہیں جس میں تہذیب اپنا بنیادی تناظر تبدیل کر رہی ہے، جو تاریخ میں ایک بڑا موڑ ہے، جہاں اُن قبل از وقوعہ تصورات کی جن پر سماج کی تعمیر ہوئی ہے، چھان پھٹک ہو رہی ہے، ان پر سوال اٹھائے جا رہے ہیں اور ان میں گہری تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں۔" آج ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ آزادی کا پیدا کردہ دھماکا ہے اور، وکٹر ہیوگو کے الفاظ میں اس "خیال کی آگاہی ہے جس کا وقت آ گیا ہے۔" بے قناعتی کی گہری گڑگڑاہٹ جو آج ہم سن رہے ہیں وہ وراثت سے محروم عوام کی گھن گرج ہے جو جبر کے عقوبت خانوں سے بلند ہو کر آزادی کی روشن چوٹیوں تک، ایک پُر شکوہ عوامی ترانے کی صورت میں فضاؤں پر چھا رہی ہے جس کے بول ہیں، "باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم۔" پوری دنیا میں، ایک بخار کی طرح، تاریخ کی سب سے وسیع تحریک آزادی پھیل رہی ہے۔ عوام کی اکثریت نے اپنی نسل اور اپنی زمین کے استحصال کو مٹا دینے کا عہد کر لیا ہے۔ عوام جاگ اٹھے ہیں اور سمندر کی بہا لے جانے والی اونچی لہروں کی طرح اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آپ ہر قریے، ہر گلی، ہر بندرگاہ، ہر مکان میں، طلبہ میں، کلیساؤں میں اور سیاسی اجتماعات میں ان کی غراہٹ کو سن سکتے ہیں۔ تاریخ میں صدیوں چلنے والی تحریک وہی تھی جس میں مغربی یورپ کی سوسائٹیاں اور قومیں مختلف نوع کی "فتوحات" کے لیے نکل کھڑی ہوتی تھیں۔ وہ عرصہ، یعنی نو آبادیاتی عہد، اب ختم ہو چکا ہے۔ مشرق مغرب سے بغل گیر ہو رہا ہے۔ کرۂ ارض پھر سے تقسیم ہو رہا ہے۔ جی ہاں، ہمارا نقطۂ نظر بھی تبدیل ہو رہا ہے۔

تاریخ کے طلبہ کو ان تبدیلیوں پر حیرت نہیں کرنی چاہیے۔ مجبور عوام ہمیشہ مغلوب نہیں رہ سکتے۔ آزادی کی خواہش بالآخر عیاں ہو کر رہتی ہے۔ انجیلِ مقدس وہ ہیجان خیز قصہ بیان کرتی ہے جس میں

(حضرت) موسیٰ نے فرعون کی عدالت میں کھڑے ہو کر کس طرح پکار کر کہا تھا، "میری اُمت کو نکل جانے دو۔" یہ ایک مسلسل قصے کا ابتدائی باب ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کی موجودہ جدوجہد اسی ابتدائی باب کا اگلا حصہ ہے۔ اندرونی کچھ چیزوں نے نیگرو کو اپنا پیدائشی حق یاد دلایا ہے، اور کچھ بیرونی چیزوں نے یاد دلایا ہے کہ اس کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر وقت کی پکار نے اس کو گرفت میں لے لیا ہے، اور اپنے افریقی سیاہ فام اور ایشیا کے زرد فام بھائیوں، جنوبی امریکا، جزائر شرق الہند اور ریاست ہائے متحدہ کا نیگرو نسلی انصاف اور اپنی موعودہ زمین کی طرف ایک احساسِ عجلت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

خوش قسمتی سے نسلی ناانصافی کی سیاہ رات کو ختم کرنے کی جدوجہد کی طرف کچھ بامعنی پیش قدمی ہوئی ہے۔ ہم نے ایشیا اور افریقا میں آزادی کے طلوع کا شاندار تماشا دیکھا ہے۔ تیس برس قبل پورے افریقا میں صرف تین خود مختار قومیں تھیں مگر آج پینتیس افریقی قومیں نوآبادیاتی غلامی سے نجات پا کر ریاستیں قائم کر چکی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں ہم نے بتدریج نسلی علاحدگی کے نظام کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ سرکاری اسکولوں میں نسلی علاحدگی کو غیر قانونی قرار دینے کا عدالت عالیہ کا ۱۹۵۴ء کا فیصلہ "علاحدہ مگر برابر" پورے نظریے کے لیے آئینی اور قانونی موت تھا۔ عدالت نے فیصلہ صادر کیا تھا کہ علاحدہ سہولتیں بنیادی طور پر عدم مساوات ہے اور ایک بچے کو اس کی نسل کے باعث علاحدہ رکھنا اس کو قانونی تحفظ فراہم نہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ فیصلہ حقِ وراثت سے محروم کروڑوں افراد کے کے لیے امید کی ایک کرن بن کر آیا۔ اور پھر چند ماہ کے بعد ایک روز روشن طلوع ہوا جب "شہری حقوق" کا ایک زبردست مسودۂ قانون ہماری سرزمین کا قانون بنا۔ یہ بل، سب سے پہلے صدر کینیڈی نے جس کی سفارش کی تھی، کروڑوں امریکیوں کی غالب اکثریت کی مدد اور استقلال سے، جس میں نیگرو اور سفید فام دونوں شامل تھے، منظور ہوا تھا۔ انسانی حقوق کی متلاطم جدوجہد کے درمیان یہ ایک دلچسپ موقع تھا: ایک دوسرے اعلانِ بریت کی ابتدا تھی، جس نے مساوی مواقع فراہم کرنے کے لیے ایک مکمل قانونی بنیاد مہیا کر دی تھی۔ اس بل پر بحث کے دوران ہم نے رضامندی کے کچھ ہمت افزا اور حیرت انگیز اشارے بھی دیکھے ہیں۔ میں یہ اطلاع فراہم کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ عام طور پر ریاست ہائے متحدہ کے جنوبی علاقے کی زیادہ تر آبادیاں Civil Rights Law کی تعمیل کر رہی ہیں اور اس عمل کے دوران خاصی سنجیدگی کا مظاہرہ بھی کر رہی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ کے حالیہ صدارتی انتخاب کے دوران ایک اور علامت ابھری ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاملات آگے بڑھ رہے ہیں۔ امریکی عوام نے اُس امیدوار کو رد کر کے، جس کا تشخص شدت پسندی، نسلیت اور مراجعت سے تھا، بڑی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہماری قوم کے ووٹروں نے دائیں بازو کے بنیاد پرستوں پر کاری وار کیا ہے۔ انھوں نے ہمارے سماج کے ان لوگوں کو شکست دی ہے جو سفید فام کو نیگرو کے خلاف صف آرا اور قوم کو فسطائیت کے خطرناک راستے پر گامزن کرنا چاہتے ہیں۔

میں آپ کو غلط تاثر نہیں دینا چاہتا۔ مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہوا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ

میں نیگرو کی آزادی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے میں ابھی بہت طویل وقت درکار ہے۔ اگر انجیلِ مقدس کی تشبیہاتی زبان استعمال کی جائے تو کہا جائے گا کہ ہم مصر کی غبار آلودہ زمین چھوڑ چکے ہیں، ایسے بحیرۂ قلزم کو پار کر چکے ہیں جس کا پانی سرما کی چھیدنے والی سردی کی گراں مزاحمت سے تحت ہو چکا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ ہم موعودہ سرزمین کے ارفع ساحلوں تک پہنچیں، ہمیں ایک پریشان کرنے والی گم راہ کن گم راہی درپیش ہے۔ ابھی ہمیں مخالفین کی انوکھی چوٹیوں کا اور مزاحمتوں کے ریڈیکل کوہساروں کا سامنا ہے۔ مگر صبر اور استقلال کے ساتھ ہم آگے بڑھتے رہیں گے، جب تک کہ ناامیدیوں کی ہر وادی بلند ترین امیدوں کی نئی چوٹیوں میں تبدیل نہ ہو جائے، جب تک کہ ترحم اور انکسار کا عمل تکبر اور غیر منطقیت کو زمین بوس نہ کر دے؛ جب تک کہ ناانصافی کی کھردری زمین کی مسطح مساوات میں قلبِ ماہیت نہ ہو جائے؛ اور جب تک کہ روشن آنکھوں کی شکنیں دور کرنے والی دانش تعصب کے ناہموار علاقوں کی قلبِ ماہیت نہ کر دے۔

ریاست ہائے متحدہ میں شہری حقوق کی تحریک کے اہم مراکز کہہ رہے ہیں کہ وقار، مساوات، ملازمتیں اور شہریت کے مطالبات پر نہ کوئی سمجھوتا ہوگا اور نہ ان کو ملتوی کیا جائے گا۔ اگر اس کا مطلب مزاحمت اور تنازعہ ہے تو فبہا۔ ہم دبنے والے نہیں۔ اب ہمیں خوف بھی نہیں آتا۔

ایک لفظ جو ہمارے مجادلے کی روح اور اس کے بیرون کی علامت ہے، عدم تشدد ہے، اور یہ بلاشبہ وہی عنصر ہے جس نے ایک فرد کو انعام کے قابل گردانا ہے جس کو جدوجہد کے رشتے سے پہچانا جاتا ہے۔ عام معنوں میں، عدم تشدد کا مطلب یہ ہے کہ جدوجہد کے لیے اسلحے پر بھروسا نہیں کیا جائے گا۔ اس کا مطلب اُن روایات اور قوانین سے عدم تعاون بھی ہے جو تعصب اور غلامی کی حکومت کی پہچان ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے، احتجاج میں عوام کی براہِ راست شمولیت ہو، بجائے اس کے کہ اُن بالواسطہ طریقوں پر انحصار کیا جائے جن میں عوام کی عملی شرکت بالکل ہی نہ ہو۔

عدم تشدد کا یہ مطلب بھی رہا ہے کہ ہمارے عوام نے حالیہ برسوں میں جدوجہد میں شمولیت کے دوران خود زخم سہے ہیں، بجائے اس کے کہ دوسروں پر زخم لگائے جاتے۔ اس کا مطلب، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ بھی ہے کہ نہ ہم اب خوف زدہ ہیں اور نہ دبنے والے ہیں۔ مگر کسی حد تک، اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کو خوف زدہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اُس سماج میں خوف پھیلانا چاہتے ہیں، ہم جس کا ایک حصہ ہیں۔ یہ تحریک ہرگز سفید فام افراد کی اہانت اور غلامی کے ذریعے نیگرو کی آزادی کی خواہاں نہیں۔ یہ کسی پر فتح پانا نہیں چاہتی۔ یہ تو امریکی سماج کی آزادی چاہتی ہے اور تمام عوام کی خودکار آزادی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔

تشدد کے ذریعے نسلی انصاف کا حصول ناقابلِ عمل بھی ہے اور غیر اخلاقی بھی۔ میں اس حقیقت سے بے بہرہ نہیں کہ تشدد اکثر عارضی نتائج فراہم کرتا ہے۔ قوموں نے اکثر جنگ کے ذریعے ہی آزادی حاصل کی ہے۔ مگر وقتی فتوحات کے باوجود، تشدد کبھی پائیدار امن نہیں لا سکتا۔ یہ سماجی مسائل کا حل نہیں، یہ صرف نئے اور پیچیدہ مسائل پیدا کرتا ہے۔ تشدد ناقابلِ عمل ہے اس لیے کہ یہ اوپر سے نیچے لانے والی پیچاں

سیڑھی کی طرح ہے جو سب کی تباہی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ غیر اخلاقی اس لیے ہے کہ مخالف کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بجائے اس کے کہ اس کا اتفاق رائے حاصل کرے۔ یہ منقلب کرنے کے بجائے نیست و نابود کرتا ہے۔ تشدد اس لیے بھی غیر اخلاقی ہے کہ یہ محبت کے بجائے نفرت کے ماحول میں پھلتا پھولتا ہے۔ یہ کمیونٹی کو تباہ کرتا ہے اور برادری کو ناممکن بناتا ہے۔ یہ سماج کو مذاکرات کے بجائے خود کلامی کی کیفیت میں چھوڑ دیتا ہے۔ تشدد بالآخر خود اپنی شکست کا باعث ہوتا ہے۔ یہ بچ جانے والوں میں تلخیاں، اور تباہ کرنے والوں میں بے رحمی پیدا کرتا ہے۔

عدم تشدد حقیقی معنوں میں روحانیت اور اخلاقیات کی تلافی کرتا ہے، میں جس کو جدید دور کے انسان کی سب سے اہم اُلجھن کہتا ہوں۔ یہ اخلاقی طریقے سے اخلاقی پہلوؤں کو مامون کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عدم تشدد ایک طاقت ور اور منصفانہ ہتھیار ہے۔ تاریخ کا یہ سب سے منفرد ہتھیار ہے، جو بغیر زخم لگائے کاٹتا ہے اور چلانے والے آدمی کو سرفراز کرتا ہے۔

میں اس طریقے پر یقین رکھتا ہوں، اس لیے کہ میرے خیال میں یہ واحد طریقہ ہے ایک بکھرے ہوئے سماج کو اکٹھا کرنے کا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو مہذب اکثریت کے شعور سے اپیل کر کے واجب انصاف کو رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس نے بے بصری، خوف، غرور اور غیر منطقیت کے ذریعے اپنے ضمیر کو سو جانے دیا ہے۔

عدم تشدد مزاحمت کار اپنے پیغام کا مندرجہ ذیل سادہ طریقے سے خلاصہ بیان کر سکتے ہیں: حکومت اور دوسرے اداروں کی پہلے قدم اٹھانے میں ناکامی کے باوجود ہم ناانصافی کے خلاف راست اقدام کریں گے۔ ہم بے جا قوانین پر عمل نہیں کریں گے نہ بے جا طریقوں پر کام کریں گے۔ ہم یہ سب کچھ پُرامن اور واشگاف طریقے سے اور خوش مزاجی سے کریں گے، اس لیے کہ ہمارا مقصد ترغیب دینا ہے۔ ہم عدم تشدد کا طریقہ اپناتے ہیں اس لیے کہ ہمارا مقصد ایسا سماج ہے جو خود اپنے لیے بھی پُر امن ہو۔ ہم الفاظ کے ذریعے ترغیب دینے کی کوشش کریں گے، پھر بھی اگر الفاظ ناکام رہے تو ہم اپنے عمل سے ترغیب دینے کی کوشش کریں گے۔ ہم بات چیت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں گے اور مناسب مصالحت کے خواہش مند ہوں گے، پھر بھی ضروری ہوگا تو تکلیف اٹھانے کے لیے بھی تیار رہیں گے حتیٰ کہ جسے ہم سچ سمجھتے ہیں اس کی گواہی کے لیے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالیں گے۔

نسلی ناانصافی کے مسئلے کے حل میں کامیابی کی مثالیں کم نہیں۔ 'موہن داس کرم چند گاندھی' نے بڑے عمدہ طریقے سے برطانوی سلطنت کے جبروت کو للکارا تھا اور اپنے عوام کو صدیوں کے سیاسی تسلط اور معاشیاتی استحصال سے نجات دلائی تھی۔ انھوں نے صرف سچائی، روحانی قوت، اور ہمت کے ہتھیاروں سے، بغیر زخم لگائے جدوجہد کی تھی۔

پچھلے دس برسوں میں ریاست ہائے متحدہ کے نہتے بہادر مردوں اور عورتوں نے اخلاقی قوت، اور

عدم تشدد کی تاثیر کی گواہی دی ہے۔ ہزاروں بے چہرہ، گم نام، سنگ دل نوجوان، سیاہ اور سفید فام دونوں، تعلیم کے تاج محل کو وقتی طور پر خیر باد کہہ کر تعصب کے خلاف مزاحم ہوئے ہیں۔ ان کی باہمت باضابطہ سرگرمیاں ناانصافی کے جھلسانے والے ریگستان کے بیچ ایک فرحت افزا نخلستان بنی ہیں۔ وہ ہماری پوری قوم کو، جمہوریت کی اُن عظیم گہری باؤلیوں کی طرف واپس لے گئے ہیں جو اُن کے اجداد نے آئین کی ترتیب اور آزادی کے اعلان کے دوران کھودی تھیں۔ ایک دن پورا امریکا اُن کے کارناموں پر فخر کرے گا۔

مجھے خاصا ادراک ہے انسانی کم زوریوں کا، ناکامیوں کا، عدم تشدد کے اثرات کا، اور کھلم کھلا تشدد کی وکالت کا۔ مگر میں اب بھی اس بات کا قائل ہوں کہ عدم تشدد عملی طور پر صحیح بھی ہے اور اخلاقی اعتبار سے اچھا طریقہ بھی ہے پرانے مسائل اور نسلی ناانصافی کو حل کرنے کا۔

ایک اور بُرائی جو جدید دنیا پر چھائی ہوئی ہے، وہ افلاس کی بیماری ہے۔ ایک دیوہیکل 'آکٹوپس' کی طرح یہ زمینوں اور دیہاتوں پر پھیلے ہوئے اپنے بازوؤں سے پوری دنیا کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ دنیا کی تقریباً دوتہائی آبادی روزانہ بھوکی سوتی ہے۔ ان کے بستر یا تو شہروں کی گلیاں ہوتی ہیں یا دیہاتوں کی خاک آلودہ سڑکیں۔ ان افلاس کے مارے خدا کے بندوں کی اکثریت کو نہ کبھی کوئی عام ڈاکٹر، نہ دانتوں کے ڈاکٹر کا علاج نصیب ہوا ہے۔ افلاس کا یہ مسئلہ ترقی یافتہ ممالک کی درجات میں بٹی ہوئی آبادی میں ہے، تاہم تمام غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی کچھ موجود ہے؛ یہ ایک وسیع معاشیاتی خلیج کے طور پر خود امیر ملکوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اب میرے ملک ہی کو لے لیجیے۔ ہم نے صنعتی پیداوار کا ایسا عظیم نظام بنایا ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہم دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند قوم بن گئے ہیں۔ اس برس ہماری قومی مجموعی پیداوار ۶۵۰ ارب ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ پھر بھی، کم از کم ہمارے ساتھی باشندوں کا پانچواں حصہ، یعنی دس ملین خاندان، جن میں تقریباً چالیس ملین افراد شامل ہوں گے، افلاس کے ذلت آمیز سماج میں گرفتار رہے گا۔ ایک اعتبار سے، امریکی باشندوں کا افلاس ایشیا اور افریقا کے افلاس سے زیادہ مایوس کن ہے۔ ایشیا اور افریقا کے مفلسوں کی حالت 'مرگِ انبوہ جشنے وارد' کی مصداق ہے، جو اکثریت کے لیے زندگی کی حقیقت ہے: وہ سب اس لیے مفلس ہیں کہ ان کے علاقے میں استحصال کے باعث ترقیات نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس امریکا کے مفلس جانتے ہیں کہ وہ دولت مند ترین قوم کے فرد ہیں، اور اگرچہ وہ افلاس کے ایک جزیرے میں گرفتار ہیں، ان کے اطراف مادّی خوش حالی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود ہے۔ ان کے پس ماندہ علاقوں سے روزانہ بلند ہوتی چمچماتے ہوئی شیشے اور آہن سے بنی ہوئی عمارتیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ چھ سو میل کی رفتار سے پرواز کرتے جیٹ ہوائی جہاز اُن کی غلاظت سے پُر آبادیوں کے 'آسمان' سے گزرتے رہتے ہیں؛ مصنوعی سیارے خلا سے چاند کی تفصیلات دکھاتے رہتے ہیں۔ صدر جانسن نے اپنے پارلیمانی خطاب میں اس تضاد کا ذکر کرتے ہوئے خبر دی تھی کہ "ریاست ہائے متحدہ امریکا کا معیارِ زندگی دنیا بھر میں سب سے بلند ہے" "مگر ساتھ ہی افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ "افراط کی اس چکاچوند میں دربدری اور بے روزگاری کے

سائے بھی لہرا رہے ہیں۔"

تو یہ واضح ہے کہ اگر آدمی کو اپنی روحانیت اور اخلاقی پس ماندگی کے زندان سے رہائی حاصل کرنی ہے تو اسے کسی نہ کسی طرح دنیا بھر کے "دولت مندوں" اور "مفلسوں" کے درمیان پھیلی خلیج پر پُل تعمیر کرنے ہوں گے۔ جدید دنیا کی فہرست پر سب سے اہم مسئلہ افلاس ہی ہے۔

افلاس کے بارے میں کوئی بات نئی نہیں۔ نئی بات تو یہ ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے ہمارے پاس وسائل موجود ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے قبل لوگوں نے آبادی اور پیداوار کے جڑواں مسئلے سے پریشان ہونا شروع کیا تھا۔ Malthus نامی ایک فکر مند انگریز نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے نہایت خوف ناک نتائج اخذ کیے تھے۔ اس نے پیشین گوئی کی تھی کہ انسان بتدریج عالمی فاقہ کشی کی طرف بڑھ رہا ہے، اس لیے کہ دنیا میں خوراک کی پیداوار سے زیادہ اس کو کھانے والے بڑھ رہے ہیں۔ بعد کے سائنس دانوں نے Malthus کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا اور کہا کہ اس نے دنیا کے وسائل اور انسان کی خوش تدبیری، دونوں کا غلط اندازہ لگایا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ ہارورڈ کے ایک ماہر ارضیات ڈاکٹر کرٹلے ماتھر نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا عنوان Enough and to Spare تھا۔ اس نے جو بنیادی موضوع چنا تھا وہ یہ تھا کہ جدید دنیا میں قحط سالی قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے آج کے ایجنڈے پر لکھا ہونا چاہیے: کسی سرزمین، کسی شہر، کسی دستر خوان پر بھوک اور تنگ دستی کیوں ہو، جب آدمی کے پاس وسائل بھی ہیں اور سائنسی علم بھی، جن کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کو زندگی کی بنیادی سہولتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں؟ ریگستان تک سیراب کیے جا سکتے ہیں اور ان کی بالائی سطح بھی تبدیل کی جا سکتی ہے۔ ہم زمین کی کمی کا شکوہ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ پچیس ملین مربع میل قابلِ کاشت ہے، جس میں سے ہم صرف سات ملین مربع میل رقبے سے کم پر کاشت کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس وٹامن، غذائیت، غذائی کیمیا اور ایٹم کی ہمہ جہتی کا حیرت انگیز علم موجود ہے۔ انسانی قوت کے وسائل کی کوئی کمی نہیں؛ کمی ہے تو انسانی ارادے کی۔ اکثر خوش حال اور محفوظ لوگ اپنے درمیان موجود افلاس اور محرومی سے لاپروا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ممالک میں مفلسوں کا خیال دلوں سے نکال دیا گیا ہے، اور ان کو ہماری سوسائٹی کے مرکزی دھارے سے بھی نکال باہر کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ ہم نے ان کو غیر مرئی ہو جانے دیا ہے۔ بالکل اسی طرح، جیسے عدم تشدد نے نسلی ناانصافی کی بدصورتی کو عیاں کر دیا ہے، افلاس کی بیماری کو بھی منظرِ عام پر لانا ہوگا اور اس کا علاج کرنا ہوگا: مرض کی علامتوں ہی کو نہیں، اس کی بنیادی وجوہات کو بھی دور کرنا ہوگا۔ یہ بھی ایک غضب ناک جدوجہد ہوگی، مگر ہمیں اس کے علاج کا طریقہ معلوم کرنے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے، خواہ یہ کام کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

اب افلاس کے خلاف عالمی پیمانے پر جنگ کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ ثروت مند قوموں کو اپنے وسیع وسائل کو ترقی پذیر دنیا کی ترقیات پر خرچ کرنا چاہیے، جاہل کو علم اور بھوکے کو غذا فراہم کرنی چاہیے۔ بڑی

قوم ہمیشہ مہربان قوم ہوتی ہے۔ اگر ایسے لوگوں کے لیے فکر نہ کرے تو نہ کوئی فرد بڑا ہو سکتا اور نہ کوئی قوم۔ ہماری مذہبی روایات کے ریشے ریشے میں یہ عقیدہ کندہ ہے کہ انسان کو خدا کی شباہت میں خلق کیا گیا ہے کہ اس کی غیر مادی روح انتہائی قدر کی حامل ہے کہ اس کی وراثت اور وقار کی قدر و قیمت ہے۔ اگر ہم اس کو ایک اخلاقی حقیقت سمجھتے ہیں تو کسی انسان کو بھوکا دیکھ کر، آدمیوں کو بیمار اور فاقہ کشی کی حالت میں دیکھ کر ہم محض تماشائی بن کر بیٹھے نہیں رہ سکتے، اگر ہم ان کی مدد کر سکتے ہوں۔ دولت مند قوموں کو دولت مند اقلیت اور مفلس اکثریت کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے۔

تمام تجزیے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہل ثروت کو افلاس زدہ لوگوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ دونوں ہی مقسوم کی ایک بافت کا حصہ ہیں۔ تمام زندگیاں آپس میں رشتے دار ہیں اور تمام انسان باہمی انحصار پر مجبور ہیں۔ مفلس کا دکھ امیر کو گھٹاتا ہے اور مفلس کی نجات امیر کو بڑھاتی ہے۔ ہم ناگزیر طور پر اپنے بھائی کے نگہبان ہیں اس لیے کہ حقیقتاً ہم ایک ہی ڈھانچے میں گتھے ہوئے ہیں۔ جون ڈن نے اس صداقت کا بڑے مشرح انداز میں تجزیہ کیا ہے، جب اس نے کہا تھا:

کوئی بھی آدمی خود کفیل جزیرہ نہیں ہوتا
ہر شخص ایک براعظم کا ٹکڑا ہوتا ہے، ایک مرکز کا حصہ
اگر سمندر میں ایک تودہ بھی بہہ جائے،
تو یورپ بھی چھوٹا ہو جائے گا
اسی طرح، جیسے ایک راس زمین
اسی طرح، جیسے تم اور تمھارے دوست
ایک فرد کی موت بھی مجھے مختصر کر دیتی ہے
اس لیے کہ میں انسانیت میں شامل ہوں
لہٰذا، کبھی نہ پوچھو کہ گھنٹی کس کے لیے بج رہی ہے
یہ تمھارے لیے بج رہی ہے

تیسری بڑی شیطنت جو ہماری دنیا کو درپیش ہے، جنگ ہے۔ حالیہ واقعات نے ہمیں صاف طور پر یاد دلایا ہے کہ قومیں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے اسلحہ خانوں میں کمی نہیں، بلکہ ان میں اضافہ کر رہی ہیں۔ دنیا کی بڑی ترقی یافتہ قوموں کے اذہان کا ارتکاز فوجی ٹکنالوجی پر ہے۔ Limited Test Ban Treaty کے باوجود جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکا نہیں جا سکا ہے۔ ان کے برعکس، پہلی غیر سفید فام، اور نام نہاد کم ترقی یافتہ طاقت، چینی عوامی جمہوریہ کے ہاتھوں جوہری دھماکے نے پوری انسانیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے امکانات کے پُر فریب وسیع آفاق وا کر دیے ہیں۔ یہ حقیقت، کہ بنی نوع انسان زیادہ تر جوہری جنگ کے خطرات کو اس لیے اپنے ذہن سے محو کر دیتی ہے کہ اس کا خیال بہت تکلیف دہ ہے

اس لیے یہ نا قابل قبول ہے۔ ایسی سوچ ہمہ وقت سر پر سوار جنگوں کے خطرات کو کم نہیں کرتی۔ رد کرنے کا طریقہ وقتی طور پر تشویش کو چھپا تو سکتا ہے مگر ذہنی سکون اور جذباتی تحفظ فراہم نہیں کرتا۔

لہٰذا، جنگ کی طرف انسان کا رجحان اب بھی قائم ہے، مگر تجربے سے حاصل ہونے والا علم ہمیں بتاتا ہے کہ جنگ فرسودہ ہو چکی ہے۔ ایسا زمانہ بھی رہا ہوگا جب شیطانی قوتوں کی ترقی کو پھیلنے سے روکنے کے لیے جنگ نے ایک منفی اچھائی کا کام کیا تھا، مگر جدید ہتھیاروں کی تباہ کن طاقت نے اس امکان کو بھی ختم کر دیا ہے کہ جنگ ایک منفی اچھائی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم یہ قیاس کر لیں کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل ہے اور آدمی کو باقی رہنے کا حق ہے تو ہمیں جنگ کا کوئی متبادل تلاش کرنا ہوگا۔ اس دور میں جب ہر طرف خلائی سیارے اڑتے پھرتے ہوں اور خود کار میزائل زمین کے اطراف موت کی شاہراہیں بناتی ہوں، کوئی قوم جنگ میں فتح کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ایک نام نہاد محدود جنگ بھی خوف ناک انسانی بربادی، سیاسی اتھل پتھل اور روحانی ازالۂ فریب سے زیادہ مصائب کی وراثت چھوڑ کر جائے گی۔ خدانخواستہ، اب عالمی جنگ صرف دھواں دیتی ہوئی راکھ کی صورت میں انسانی نسل کی ایک گونگی شہادت چھوڑے گی، جس کی غلطیوں نے انسان کو بے رحم اور قطعی موت کے راستے پر گام زن کیا ہے۔ لہٰذا، اگر انسان جھجکے کے بغیر جنگ سے آنکھیں لڑا تا رہا تو وہ اس زمین کو ایسے جہنم میں بدل دے گا جس کا دانتے بھی تصور نہیں کر سکا ہوگا۔

لہٰذا میں آپ سب کی خدمت میں، اور ان سب کی خدمت میں جو ان الفاظ کو آئندہ پڑھیں گے، یہ کہنا چاہوں گا کہ عدم تشدد کے فلسفے اور حکمتِ عملی پر فوراً کام کیا جائے اور انسانی تنازعے کے ہر میدان میں اس کا سنجیدگی سے تجربہ کیا جائے، جس میں قوموں کے درمیان رشتے بھی شامل ہوں۔ قومی ریاستیں ہی جنگ کرتی ہیں، جنھوں نے ہتھیار بنائے ہیں، جو بنی نوع انسان کی زندگی کے لیے خطرہ ہیں اور جو اپنے کردار میں نسل کش بھی ہیں اور خود کش بھی۔

ہمیں ان کی قدیم عادتوں سے، طاقت کے وسیع ڈھانچوں سے اور ناقابلِ بیان الجھے ہوئے مسائل کے حل سے بھی نمٹنا ہے، مگر جب تک کہ ہم اپنی انسانیت سے مکمل طور پر دست بردار نہیں ہو جاتے اور اُن ہتھیاروں کی موجودگی میں جو ہم نے خود بنائے ہیں، خوف و ناطاقتی کے آگے سرِ خم نہیں کرتے، یہ اتنا ہی لازمی اور ضروری ہوگا کہ قوموں کے درمیان جنگ اور تشدد کا خاتمہ کیا جائے کہ اسی طرح ناانصافی ختم کی جا سکتی ہے۔ صرف سفید فام افراد کے ساتھ برابری سے سفید فام اور نیگرو افراد کے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے، اگر سماج میں برابری تشدد کے زور پر ہو اور دنیا تباہی کی طرف جا رہی ہو۔

میں اُن مسائل کی پیچیدگی کو کم کرنا نہیں چاہتا، تخفیفِ اسلحہ اور امن کے حصول کے لیے جن کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ ہم میں خواہش ہے اور نہ ہمت، نہ ایسے مسائل سے نمٹنے کی بصیرت، جب تک کہ ہم اس سلسلے میں اپنے ذہنی اور روحانی نوقدری (reevaluation) کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں ــــ ارتکاز میں ایسی تبدیلی کے ساتھ جو ہمیں دیکھنے کی صلاحیت دے کہ وہ چیزیں جو

بالکل اصلی اور طاقت ور معلوم ہوتی ہیں، واقعی اب اصلی نہیں اور اپنے انجام کو پہنچنے والی ہیں۔ ہمیں اعلیٰ سطح کی کوشش کرنی ہوگی آج کے لیے، اشتیاق پیدا کرنے کے لیے تاکہ ہم ایک نئی دنیا میں قدم رکھیں جو اب ممکن ہوگئی ہے، ''ایسا شہر جس کی بنیادیں تھیں، جس کو سوچنے اور تعمیر کرنے والا خدا ہے۔''

ہم منفی راستوں پر چل کر ایک پُر امن دنیا نہیں بنائیں گے۔ اتنا ہی کہنا کافی نہیں کہ ''ہم کو جنگ نہیں کرنی چاہیے۔'' امن سے محبت کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے قربانی دینی چاہیے۔ ہمیں جنگ کے اخراج کے لیے صرف منفی کوشش نہیں، بلکہ امن کے لیے ایک مثبت عہد کرنا چاہیے۔ یونانی ادب میں Ulysses اور Sirens کے بارے میں ایک مسحور کن قصہ ہے، جو اب تک ہمارے لیے محفوظ ہے۔ Sirens میں گانے کی اتنی پیاری صلاحیت تھی کہ ملاح ان کے جزیرے کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ بہت سے جہاز ان کے جزیرے کی طرف (ہمیشہ کے لیے) چلے گئے۔ جزیرے کی کشش میں لوگوں نے سمندر میں چھلانگ لگادی، اپنے گھر بار، اپنے فرائض اپنی عزت سب کچھ فراموش کر بیٹھے اور موت کے منہ میں چلے گئے۔ Ulysses نے طے کرلیا تھا کہ Sirens اس کو بہکا نہیں سکیں گے، اس لیے پہلے اس نے خود کو کشتی کے آہنی مستول سے کس کر باندھ لینے کا فیصلہ کیا، اور اس کی کشتی کے چلانے والوں نے اپنے کانوں کو لاکھ ٹھونس کر بند کرلیا۔ مگر بعد میں کشتی بانوں نے اپنے آپ کو بچانے کا نیا طریقہ ایجاد کرلیا: وہ گلوکار Orpheus کو اپنے ساتھ کشتی پر لے گئے، جس کے گیت Sirens سے کہیں زیادہ سُریلے تھے۔ جب Orpheus گاتا تو Sirens کو بھلا کون سنتا؟

سو، ہمیں جنگ سے بچنے کے لیے منفی تصورات ہی پر انحصار نہیں، امن کے لیے مثبت عہد بھی کرنا چاہیے۔ ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ امن کی موسیقی کہیں زیادہ سُریلی ہے، ایک کائناتی نغمہ ہے جو جنگ کی بے آہنگی سے کہیں زیادہ اعلیٰ ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو، ہمیں دنیا کی تمام قوموں کی بہتری، امن و آشتی کو حقیقت بنانے اور انسان کے تخلیقی جوہر کے مثبت استعمال کے لیے عالمی طاقتوں کی کھینچا تانی کی حرکیات کی قلب ماہیت کرنی چاہیے۔ مختصر یہ کہ ہمیں ہتھیاروں کی دوڑ کو ''امن کی دوڑ'' میں بدل دینا چاہیے۔ اگر ہم میں امن کے لیے ایسا مثبت تمنا کرنے کی لگن ہے تو ہم امیدوں کے اب تک مہر شدہ دروازوں کو کھولنے اور اپنے کائناتی نوحے کو تخلیقی تکمیل کی دعا میں بدل دیں گے۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا اس کا نچوڑ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی بقا نسلی ناانصافی، افلاس اور جنگ کے مسائل کو حل کرنے کی انسانی صلاحیت پر مبنی ہے۔ ان مسائل کا حل اس نکتے پر ہے کہ انسان اپنی اخلاقی ترقی کو سائنسی ترقی کے برابر رکھے اور ہم آہنگی سے زندہ رہنے کا عملی فن سیکھے۔ کچھ برس قبل ایک مشہور ناول نگار کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے کاغذات میں مستقبل میں لکھی جانے والی کہانیوں کے پلاٹ کی ایک فہرست ملی تھی، جس میں سرفہرست یہ جملہ لکھا ہوا تھا: ''ایک بکھرے ہوئے خاندان کو وراثت میں ایک مکان ملتا ہے جس میں سب کو اکٹھا رہنا ہوگا۔'' بنی نوع انسان کا یہی سب سے بڑا نیا مسئلہ ہے۔ ہم کو بھی وراثت میں

ایک بڑا مکان ملا ہے، ایک عظیم ''عالمی گھر'' جس میں ہم سب کو اکٹھے رہنا ہے — کالا ہو یا گورا، مشرقی ہو یا مغربی، ذات پرست ہو یا یہودی۔ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ، مسلمان ہو یا ہندو، ایک خاندان ہے جو بلا وجہ بکھرا ہوا ہے، اپنے خیالات، تہذیب اور مفادات کے باعث، اور چوں کہ ہم اب ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، ہمیں بہر حال اس بڑی ساری دنیا میں ایک ساتھ رہنے کے طریقے سیکھنے ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری وفاداریاں فرقوں پر نہیں مذہبی اتحاد کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ ہمیں اب اپنی بالا ترین وفاداری من حیث الکل بنی نوع انسان کے ساتھ رکھنی چاہیے تا کہ ہم انفرادی سوسائٹیوں میں 'بہترین' کا تحفظ کریں۔

ایک عالمی فیلوشپ کا نعرہ جو قبیلے، نسل، درجے اور قوم کے بجائے ہمسائگی کے لیے ہو وہی حقیقی نعرہ ہوگا جس میں تمام انسانوں کے لیے بلا کسی شرط کے محبت ہو۔ اس اکثر غلط سمجھے جانے والے تصور کو جسے دنیا بھر کے نطشے جیسے شاعروں نے ایک کم زور اور بزدل قوت کی طرح رد کر دیا تھا، آج انسان کی بقا کے لیے مطلق ضرورت سمجھا جا رہا ہے۔ جب میں محبت کا تذکرہ کر رہا ہوتا ہوں تو میں کسی زود حس اور کم زور ردعمل کی بات نہیں کرتا، جو ایک معمولی جذباتی بیہودگی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میں دراصل اُس طاقت کی بات کرتا ہوں جسے تمام عظیم مذاہب نے متحد کرنے والا ایک اعلیٰ اُصول زندگی گردانا ہے۔ محبت ایک طرح سے وہ کنجی ہوتی ہے جو قطعی حقیقت کے طرف لے جانے والے دروازے کو کھولتی ہے۔ قطعی حقیقت کے بارے میں ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، بدھ مت الیقین کی قطعی حقیقت کو کتنی خوب صورتی سے سینٹ جان کے پہلے Epistile میں سمو دیا گیا ہے:

Let us love one another: for love is of God; and everyone
that loveth is born of God, and knoweth God.
He that loveth not knoweth not God; for God is love.
If we love one another, God dwelleth in us, and His
love is perfected in us.

ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ یہ جذبہ اس دور کا فرمان ہوگا۔ جیسا کہ آرنلڈ ٹائن بی نے کہا ہے ''محبت وہ قطعی قوت ہے جو موت اور شیطنت کے مردود انتخاب کے مقابلے میں اچھی زندگی کا انتخاب کرتی ہے۔ اس لیے ہماری فہرست میں پہلی امید یہی امید ہونی چاہیے کہ محبت ہی فاتح ہوگی۔'' نہ ہم اب نفرتوں کے خدا کی پرستش کر سکتے ہیں اور نہ انتقام کی قربان گاہ میں اپنا سر خم کر سکتے ہیں۔ نفرت کی ہمیشہ بڑھتی ہوئی لہریں تاریخ کے سمندر کو متلاطم کرتی ہیں۔ تاریخ ایسی قوموں اور ایسے افراد کی باقیات سے بھری پڑی ہے جنھوں نے نفرت کا، خود شکستگی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ دنیا کے مسائل کے حل کی کلید محبت ہے۔

میں آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرا ذاتی ایقان ہے کہ ایک دن آدمی سر اُٹھائے گا اور تیزی سے تباہی کی طرف جاتے ہوئے دور کو نئے احکامات جاری کرے گا۔ اس عہد کی کشاکش اور بے اعتباری کے

بجائے کچھ اچھی اور معنی خیز پیش رفت ہو رہی ہے۔ استحصال اور جبر کا قدیم نظام ہچکیاں لے رہا ہے، اور ایک ناپائیدار دنیا کی کوکھ سے انصاف اور مساوات کے نئے نظام جنم لے رہے ہیں۔ سماج کی سب سے نچلی سطح والوں کے لیے مواقع کے دروازے بتدریج کھولے جا رہے ہیں۔ قمیصوں اور جوتیوں سے محروم آبادی کے لیے تجسیم نو کا ایک نیا احساس پنپ رہا ہے، مایوسیوں کے تاریک پہاڑوں کی بنیادوں میں سے امید کی ایک سرنگ نکالی جا رہی ہے۔ ''تاریکیوں میں بیٹھنے والوں نے ایک عظیم روشنی دیکھ لی ہے۔'' یہاں وہاں، اور فرد یا گروہ محبت کرنے کی ہمت کر رہا ہے، اور اخلاقی بلوغت کی اعلیٰ بلندیوں تک اٹھ رہا ہے۔ سو حقیقی معنوں میں زندہ رہنے کا یہ بہترین موقع ہے، لہٰذا میں ابھی تک مستقبل سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ مانا کہ ماضی کی آسان روی کی خوش فہمی ناممکن ہے۔ مانا کہ امن اور آزادی کی جہد کی رہنمائی کرنے والے اب بھی تکلیف دہ قید و بند اور موت کی دردناک دھمکیوں کا ہدف ہیں، عقوبت کے طوفانوں کے تھپیڑے کھاتے رہیں گے، حتیٰ کہ ان میں یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ وہ اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے اور اس ترغیب سے بھی چھٹکارا نہیں پا سکیں گے کہ باعزت پسپائی سے ان کو ایک پُرسکون زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ مانا کہ ہمیں ایک عالمی بحران کا سامنا ہے جو ہمیں زندگی کے متلاطم سمندر کے بیچ لا کھڑا کرتا ہے۔ مگر ہر بحران کے اپنے خطرات اور امکانات ہوا کرتے ہیں۔ نجات بھی ہو سکتی ہے اور تباہی بھی۔ ایک تاریک اور الجھی ہوئی دنیا میں اب بھی خدا کی سلطنت آدمیوں کے دلوں کو مسخر کر سکتی ہے۔

☆☆☆

نیلسن مینڈیلا / باقر نقوی

نوبیل خطبہ

اعتراف کمال "نسلی امتیاز برتنے والی حکومت کے پُر امن اختتام اور ایک نئے جمہوری جنوبی افریقا کی بنیاد رکھنے کے کوششوں کے لیے۔"

اعلانِ تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

ناروے کی نوبیل کمیٹی نے نسلی امتیاز رکھنے والی حکومت کے پُر امن اختتام اور ایک نئے جمہوری جنوبی افریقا کی بنیاد رکھنے کے کوششوں کے لیے نیلسن آر مینڈیلا اور فریڈرک ولیم ڈی کلرک کو ۱۹۹۳ء کا امن کا نوبیل انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم آج ان انعام یافتگان کو بہ طیب خاطر خوش آمدید کہتے ہیں۔

یہ تیسری بار ہو رہا ہے کہ نوبیل کمیٹی نے انسانی حقوق کی وکالت کرنے والوں کو انعام سے نوازا ہے، جنھوں نے جنوبی افریقا میں نسلی امتیار برتنے والی حکومت کے خلاف جد و جہد میں عملی طور پر حصہ لیا ہے۔ جنوبی افریقا پر اتنی توجہ کیوں دی گئی ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام اور ہٹلر کی حکومت کے زوال کے بعد نسلی امتیاز کے نظام کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا تھا۔ ایک عام روش کے تحت اداروں کے ذریعے نسلی امتیاز پر مبنی روک ٹوک کو بنایا اور قدیم نوآبادیاتی نظام مسمار کیا جا رہا تھا۔ مگر عین اس وقت جب یہ روش عام ہو گئی تھی، جنوبی افریقا نے مخالف روش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے (جنوبی افریقا میں) قانون سازی اور اداروں کی تشکیل کے ذریعے باقاعدہ ایک ایسا وحشی نظام مسلط کیا جا رہا تھا جس میں نسلی امتیاز کو مرکزیت حاصل تھی۔ اور اس طرح محض نسل کی بنا پر جبر کو تحقیر کی علامت بنا دیا گیا تھا۔ نسلی امتیاز کے نظام نے نسل پرستی کو ایک چہرہ عطا کر دیا تھا۔ جب تقریباً ایک پیڑھی قبل افریقن نیشنل کانگریس کے رہنما البرٹ لوتولی کو ۱۹۶۰ء کا نوبیل امن انعام دیا گیا تھا تو اس نے اداروں کے ذریعے انسانی برابری کی بیخ کنی کی

طرف توجہ دلائی تھی۔ ایک عیسائی ہونے کے باعث، لوتولی کے مذہبی عقیدے میں انسانی برابری جاگزیں تھی۔
اُس نے کہا تھا:

''ایک عیسائی اور وطن پرست ہونے کے باعث میں (لوتولی) ان حرکات کا خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا تھا، جن کے ذریعے زندگی کے تقریباً ہر طبقے میں، انسان میں موجود خدائی عنصر کو گھٹایا جارہا تھا یا اس کی حدود متعین کی جارہی تھیں جن سے پرے، اپنی سیاہ جلد کے باعث انسان کو اپنے خالق کی خدمت کی کوشش کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے حالات میں جب ملکی قانون انسان کو رنگ دار بنانے پر خدا پر معترض ہو، ایسی چیز تھی جسے، بحیثیت ایک عیسائی کے، میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔''

لوتولی کو ۱۹۶۰ء کا امن انعام دے کر، نارویائی کمیٹی نے ایک شروعات کی تھی، کچھ معنوں میں، جو ایک نئی پالیسی بن گئی۔ اس کے بعد سے انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرنا امن انعام دیے جانے کے لیے ایک اہم کسوٹی بن گیا، ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسوٹی نزاعی بھی رہی ہے، اس لیے کہ انسانی حقوق کے لیے کام کرنا بہت سے علاقوں میں تنازعے کا باعث ہوا ہے۔ اور ایک سطح پر، کچھ وقت کے لیے یہ صحیح ثابت بھی ہوا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ کمیٹی کی اس پالیسی کو دنیا بھر میں اور مختلف تہذیبوں میں سراہا بھی گیا ہے۔

اگر پائیدار امن کے حصول کے لیے جدوجہد کی جارہی ہو، تو اس عمل میں ایک دوسرے کے کردار کا احترام، دیانت اور عظمت کا پاس ہونا اہم ترین ضرورت ہوگی۔ پائیدار امن کے لیے ایمانوئیل کانٹ کے دو سو برس قبل لکھے ہوئے مشہور مضمون کا بھی یہی اہم نکتہ تھا۔ اس نے امن کو انصاف کے تصور سے مربوط کیا تھا جو اس کے سیاسی فلسفے کا بنیادی پتھر تھا۔ سرد جنگ کے درمیان، خیال پرستی کی بنیاد پر کیے جانے والے جس قسم کے جبر کے باعث، جو اس زمانے کی آمرانہ حکومتوں کے ہاتھوں روا رکھا جارہا تھا، یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ امن تشدد کے میزان پر انحصار کرتا ہے، اور یہ بھی کہ زبردستی اور دباؤ سے استحکام پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی خیالات نے ان لوگوں کی ہمت افزائی کی ہوگی جو انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کے ذریعے امن کے حصول پر معترض ہوتے تھے۔ آج ہم پر واضح ہو رہا ہے کہ جبر کی شدت کی بنیاد پر کھڑی ہونے والی حکومتیں نازک ترین ہوتی ہیں۔ نہ وہ آزادی فراہم کرتی ہیں نہ استحکام دیتی ہیں۔ انسان کے بنیادی حقوق میں رخنہ ڈالنے اور انسانی رُتبے اور عزتِ نفس کی دانستہ بیخ کنی کرنے سے ہی اختلافات بڑھتے ہیں۔ ایسی حکومتیں جلد یا بہ دیر اپنے آپ کو ایسے گرداب میں پاتی ہیں جس میں جنگ، بدامنی اور خون ریزی کا سامنا ہوتا ہے۔

جنوبی افریقا بہت عرصے سے شیطانی چکّر کے نرغے میں الجھا ہوا ہے۔ پھر بھی، ۱۹۹۰ء کی ابتدا میں حکومت نے اپنے نئے صدر فریڈرک ولیم ڈی کلرک کی حکمرانی میں اپنی پالیسیاں اُلٹ دی ہیں۔ تقریباً اٹھائیس برس کی قید کے بعد نیلسن مینڈیلا کو غیر مشروط رہائی دے دی گئی ہے اور نسلی امتیاز ختم کرنا حکومت کی پالیسی کا حصہ بن گیا ہے۔ کس درجے تک حالات کی یہ تبدیلیاں اخلاقی بہتری لاتی ہیں، ہر شخص کو خود اس پر غور کرنا چاہیے۔ جنوبی افریقا ایک عرصے سے شیطانی چکّر کے نرغے میں الجھا ہوا ہے اور یہ صرف وقت ہی بتائے

۵۔ آیا یہ شروعات تاخیر سے ہوئی ہیں یا نہیں۔

مذاکرات کی شروعات میں افریقن نیشنل کانگریس فطری شراکت دار تھی، جس کے لیڈر نیلسن مینڈیلا قید خانے سے سیدھے مذاکرات کی میز پر پہنچائے گئے تھے۔ مینڈیلا ابتدا ہی سے نسلی امتیاز کے مخالف تھے۔ پہلے تو وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو گاندھی کے اہنسا کے طریقۂ کار سے متاثر تھے، مگر ۱۹۶۰ء میں شارپ ول میں ہونے والے قتلِ عام سے ماحول بہت سنگین ہو گیا۔ ۱۹۶۲ء میں مینڈیلا کو قید کر دیا گیا اور وہ اٹھائیس برس تک محبوس رہے۔ ۱۹۹۰ء میں رہائی کے چند ماہ بعد وہ نوبیل فاؤنڈیشن اور ایلی ویزل فاؤنڈیشن کی شراکت میں اوسلو میں منعقد کی جانے والی ''نفرت کانفرنس'' میں شرکت کے لیے آئے تو ہمیں ان کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملا تھا۔ اس کانفرنس میں مختلف گروہوں کے سربرآوردہ مردوں اور عورتوں نے شرکت کی تھی۔ اس ماحول میں نیلسن مینڈیلا کی شخصیت ابھر کر سامنے آئی۔ انھوں نے اخلاقی اختیار کے ساتھ اور ایسے تعمیری لہجے میں خطاب کیا جس نے مندوبین پر گہرا تاثر چھوڑا۔ یہ سب کچھ میں اپنے ذاتی یادوں کے خزانے سے نکال کر نکال رہا ہوں، مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ احساسات صرف میرے ہی نہیں تھے۔

بہت سے لوگوں کو نیلسن مینڈیلا کے قید سے رہا ہونے کے بعد ان کے بظاہر تلخ انداز کا احساس ہوا تھا۔ انھوں نے خود بھی کہا تھا، اگر ان کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے ذہن میں تلخ خیالات ہی کو پالتے رہتے۔ مگر پس اندیشی کے بعد انھوں نے کہا تھا کہ ان تمام لوگوں کو جو انصاف کے لیے ایسی بڑی قربانیاں دے چکے ہوتے ہیں، اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ وہ سب رائگاں نہ ہوں، اور ایسے ہی خیالات ان کے دلوں سے تلخیوں کو دور کر دیتے ہیں۔

دو قطعی مختلف اندازِ نظر کے حامل انعام پانے والوں میں، ایک نے جابروں کی طرف سے اور دوسرے نے مجبوروں کی طرف سے، اس شیطانی چکر کو توڑنے کے لیے آگے قدم بڑھائے ہیں، ان کا ملک جس کے نرغے میں تھا۔ ان شروعات کو دنیا دیکھ رہی ہے، شروعات جو دونوں افراد کی بلند ذاتی راست بازی اور سیاسی دلیری سے عبارت ہیں۔ دونوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ماضی کے گہرے زخموں کو نہیں کریدیں گے۔ اس عمل کے باعث وہ دوسرے بہت سے علاقوں کے تنازعات میں الجھے ہوئے رہنماؤں سے بہت مختلف ہیں، حالاں کہ جنوبی افریقا کے زخم شاید دوسری جگہوں کے زخموں سے کہیں زیادہ گہرے ہیں۔ مینڈیلا اور ڈی کلرک نے مفاہمت کرنے، نہ کہ متبادل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں کہیں زیادہ تلخیاں بڑھتیں اور مزید خونیں تنازعات پیدا ہوتے۔ مفاہمت کی پالیسی کا ایک اور زاویہ ہوتا ہے جس میں، کچھ لو کچھ دو، کے ذریعے کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ اس بنیاد پر ہونے والا سیاسی عمل نہایت بلند سیاسی خوبی کو منعکس کرتا ہے، مگر کامیابی حاصل کرنے کے لیے تمام گروہوں کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

جنوبی افریقا میں نہایت محترم اور مدبرانہ سیاست کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اور یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ۱۹۹۰ء میں مینڈیلا کی رہائی کے بعد یہ ہوا ہے۔ اداروں کے ذریعے نسلی امتیاز برتنے والی حکومت گرائی

جا چکی ہے، ایک عبوری آئین نافذ کر دیا گیا ہے اور ایک وسیع البنیاد عارضی ایگزیکیٹو کونسل قائم کر دی گئی ہے۔ مکمل جمہوری انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس ساری پیش رفت کا سہرا، جس میں سے ایک جمہوری جنوبی افریقہ ابھر رہا ہے، ان دونوں انعام یافتگان کے سر بندھتا ہے۔

پھر بھی ہمیں علم ہے کہ یہ عمل ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ خلل کے خطرات بھی موجود ہیں۔ ایسے گروہ بھی ہیں جو مذاکرات میں شریک نہیں تھے، یا جنھوں نے ان مذاکرات سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ جنوبی افریقہ آج بھی ایک ایسا سماج ہے جو تلخیوں، خوف اور تشدد سے عبارت ہے۔ مذاکرات کے دوران مارے جانے والوں کی گنتی دس ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ شیطانی چکر فیصلہ کن حد تک توڑا نہیں جا سکا ہے۔ لہٰذا، آج وہاں دو مبارزت طلب میلانات ہیں: تنازعہ اور مفاہمت۔ اس مسلسل عمل میں یہ ضروری ہے کہ تمام گروہ نیک نیتی سے اپنا کردار ادا کرنے کا مظاہرہ کریں تاکہ تشدد کا خاتمہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان گروہوں کو مفاہمت اور "پچھاڑ پچھاڑ" کے مسلسل عمل میں عملی طور پر شریک کیا جائے۔ اس کے لیے ناقابل شبہ تدبر کی اشد ضرورت ہے۔

تو کیا ہمیں اس وقت تک انعام دینے کے لیے انتظار کرنا چاہیے تھا جب تک کہ مفاہمت کی پالیسی کی کامیابی میں حتمی شروعات نہ ہو جاتیں؟ کچھ لوگ تو ایسا ہی کہیں گے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی حتمی شروعات کی بات کرنا عقل مندی ہوگی؟ امن اور مفاہمت کے لیے ان تھک کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ الجھیلے پڑ جانے سے نئے تنازعے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے نوبل انعام دیتے ہوئے نارویائی نوبل کمیٹی اس عمل میں کسی نہ کسی طرح ضرور شریک رہے گی۔ نوبل نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ انعام اس فرد یا ان افراد کو دیا جائے گا جنھوں نے پچھلے برس کے دوران امن کے لیے سب سے زیادہ کام کیا ہو۔ نوبل کمیٹی کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ نیلسن مینڈیلا اور ولیم ڈی کلرک نے امن اور مفاہمت کے حیرت انگیز نتائج کے حصول میں شان دار خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے امن کو ایک موقع فراہم کیا ہے۔ اب امن غالب ہوتا ہے یا نہیں یہ صرف وقت ہی بتائے گا۔

الفریڈ نوبل کی یہ نیت بھی تھی کہ انعام دینے والا ادارہ بھی امن کے حصول کے عمل میں مثبت کردار ادا کرے، لہٰذا، نوبل کمیٹی امید کرتی ہے کہ اس برس کا انعام جنوبی افریقہ میں مکمل جمہوریت اور امن کے حصول میں ہونے والی کوششوں میں، خواہ وہ کتنا چھوٹا سا حصہ ہی کیوں نہ ہو، مثبت کردار ضرور ادا کرے گا۔

نوبل امن انعام دینا نارویائی نوبل کمیٹی کا استحقاق ہے۔ ہم ان لوگوں کے لیے عمیق تحسین اور احترام کے جذبے کے تحت ایسا کرتے ہیں جو خوف اور تشدد سے مملو دنیا میں اپنی انسانیت کو قائم رکھتے ہیں، جو مسائل کو حل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں، اور جو اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نیلسن مینڈیلا اور ولیم ڈی کلرک کی مفاہمتی پالیسیاں نہ صرف جنوبی افریقہ کے لیے امید کے چراغ روشن کرتی ہیں بلکہ یہ تمام دنیا کے لیے ایک شان دار نمونہ پیش کرتی ہیں کہ شیطانی چکروں، خوف اور تشدد کے ماحول سے کس طرح باہر نکلا جائے۔

خطبہ — نیلسن منڈیلا☆

جلالت مآب شاہ ناروے، عزت مآب۔، ناورپائی نوبیل کمیٹی کے محترم ارکان۔

عزت مآب وزیراعظم، مادام گرو ہارلم برونڈلینڈ (Madame Gro Harlem Brundtland)، وزرا، ارکان پارلیمان اور سفرا، رفیق انعام یافتگان، مسٹر ایف ڈی کلارک، ممتاز مہمانان گرامی، خواتین وحضرات!

میں نارویائی نوبیل کمیٹی کے ارکان کی خدمت میں اپنا دلی شکرانہ پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ہم کو نوبیل کا امن انعام دے کر سرفراز کیا اور ہمارے رُتبے کو رفعت عطا کی ہے۔

میں اس موقع پر اپنے ہم وطن عوام اور انعام میں شریک ساتھی اور ریاست کے صدر ایف ڈی کلارک کو اس بلند اعزاز کے دیے جانے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ہم دونوں مل کر اپنے دو ممتاز جنوبی افریقیوں، آں جہانی چیف البرٹ لوتُولی اور محترم عالی آرچ بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو، کے اعزاز میں شریک ہو رہے ہیں جنھوں نے نسلی امتیاز کے شیطانی نظام کے خلاف بنیادی امداد بہم پہنچائی اور آپ نے جن کو نوبیل انعام عطا کر کے ویسا ہی خراج پیش کیا ہے، وہ جس کے حق دار تھے۔

یہ ہماری بے باکی تو نہ ہوگی اگر ہم اپنے پیش روؤں میں ممتاز نوبیل امن انعام یافتہ آں جہانی مکرم مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو بھی شامل کر لیں۔

انھوں نے بھی اسی نوع کے ایک بڑے معاملے کے منصفانہ حل میں، آج جنوبی افریقا جس سے نبرد آزما ہے، اپنا حصہ ڈالا تھا اور موت سے ہم آغوش ہو گئے تھے۔

ہم یہاں جنگ اور امن، تشدد اور عدم تشدد، نسلی منافرت اور احترام آدمیت، جبر اور مجبوری، آزادی اور انسانی حقوق، افلاس اور طلب سے آزادی کی دوئی کو چیلنج کر رہے ہیں۔

اس مقام پر ہماری حیثیت اپنے ملک کے اُن لاکھوں افراد کے نمائندوں سے کچھ زیادہ نہیں جنھوں نے ہمت کر کے اُس سماجی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جس کی اصلیت جنگ، تشدد، نسلی منافرت، ظلم وستم، جبر وتعدی اور عوام کا افلاس ہے۔

میں یہاں نمائندگی کر رہا ہوں کرۂ ارض کے ان کروڑوں افراد کی، نسلی عدم امتیاز کی تحریکوں، حکومتوں اور اداروں کی جنھوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہے، ملک کی حیثیت میں جنوبی افریقا اور اس کے عوام سے لڑنے کے لیے نہیں، بلکہ ایک غیر انسانی نظام کی مخالفت کے لیے، انسانیت کے خلاف نسلی امتیاز کے جرم کو ختم کرنے کے لیے۔

یہ بے شمار افراد، جو ہمارے ملک کے اندر بھی اور باہر بھی، جن میں روحانی شرافت تھی اور جو بغیر

☆ http://nobelprize.org/nobel_prizes/peace/laureates/1993/mandela-lecture.html

کسی ذاتی منفعت کی طلب کے استبداد اور نا انصافی کی راہ میں ڈٹ گئے۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ کسی ایک فرد کو زخم لگانا سب کو زخمی کرنے کے مترادف ہے اور وہ انصاف اور عام انسانی نفاست کے دفاع کے لیے متحد ہو کر کمر بستہ ہو گئے۔

ان کی ہمت اور ثابت قدمی ہی تھی جس کی بنا پر ہم، آج، تاریخ کا تعین بھی کر سکتے ہیں جب تمام انسانیت متحد ہو کر ہماری صدی میں ہونے والی انسانیت کی تاریخ کی سب سے نمایاں فتح کا جشن منائے گی۔

جب وہ لمحہ آئے گا، ہم سب، ایک ساتھ مل کر نسلی منافرت پر، نسلی امتیاز پر اور اقلیت کی حکومت پر باہمی فتح کی خوشی منائیں گے۔

وہ فتح بالآخر پانچ سو برس قدیم افریقی نو آبادی کی تاریخ کو دفن کر دے گی، پرتگالی سلطنت کے قیام کے ساتھ جس کی ابتدا ہوئی تھی۔

اس طرح تاریخ میں ایک بڑا اقدام اٹھایا جائے گا، دنیا کے عوام کی خدمت کے لیے اور نسلی منافرت سے جنگ کرنے کے لیے، وہ جہاں بھی ہو اور جس بھیس میں بھی ہو۔

افریقی براعظم کے جنوبی سرے پر ان لوگوں کے نام پر ایک قیمتی یادگار تعمیر کی جا رہی ہے جنھیں تمام انسانیت کے نام پر دکھ اٹھانے پڑے تھے، جب آزادی کے لیے، امن کے لیے، انسانی وقار کے لیے اور انسان کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

اس صلے کو سکوں میں نہیں تولا جا سکتا۔ نہ ہی ان کا حساب کیا جا سکتا ہے ان تمام کم یاب دھاتوں اور قیمتی پتھروں کی قیمت سے، جو افریقا کی دھرتی کے بطن میں پوشیدہ ہیں، جن پر ہم اپنی پیش روؤں کے نقوش قدم پر چلتے رہتے ہیں۔

اس کو ناپا جانا چاہیے خوشیوں اور بہبود سے ان بچوں کی، ان باشندوں کی جو بھی خطرے میں تھے کسی سوسائٹی میں اور ہمارے بیش بہا خزانوں میں۔

بچوں کو بالآخر جنوبی افریقا کے کھلے میدانوں میں کھیلنا چاہیے، جنھیں نہ بھوک کا ورد ستاتا ہو نہ بیماریاں ان کو پامال کرتی ہوں، نہ انھیں لاعلمی کے، ایذا رسانی کے اور بدسلوکی کے تازیانے لگتے ہوں، اور نہ انھیں ایسے کام کرنے پڑتے ہوں جن کے بوجھ ان کے معصوم و نازک جسم اٹھانے کے قابل نہ ہوں۔

اس جلیل القدر اجتماع کے سامنے، ہم نئے جنوبی افریقا کی جانب سے عہد کرتے ہیں کہ ہم World Declaration on the Survival, Protection and Development of Children کے اصولوں اور مقاصد پر پوری تن دہی سے عمل کریں گے۔

جس صلے کے بارے میں ہم نے باتیں کی ہیں، ان کو ان بچوں کے والدین کی خوشیوں سے بھی ناپا جانا چاہیے، جو زمین پر چل سکیں بلا کسی رہزنی کے خوف کے، سیاسی یا مالی منفعت کے لیے مارے جانے کے خوف کے یا ان کی طرف نفرت سے تھوکے جانے کے خوف سے اس لیے کہ وہ بھکاری ہیں۔

انھیں بھی مایوسی کے اس گراں بوجھ سے نجات ملنی چاہیے جو وہ اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں، جو بھوک کی پیداوار ہیں، جو بے گھر بھی ہیں اور بے روزگار بھی۔

اس تحفے کی قیمت ہمارے ملک کے عوام کی خوشیوں اور بہبود سے ناپی جانی چاہیے جنھوں نے ڈھا ڈھائے ہیں اور جو ایسی تمام غیر انسانی دیواریں مسمار کردیں گے جو انھیں آپس میں تقسیم کرتی ہیں۔

ہمارے عظیم عوام کو عظمت انسانیت کے ان تمام اعمال کو فراموش کرنا ہوگا جن کے ذریعے کچھ کو آقا اور باقی ماندہ کو غلام بنا دیا گیا تھا، اور ہر ایک کو دوسرے کا شکار کرنے والوں میں تبدیل کردیا گیا تھا، جن کی بقا دوسرے کی تباہی پر منحصر تھی۔

ہمارے مشترک انعام کو اس مسرت بخش امن سے ناپا جانا چاہیے جس کو فتح نصیب ہوگی، اس لیے کہ مشترک انسانیت کو، جو سفید اور سیاہ کو ایک نسل میں پیوست کرتی ہے، ہم میں سے ہر ایک سے کہنا ہوگا کہ ہم سب جنت کے باسیوں کی طرح اکٹھے رہیں گے۔

لہٰذا ہم زندہ رہیں گے، اس لیے کہ ہم ایسا سماج تخلیق کریں گے جو اس کا اعتراف کرے گا کہ تمام لوگ برابری کی بنیاد پر پیدا ہوئے ہیں اور جس میں ہر فرد بشر ایک ہی معیار کے طرزِ زندگی کا، آزادی، خوش حالی، انسانی حقوق اور منصفانہ حاکمیت کا حق دار ہوگا۔

ایسے سماج کو پھر کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ اس میں ضمیر کے قیدی ہوں، کہ اس میں انسان کے بنیادی حق پامال کیے جاسکیں۔

نہ اس بات کی اجازت ہوگی کہ ایک بار پھر کبھی حق حکمرانی غصب کرنے والے، جو اپنے رذیل مقاصد کے حصول کے لیے عوام سے انکا حق حاکمیت سلب کرنے کی تاک میں رہتے ہیں پر امن تبدیلیوں کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کرسکیں۔

اس سلسلے میں ہم ان افراد سے اپیل کرتے ہیں جو برما پر حکمران ہیں، کہ وہ نوبیل امن انعام یافتہ ہماری رفیق 'آنگ سان سوکی' کو رہا کریں اور، برما کے عوام کے مفاد میں، ان سے اور ان لوگوں سے سنجیدہ مذاکرات کریں وہ جن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ہم دعا گو ہیں کہ وہ جن کے پاس طاقت ہے، بغیر کسی تاخیر کے ایسا کریں گے اور اُن (مادام سو کی) کو موقع دیں گے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور عزائم کے ساتھ اپنے ملک اور اپنے عوام، سب کی بھلائی کے لیے کام کرسکیں۔

اپنے ملک کی ناہموار اور ٹھوکریں کھاتی ہوئی سیاست سے قطع نظر، میں اس موقعے پر ناروینی نوبیل کمیٹی کے ساتھ مل کر اپنے شریک انعام مسٹر ایف ڈبلیو ڈی کلرک کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بڑی دلیری کی بات تھی کہ انھوں نے نسلی امتیاز کے ذریعے ہمارے ملک کے ساتھ کیے جانے والے ہول ناک سلوک کا اعتراف کیا ہے۔

انھوں نے اپنی دانش مندانہ دور اندیشی کے باعث قبول کر لیا تھا کہ جنوبی افریقہ کے عوام کے ساتھ برابری کی سطح پر مذاکرات ہونے چاہئیں، یہ طے کرنے کے لیے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کیا فیصلے کرتے ہیں۔

مگر، ہمارے ملک میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو غلطی سے اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی ان سماجی اور علاقائی روایات سے چمٹے رہ کر ہی امن و انصاف کے حصول میں شریک ہو سکتے ہیں جنھوں نے ہمیں سوائے تباہی اور کچھ نہیں دیا ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ ان لوگوں کو بھی عقل سلیم عطا ہو اور وہ سمجھیں کہ تاریخ کو رد نہیں کیا جا سکتا، کہ ناپسندیدہ اور مکروہ ماضی کو دوبارہ رائج کر کے نیا سماج تخلیق نہیں کیا جا سکتا، خواہ اسے کتنے ہی دل لبھانے والے انداز میں کیوں نہ پیش کیا جائے۔

ہم اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملک کی بہت ساری جمہوری تحریکوں کو، Patriotic Front کے ارکان سمیت، خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے ہمارے ملک کو ایک جمہوری تبدیلی کے قریب لانے میں خود بھی مرکزی کردار کیا ہے، جیسی کہ آج موجود ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ان تحریکوں کے بہت سے نمائندے، جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ہمارے وطنی ڈھانچوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں، ہمارے ساتھ اوسلو تشریف لائے ہیں۔ انھیں بھی ہم انعام نوازی میں شریک سمجھنا چاہیے جو نوبیل امن انعام عطا کرتا ہے۔

ہمیں قوی امید ہے کہ اپنی تخلیق نو کی جہد کے دوران جنوبی افریقہ نئی دنیا کی اس کائنات اصغر کی طرح ہوگا جو خود اپنی تخلیق میں کوشاں ہے۔

اس کائنات اصغر کو ایک جمہوری دنیا ہونا چاہیے جس میں احترام انسانیت ہو، جو افلاس کی ہولناکی، بھوک سے، محرومیوں سے اور جہالت سے پاک ہو، جس میں خانہ جنگیوں اور بیرونی جارحیت کا عذاب نہ ہو، جو لاکھوں افراد کو ہجرتوں کی صعوبتوں پر مجبور نہ کریں۔

جنوبی افریقہ کی ریاست اور براعظم افریقہ کا جنوبی منطقہ جس عمل میں مصروف ہے، ہم سب کو اشارے اور ترغیب دے رہا ہے کہ ہم ان طوفانی لہروں کو سر کریں اور اس علاقے کو ایک ایسی زندہ مثال بنائیں، پوری دنیا کے صاحبان ضمیر جس کی خواہش کریں۔

ہمارے نزدیک نوبیل امن کا یہ انعام ان معاملات کی ستائش کے لیے نہیں ہے جو گزر چکے ہیں اور جاری ہیں۔

ہم ایسی آوازیں سن رہے ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ ایک اپیل ہے ان کائناتی لبوں کی طرف سے، جنھوں نے ہمیشہ اور ہر جگہ پر نسلی امتیاز کے نظام کا اختتام چاہا ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی باقی ماندہ زندگی کو اپنے ملک کے بے نظیر دکھ بھرے تجربات کے بیان

کرنے میں صرف کریں، کہ عملی طور پر انسانی زندگی کے لیے جمہوریت، انصاف، امن انسلی عدم امتیاز، ہر فرد کے لیے خوش حالی، ایک صحت مند ماحول، برابری اور عوام سے یک جہتی ہو۔

اس اپیل سے متاثر ہو کر، جس منزلت سے آپ نے ہمیں سرفراز کیا ہے، ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم بھی، جس قدر ممکن ہوا، اپنی دنیا کی تجدید کریں گے تاکہ مستقبل میں کوئی بھی "کرۂ ارض کا بدنصیب" نہ کہلائے۔

ہم اپنی آئندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع نہ فراہم کریں کہ بے اعتنائی، کلبیت یا خود غرضی نے ہم کو انسانیت کے آدرش پر پورے اترنے میں ناکام کیا ہے، نوبیل امن انعام جس کو سموئے ہوئے ہے۔

کاش ہم سب کی کوششیں یہ ثابت کردیں کہ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر بالکل صحیح تھا، جب اس نے کہا تھا کہ اب انسانیت کو ظالمانہ طریقے سے نسلی منافرت اور جنگ کی اندھیری راتوں کا قیدی نہیں بنایا جاسکتا ہے جن میں ستارے بھی نہ جگمگاتے ہوں۔

کاش ہم سب کی کوششیں ثابت کردیں کہ وہ (مارٹن لوتھر کنگ جونیئر) محض خواب دیکھنے والا نہیں تھا، جب وہ کہہ رہا تھا کہ حقیقی بھائی چارے اور امن کا حسن سونے، چاندی اور جواہرات سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

وہ صبح کبھی تو آئے گی!

شکریہ!

☆☆☆

یاسر عرفات/ باقر نقوی

نوبیل خطبہ

اعتراف کمال: "اعتراف کمال: مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام میں ان کی کوششوں کے لیے۔"

اعلانِ تجلیل

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات

ناروی کمیٹی نے مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام میں ان کی کوششوں کے لیے ۱۹۹۴ء کا انعام، حروف تہجی کے اعتبار سے، یاسر عرفات، شیماں پیریز اور اسحاق رابین کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے لیے یہ خوشی کا موقع ہے کہ آج ہم تینوں انعام پانے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ نہایت پیچیدہ سیاسی عمل میں بہت مصروف ہیں۔ ہم اپنے قلب کو زیادہ کشادہ محسوس کر رہے ہیں کہ انعام حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس چھوٹے سے برف زار ملک میں تشریف لانے کے لیے وقت نکالا۔

مشرق وسطیٰ کے مقدر پر دنیا کا اس قدر توجہ دینا محض اتفاق نہیں۔ مشرق وسطیٰ کا یہ تنازعہ یا تنازعات، ہم سب کے لیے خاص طور سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مشرق وسطیٰ اُس مقام پر واقع ہے جہاں ایشیا اور یورپ ملتے ہیں۔ یہی وہ زمین ہے جس میں کئی بڑے مذاہب کی جڑیں پیوست ہیں۔ اس لیے، مشرق وسطیٰ وہ آئینہ ہے جس میں دنیا خود کو منعکس دیکھتی ہے۔ وہاں جس طرح تنازعات حل کیے، یا نہیں کیے جاتے ہیں، مثال ہیں امید پیدا کرنے کی، یا دوسرے علاقوں میں ان کو ٹھنڈا کرنے کی۔ اسی وجہ سے تمام واقعات پر، محض انعام یافتگان کی سرگرمیوں ہی پر نہیں، اس فکر مندی سے نگاہ رکھی جاتی ہے۔

مجھے اپنے ایک ذاتی مشاہدے پر کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔ چوں کہ ہماری نشوونما پروٹسٹنٹ عیسائی روایات کے مطابق ہوئی تھی، ہمارے ذہنوں میں، ابتدائی اسکول کے دوران، ناروے اور فلسطین

دونوں ملکوں کی تاریخ اور جغرافیہ پہلے ہی کوٹ کوٹ کر بھری جا چکی تھی۔ دس برس پہلے جب میں پہلی بار فلسطین گیا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایسے ملک میں آ گیا ہوں، عرصۂ دراز سے جس سے واقف ہوں۔ ایسا نہیں تھا، کہ میں نے اس کی پیچیدہ اور خونی تاریخ انجیل سے پڑھ لی تھی۔ بچپن کے تصورات بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں؟ وہ ملک میری یادوں میں بسا ہوا تھا۔ میں یروشلم اور جیریکو جا چکا تھا۔ ساتھ ہی، مجھ میں گہری روحانی بے چینی پیوست تھی، جو ہولوکاسٹ نے ہم یورپ والوں کے دلوں میں پیدا کی تھی۔ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے ذریعے عالمی برادری نے ایک غلط کو صحیح کرنے کی کوشش کی تھی، اور شاید صحیح ہی کیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے ذہن میں زیادہ بے چینی سرایت کرتی محسوس کی، جیریکو کے قریب واقع کیمپ کے اجڑے منظر کو دیکھ کر ہی نہیں، اس ثبوت سے کہ آج پھر کچھ لوگ دربدر ہوئے ہیں۔ کیا اس تاریخ کی کوئی انتہا نہیں ہے؟ کیا مزید بے انصافی کیے بغیر ناانصافی کا مداوا نہیں ہو سکتا؟

اس برس کے انعام یافتگان کے انتخاب کے ناقدوں نے کہا ہے کہ نوبیل کمیٹی اس تنازعے سے اتنے فاصلے پر ہے کہ اس کو سمجھ نہیں سکتی۔ شاید— غالباً وہی جو اس کے درمیان رہتے ہیں اس کے معانی جانتے ہیں۔ اس کے برعکس، وہی لوگ حل کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے زیادہ وسیع مناظر ہوں، اور وہی، ابسن کے الفاظ میں ''کھوکھلے ہاتھوں کے ذریعے، ایک بہتر نظارے کے لیے'' واقعات کو دیکھ سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ، ان نظاروں کو ہم آہنگ کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ بس، اس برس کے انعام یافتگان نے بالکل یہی کچھ کیا ہے۔ تنازعے کے درمیان رہتے ہوئے بھی انھوں نے اس سے پرے دیکھنے کی صلاحیت قائم رکھی ہے۔

کمیٹی کے نزدیک، اسرائیل اور PLO کے درمیان پچھلے برس ہونے والے 'اوسلو میثاق' کا مطلب یہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے واقعات نے نیا موڑ کاٹا ہے۔ اس میں انقلابی بات یہ تھی کہ دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے کے وجود کا اقرار کر لیا تھا۔ کم از کم، اس اقرار کے باعث کہ، 'تشدد کو تشدد پیدا کرتا ہے' کے خوف ناک چکر سے باہر نکلنے، اور پُر امن ہم بودیت کے ممکنہ راستے کھل گئے تھے۔ معاہدوں کی تکمیل کے بعد سے ترقیات زیادہ حرکی ہو گئی ہیں۔ اس کا اطلاق اسرائیل اور فلسطینی عوام کے درمیان تعلقات، اور اسرائیل اور اس کی ہمسایہ ریاستوں کے درمیان تعلقات، دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ وزیراعظم رابین نے کل کی پریس کانفرنس میں کہا تھا، اوسلو میثاق نے دنیا بھر سے تعلقات کی بہتری کے راستے ہموار کر دیے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ نوبیل کمیٹی کو انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہ کہنا، اوسلو میثاق کے نتیجے میں، ہر میدان میں، جو کچھ حاصل کیا گیا ہے، اسے نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہمیں اس کا انتظار کرنا پڑتا، کانٹ نے اپنے مشہور مضمون میں جسے ''ابدی امن'' کہا تھا، تو ہمیں ایک طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑتا۔ امن کو ابدالآباد کے لیے جیتنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر فیصلے میں کسی عمل میں داخل ہونے کے عنصر کو شامل ہونا چاہیے، ایسا عمل جس میں امن کا وعدہ شامل ہو۔ نوبیل امن انعام ان کوششوں کے لیے جو کی

گئی ہوں، اور ایسی مزید کوششوں کی ہمت افزائی کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ انعام کے بارے میں الفریڈ نوبیل کا ارادہ بھی یہی تھا۔

کمیٹی کا خیال ہے کہ اس برس کے انعام یافتگان وہ افراد ہیں جو اوسلو میثاق کے، اور اس پر عمل کرانے کے، سب سے زیادہ ذمے دار ہیں۔ انھوں نے، روز بہ روز ہونے والے مذاکرات پر نظر رکھی، اور اس پر مبنی مشکل اور ضروری فیصلے کیے تھے کہ دوسری پارٹی کو کیا رعایات دی جائیں۔ جنگ اور نفرت کے زہر آلودہ حالات میں، انھیں اپنے مقابل کو کم سے کم اعتبار دینا تھا، یہ اعتبار بھی کر لینا تھا کہ امن کے لیے دیے جانے والے اشارے اصلی ہیں، اور یہ بھی اعتماد کرنا تھا کہ اگر انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو کوئی اس کو تھامنے والا بھی ہوگا۔ اس شرط پر انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا جوا کھیلا تھا۔ اس کے لیے بڑی ہمت درکار ہوتی ہے۔ ایسے مذاکراتی کھیل کی کامیابی کے لیے ایک قسم کی موزونیت ہونی چاہیے۔ دونوں فریق یہ احساس کرنے کے قابل ہوں کہ 'لو اور دو' کا تبادلہ اندازاً برابری پر ختم ہوگا۔ تینوں انعام یافتگان شکریے کے مستحق ہیں کہ وہ اتنا نازک توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ رعایات کے بعد رعایات ہونی چاہییں ورنہ عمل رک جائے گا۔ اب تک، دونوں جماعتوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ عمل کے دوران ایسا کچھ نہیں کیا جائے گا کہ "کھیل کے اصول" ٹوٹ جائیں۔

بہت سی وجوہات کی بنا پر، جو زیادہ واضح نہیں ہیں، اور میں جن پر وقت ضائع نہیں کروں گا، دنیا نوبیل امن انعام کی عزت کرتی ہے۔ اس وجہ سے نوبیل کمیٹی کو ترغیب ملتی ہے کہ وہ اپنے منصب سے سرک کر، بہ قول شخصے، اخلاقی انصاف کا لبادہ اوڑھ لیں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہم اپنے فرائض بڑے انکسار کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ دور سے دیکھنے والے کو، شاید اس دور سے دیکھنے والے کے لیے جو دنیا کے مراعات یافتہ اور پُرامن گوشے سے تعلق رکھتا ہے، اخلاقی بنانا آسان، بلکہ ذرا زیادہ ہی آسان ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر میں اس بات کا قائل ہوں کہ امن انعام کی عزت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں سے تکبر کو خارج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح انعام پانے والا حقیقی اخلاقی منصوبے، امن، کی مدد کر سکتا ہے۔ ارادہ یہ نہیں تھا کہ کسی کو نیک چلنی کی سند دی جائے، بس، نوبیل کے اپنے دیے ہوئے رہنما اشاروں کے مطابق امن کے لیے عملی کام کرنے والے کو انعام دیا جائے۔

شروع ہی سے، کمیٹی نے امن کے لیے عملی کام کی ایک وسیع تعریف متعین کر رکھی ہے۔ اس کا حلقہ انسانیت کی بھلائی کے کام کا ہے، انسانی حقوق سے سیاسی عمل کے راستے تک کا ہے، جو تنازعات کی ممانعت کرے، ان کو روکے یا ان کو حل کرے۔ اور ہمارے انعام پانے والے حضرات نے، بڑی شدت اور ہمت سے، اسی اہم اور آخری علاقے میں مداخلت کی ہے۔ نفرت اور تشدد، نفرت اور تشدد کو جنم دیتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ اس خوف ناک چکر میں گرفتار تھا؛ بے شمار افراد پر یہ بھوت سوار ہو چکا تھا، مگر، جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سے باہر نکلنے کی طاقت رکھتے ہیں، جو سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور

پُر امن ہم بودیت کی تلاش میں اپنی ڈگر پر واپس چلے جاتے ہیں۔ شاید ایسے لوگ ہی اس احترام اور تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ نہیں سکھایا گیا تھا کہ ایسی واپسی ہی سب سے زیادہ شادمانی کی وجہ بنے؟

ایسے ہی ایک سابقہ موقعے پر میں نے برطانوی شاعر اور دانش ور اسٹیفن اسپنڈر کے تصورات کو یاد کیا تھا، جب اس نے ہسپانوی خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا۔ اس کے نزدیک فسطائیت کے خلاف جنگ ایک اعلیٰ مقصد تھی، مگر ایک ایسا وقت آیا جب اس نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اس پر خوف ناک انکشاف ہوا تھا کہ جنگ اس پر کیسے بہیمانہ اثرات مرتب کر رہی تھی۔ ''مجھے معلوم ہو گیا تھا'' اس نے لکھا تھا، ''اگر میں ہر مارے جانے والے بچے کے بارے میں بلا رُو رعایت نہیں سوچتا تو گویا میں بچوں کے مرنے کی ہرگز کوئی پروا نہیں کرتا۔'' اسپنڈر میں اتنی بہادری تھی کہ وہ اپنی اس قسم کی تجزیاتی خود احتسابی کر سکتا تھا، اور اس خوف ناک چکر کو توڑ کر باہر نکل سکتا تھا۔

اس طرح میں انعام یافتگان کے کردار کا احاطہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں، نہ ان کے ارادوں کا، جو وہ آئندہ کرنے والے ہیں، جس کا خود انھیں بھی خیال نہیں ہوگا۔ میں صرف اتنا بتانا چاہ رہا ہوں کہ صورت حال کتنی پیچیدہ ہے اور فیصلہ کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ مگر میرا اصل پیغام کچھ اور ہے، بہت محدود مگر ضروری: میں توجہ مرکوز کرانا چاہ رہا ہوں اس جرأت اور یک سوئی کی طرف جس سے انھوں نے اوسلو مذاکرات کے شروع ہونے کے بعد سے اہم سیاسی اقدام کیے ہیں۔

تینوں انعام پانے والے ایسے درجات پر فائز ہیں جن میں ان کے پاس واقعات پر اثر انداز ہونے کی طاقت ہے، مگر ان کی حیثیت سب کے سامنے ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے ساتھ مل کر واقعات کی سمت بدلنے، نفرت اور تشدد کے خوف ناک چکر کو توڑ کر باہر نکلنے اور موافقت کی راہوں کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ رہنماؤں کی حیثیت میں وہ امن کے حصول کی تمنا کو مہمیز کر رہے ہیں، بلا شبہ جو عوام کے دلوں میں بھی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ ماضی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، مگر اس کی طرف مختلف رویے اپنائے جا سکتے ہیں۔ اس کے سایے میں رہنے کا بھی فیصلہ کیا جا سکتا، یا پھر اس کے استعمال سے بہتر مستقبل کی تعمیر بھی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے انعام یافتگان (دوستوں) نے آخر الذکر راہ اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، اور اب تک وہ اس میں کامیاب رہے ہیں: اب واقعات نے ایک نیا موڑ کاٹا ہے۔

حالات اب بھی بھرپور تناؤ کی کیفیت میں ہیں: نشاناتِ تشدد، قتل و عدم تحفظ نظر آ رہے ہیں: اور استحکام ابھی بہت دور کی بات ہے۔ پھر بھی ہمارے دوستوں نے نہ صرف یہ دکھا دیا ہے کہ مصالحت کا راستہ نکالا جا سکتا ہے، بلکہ انھوں نے بڑی ہمت سے اس راستے پر کئی قدم آگے بڑھائے ہیں۔ اُن کوششوں کی پسندیدگی میں، اور اس امید پر کہ جو عمل انھوں نے شروع کیا ہے وہ جاری رہے گا، آج انھیں نوبیل امن سے نوازا جا رہا ہے۔

خطبہ — جناب یاسر عرفات

جلالت مآب شاہ ہارالڈ، جلالت مآب ملکہ سونیا، پروفیسر سیرسٹیڈ، صدر نشین نوبیل امن کمیٹی، عزت مآب، خواتین و حضرات۔

قرآن کریم سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''تب، اگر وہ امن کے حصول پر راضی ہو جائیں، تم بھی اُن کی طرف جھکو، اور اللہ پر بھروسا کرو۔'' (قرآن الکریم، ۸:۶۲)

جب سے میرے عوام کی طرف سے مجھے اپنے گم کردہ گھروں کی بازیابی کا دشوار فرض سونپا گیا ہے، میں خود کو ایک گرم جوش عقیدے سے لبریز پاتا ہوں، کہ گھروں سے نکالے ہوئے لوگ، جو اپنے گھروں کی کنجیوں کے ساتھ اپنے کٹے ہوئے دست و پا، جسم کے نا قابل علاحدگی حصے، اٹھائے ہوئے ہیں، اور وہ جو اپنے وطن میں زخموں کو اپنے نام کی طرح گلے سے لگائے ہوئے ہیں، ایک دن، اپنی تمام قربانیوں کے طفیل، واپسی اور آزادی سے نوازے جائیں گے۔ اور یہ بھی کہ، درد سے بچھے ہوئے لمبے راستوں کا مشکل سفر ان کی دہلیزوں پر ختم ہوگا۔

اب، جب کہ ہم ہلالِ امن کی پہلی رویت کو ایک ساتھ منا رہے ہیں، میں اُن شہیدوں کی آنکھوں میں جھانک رہا ہوں، جن کی نگاہ میرے شعور میں سرایت کر گئی ہے۔ اور اب، جب کہ میں اس شہ نشین پر ایستادہ ہوں، وہ مجھ سے اپنے وطن اور اپنی خالی کی ہوئی جگہوں کے بارے میں استفسار کر رہے ہیں۔ میں ان سے اپنے آنسو چھپا رہا ہوں اور ان سے کہہ رہا ہوں، ''تم کتنے صحیح تھے۔ تمھاری فیاض قربانیوں نے ہم کو اپنی مقدس زمین سے پیار کرنے کے قابل بنایا ہے، اس پر پہلا قدم رکھنے کی توفیق دی ہے، مشکل مجادلے کے لیے، امن کے مجادلے لیے، بہادروں کے امن کے لیے۔''

اب، جب کہ ہم اپنے اندر کی تخلیقی قوتوں کی دوبارہ بیداری کا جشن منا رہے ہیں، اور اپنے ہمسایوں سے بلند، اپنے جنگ آلودہ گھروں کی تجدید کر رہے ہیں، جہاں ہمارے بچے ایک ساتھ کھیلتے ہیں اور پھول چننے میں مقابلے کرتے ہیں، اب، میں اپنے فلسطینی عرب عوام کے دلوں میں قومی اور انسانی تفاخر محسوس کرتا ہوں جن میں کبھی نہ ختم ہونے والی طاقتِ صبر اور داد و دہش ہے، جن کے دل وطن، تاریخ اور عوام کے درمیان بندھن کے جذبات سے لبریز ہیں، جنھوں نے وطن کی قدیم داستان میں رزمیۂ امید کا ایک نیا باب شامل کیا ہے۔

میں اس نوبیل انعام کو معنون کرتا ہوں ان کے نام، اس مہربان اور صبر آزما قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام، صنوبر اور شبنم کی، آگ اور پسینے کی اس قوم کے نام۔ میں اس (انعام) کو ان بچوں کے لیے رکھ رہا ہوں،

جن سے وعدہ کیا گیا ہے آزادی کا، بچاؤ اور تحفظ کا، بیرونی دھمکیوں یا اندرونی استحصال سے آزاد وطن کا۔

میں جانتا ہوں، میں اچھی طرح جانتا ہوں، جناب صدر نشین، کہ بلند و برتر اور بڑا معنی خیز انعام دیا گیا ہے مجھے اور میرے شرکائے کار جناب اسحاق رابین اسرائیلی وزیر اعظم اور جناب شیمان پیرے وزیر خارجہ، کی کامیابیوں کو توقیر عطا کرنے کے لیے، مگر تلاش راہ کی ہمت افزائی کے لیے بڑے قدموں اور عمیق آگاہی کے ساتھ، سچے ارادوں کے ساتھ تا کہ ہم قلب ماہیت کر سکیں امن کے انتخاب کی، بہادروں کے امن کی، الفاظ سے عمل اور حقیقت تک، کہ ہم اہل ہو سکیں پیغام کو آگے لے جانے کے لیے، ہم کو جس پر مامور کیا ہے ہمارے عوام نے، اور انسانیت نے اور ایک آفاقی اخلاقی فریضے نے۔

فلسطینی، جن کے قومی مقاصد، اپنے عرب بھائیوں کی طرح اُس مکمل اور منصفانہ امن کی خاطر، عرب اسرائیلی باب امن کی حفاظت کرتے ہیں، جو ''زمین برائے امن'' کی بنیاد پر اور بین الاقوامی جواز اور تجاویز کی تکمیل امن کے باعث وجود میں آیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک بیش بہا اثاثہ ہے اور ہمارے مفاد میں ہے۔ یہ ایک حتمی انسانی اثاثہ ہے جو ایک فرد کو، پابندیوں سے مبرا، کسی بھی علاقائی، مذہبی یا گروہی انفرادیت کی نشوونما کی آزادی دیتا ہے۔ یہ عرب اسرائیلی رشتوں میں ان کی فطری معصومیت کو تازہ دم کرتا ہے، اور عرب جذبے کو عدم پابند انسانی اظہار کے ذریعے یہود/ یورپی المیے کے عمیق ادراک کا اختیار دیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے یہ اذیت گزیدہ یہودی جذبے کو اجازت دیتا ہے اپنے بے زنجیر اظہار کی، اس عذاب کے لیے جو فلسطینیوں نے اپنی شگفتہ تاریخ میں سہا ہے۔ جنھوں نے اذیتیں سہی ہوں، ان کے درد کو صرف اذیت گزیدہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

امن ہمارے مفاد میں ہے۔ اس لیے کہ منصفانہ امن کی فضا ہی میں فلسطینی اپنی جائز آزادی اور خود مختاری حاصل کر سکتے ہیں، اپنی قومی اور تہذیبی شناخت کی نشوونما کر سکتے ہیں، ساتھ ہی مستحکم رشتہ ہائے ہمسائگی سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں اور اسرائیلی عوام سے باہمی احترام اور تعاون کے رشتے استوار کر سکتے ہیں۔ اس کے بدلے میں اسرائیلی مشرقِ وسطیٰ کی اپنی شناخت کو واضح کر سکتے ہیں اور عرب ہمسایوں کی طرف اپنے معاشیاتی اور تہذیبی دریچوں کو کھول سکتے ہیں۔

عرب اپنے علاقے کی ترقی کے خواہاں ہیں، طویل جنگ زدہ برسوں نے، جس کو دنیا کے جمہوری، اکثریت اور خوش حالی کے ماحول میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے سے روک دیا تھا۔

جس طرح جنگ ایک بڑی مہم ہوتی ہے اسی طرح امن بھی ایک چیلنج اور بازی ہوتا ہے۔ اگر ہم امن کو طوفان کے درمیان بادو باراں کو برداشت کرنے کے لیے وسائل فراہم نہ کریں، اگر ہم امن کی نشوونما اس لیے روک دیں کہ وہ طاقت حاصل کر سکے، اگر ہم اس کو بڑھنے اور طاقت حاصل کرنے کا موقع فراہم نہ کریں تو بازی بے کار یا ضائع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا میں اس شہ نشین سے امن میں شریک ساتھیوں سے امن کے

عمل کو تیز کرنے کی درخواست کرتا ہوں تاکہ (مقبوضہ علاقوں سے) واپسی کا عمل شروع ہو تاکہ تیزی سے نئے مرحلے پر پہنچنے کے لیے انتخابات کرائے جاسکیں، تاکہ امن کی جڑیں گہری ہوسکیں، اس کی نشوونما ہو سکے اور امن ایک حقیقت بن کر استوار ہو سکے۔

ہم نے امن کا عمل، زمین برائے امن کی بنیاد پر اور فلسطینی عوام کے جائز حقوق کے حصول کے لیے اقوامِ متحدہ کی قرارداد ۲۴۲ اور ۳۳۸ اور دوسرے بین الاقوامی فیصلوں کی بنیاد پر شروع کیا تھا۔ اس کے باوجود امن کا عمل پوری گنجائش کی حد تک جاری نہیں ہوسکا ہے، اعتماد کا نیا ماحول اور امن معاہدے کے پہلے اور دوسرے برسوں میں کیے جانے والے اقدام بڑے ہمت افزا رہے ہیں اور کارروائیوں کو آسان کرنے اور تحفظات کو ختم کرنے کے کا تقاضا کرتے ہیں۔ جو کچھ باقی رہ گیا ہے، خصوصاً انتقالِ اقتدار اور مغربی کنارے سے اسرائیلی انخلا اور نئی آبادیوں کے بارے میں اقدامات، تاکہ انخلا مکمل ہو سکے، اس کو پورا کیا جانا چاہیے۔ یہ عمل ہماری سوسائٹی کو اپنے بنیادی ڈھانچے کی تعمیرِ نو کرنے اور اپنی وراثت اور علم کے ذریعے ایک نئی دنیا بنانے کے مواقع فراہم کرے گا۔

میں اس سیاق و سباق میں امن کانفرنس کے کفیل روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکا سے امن کے عمل کی امداد میں بڑے قدم اٹھانے اور تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میں ناروے اور مصر سے بھی مطالبہ کرتا ہوں، جو پہلے ممالک تھے جنھوں نے اوسلو، واشنگٹن اور قاہرہ سے شروع ہونے والے اسرائیلی فلسطینی معاہدہ برائے امن کی نگہداشت کی تھی، تاکہ اس سے پیدا ہونے والے قابلِ قدر اقدام کی پیروی کی جائے۔ امن کے عمل، بہادروں کے امن کے ساتھ اوسلو اور دوسرے ممالک کا بھی نام روشن رہے گا جنھوں نے کثیر پہلو گفت و شنید کی کفالت کی تھی۔

اس مرحلے پر میں دنیا کے تمام ممالک، بالخصوص عطیات دینے والے ممالک سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ جلد اپنے حصے کے عطیات کی ادائیگی کریں تاکہ فلسطینی عوام اپنے معاشیاتی اور سماجی مسائل پر قابو پانے کی کوشش کریں اور اپنے بنیادی ڈھانچوں کی تعمیرِ نو اور تجدید کرسکیں۔ ضروری مادی حالات کی غیر موجودگی میں امن کے عمل کو مستحکم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے امن پھل پھول نہیں سکتا۔

میں امن کے عمل میں اپنے حصے داروں سے بھی مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ ضروری، مکمل اور ترجیحاتی پیش بینی کی مدد سے امن کے عمل کو مضبوط بنائیں۔

صرف اعتماد ہی امن نہیں لا سکتا، مگر حقوق اور اعتماد کا اعتراف یہ کام کرسکتا ہے۔ حقوق کے اعتراف میں ناکامی ناانصافی کا احساس پیدا کرتی ہے، راکھ میں دبے ہوئے انگارے کو دہکائے رکھتی ہے، امن کو خوف کے سراب کی طرف متحرک کرتی ہے اور پھٹنے پر تیار شتابے (fuse) کو دوبارہ روشن کرتی ہے۔

ہم امن کو ایک تاریخی ترجیحاتی حقِ انتخاب کے طور پر دیکھتے ہیں، داؤ پیچ کی طرح نہیں، جو نفع یا

نقصان کے وقتی حسابات پر منتج ہو۔ امن کا عمل سیاسی عمل نہیں ہوتا، یہ ایک مرکب کارروائی ہوتا ہے جس میں قومی آگاہی، معاشیاتی، سائنسی اور تکنیکی ترقیات ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں، اُسی طرح جیسے تہذیبی، سماجی اور تخلیقی انضمام ضروری کردار ادا کرتے ہیں، جو امن کا نچوڑ ہوتے ہیں اور اس کے عمل کو مضبوط کرتے ہیں۔

میں ان سب پر نظر ثانی کرتا ہوں، جب میں امن کے اس مشکل راستے کو یاد کرتا ہوں ہم جس پر چلے ہیں، مگر ہم نے ایک مختصر فاصلہ ہی طے کیا ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو ہمت اور انتہائی جاں بازی سے تیار کرنا ہوگا، طویل فاصلے طے کرنے کے لیے، مکمل اور منصفانہ امن کے ٹھکانے کی طرف، تاکہ ہم امن کی تخلیقی قوت کے عمیق معنی کو سمجھ سکیں۔

جب ہم نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم امن کے ساتھ اکٹھے رہیں گے تو ہمیں ایسی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے جو وقت اور نسلوں کی حدوں سے بلند ہو۔ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی سے انخلا کے لیے وہاں بسائی جانے والی نئی بستیوں کے سوال پر دل کی گہرائیوں سے غور کیا جانا چاہیے، اس لیے کہ یہ واقعات جغرافیائی اور سیاسی اتحاد کے مسائل پر ضرب لگاتے ہیں، اور مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے علاقوں کے درمیان رسل و رسائل کی آزادی کے آڑے آتے ہیں اور تناؤ کے ارتکازات کا باعث ہوتے ہیں: یہ اُس امن کی روح کے منافی ہیں اور اس کی طمانیت کو مجروح کرتے ہیں، ہم جس کو قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یروشلم کے سوال پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سب کی روحانی جنت کے مترادف ہے۔ یہ فلسطینیوں کا شہر ہے جہاں یہودیوں کے متبرک مقامات بھی ہیں جو اسلامی اور عیسائی متبرک مقامات جیسے احترام کے لائق ہیں، لہٰذا ہم کو اس حقیقت کو پوری دنیا کے لیے روحانی ہم آہنگی کے روشن مینار اور تہذیب اور مذہبی وراثت کے نقطۂ شعاع کی طرح پیش کرنا چاہیے۔ اس سیاق وسباق میں ایک اہم کام جو امن کے عمل کو آگے کی طرف بڑھاتا ہے اور ہم کو اپنے ذہنوں کی گہرائیوں میں بیٹھی ہوئی رکاوٹوں کو اٹھانے میں مدد کرتا ہے، وہ حوالات اور قید میں ڈالے ہوئے افراد کی رہائی کا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ان کو رہا کیا جائے تاکہ ان کی مائیں، ان کی بیویاں اور بچے ایک بار پھر مسکرانے لگیں۔

ہمیں اس نوزائیدہ بچے کو موسم سرما کی ہواؤں سے بچانا چاہیے، ہمیں اس کی پرورش دودھ اور شہد سے کرنی چاہیے، دودھ اور شہد کی سرزمین سے، سالم، ابرہیم، اسماعیل اور اسحاق کی سرزمین، مقدس سرزمین سے، امن کی سرزمین سے۔

میں آخر میں اپنے امن کے ساتھیوں جناب اسحاق رابین، وزیراعظم اسرائیل اور جناب شیمان پیریز وزیر خارجہ اسرائیل کو نوبیل کو امن انعام دیے جانے پر مبارک باد دینا چاہوں گا۔

میری مبارک باد، دوست ملک کے لیے، ناروے کے عوام کے لیے، اور ان کی کفالت کے لیے، ان کی گرم جوش مہمان نوازی کے لیے جو اُن کی تاریخ اور ان کی شرافت پر دال ہے۔ میں آپ کو یقین

والا ہوں، خواتین و حضرات، کہ ہم اپنے آپ کو دریافت کریں گے امن کے ماحول میں، نہ کہ جنگ اور مقابلے میں، اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ اس کے بدلے میں اسرائیلی بھی خود کو جنگ سے زیادہ امن میں دریافت کریں گے۔

اللہ اکبر

امن ہو اس دھرتی پر

اور نیک تمنائیں تمام انسانوں کے لیے

شکریہ!

☆☆☆

باقر نقوی

جوڈی ولیمز اور آئی سی بی ایل ☆

اعتراف کمال: جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی ممانعت اور صفائی کی کوششوں کے لیے۔

جلالت مآب، عزت مآب، خواتین و حضرات!

اس لمحے ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے اعتقاد میں غیر متزلزل بھی ہیں اور جو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایسے کام کیے جا سکتے ہیں جو دنیا کو یکسر بہتر، محفوظ اور نرم دل بنا سکتے ہیں، اور جو مشکل نظر آنے والے کام کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ایسے افراد ہماری توصیف اور شکرانے کے حق دار ہیں۔ ہمیں آج ایسے لوگوں میں سے چند کا اوسلو سٹی ہال میں خیر مقدم کرتے ہوئے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے۔ International Campaign to Ban Landmines(ICBL) کے نمائندو آپ کو، اور اس مہم کو جاری رکھنے کی سب سے بڑی طاقت جوڈی ولیمز، سب کو ہم صمیم قلب سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ سب نے نہ صرف اس کام کو آگے بڑھایا ہے، بلکہ یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ ناممکن بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ نے ایسے ہتھیاروں کی ٹکنالوجی کے استعمال کے خلاف بین الاقوامی سطح پر رائے عامہ کو ابھارنے میں مدد کی ہے جو بالکل نہتے اور بے گناہ لوگوں کو اچانک آ لیتے ہیں۔ آپ نے یہ امکانات بھی پیدا کر دیے ہیں کہ رائے عامہ کی اس لہر کو سیاسی عمل میں بدلا جا سکے۔

ہم سب کو اعتراف ہے کہ اس کام کا ایک بڑا حصہ ابھی پایۂ تکمیل تک پہنچانا باقی ہے۔ بہت سی قومیں، جن میں بڑی قومیں بھی شامل ہیں، اس ہتھیار کا استعمال ترک کر دینے کا وعدہ کرنے کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ اندازاً ایک سو ملین (دس کروڑ) بارودی سرنگیں ابھی تک بچھی ہوئی ہیں اور ان کے خاتمے کے لیے بہت کام کرنا باقی ہے۔ بارودی سرنگوں سے زخمی ہو کر معذور ہونے والے بے گناہ

☆ ناروے کی نوبل کمیٹی کے صدر نشین کی تقریر جو ۱۹۹۷ء کا امن انعام عطا کیے جانے کے موقعے پر ۱۰ دسمبر ۱۹۹۷ء کو اوسلو میں کی گئی۔

افراد کے لیے روزگار کے باعزت مواقع مہیا کرنے کی کوششوں کی ابھی صرف ابتدا ہی ہوئی ہے مگر آپ کی بے لوث کوششوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے اور ایسے ادارے وجود میں آگئے ہیں جن کی بنا پر امید ہے کہ ہم دنیا کو زمینی بارودی سرنگوں سے مکمل طور پر پاک کرنے کا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ راہ متعین ہے، اور تحریک کی ابتدا ہو چکی ہے۔ یہ کم درجے کی کامیابی نہیں، بلکہ بہت اہم اور فیصلہ کن جد و جہد کی طرف پہلا قدم ہے۔ آج ہم اسی اقدام کی پذیرائی کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں، وسیع پیمانے پر لام بندی اور عوام کی شرکت کا ارتکاز، جو ہم دیکھ رہے ہیں، امید افزائی کی ایک صورت ہے کہ ہم موجودہ مسئلے کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ امید ہمیں ایسی نظیر فراہم کرتی ہے جس کی بنا پر عالمی سطح پر اس مسئلے (سے متعلق) سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ چھوٹے بڑے، ایک ہزار سے زیادہ غیر سرکاری اداروں کے لیے، جنھوں نے اس مسئلے پر کمر باندھ رکھی ہے، ICBL ایک چھتری کا کردار ادا کرتا ہے۔ ناروے کی نوبیل کمیٹی ان تمام اداروں کا احترام کرتی ہے اور وسیع پیمانے پر ان کی یک جہت کارکردگی سے حاصل ہونے والے اثرات کی نشان دہی کرنا چاہتی ہے۔

اس عمل کی ایک اور نمایاں صفت، جس پر غور کیا جانا چاہیے، یہ ہے کہ سیاسی سطح پر کس طرح پیش قدمی کی جائے۔ ایک ہفتہ قبل کینیڈا کے شہر اوٹاوا میں، ایک سو اکیس ممالک نے جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی مکمل ممانعت پر دستخط کر دیے ہیں۔ وزیر خارجہ لائیڈ ایکس وردی کے ذریعے کینیڈا کی حکومت نے اس سلسلے میں پہل کی تھی، جب ۱۹۹۶ء میں انھوں نے تمام ممالک کو اوٹاوا میں مدعو کیا تھا۔ ایکس وردی نے اس متوقع اجتماع کے بارے میں کہا تھا کہ "ایسا معاہدہ ایک مؤثر طاقت فراہم کرسکے گا جس کی بنا پر اخلاقی نوعیت کا معیار متعین ہوگا کہ ان بارودی سرنگوں کی پیداوار، استعمال، ذخیرہ اندوزی، اور ان کی رسد پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دی جانی چاہیے۔" اس سلسلے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ بے شمار استثنا کے ذریعے اس معاہدے کو کم زور نہ کیا جائے تاکہ زیادہ ملک اس میں شرکت کی طرف راغب ہوسکیں، بلکہ اس کے ذریعے دنیا کو ایک واشگاف پیغام دیا جائے۔" اگرچہ اس وجہ سے بہت سے ممالک نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے ہوں گے، مگر بلاشبہ عوام کی زبردست تائید اور سیاسی دباؤ کے پیش نظر بڑے ممالک کو اس میں شامل ہونا پڑا۔

بارودی سرنگوں کا مسئلہ ایک زمانے سے بین الاقوامی فہرست عمل پر رہا ہے۔ Landmine Protocol to the Conventional Weapons Convention کے سلسلے سے ۱۹۸۰ء میں یہ زیر بحث بھی آیا تھا۔ جب ۹۶-۱۹۹۵ء میں Protocol میں تبدیلیوں کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی تب محسوس کیا گیا تھا کہ اس ضمن میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

نومبر ۱۹۹۱ء میں Vietnam Veterans of America Foundation واشنگٹن ڈی سی میں اور فرینکفرٹ میں Medico International نے بارودی سرنگوں کی روک تھام کرنے کے لیے تحریک چلانے پر اتفاق کیا تھا۔ جب زمینی بارودی سرنگوں کے بارے میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس ۱۹۹۳ء میں منعقد ہوئی تھی، اس میں چالیس ملکوں کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ اس کے اگلے برس جنیوا میں پچھتر اداروں کے نمائندہ مندوبین شریک ہوئے تھے۔ آج یہ صورت حال ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ ادارے ICBL کے رُکن بن چکے ہیں۔ اس مقبول عام عمل سے منسلک ہونے کی وجہ سے ۱۹۹۱ء میں شروع کیا جانے والا عمل ایک نئی سیاسی شروعات کا باعث ہوا تھا اور فراموش گاری کا شکار اس مسئلے کو دوبارہ سامنے لایا گیا تھا۔

یہ ابتدا بہت دلچسپ ہے، جو بہ ظاہر اقوام متحدہ اور بین الاقوامی گفت و شنید کے نظام کو ہونے والی پیش رفت سے بھی آگہی دے گی، اور ان کو نئی زندگی بھی عطا کرے گی۔ مؤثر سیاسی عمل اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ہر سطح پر اس میں ہاتھ بٹایا جائے۔ مقامی سطح پر، اگرچہ یہ پرانی خبر ہے، ایک سو پچاس برس قبل پہلی بار پہلا de Tocqueville نے امریکی جمہوریت کا یادگار تجزیہ پیش کیا تھا۔ یاد رہے کہ نمائندہ ادارے خلا میں کار سیاست جاری نہیں رکھ سکتے۔ ان کو کسی نہ کسی صورت میں رائے عامہ میں موجود رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عوامی سطح پر جو بھی تاثر بنے اس کو افراد اور متنوع اداروں اور انجمنوں کی مدد اور ان کے رہ نمائی کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ یہ ہیں وہ بنیادی اداراتی عناصر جن کو ہم شہری سوسائٹی کے نام سے جانتے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شہری سوسائٹی سرے سے وجود میں آئی ہی نہیں۔ شاید اسی وجہ سے، اور یہ حیرت کی بات بھی نہیں، کہ اقوام متحدہ کبھی اتنی پُر اثر نہیں ہوئی ہے جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ مگر غیر سرکاری اداروں کے، بلکہ کئی قومی حکومتوں کے اور بین الاقوامی سیاسی نظاموں کے مابین ہونے والے وسیع تعاون میں، جس میں اقوام متحدہ سب سے آگے رہتی ہے، ہمیں ایسے نقوش ابھرتے نظر آتے رہے ہیں جو ایک عالمی سوسائٹی کا روپ دھار سکتے ہیں۔ دوسری قرابتوں میں بھی ہمیں ایسی جھلکیاں دکھائی دی ہیں، مگر یہ مشکل تمام اس قدر ہی صاف جتنی کہ اس مخصوص معاملے میں نظر آرہی ہیں۔ اور ایک نمایاں امید کی کیفیت میں یہ ہم کو مزید ترقی کے لیے اسی سمت اشارہ کر رہی ہیں جس میں ہم ایک زیادہ پُر امن دنیا کے امکانات دیکھ رہے ہیں۔

تو پھر، زمینی بارودی سرنگیں ایسا مسئلہ کیسے بن گئیں جن کے بارے اتنی عالم گیر تشویش پیدا ہوگئی ہے؟ دنیا میں ایسے ہتھیار بھی تو موجود ہیں جو کئی معنوں میں زیادہ ہول ناک ہیں، زیادہ بڑے خطرے کا باعث ہیں، بالخصوص جوہری ہتھیار۔ اور کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم کچھ اقسام کے ہتھیاروں پر پابندی لگا کر، دوسرے معنوں میں، اور ہتھیاروں کے استعمال کو، اور اسی طرح جنگوں کو جائز بنا رہے

ہیں؟ امن کے سلسلے میں یہ کیسی مصلحت اندیشی ہے کہ بس صرف چند ہتھیاروں پر پابندی لگادی جائے؟

بلاشبہ، جوہری ہتھیاروں کی بابت بھی ہم نے ایسی ہی پیروی دیکھی ہے، اور نارویائی نوبیل کمیٹی نے مختلف مواقع پر، زیادہ دور نہیں ۱۹۹۵ء میں بھی، جوہری ہتھیاروں کے اضافے کے عملی مخالفین کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ جوہری ہتھیاروں اور زمینی بارودی سُرنگوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ پہلا ہتھیار تو امرا کا ہے اور دوسرا فقرا کا۔ اس کے باوجود ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں ہی شکار ہونے والوں کو، ایک طرح سے، روایتی جنگ سے دور رکھتے ہیں۔ دونوں ہی شہری آبادیوں کو نشانہ بناتے ہیں اور ان کے اثرات لڑی جانے والی جنگوں کے بعد کی نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ یہ ایسے ہتھیار ہیں جو امن کے زمانے میں بھی جنگ کے سایے پھیلاتے ہیں۔ زندگی کے لیے اور اعضائے انسانی کے لیے بھی خطرات ہر طرف ہیں اور کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔ مگر شہری آبادیوں اور دورِ امن میں جنگ کے عواقب کے اثرات کی حد بندی کرنا امن کے لیے کام کرنے والوں کے پیش نظر ایک اہم مقصد رہا ہے۔

اس وقت بھی، جب کہ جوہری جنگ ہم سب پر سایہ فگن ہے— اور شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۵ء کے بعد سے اب تک نہ واقع ہونے والا خطرہ رہی ہے۔ زمینی بارودی سُرنگیں، کہیں نہ کہیں، ہر روز پھٹ رہی ہیں۔ (افسوس کہ) ان کے شکار ہو کر مرنے اور اپاہج ہونے والے، ہر برس ۲۶۰۰۰ کے تگ بھگ لوگ، ہم میں سے مفلس ترین اور بے کس ترین افراد ہی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اتنے افراد کا شکار ہونا ہی اتنا ہول ناک پہلو نہیں بلکہ، زیادہ ہول ناک تو ان بے شمار افراد کے لیے ہے جو پُرخطر علاقوں میں رہتے ہیں مگر جنھیں یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کو کھیل کود کے لیے کہاں بھیجیں، یا وہ جس علاقے میں گھر کے چولھے روشن کرنے کے لیے ایندھن تلاش کرتے پھرتے ہیں وہاں ان کی زندگیوں کو بڑے خطرات لاحق ہیں۔ ایسے افراد اپنی زمین کے استعمال اور اپنا سماج بنانے کے مواقع کے حق سے محروم کردیے گئے ہیں۔

ICBL اور جوڈی ولیمز کا کام بے ہتھیار کرنا نہیں۔ نارویائی نوبیل کمیٹی نے بارہا بے ہتھیار کرنے کی کوششوں کا، یا نوبیل کمیٹی کے اپنے الفاظ میں "ہتھیار بند افواج میں کمی" کرنے کے کام کا احترام کیا ہے۔ بے ہتھیاری تناؤ کو کم کرتی ہے اور اس کے ذریعے جنگ کے خطرات میں بھی کمی ہوتی ہے۔ ICBL اور جوڈی ولیمز کے کام کا بنیادی مقصد وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے، جنگ سے شہری آبادیوں کی حفاظت! یہ انسانیت سے متعلق ایک منصوبہ ہے۔ انسانیت کے احترام میں نارویائی نوبیل کمیٹی کی روایتی کوششیں امن کے انعام سے شروع ہوئی ہیں، جو پہلی بار ۱۹۰۱ء میں ریڈ کراس کے بانی ہنری ڈونانٹ کو عطا کیا گیا تھا۔ انسانیت کی بھلائی کے سلسلے میں کیا جانے والا کام، انسانی ذہن میں موجود جنگ اور تشدد کی وجوہ کو دور کرنے کے ذریعے جنگ کے امکانات کو روکتا ہے۔ الفریڈ نوبیل کے

الفاظ میں، انسان دوستی کی کوششوں کا مقصد ہوتا ہے "قوموں کے درمیان برادری" کے جذبات پیدا کرنا۔ یہ مظلوموں کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ ہوتا ہے، دونوں کی طرف، جو یا تو اپاہج ہو چکے ہیں یا اس کے خطرے میں ہیں۔ یہ مظاہرہ ہے خبر گیری کا اور دردمندی کا جو تمام قومی سرحدوں سے ماورا ہوتی ہے۔

یہ ایک متناقضہ ہے کہ نہیں، کہ زمینی بارودی سرنگوں کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہی نوبیل کی سب سے تاباں ایجاد تھی، یعنی ڈائنامائٹ۔ نوبیل بنیادی طور پر ایک نیک انسان تھا، اور وہ ہتھیاروں کی ٹکنالوجی میں ڈائنامائٹ کی طاقت کے بارے میں فکر مند رہا کرتا تھا۔ اس کے حق میں ایک بار تو اس نے نظریہ تسدید (Doctrine of Deterrence) بھی پیش کیا تھا۔ اس نے اپنی قریبی دوست، امن کی بڑی پرچارک برتھا فان اسٹنر، کو لکھا تھا کہ امن کے لیے ہونے والے اجتماعات کے مقابلے میں اس کے کارخانے، جنگوں کو روکنے کے معاملے میں زیادہ نتیجہ خیز ہیں۔ مگر شاید وہ اس بات کا زیادہ قائل نہیں رہا ہوگا۔ شاید اسی لیے اس نے امن انعام جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ممکنہ طور پر جس کا خیال لیڈی برتھا فان اسٹنر ہی سے آیا ہوگا۔ تو اس کا مقصد خوف کے زیر اثر امن کے حصول کو اعزاز دینا نہیں تھا، بلکہ تصفیے اور بھائی چارے کے امن کو۔ برتھا فان اسٹنر کا خیال اس کی وصیت کے مخصوص الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، جس میں اس نے امن کے لیے منعقد کرنے والے اجتماعات کو امن انعام کی کسوٹی قرار دیا تھا۔ اور نوبیل کے انتقال کے بعد ۱۹۰۵ء میں خود لیڈی برتھا فان اسٹنر ہی پہلی عورت تھی جس کو امن کا انعام دیا گیا تھا۔ بہت کم عورتوں کو یہ انعام دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے زیادہ عورتوں کو اس گروہ میں شامل ہونا چاہیے تھا مگر ہمیں اس کی شروعات کی نیک نامی ضرور لینی چاہیے۔ اپنی بے لوث، ان تھک اور انسانیت و امن کے لیے بار آور خدمات سے جوڈی ولیمز، لیڈی برتھا فان اسٹنر کی لائق جانشین ٹھہرتی ہیں جنھوں نے نوبیل کو اس انعام کا تصور پیش کیا تھا، اور جو اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ امن کی جڑیں انسانی دماغ میں پیوست ہونی چاہئیں۔

ایک اہم قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ عملی طور پر اب بارودی سرنگوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ بین الاقوامی یادداشت نامہ بن چکا ہے۔ ایک عالم گیر رائے بن چکی ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اور دنیا کو زمینی بارودی سرنگوں کے جال سے نکالنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اسی کی تحسین اور ان کی کوششوں کے شکرانے کے لیے آج ہم ICBL اور جوڈی ولیمز، دونوں کو ۱۹۹۷ء کے امن کے نوبیل انعام کا اعزاز پیش کر رہے ہیں۔ بارودی سرنگوں کی تیاری اور ان کی فروخت کا خاتمہ، تمام موجود بارودی سرنگوں کی تباہی، اور ان سے متاثر ہونے والے افراد کی امداد کے ایک وسیع اور محنت طلب کام کی ابھی صرف ابتدا ہوئی ہے۔ آیئے ہم امید کریں کہ اس عمل کو مزید کمک میسر ہوگی تاکہ اس کام کو زور شور سے کیا جائے اور مستقبلِ قریب میں جان لیوا بارودی سرنگوں سے پاک دنیا ایک حقیقت بن سکے۔

خطبہ☆

جلالت مآب، ناروینی نوبیل کمیٹی کے عزت مآب ارکان، جناب اعلیٰ اور مہمانانِ گرامی!

آج اس مقام پر، ICBL کے نمائندوں کے ہمراہ ۱۹۹۷ء کا امن مشترکہ انعام حاصل کرنے کے لیے موجودگی میرے لیے باعث افتخار ہے۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں جنھوں نے نوبیل کمیٹی کے روبرو ہمیں اس انعام کے لیے نامزد کیا، اُن بہت سے نامزدگان کے ساتھ، جنھوں نے بھی بڑی تن دہی اور توجہ سے امن اور اس بین الاقوامی مہم کے لیے کام کیا ہے۔

میں خود کو صد درجہ مفتخر پاتی ہوں، مگر اس اعزاز سے جو کچھ بھی ذاتی شناخت ملتی ہے، میں سمجھتی ہوں کہ یہ دنیا کو بدلحاظ ہتھیار سے پاک کرنے کے لیے کیے جانے والی انسان دوست کوششوں میں بہت بلند اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ نوبیل کمیٹی کے الفاظ میں اس بین الاقوامی جدوجہد نے ''ایک عمل کی ابتدا کی جس نے صرف چند ہی برسوں میں جان لیوا بارودی سرنگوں پر بندش کو خواب و خیال سے ایک قابل عمل حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے۔''

مزید، کمیٹی نے یہ بھی دیکھا کہ یہ جدوجہد ایک وسیع عوامی سطح پر ابھری ہے اور عوام کی اس درجے کی لگن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے جس کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ بہت سی چھوٹی اور درمیانہ درجے کی قومی حکومتوں کی اس مسئلے سے وابستگی کی وجہ سے بھی، یہ کام امن کی ایک معقول اور باعمل پالیسی بن کر نمایاں ہے۔

جان لیوا بارودی سرنگوں پر بندش کی خواہش نئی نہیں۔ اس صدی کے ساتویں عشرے میں ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی نے، چند ایک غیر سرکاری اداروں (NGOs) کی معیت میں دنیا پر زور ڈالا تھا کہ اس کو اُن ہتھیاروں پر نظر کرنی چاہیے جو ضرر رساں بھی ہیں اور غیر امتیازی بھی۔ ان میں زمینی بارودی سرنگ خاص تردّد کا باعث ہے۔ لوگ اکثر سوال کرتے ہیں کہ اس ایک ہتھیار ہی پر توجہ کیوں مرکوز ہے؟ زمینی بارودی سرنگ کسی اور ہتھیار سے کتنی اور کیوں مختلف ہے؟

زمینی بارودی سرنگ دوسرے ہتھیاروں سے اس لیے مختلف ہے کہ ایک بار یہ زمین میں دبا دی جائے اور دبانے والا سپاہی اس کو چھوڑ کر چلا جائے تو یہ ایک فوجی اور شہری میں، ایک عورت اور بچے میں، اور ایک بوڑھی دادی اماں میں جو گھر کا چولھا جلانے کے لیے لکڑیاں چننے نکلی ہو تمیز نہیں کر سکتی۔ مشکل یہ ہے کہ فوجی نقطۂ نگاہ سے جنگ کے دوران کسی ایک دن، ایک یا دو ہفتے، بلکہ اگر جنگ طویل ہو جائے ماہ دو ماہ تو اس ہتھیار کے استعمال کرنے کا جواز ہو سکتا ہے مگر جنگ بندی کے بعد بارودی سُرنگ امن کے دنوں یا زمانوں کا ادراک نہیں کر سکتی۔ بارودی سُرنگ ہمیشہ، ابد الآباد تک شکار

☆ جوڈی ولیمز کا خطاب

کے لیے تیار رہتی ہے۔ عام لفظوں میں، بارودی سرنگ مستعد ترین سپاہی ہوتی ہے، یعنی دائمی چوکی دار کا کام کرتی ہے۔ جنگ ختم ہو جاتی ہے مگر بارودی سرنگ موت کا کھیل جاری رکھتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے دنیا کے بیشتر تنازعے اندرونی تنازعے رہے ہیں۔ ان جنگوں میں اکثر و بیشتر، زمینی بارودی سرنگ ہی ہتھیار بنی ہے۔ اس حد تک کہ کروڑوں زمینی بارودی سرنگیں تقریباً ۷۰ ملکوں کو آلودہ کیے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں میں بھاری اکثریت ترقی پذیر ممالک کی ہے، بنیادی طور پر ان ملکوں میں جن کے پاس اس نحوست کو دور کرنے کے لیے، اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی اور اپاہج ہونے والے افراد کی دیکھ بھال کے لیے وسائل نہیں ہوتے۔ نتیجے میں بین الاقوامی برادری کو عالمی سطح پر ایک انسانی بحران درپیش ہے۔

اجازت ہو تو میں اس وبا کے درجے کی مثالیں پیش کروں۔ اس وقت کمبوڈیا میں چالیس سے ساٹھ لاکھ تک زمینی بارودی سرنگیں ملک کے پچاس فی صد علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ افغانستان میں غالباً نوے لاکھ زمینی بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ امریکی فوج کے مطابق، افغانستان پر روسی فوجوں کی یلغار کے دنوں میں پورے ملک میں تین کروڑ کے قریب زمینی بارودی سرنگیں بچھائی گئی تھیں۔ سابقہ یوگوسلاویہ میں چند سالہ لڑائی کے دوران ملک کے مختلف علاقوں میں ساٹھ لاکھ زمینی بارودی سرنگیں بچھائی گئیں۔ انگولا میں نوے لاکھ، موزمبیق میں دس لاکھ، صومالیہ میں دس لاکھ۔ میں اس طرح گنتی گنی تو آپ اکتا جائیں گے۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں زمین میں دفن بارودی سرنگوں کی فکر کرنی ہے، بلکہ ہمیں ان کے اُس انبار کی بھی فکر کرنی ہوگی جو استعمال کے لیے تیار موجود ہے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں دس سے بیس کروڑ تک زمینی بارودی سرنگوں کا انبار موجود ہے۔

جب ICRC نے ۱۹۷۰ء دنیا کے تمام ملکوں پر زور دیا کہ وہ بلاامتیاز افراد کو زخمی اور اپاہج کرنے والے ہتھیاروں پر پابندیاں بڑھانے پر غور کریں تو زمینی بارودی سرنگوں پر پابندی کی بہت کم حمایت کی گئی۔ کئی برسوں کی گفت و شنید اور معاملت کے نتیجے میں ۱۹۸۰ء کا Convention on Conventional Weapons (CCW) وجود میں آیا۔ یہ معاہدہ زمینی بارودی سرنگوں کو ضابطے میں لانے میں معاون ہوا تھا۔ جب کہ یہ اجتماع کمان داروں کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کب اس ہتھیار کا استعمال صحیح ہوگا اور کب صحیح نہیں ہوگا، اس نے ان کو دورانِ جنگ اس قانون کے اطلاق کے بارے میں فیصلے کرنے کی بھی اجازت دی تھی۔ بدقسمتی سے لڑائی کے جوش میں جنگ کے قوانین ذہنوں میں صحیح طرح نہیں سماتے۔ جب آپ خود کو بچانے کی کوشش کر رہے ہوں تو اس وقت آپ جو بھی ہاتھ آئے استعمال کر گزرتے ہیں۔

ان دنوں سرد جنگ تیزی پر تھی اور اندرونی تنازعے، جو اکثر بڑی طاقتوں کی نیابت میں ہونے والی جنگ ہوا کرتے تھے، پھیلتے گئے۔ بالآخر، سوویت بلاک کے انہدام کے ساتھ، لوگوں نے

جنگ اور امن دونوں کو بدلے ہوئے انداز میں دیکھنا شروع کردیا۔ اور لوگوں نے اس پر بھی غور شروع کردیا کہ جوہری بربادی کے مہیب خطرے کے امکانات کی عدم موجودگی کی صورت میں سرد جنگ کے دوران لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی تھیں۔ تب انھیں پتا چلا کہ اُس دور میں لڑی جانے والی اندرونی لڑائیوں میں سب سے پُرفریب ہتھیار افراد کُش جان لیوا زمینی بارودی سُرنگ تھا جو کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہ اس نے، ایک بھیانک وبا کی صورت پورے کرۂ ارض کو آلودہ کردیا ہے۔

سرد جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی جب کچھ امن قائم ہوا تو اقوامِ متحدہ اُن قوموں میں نفوذ کرنے کے قابل ہوئی جو جنگ وجدل کے باعث ٹوٹ پھوٹ گئے تھے، اور جب عملاً اس کے قدم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ لاکھوں کروڑوں زمینی بارودی سرنگیں، جو امن و آشتی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو رہی تھیں، ان سوسائٹیوں کی جنگ کے بعد کی تعمیرِ نو میں رخنہ بن رہی تھیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کمبوڈیا کے دارالحکومت نام پین میں ہوں، اور آپ امن فوج کی کارروائیاں شروع کرنا چاہتے ہوں تو یہ کام نسبتاً آسان معلوم ہوگا۔ مگر جب آپ ساحل کے عقبی علاقوں میں فوجیں اتارنا چاہیں، جہاں چالیس سے ساٹھ لاکھ تک زمینی بارودی سرنگیں مٹی تلے دبی ہوئی ہیں تو آپ یقیناً ایک بڑے مسئلے سے دوچار ہوں گے، اس لیے کہ سارے اہم راستوں میں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں۔ امن معاہدے کا ایک جزو لاکھوں مہاجروں کو وطن واپس لانا تھا تا کہ وہ کمبوڈیا میں بنائی جانے والی نئی جمہوریت کے انتخابات میں اپنا حقِ رائے دہی استعمال کرسکیں۔ ایک جزو ان کو واپس لانے کے منصوبے میں ہر خاندان کو خاطر خواہ زمین دینا بھی تھا تا کہ وہ خود کفیل ہو سکیں، تا کہ وہ ملک کی معیشت پر بوجھ نہ بنیں، تا کہ وہ ملک کی تعمیرِ نو میں حصہ لے سکیں۔ مگر انھیں پتا چلا کہ اتنی ساری زمینی بارودی سرنگوں کی موجودگی میں خاندانوں کو زمینیں نہیں دی جاسکیں گی۔ اور خاندانوں کو کیا ملا؟ صرف پچاس ڈالر فی خاندان اور ایک برس کے کھانے کو چاول۔ یہ ہے اثر زمینی بارودی سرنگوں کا!

یہ دراصل غیر سرکاری اداروں ہی کا فیض تھا کہ ہم سنجیدگی سے اس مسئلے کی گہرائیوں میں جاکر حل تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ اس ہتھیار کو کس طرح سرے سے ختم ہی کردیا جائے۔ ترقی پذیر ملکوں میں زمینی بارودی سرنگوں پر کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بچوں کے گروہ، ترقیاتی ادارے، مہاجرین کے ادارے، طبّی اور انسانی بنیادوں پر امداد فراہم کرنے والے ادارے— سب کو زمینی بارودی سرنگوں کے بحران سے نمٹنے کی بابت اپنے پروگراموں میں اور ان لوگوں کے بارے میں کتر بیونت کرنی پڑی جو اس سلسلے میں امداد فراہم کر رہے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب انسانی ہم دردی کی بنا پر زمینی بارودی سرنگوں کو ناکارہ بنانے والے غیر سرکاری ادارے وجود میں آئے تھے۔ اس کوشش میں کہ وہ آلودہ دیہاتی علاقوں کی زمینوں کو ان ہتھیاروں سے پاک کرسکیں۔

وہ تو بس مٹھی بھر ادارے تھے، جو انسانیت اور انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرنے میں محو

تھے، جنھوں نے ۱۹۹۱ء کے اواخر اور ۱۹۹۲ء کی ابتدا میں منظم انداز میں ان ہتھیاروں کی بندش کے لیے کوششیں کی تھیں۔ ۱۹۹۲ء کے اکتوبر میں Handicap International, Human Rights Watch, Medico International, Mines Advisory Group, Physicians for Human Rights اور Vietnam Veterans of America Foundation نے یک جا ہوکر زمینی بارودی سرنگوں کے استعمال، تیاری، تجارت اور ذخیرہ اندوزی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا۔ حکومتوں کو انسانیت کی بھلائی کے لیے بارودی سرنگوں کی صفائی اور متاثرہ افراد کی بھلائی کے لیے زیادہ امداد مہیا کرنے پر بھی زور دیا گیا تھا۔

اس نامبارک ابتدا سے ہی ICBL ایک ہزار اداروں کا غیر معمولی اتحاد بن گیا تھا جو اکٹھے ہوکر ۶۰ ملکوں میں زمینی بارودی سرنگوں کی بندش کے لیے ایک مشترکہ ہدف کے حصول کے لیے کوشاں رہا۔ اور جوں جوں مہم میں اضافہ ہوتا گیا، رہ نما کمیٹی کو وسعت دی گئی تاکہ وہ ان لوگوں کی نمائندگی کرسکے جو اس عالمی تحریک میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم نے افغان اور کمبوڈیا کی مہمات کو ساتھ ملالیا اور ۱۹۹۶ء میں Rädda Barnen کو، اور جنوبی افریقا اور کینیا کے اتحاد کو بھی اس سال کی ابتدا میں شامل کیا اور ہم اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتے رہے۔ اور چھ برسوں میں ہم نے مقصد حاصل کرلیا۔ اس برس ستمبر میں ۸۹ ممالک یہیں اوسلو میں اکٹھے ہوئے اور آسٹریا کے پیش کیے ہوئے میثاق کے مسودے کی بنیاد پر سال کی ابتدا میں بندش کے بارے میں بات چیت مکمل کرلی گئی۔ پچھلے ہفتے ہی، اوٹاوا، کینیڈا میں ۱۲۱ ممالک میثاقِ ممانعت سے یک جہتی کے لیے اکٹھے ہوئے۔ اس میثاق پر جلد سے جلد عمل درآمد کی سیاسی خواہش کے اظہار کے لیے تین ممالک، کینیڈا، ماریشس اور آئرلینڈ نے اس پر فوراً اپنے دستخط ثبت کردیے۔

اپنی تاسیس کے پہلے چند برسوں میں ICBL کی نشوونما شمال میں ہوئی، ان ممالک میں جہاں جان لیوا زمینی بارودی سرنگیں بنانے والے خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ حکمتِ عملی یہ تھی کہ قومی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر اس کی پیداوار کی ممانعت کی جائے۔ اس حکمتِ عملی کا ایک جزو یہ تھا کہ دنیا بھر کی حکومتوں کو اس عمل پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے کہا جائے۔ ساتھ ہی کوشش کی جائے کہ ICBL کی جانب سے اس کے بنانے کی ممانعت ہو۔ اس میں ہم کامیاب نہیں ہوئے، مگر ڈھائی برس کے نظرِ ثانی کے عمل کے دوران، اور اس دباؤ کے ساتھ جو ہم بڑھا سکے تھے، انسانیت کے اس عالمی مسئلے پر بڑھتی ہوئی بین الاقوامی توجہ نے اثر دکھانا شروع کیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا نے ۱۹۹۲ء میں اس ہتھیار کی برآمد کے التوا کی قانون سازی کر کے پہلا قدم اٹھایا۔ جب اس قانون کے مصنف سینیٹر لی ہی امریکا میں اس ہتھیار کی ممانعت کی جنگ میں مشغول تھے، دوسری قومیں اس کی ابتدائی لیڈرشپ میں اس سے آگے نکل گئیں۔ بلجیم پہلا ملک تھا

جس نے مارچ ۱۹۹۵ء میں اندرونِ ملک اس کی نقل و حمل، پیداوار، تجارت اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کی تھی۔ آسٹریا، ناروے، سویڈن اور دوسرے ممالک نے اس کی پیروی کی۔ لہٰذا جب CCW بھی اس مہم میں ناکام ہو رہا تھا، حکومتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ممانعت کے مطالبے کر رہی تھیں جو کبھی ایک یوٹوپیائی ہدف کہا جاتا تھا، زور پکڑتا اور زیادہ متحرک ہوتا جا رہا تھا۔

جس وقت یہ مسئلہ متحرک تھا، جب CCW کے آخری مہینوں میں اس پر نظرثانی کی جا رہی تھی، ہم نے کوشش کی کہ انفرادی طور پر وہ حکومتیں جنھوں نے عملی اقدام کیے تھے یا ممانعت کے مطالبے کیے تھے، اکٹھے ہو کر ایک خود تشخیصی بلاک بنائیں۔ اعداد و شمار کی خود اپنی بھی ایک طاقت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا CCW کے آخری دنوں میں ہم نے ان سب کو دعوت دی اور ان سب کے نمائندے آئے بھی۔ متعدد حکومتوں نے ہمارے ساتھ بیٹھنے اور اس پر بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ زمینی بارودی سرنگوں پر ممانعت کی تحریک یہاں سے کس منزل کی طرف جائے گی۔ تاریخی اعتبار سے، غیر سرکاری ادارے اور حکومتیں ایک دوسرے کو رفیق نہیں مخالفین کی حیثیت میں دیکھتی آئی ہیں، ہمیں ان سب کے اکٹھے ہونے پر اچنبھا ہوا تھا۔ پہلی مجلس میں سات، یا شاید نو، دوسری میں چودہ اور تیسری میں سترہ ارکان شریک ہوئے تھے۔ تیسری مجلس کے ختم ہونے تک، جس میں مئی ۱۹۹۶ء کی تیسری تاریخ تک نظرثانی کا اجتماع ختم ہو رہا تھا، کینیڈا کی حکومت نے ایک سرکاری مجلس کی مہمان داری کی پیش کش کر دی تھی، جس میں ممانعت کی حامی حکومتیں اکٹھے ہو کر اس بات کی حکمتِ عملی تیار کریں کہ ممانعت کے فیصلے کو کس طرح حاصل کیا جائے۔ CCW کے نظرثانی کے عمل سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا جو ہم چاہتے تھے، تو پھر ہم کو یہ سوچنا تھا کہ اور کیا کریں۔

تیسری سے پانچویں اکتوبر تک اوٹاوا میں ہماری مجلس ہوئی جو بڑی مسحور کن تھی۔ اس میں پچاس حکومتیں مکمل ارکان کی حیثیت میں اور چوبیس مبصرین شامل تھے۔ ICBL بھی اجتماع میں حصہ لے رہی تھی۔ اس (مجلس) کا بنیادی مقصد ایک 'اعلانِ اوٹاوا' کی تیاری تھا، ریاستیں جس پر دستخط کے ذریعے زمینی بارودی سرنگوں کی ممانعت کا اشارہ دیں گی، اور ایک "Agenda for Action." طے پائے گا جس میں منزلِ ممانعت کی راہ کا تعین ہوگا اور اس طرف پیش قدمی کا مستحکم خاکہ بھی۔ ہم سب اس کے لیے بالکل تیار تھے، مگر چند لوگ کینیڈا کے وزیرِ خارجہ کے اختتامی کلمات کے منتظر تھے۔ وزیرِ خارجہ ایکس ورودی کھڑے ہوئے اور انھوں نے سب کو اعلانِ اوٹاوا اور "Agenda for Action." کی تیاری پر مبارک باد پیش کی۔ اس تقریر کو ممانعت کی تحریک کے اوزار کے طور پر دیکھا گیا۔ مگر وزیرِ خارجہ نے صرف مبارک باد ہی پر اکتفا نہیں کی۔ انھوں نے اپنی تقریر ایک چیلنج پر ختم پر کی۔ کینیڈا کی حکومت نے دنیا کو ایک برس کے اندر کینیڈا واپس آنے اور جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی مکمل ممانعت کے بین الاقوامی میثاق پر دستخط کا چیلنج دے دیا۔

ICBL کے ارکان خوشی سے پاگل سے ہو گئے مگر کمرے میں موجود حکومتوں کے نمائندوں پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ حتیٰ کہ ممانعت کی حامی ریاستوں کے نمائندے بھی اس چیلنج سے خوف زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ کینیڈا کی حکومت نے سفارتی آداب و انداز کی خلاف ورزی کر کے 'نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن' کے مصداق ان سب کو چٹان اور کھائی کے درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ ان سب نے کہا تھا کہ وہ ممانعت کے حامی ہیں۔ وہ اوٹاوا آئے تھے میثاق ممانعت کی راہ عمل تیار کرنے، اور انھوں نے ارادے کے اعلان پر دستخط بھی کیے تھے۔ اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ انھیں کچھ نہ کچھ جواب تو دینا تھا۔ سب دم بخود تھے۔ ہم لوگوں نے کھڑے ہو کر زور سے تالیاں بجائیں، جب کہ حکومتی ارکان منہ بسور رہے تھے، مگر جب انھیں ابتدائی جھٹکے سے افاقہ ہوا تو ان حکومتوں کے نمائندوں نے، جو جلد از جلد واقعی میثاق ممانعت چاہتے تھے، چیلنج قبول کیا اور مل جل کر کم سے کم وقت میں میثاق ممانعت کا معاملہ طے کر ہی ڈالا۔

وہ کام جسے ہم Ottawa Process کے نام سے جانتے ہیں، ایکس ورددی چیلنج سے شروع ہوا تھا۔ یہ میثاق خود اس ممانعت کے میثاق کی بنیاد پر بنا تھا جس کا مسودہ آسٹریا نے تیار کیا تھا، اور جس کو ویانا میں، بان میں، برسلز میں ہونے والی سلسلے وار مجلسوں میں طے کیا گیا تھا، اور جو اوسلو میں ستمبر میں ہونے والے تین ہفتے طویل مذاکرات میں فیصل ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میثاق کے لیے ہونے والے مذاکرات تاریخی حیثیت کے حامل تھے۔ وہ کئی وجوہ کی بنا پر تاریخی تھے۔ پہلی بار، چھوٹی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں ICBL میں شامل غیر سرکاری اداروں کے ساتھ مل کر دنیا کے اسلحہ خانوں کو اس خوف ناک ہتھیار سے پاک کرنے کے میثاق کی شرائط طے کرنے کی غرض سے اکٹھی ہوئی تھیں۔ پہلی بار بڑی چھوٹی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں ممانعت کے میثاق کو کم زور کرنے کے لیے ایک بڑی عالمی طاقت کے دباؤ کو خاطر میں نہیں لائیں۔ یہ بھی شاید پہلی بار ہوا تھا کہ گفت وشنید کے لیے پیش کیے جانے والے مسودے کے مقابلے میں ایک زیادہ طاقت ور میثاق طے پایا تھا۔ میثاق حکومتی اتفاق رائے کا یرغمال بھی نہیں بن سکا، جو بلا شبہ ایک بے کار میثاق پر منتج ہو جاتا۔

اوسلو میں ہونے والی گفت وشنید نے دنیا کو جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کی ممانعت کے ایسے میثاق کا تحفہ دیا ہے جو رخنوں اور تحفظات سے تقریباً پاک صاف ہے۔ یہ میثاق جان لیوا زمینی بارودی سرنگوں کے استعمال، ان کی پیداوار، تجارت اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ میثاق دستخط کیے جانے کے چار برس کے اندر اندر ریاستوں میں ذخیرہ کردہ تمام زمینی بارود سرنگوں کی تباہی چاہتا ہے۔ یہ تمام ریاستوں سے بارودی سرنگوں کی مکمل صفائی اور زخمی ہونے والوں کی امداد میں اضافے کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ایک کامل میثاق نہیں، مہم والوں کو ان کی صفائی میں استعمال ہونے والے اوزار antihandling device اور antivehicle mines کے بارے میں تشویش ہے۔ ہم تربیت کے لیے بچا رکھنے والی بارودی سرنگوں کے بارے میں بھی فکر مند ہیں۔ ہم غیر سرکاری افراد پر بھی اس میثاق کا

براہ راست اطلاق اور زخمی افراد کی امداد کے بارے میں سخت زبان کا استعمال پسند کریں گے۔ مگر چوں کہ حکومتوں کے قریبی تعاون سے یہ میثاق ممکن ہوا ہے، ہمیں یقین ہے کہ سالانہ اجتماعات اور نظر ثانی کانفرنسوں کے ذریعے، میثاق میں، جن کا انعقاد طے پایا ہے، یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں، پچھلے ہفتے، ایک سو ایکس ملکوں نے اوٹاوا میں میثاق پر دستخط کر دیے ہیں۔ تین ملکوں نے ایک ساتھ اس کی توثیق بھی کر دی ہے؛ اس کے جلد سے جلد عمل میں لانے سے بین الاقوامی برادری کے سیاسی ارادوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ واقعی قابل تعریف ہے۔ امریکا میں ہونے والی خانہ جنگی اور کریمیا کی جنگ کے بعد سے زمینی بارودی سرنگوں کا استعمال ہوتا رہا ہے پھر بھی ہم ان کو دنیا کے اسلحہ خانوں سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہ کامیابی حیرت ناک بھی ہے اور تاریخی بھی۔ اس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ شہری سوسائٹیوں اور حکومتوں کو مل کر کام کرنا چاہیے نہ کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا مخالف سمجھیں۔ یہ میثاق بتاتا ہے کہ چھوٹی اور درمیانہ درجے کی طاقتیں شہری سوسائٹی کے ساتھ مل کر انسانیت کے تحفظات کی جانب زیادہ سرعت سے متوجہ ہو سکتی ہیں۔ اس قسم کا اشتراک سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں ایک نئے قسم کی عالمی طاقت ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ International Campaign to Ban Landmines کی وجہ سے بہت فرق پڑا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی دین میثاق ہے۔ ہمیں سب سے بڑا فخر میثاق پر ہے۔ یہ کہنا احمقانہ فعل ہوگا کہ نوبیل انعام کوئی زیادہ فخر کی بات نہیں۔ بلاشبہ ہم کو اس پر فخر ہے۔ اس لیے کہ نوبیل انعام اس مہم کے انجام کی توثیق کرتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی بھی توثیق ہے کہ غیر سرکاری اداروں نے پہلی بار حکومتوں کے بہت قریب ہوکر، اقوام متحدہ اور ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی کی معیت میں اسلحے پر قابو پانے پر کام کیا ہے۔ ایک ساتھ ہوکر ہم نے ایک مثال قائم کی ہے۔ ایک ساتھ مل کر ہم نے تاریخ میں تبدیلی کی ہے۔ اوسلو میں فرانس کی سفیر کے اختتامی کلمات بہترین تھے۔ انھوں نے کہا تھا: ''یہ واقعہ محض میثاق کی وجہ سے تاریخی نہیں۔ یہ اس لیے تاریخی ہے کہ پہلی بار ریاستوں کے رہنماؤں نے اکٹھے ہوکر شہری سوسائٹی کی خواہشات پوری کی ہیں۔''

بین الاقوامی مہم ان سب کی شکر گزار ہے۔ ایک ساتھ ہوکر ہم نے وہ کام کیا ہے کہ اس سے دنیا کو ایک دن بارودی سرنگوں سے مکمل طور پر پاک زندگی فراہم کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔

آپ سب کا شکریہ

☆☆☆
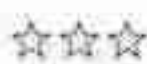
باقر نقوی

جان ہیوم اور ڈیوڈ ٹرمبل☆

اعتراف کمال   شمالی آئر لینڈ کے تنازعے کے پُرامن حل کی تلاش میں ان کی کوششوں کے لیے۔

جلالت مآب، عزت مآب افراد، خواتین وحضرات!

اس برس گڈ فرائیڈے کے دن ایک معاہدے پر دستخط ہوئے تھے جو حقیقت میں در بازی کا ایک عمل تھا جس کے ذریعے شمالی آئر لینڈ میں ایک عرصے سے جاری خون آشام تنازعے کا پُرامن حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ۲۵ رمئی کو ہونے والی براہِ راست رائے شماری میں عوام نے بھاری اکثریت سے اس معاہدے کی توثیق کردی۔ معاہدے میں طے شدہ اصولوں کی بنیاد پر جون کے مہینے میں انتخابات کے ذریعے شمالی آئر لینڈ اسمبلی وجود میں آئی اور خزاں کے موسم میں تصفیے سے معدود ماضی کے دشمنوں نے اکٹھے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت بھی کی ہے۔

ہم سب ان مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہیں جو آگے آنے والے ہیں۔ اس برس کے موسم خزاں میں دہشت گردی کے حملے بھی ہوئے ہیں اور ہم نے جانیں ضائع ہوتی دیکھی ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ حملے محض اکا دُکا وارداتیں ہیں، کہ یہ ایک طرح سے گڈ فرائیڈے معاہدے کے بنیاد پر دیرپا امن کی تلاش میں معاون ہوئے ہیں۔ آئرش ریپبلک آرمی (IRA) کی نافذ کردہ جنگ بندی، جو تلاشِ امن کی سب سے اہم شرط تھی، اب بھی قائم ہے۔ لہٰذا، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری پریشان حال دنیا کے حالات اچانک تبدیل ہو سکتے ہیں، اس برس کے گڈ فرائیڈے کے بعد سے صورتِ حال مختلف رہی ہے۔ تشدد

☆ ناروے کی نوبیل کمیٹی کے صدر نشین کی تقریر جو ۱۹۹۸ء کا امن انعام عطا کیے جانے کے موقعے پر ۱۰ دسمبر ۱۹۹۸ء کو اوسلو میں کی گئی۔

کا شیطانی چکر ٹوٹ چکا ہے۔ امن کا عمل اپنی الگ رفتار سے جاری ہے جس کے باعث پہلے جیسے تشدد کی فضا کی واپسی خلافِ قیاس ہے، اگرچہ عمل کے تسلسل کے دوران ہمیں معمولی دھچکوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ناروے کی نوبیل کمیٹی نے دو حضرات کا انتخاب کیا ہے جنھیں، ان کی رائے کی مطابق، بہ طورِ خاص امن کے عمل میں معاونت کے لیے اعزاز دیا جانا چاہیے، یعنی جان ہیوم اور ڈیوڈ ٹرمبل۔ اپنے سرد مگر پُرامن شمال میں، بے پایاں مسرت کے ساتھ ہم آپ دونوں کو ۱۹۹۹ء کا امن انعام حاصل کرنے کے لیے خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ اُن بہت سے افراد میں سرِفہرست ہیں جنھوں نے آئرلینڈ اور اس کے باہر، امن کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

جان ہیوم اور ڈیوڈ ٹرمبل، دونوں شمالی آئرلینڈ سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں وہ تنازعے کے ساتھ اور تنازعے میں ہی رہتے رہے ہیں۔ دونوں ہی سربرآوردہ سیاست داں ہیں اور شمالی آئرلینڈ کی اُن دو سب سے بڑے سیاسی جماعتوں کی رہ نمائی کرتے ہیں، جو تقسیم زدہ عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان دونوں نے خود کو اس راہ پر چلنے کے لیے وقف کردیا ہے جس کا معاہدے میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ تنازعات کو امن کے ساتھ ہی حل کیا جانا چاہیے۔ استصوابِ رائے میں اس معاہدے کی جس شدت سے حمایت کی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں نے صحیح سمت کا انتخاب کیا ہے۔

ہر سمت کی ہوا کے لیے اپنے بادبان تراشنا ہی سیاسی رہ نمائی نہیں ہوتی، اصل رہ نمائی تحریک کی ابتدا کرنے، اور صحیح وقت پر کام کرنے میں ہوتی ہے۔ دوسرے سیاسی رہ نماؤں کی طرح، دونوں انعام یافتگان نے مل کر ایسی اعتماد کی فضا تیار کرنے میں معاونت کی ہے جس کے ذریعے پُرامن طریقے سے مناسب مصالحت ممکن ہو سکے۔ سیاسی رہ نماؤں کی حیثیت میں وہ اپنے حلقے کے عوام کو ضمانت دیتے ہیں کہ پُرامن طریق پر چلنے سے ہی حل کی طرف پیش قدمی ہوسکے گی جس پر دونوں خطے قائم رہیں گے، اور اُن سے بہتر حالات میں زندگی گزار سکیں گے، جو جنگ کے جاری رہنے کی صورت میں درپیش ہوتے۔ تناؤ کی حالت کے ایسے موقعوں پر بڑے پیمانے کی دانش اور ہمت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آج کے انعام یافتگان نے دونوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

مگر دونوں کے درمیان اختلافات ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں تشدد کی بڑھتی ہوئی لہروں کے زمانے میں جان ہیوم نے ایک سیاسی جماعت، سوشل ڈیموکریٹک اینڈ لیبر پارٹی کی بنیاد رکھنے میں حصہ لیا اور باشرکتِ غیرے اس کے سربراہ بن گئے۔ یہ ایک قومیت پسند سیاسی جماعت ہے، مگر اصولوں کی بنیاد پر ڈٹی کھڑی رہی، کہ صرف پُرامن طریقے ہی استعمال ہونے چاہییں۔ ہر کسی سے زیادہ وہ پس منظر میں، ڈیوڈ، ہیوم ہی امن کے عمل کے، جس کا اعادہ گڈ فرائیڈے معاہدے میں کیا گیا ہے، معمار ہیں۔ یہ بغیر کسی اضطراب کے اس مؤقف پر قائم ہیں کہ مذاکرات اور اداراتی حل ایک ساتھ ہونے چاہییں۔ ان لوگوں کو بھی، جنھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کو تشدد کے ذریعے آگے بڑھانے کا راستہ چنا ہے، امن کے عمل میں شامل

ہونے، اپنی حکمت عملی کو تبدیل کرنے کے مواقع فراہم کیے جانے چاہییں، اور ان کے وعدوں پر اعتبار کیا جانا چاہیے۔ بالخصوص بڑھتے ہوئے تشدد کے دنوں میں کبھی کبھی ہیوم کو شدت پسندوں کے لیے بھی نرم رویہ اپنانے پر نہایت درشت نکتہ چینی برداشت کرنی پڑی تھی، ان کی اپنی صفوں سے بھی اور غیروں کی جانب سے بھی۔ مگر اپنی ذاتی راست بازی کے سہارے، ہیوم مضبوطی سے جمے رہے، اور ان کی تدبیریں کامیاب رہیں۔

شمالی آئر لینڈ کے نوبیل ادب انعام یافتہ شیمس ہینی نے دو انعام یافتگان کے درمیان فرق کو بیان کرنے کے لیے خار پشت اور لومڑی کی حکایت استعمال کی تھی۔ اس نے لکھا تھا ''جان ہیوم ایک خار پشت کی مانند ہے جس کو معلوم تھا کہ بڑے سچ کا بول بالا تو ہونا ہی ہے۔'' اس کے برعکس ڈیوڈ ٹرمبل'' ایک چالاک لومڑی ہے جو اپنی دانش ورانہ صفائی اور سیاسی دلیری کے باعث جانتا تھا کہ ۱۹۹۸ء ہی وہ وقت تھا جس میں ایک باعزت اور معقول یکجائیت کی گنجائش کی طرف پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنے میں اس نے سارے شمالی آئر لینڈ کے باشندوں کے لیے ایک معتبر اور پسندیدہ مستقبل کے امکانات روشن کیے ہیں۔'' جب ٹرمبل شمالی آئر لینڈ کی سب بڑی روایتی سیاسی جماعت السٹر یونینسٹ پارٹی کے منتخب لیڈر بنے تھے، وہ اعلی پیمانے کی سیاست میں نسبتاً نووارد تھے اور مصالحت نہ کرنے والے یونینسٹ کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ مگر جلد ہی انھوں نے دکھا دیا کہ ان کی شخصیت میں اور بھی سیاسی پہلو پوشیدہ ہیں، اس لیے کہ اُنھوں نے صاف طور پر محسوس کرلیا تھا کہ موجودہ حالات یونینسٹوں سے زیادہ لچک دار رویے کے متقاضی ہیں۔ ان کی سربراہی میں لوگوں کے خوف اور بدگمانی میں کافی حد تک کمی آئی جس کے باعث یونینسٹوں کی اکثریت گڈ فرائیڈے معاہدے کی حمایت میں صف آرا ہوگئی۔ یہ کہنا شاید ضروری نہ ہو کہ ٹرمبل بھی اپنے مدلّل مصالحتی لہجے کے لیے سخت نکتے کے ہدف بنے ہیں۔

وہی لوگ جنھیں ذاتی سطح پر اپنے حقوق کی پامالی کا تجربہ ہوا ہو، جنھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے پیاروں کو قتل ہوتے دیکھا ہو، جن کی زندگیاں خسارے میں، خوف میں اور بدگمانی میں گزری ہوں، صرف وہی بتا سکتے ہیں کہ اس نوعیت کے حالات میں زندگی گزارنا کیسا ہوتا ہے، یا جب ایسے اشتعال دلانے والے حالات کا سامنا ہو تو ان کا ردِ عمل کیسا ہوتا ہے۔ امن کا نوبیل انعام پانے والی خاتون الوا مرڈال کی فلسفی بیٹی Sissela Bok نے اپنی کتاب "A Strategy for Peace" میں "The Pathology of Partisanship" کے بارے میں بتایا ہے کہ حالتِ جنگ کس طرح ہم میں ایسی ذہنی حالت پیدا کرسکتی ہے جس میں ہم بے گناہ افراد کا احترام کرنے، ان پر رحم کرنے سے عاری ہوجاتے ہیں۔ اس نے اسٹیفن اسپنڈر جیسے ادیب کی دہشت ناک حالت کا ذکر کیا ہے جس کو بھی ہسپانوی خانہ جنگی کے دوران اسی قسم کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ سیسیلا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فقط مضبوط و مستحکم رہبری اور اداروں کی ضمانت کے ذریعے ہی سماج اس قسم کی معذرتوں کے بوجھ کو برداشت کرسکتا ہے۔

ہم لوگوں کو، جو باہر سے اندر کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں، خاکساری کا مظاہرہ کرنا چاہیے

اور جلد فیصلے نہیں کرنے چاہئیں۔ فیصلے کرنا ہمارا کام نہیں۔ تنازعہ ہم کو فیصلوں میں الجھاتا بھی نہیں۔ یہ عام انسانی حقیقتوں پر روشنی ڈال کر ہمیں کچھ بتاتا ہے۔ طرف داری کا مرض اس کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ فیصلہ ہی ہمیں بتاتا ہے کہ مار دھاڑ کیوں زیادہ مار دھاڑ ہی کو جنم دیتی ہے۔ یہ عجیب و غریب بھی ہے اور امید افزا بات بھی کہ شمالی آئر لینڈ میں فریقین کی دوریوں کے باوجود، ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب زیادہ لوگ اس معاملے میں آگے بڑھ کر کہہ رہے ہیں کہ درگزر اور مصالحت انتقام سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اپنے اطراف کی دنیا پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ مار دھاڑ کا طویل ماضی سہنے کے بعد امن کے متلاشی یہی چاہتے ہیں کہ انصاف کی پکار کو مصالحت اور معافی کے ماتحت ہونا چاہیے۔ ہم نے جنوبی افریقا کی مثال سے بھی یہی سیکھا ہے۔ دنیا میں بھلا اور کون ہے جو شمالی آئر لینڈ میں، دو متحارب حقیقتوں جیسے حالات میں گرفتار ہے؟ اسی اثنا میں سیسیلا ہمیں بتاتی ہے کہ مصالحت کی خواہشوں کو ابھارنے اور ہمیں تشدد سے دور لے جانے میں طاقت ور قیادت اور اداراتی ضمانتیں کتنی اہم ہوتی ہیں۔ ہمارے انعام یافتگان ایسی قیادت ہی کی طرف داری کرتے ہیں۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دونوں فریقین پر معتدل اور مشمولہ رویوں کے باعث تنقید کی گئی ہے۔ اتنا خوف اور اتنی بدگمانی ہو چکی ہے کہ بہت سے لوگ مخالفین کے ارادوں کے نیک ہونے پر یقین نہیں کرتے۔ مشمولہ حکمتِ عملی کو اپنانے کا مطلب ہوتا ہے بدگمانی سے بالارادہ ناتا توڑنا اور خوف کی پروا نہ کرنا۔ یہی ہے مصالحت کی حکمتِ عملی۔ بلاشبہ ایسے حالات بھی ہیں جن میں دوسرے فریق کے نیک ارادوں پر بھروسا کرنا ایک طرح کا بھولپن ہوگا۔ اور ایسا کرنے میں خطرات بھی ہوں گے۔ مگر حقیقی امن کے عمل کو آگے بڑھانے میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو خطرہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمیں دلاوروں کی یا، دوسرے لفظوں میں، بھولے لوگوں کی ضرورت ہوگی، جو ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ کبھی کبھی بھولپن حیرت انگیز طور پر حریف کو بالکل نہتا کر دیتا ہے۔

سیسیلا بوک کے قول کے مطابق، قیادت کے علاوہ، ہمیں اداروں کی ضمانتوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ گُڈ فرائیڈے معاہدہ ایسی اداراتی ضمانتیں فراہم کرتا ہے۔ یہ نہ کسی کی نمائندگی کرتا ہے، نہ کبھی ایسا کوئی ادارہ تھا۔ یونینسٹ اب بھی یونینسٹ ہیں اور نیشنلسٹ اب بھی نیشنلسٹ ہیں۔ انھوں نے اپنے تنازعات کے پُرامن حل کے لیے ادارے حاصل کیے ہیں، اور بس۔

اجازت ہو تو ہم اس سے متوازی اپنے تجربات کا ایک خلاصہ پیش کریں۔ ۱۸۱۴ء میں ناروے کو سویڈن کے ساتھ اتحاد پر مجبور کیا گیا تھا۔ ناروے کی سرزمین پر ناروے کے کسانوں کی فوج اور سویڈن کی پیشہ ور فوج کے درمیان، جو براعظم یورپ سے نپولین کو شکست دے کر واپس ہوئی تھی، جنگ چھڑ گئی۔ بڑی طاقتوں نے مداخلت کر کے ناروے کی جنگ کو ختم کرادیا۔ انھوں نے، جس میں برطانیہ عظمیٰ شریک تھا، فیصلہ کیا کہ ناروے کو سویڈن سے اتحاد کر لینا چاہیے۔ مگر ناروے کو اپنا نیا آئینی نظام

جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس طرح ہتھیاروں کی جگہ سیاسی اداروں نے لی تھی۔ Clausewitz کی مشہور حکایت کے برعکس، دوسرے طریقوں سے سیاست جنگ کا تسلسل بن گئی۔ اکانوے برس بعد وہ اتحاد پُرامن طریقے سے کالعدم ہو گیا۔ جب سویڈن کے نوبیل نے نارویائیوں کو امن کا انعام دینے کی ذمے داری سونپی تو ان دونوں حریفوں کے درمیان یہ عمل ایک پُرامن علامت بن گیا۔

۱۹۷۷ء میں نارویائی نوبیل کمیٹی نے ۱۹۷۶ء کا امن انعام Mairead Corrigan اور Betty Williams کو عطا کیا تھا جن کا شمار آئرلینڈ کے امن پسندوں میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے مستقل یہی کہا جا رہا ہے کہ وقت اُس انعام کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس بار بھی ہمارے کانوں میں یہی آوازیں آ رہی ہیں کہ ہمارا انتخاب عاجلانہ ہے، کہ دیرپا امن کا حصول ابھی دور کی بات ہے۔ یہ دلیل آسانی سے سمجھ میں آ رہی ہے اور ہمیں اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہو سکتی تھی اگر ہم یہ کہنے کے قابل ہوتے کہ امن کا قیام یقینی ہے۔ مگر ان انعامات کے سلسلے میں، جیسا کہ اوروں میں بھی ہوا ہے، کمیٹی کے ارکان کے ذہنوں میں یہ بات بسی ہوئی تھی کہ انعام کو موجودہ حالات کی عکاسی کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ اس کو امن کی ترقی کا موجب ہونا چاہیے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ امن کے قیام کے عمل میں طویل عرصہ لگ سکتا ہے اور اس کی راہ میں اُلٹ پھیر بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں ضروری ہوتا ہے کہ فساد کے امکانات کے باوجود پیش قدمی پر توجہ مرکوز رہے، اور ان افراد پر بھی جو اس نیک عمل کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے ہوں۔ پسپائی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کی ساری کوششیں بے کار گئیں۔ اس کے ذریعے اگلے موقعے پر از سرِ نو ہونے والی کوششوں کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ یہی طریقہ ہوتا ہے امن کی عمارت تعمیر کرنے کا، Max Webber کے مطابق، جیسے آہستہ آہستہ سخت لکڑی میں سوراخ کیا جاتا ہے۔ اس راستے میں کام جاری رکھنا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جیسا کہ اختتامی نوک پلک کا درست کرنا۔ اور موجودہ درجے کی طرف توجہ دلانے کے ذریعے ہی مزید ترقی میں ہاتھ بٹایا جا سکتا ہے۔

ہمارے دونوں انعام یافتگان نے بھلائی کے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔ ان دونوں نے بڑی ہمت کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اسی طرح اوروں نے بھی۔ جیری ایڈمس، برٹی ایہرن، ٹونی بلیئر اور بل کلنٹن اُن بہت سے ناموں میں چند نام ہیں جنھوں نے گڈ فرائیڈے معاہدے کی تکمیل کے آخری درجے پر اہم کردار ادا کیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سینیٹر جارج مچل نے، جنھوں نے ثالثی کی تھی، دونوں انعام یافتگان کے کام کا کتنا درست تجزیہ کیا، میں جس کا حوالہ دینا چاہتا ہوں "نہ مسٹر ہیوم کے بغیر امن کا عمل شروع ہو سکتا تھا، اور نہ مسٹر ٹرمبل کے بغیر معاہدہ۔" ہمارے لیے یہ افتخار کی بات ہے کہ ہم آپ دونوں کو آج اور اس جگہ اعزاز دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس راہ میں کئی مشکلیں بھی ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ آپ اس عمل کی رہ نمائی کریں گے، اور آپ کو کئی جہتوں سے اس کی محکم حمایت بھی حاصل ہے۔

خطبہ☆

جلالت مآب، ناروے کی نوبیل کمیٹی کے ارکان، عزت مآب، خواتین اور حضرات!

میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے نوبیل کمیٹی کا شکر گزار ہوں جس نے مجھ کو آج اس اعزاز سے سرفراز کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح انھیں بھی اس بات کا علم ہے کہ یہ امن آئرلینڈ کے عوام کا ہم پر قرض تھا، بالخصوص اہلِ شمال کا جنھوں نے اس تنازعے کے مہیب سایے میں زندگی بھی گزاری ہے اور اس کے دکھ بھی جھیلے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈیوڈ ٹرمبل مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ نوبیل انعام بے حد درمند اور انسانی جذبات سے مملو انسانیت کی اس وسیع دنیا کی طرف سے اُن لوگوں کے لیے، ہم جن کی نمائندگی کرتے ہیں، ہم دونوں کو عطا ہو رہا ہے۔

ہمارے تنازعے کے پچھلے تیس برسوں میں گہرے ملال اور سراسر ہولناکی کے بہت سے لمحات آئے ہیں۔ بہت سے لوگ اچنبھے میں تھے کہ شاید ڈبلیو بی ییٹس کے الفاظ سچ نہ ہو جائیں:

لمبے عرصے کی قربانی دل کو پتھر کر دیتی ہے

کبھی نہ ختم ہونے والے عرصے سے، اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ہمارے لوگ ہر آنے والے دن کو جھیلتے رہے ہیں اور انھوں نے اپنے رہنماؤں کی ہمت افزائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے کہ وہ ان حالات کے حل تلاش کرنے کی ہمت کریں تاکہ ہماری نئی نسل ہر صبح ایک تبسم آمیز اُمید سے اپنے مستقبل کا انتظار کرے۔ دراصل یہ انعام ان ہی کا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ آج کے دن کی کیا اہمیت ہے، کہ یہ دن اپنی پوری توانائی سے ہمارے امن کے عمل کو مستحکم کرے گا۔

آج ہم بھی پچاس برس قبل بنائے جانے والے انسانی حقوق کے عالمی اعلان کی منظوری کا دن منا رہے ہیں اور دنیا بھر میں بھی اس کا یوم منایا جا رہا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے اور مناسب بھی کہ ہر سماج میں بین الاقوامی سطح پر آج کا دن امن کی اعانت کے لیے مختص کر دیا گیا ہے جس میں انسانی حقوق کا پورا احترام ہو۔ یہ صحیح بھی ہے اور مناسب بھی کہ ہمارے ملکی قوانین میں بھی انسانی حقوق کے کنونشن کی سفارشات گُڈ فرائیڈے معاہدے کے عنصر کی صورت میں شامل ہوں۔

امن کے سلسلے میں کام کرنے کے دوران یورپ کے تجربات نے میرا دل بڑھایا ہے۔ میں ہمیشہ اس کے قصے کو بیان کرتا ہوں، اس لیے کہ یہ اس قدر سادہ ہے مگر اتنا گہرا کہ دنیا کے کسی بھی علاقے کے تنازعے پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں یورپ کی پارلیمنٹ کے رُکن کی حیثیت سے اسٹراسبرگ میرا جانا ہوا تھا۔ میں نے اسٹراسبرگ اور Kehl کے درمیان کا پُل پیدل چل کر عبور کیا تھا۔

☆ جان ہیوم کا پیش کردہ اوسلو، ۱۰ دسمبر ۱۹۹۸ء

اسٹراسبرگ فرانس میں ہے۔ Kehl جرمنی میں واقع ہے۔ دونوں شہر ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ میں چلتے چلتے، پُل کی بیچوں بیچ تھوڑی دیر کو رُک کر سوچ میں پڑ گیا— اُدھر جرمنی ہے اور اِدھر فرانس۔ آج سے تیس برس قبل، دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد اگر میں اس جگہ کھڑا ہوتا، جب صدی میں دوسری بار پچیس ملین افراد لقمۂ اجل ہو چکے تھے اور کہتا کہ ''فکر نہ کرو، تیس برس بعد ہم سب ایک متحد یورپ کا حصہ ہوں گے، ہمارے تنازعات حل اور جنگیں ختم ہو چکی ہوں گی اور ہم ایک دوسرے کے مفاد کے لیے کام کر رہے ہوں گے'' تو مجھ کو کسی ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا گیا ہوتا۔ مگر آج یہ سب کچھ ہو چکا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ دنیا بھر میں یورپی پارلیمنٹ تنازعات کے حل کیے جانے کا سب سے بہترین نمونہ ہے، اور ہر ایک کا فرض ہے، بالخصوص ان لوگوں کا جو تنازعات کے علاقوں میں رہتے ہیں، کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ یہ سب کس طرح ہو گیا اور اس کے اُصولوں کو اپنے علاقوں کے تنازعات کے حل میں استعمال کریں۔

سارا تنازعہ ہی اختلاف کا ہے، فرق نسل کا ہے، مذہب کا یا قومیت کا ہے۔ یورپ کے سرخیلوں نے فیصلہ کیا کہ فرق میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ فرق فطری ہوتا ہے۔ فرق دراصل انسانیت کا نچوڑ ہے۔ فرق ایک پیدائشی حادثہ ہوتا ہے اور اس کو کبھی نفرت یا تنازعے کا سبب نہیں ہونا چاہیے۔ فرق کا جواب یہ ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ اور اسی میں امن کا بنیادی اصول مضمر ہے کہ فرق کی بوقلمونی کا احترام کیا جائے۔

تو یورپ کے لوگوں نے ادارے تشکیل دیے جنھوں نے فرق کا احترام کیا۔ وزیروں کی کونسل، یورپی کمیشن اور یورپی پارلیمان وغیرہ۔ مگر ان سب کو باہمی معاشی فوائد کے لیے مل کر کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ انھوں نے خون نہیں، اپنا پسینہ بہایا ہے اور اس عمل میں انھوں نے بد اعتمادی کی ساری رکاوٹیں مسمار کر دی ہیں اور ایک نیا یورپ وجود میں آیا ہے جو فرق کے احترام کے اقرار کی بنیاد پر روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔

بس یہی کچھ ہم شمالی آئر لینڈ میں کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمارا معاہدہ، عوام نے جس کی بھرپور حمایت کی تھی، تفاوت کا احترام کرنے والے اداروں کی تشکیل کرتا ہے مگر اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ہم مل جُل کر اپنے باہمی مفاد کے لیے کام کریں گے۔ ہماری اسمبلی انتخاب کرنے والے افراد کے تناسب کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے تا کہ اس میں ہر طبقے کی نمائندگی ہو۔ نئی انتظامیہ کو بھی اسمبلی کے ارکان اسی بنیاد پر منتخب کرنے ہوں گے تا کہ ہر طبقے کے لوگ ایک ساتھ مل کر کام کریں۔ آئر لینڈ کے دونوں حصوں کے درمیان، اور برطانیہ اور آئر لینڈ کے درمیان بھی ادارے ہوں گے اور وہ بھی عوام کے مشترک مفاد کا اور تفاوت کا احترام کریں گے۔

ایک بار یہ ادارے وجود میں آ گئے اور ہم نے اپنے مشترک مفاد میں مل جل کر کام کرنے کی ابتدا کر دی، تب ہی زخموں کے اندمال کا عمل شروع ہوگا، تب ہی ہم ماضی کی بے اعتمادیوں اور تعصبات کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں گے اور معاہدے اور تفاوت کے احترام کی بنیاد پر ہمارا نیا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اپنے دونوں حصوں کے عوام کی شناخت کا احترام ہوگا اور طرفین میں سے کوئی بھی فاتح نہیں ہوگا۔

دنیا بھر سے ملنے والے بے انتہا تعاون اور یک جہتی کے پیغامات نے امن کے عمل کو جاری رکھنے میں ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہم اہل آئر لینڈ اس یک جہتی اور تعاون کی قدر کرتے ہیں، ساتھ ہی امریکا، یورپی یونین اور دنیا کے اطراف پھیلے ہوئے دوستوں، سب کے شکر گزار ہیں۔ اس خیر خواہی اور جذبات کی فراخ دلی کی عدم موجودگی میں امن کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ ان روایتی موقعے پر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آئر لینڈ میں موسم بہار کے اس امن و امید کے حصول کے عمل میں بہت سے افراد نے ہماری کوششوں میں اپنی تمام ہنر مندیوں اور گہرے جذبات کے ساتھ ہمارا ہاتھ بنایا تھا۔ ہم شکر گزار ہیں وزرائے اعظم ٹونی بلیئر اور برٹی ایہرن کے، ریاست ہائے متحدہ کے صدر بل کلنٹن کے اور یورپی یونین کے صدر ژاک ڈیلورا ور ژاک سانتیخ کے اور ان تین افراد کے جنھوں نے بات چیت کے دوران ہماری امداد کی تھی، یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکا کے ایوان بالا کے لیڈر سینیٹر جارج مچل، فن لینڈ کے ہیری ہولکری اور کینیڈا کے جنرل جان ڈی چیسٹی لین۔ ہم اپنی نہایت ممتاز سیکریٹری آف اسٹیٹ مو ماؤلم کو اس موقعے پر بھلا کس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔

جزیرہ نما آئر لینڈ میں دو اہم سیاسی روایات مشترک ہیں۔ تاریخ نے ہمارے مقدر میں ساتھ ساتھ رہنا لکھ دیا ہے۔ ان سیاسی روایات کے نمائندے آج اس مقام پر آپ کے سامنے ایستادہ ہیں۔ ہم سال ہا سال کی مشکلات اور اندوہ کے باوجود مشترک اخلاص اور عزم کے ساتھ آئر لینڈ کو امن اور برداشت کی ایک سچی علامت بنا کر ہی دم لیں گے۔

سیاسی ہدف کے حصول کی کوششوں میں آئر لینڈ نے بہت سے جانیں گنوائی ہیں۔ خوں ریزی کے ذریعے سیاسی تبدیلی صرف اس تبدیلی کا راستہ روکتی ہیں جو سچ مچ اہم ہوتی ہے، یعنی قلب انسانی میں تبدیلی۔ اب ہمیں تبدیلی کے مستقبل کی ایسی تشکیل کرنی ہوگی جو صحیح معنوں میں بنیادی ہو، جس کا مقصد حقیقی یکسوئی پر ارتکاز ہو، جو آئر لینڈ اور اس کے عوام کی بھلائی کے لیے مثالیت پسندی کی اور عہد و اقرار کی نئی طاقتوں کو استعمال کر سکے۔

اپنی سیاسی زندگی کے دوران میں نے غیر معمولی ہمت اور استقلال والے منفرد مرد اور عورتوں کو تشدد کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنی تباہ شدہ زندگیوں میں بھی ان میں ایسی بے زبان شجاعت کا ظہور دیکھا ہے جو تشدد کرنے والی شیطنت کو، غارت گر تشدد کو اور بے مقصد اوچھے پن کو اپنی

خاموشی سے للکارتی ہے۔

میں نے مختلف النوع سیاسی وابستگیاں رکھنے والے افراد کے درمیان امن کے حصول کے ارادوں کو ایک مشترک بندھن بنتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں نے غلط فہمی اور تناؤ کے دور میں بھی آئرش اور برطانوی عوام کی دوستی کو تمام تر تنگ ذہن سیاسی اختلافات کے باوجود بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہم دو ہمسایے جزیرے ہیں جن کا مقسوم ایک ساتھ دوستی اور بھائی چارے کے ساتھ رہنا ہے۔ ہم دوست ہیں، اور امن کا حصول ہماری دوستیوں کو اور مستحکم کرے گا اور، ایک ساتھ، ہم کو ایسے بے شمار رشتے اور بندھن بنانے کی اجازت دے گا جو ہم کو مختلف طریقوں سے متحد رکھیں گے۔

گڈ فرائیڈے معاہدہ پورے آئرلینڈ کے عوام کے لیے نئے مستقبل کی راہیں وا کرتا ہے۔ تفاوت اور سیاسی اختلافات کے احترام کی بنیادوں پر تعمیر کیا ہوا مستقبل۔ ایک ایسا مستقبل جس میں سب اپنی تمام تر اُمنگوں اور اعتقادات کے ساتھ شادماں رہ سکیں، جس میں بس ان کے نشانات امتیاز ہوں نہ کہ تقسیم کا خوف مسلسل۔

یہ معاہدہ ایسی گنجائش پیدا کرتا ہے جو کسی کی بھی سیاسی روایت کی، کسی گروہ کی یا کسی فرد کی self-respect کو کم نہیں کرتی۔ یہ ہم سب کو، شمالی آئرلینڈ میں اور آئرلینڈ کے پورے جزیرے کے تمام باسیوں کو اجازت دیتا ہے کہ ہم ایک ساتھ ہو جائیں اور بالاشتراک سب کی بھلائی کے لیے کام کریں۔

کسی سے اپنی دل پسند اُمنگوں یا اعتقادات کو تج دینے کے لیے نہیں کہا جاتا۔ ہم سب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنی ہی طرح دوسروں کے خیالات اور حقوق کا احترام کریں، اور مل کر مشترک تصورات کا ایک ایسا عہد نامہ تیار کریں جو نئی دریادلی، اور سب کے حقوق کے مقاصد سے متحد بنیاد پر استوار ہو۔

یہی ہے وہ کچھ جس پر نیا اور متفقہ آئرلینڈ بنے گا۔ ہم میں سے ہر ایک کا یہی مطالبہ ہے۔

آئرلینڈ کے دونوں حصوں کے عوام اکٹھے ہو کر امن کے لیے سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے، بیلٹ باکس کے ذریعے، بھاری اکثریت سے گڈ فرائیڈے معاہدے پر صاد کیا ہے۔ انھوں نے کڑے ارادوں کے ساتھ طے کیا ہے کہ امن کو سنگِ خارا کے جگر میں پیوست کر دیا جانا چاہیے تاکہ اس کے تمام امکانات پر مقصد کے استقلال کے ساتھ استفادہ کیا جا سکے۔

اب یہ ہر گروہ کے اہلِ سیاست پر منحصر ہے کہ وہ آئرلینڈ کے عوام کے فرمان پر قطعی عمل کریں۔ ایک عرصے سے ان کے دلوں میں جس امن کی اُمنگ رہی تھی، اس کے قیام اور پرورش کے لیے ایسے مستحکم ادارے قائم کریں کہ اس جزیرے سے تشدد اور بے اعتمادی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع ہو

جائے۔ اب آئر لینڈ میں نئے آفاق کی جانب بڑھنے کی سرگرم تمنا انگڑائیاں لے رہی ہے۔

میں ان سب کو سلام کرتا ہوں جنھوں نے اس عمل کو ممکن بنایا ہے۔ ان رہنماؤں کو اور سیاسی جماعتوں کے تمام ارکان کو جنھوں نے معاہدے اور نئے مستقبل کی تشکیل میں ہاتھ بٹایا ہے؛ ری پبلکن اور شاہی کے طرف داروں کی تحریک کے سرخیلوں کو بھی جنھوں نے بہ کمال پیش بینی اور عالی ہمتی ایک مختلف راہ اپنائی ہے؛ آئر لینڈ کے ہر طبقے کے عوام کو بھی جنھوں نے امن کی طرف اپنے قدم بڑھائے ہیں، اور اس کے حصول کو ممکن بنایا ہے۔

اور اب ہمارے سامنے ایک نئی تاریخ کی تشکیل کا چیلنج ہے: یہ دکھانے کا کہ ماضی کی ناانصافیاں اور رنجشیں نئے جذبات اور دریا دلی عملیت کی راہ کے روڑے نہیں بن سکتیں۔

میری خواہش ہے کہ میں آئر لینڈ، شمال اور جنوب، کے زخم مندمل ہوتے دیکھوں، اور دونوں حصوں کو یورپ میں اپنا کردار ادا کرتا دیکھوں تا کہ تمام آئر لینڈ والوں کے درمیان وطن دوستی اور نئی کوششوں کے مشترک بندھن مضبوط ہوں۔

میری خواہش ہے کہ میں دنیا کے تمام لوگوں کے لیے آئر لینڈ کو ایسی مثال بنتا دیکھوں جس میں لڑائی جھگڑوں سے نہیں بلکہ اعلیٰ آدرشوں کے لیے جینا زندگی کا مقصد ہو، جس میں ہر فرد احترام اور عزت کا حق دار ہو۔

میری خواہش ہے کہ آئر لینڈ کو ایسی شراکت بنتا دیکھوں جس میں جنگ ہو تو افلاس کو مٹانے کے لیے، جہاں ہم کنارے لگا دیے جانے والوں اور ناداروں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں، جہاں ہم مل جل کر ایسے مستقبل کی تعمیر کریں جو ہمارے ارفع خوابوں جیسا عظیم ہو۔

آئرش شاعر لوئی میک نیس نے اُمید اور اقرار کے ایسے الفاظ لکھ دیے ہیں جو میرے نزدیک ہم سب کو درپیش چیلنج ــــ شمال، جنوب، یونینسٹ اور نیشنلسٹ ــــ کی غمازی کرتے ہیں:

ایک رخشندہ ستارے کے طفیل

راہ ہموار ہوئی ہے اپنی

زندگی ہی ہے ہمارا انجام

اک ذخّار سمندر کی طرح

یہی ہے وہ سفر ہم اہلِ آئر لینڈ جس پر نکل پڑے ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، دنیا ابھی پچاس برس قبل کے انسانی حقوق کے اعلان کا جشن منا رہی ہے۔ میرے نزدیک ایک بے مثال موزونیت ہے، ایک قسم کا شاعرانہ تکملہ ہے، اس اتفاق میں کہ میں اور میرے ساتھی، اُس سماج کی نمائندگی کر رہے ہیں جس کو تاریخ کی ہول ناک طاقتوں نے ایک

عرصے تک تقسیم کیے رکھا تھا، اور آج، اس اعزاز میں ہم دونوں شراکت دار ہیں۔ میں بہ کمالِ انکسار اس اعزاز کو قبول کرتا ہوں، اپنے عوام کی جانب سے، جو برسوں کے نزاع کے بعد، ایک ساتھ امن سے رہنے کا عہد کر چکے ہیں۔ ہمارا عہد Universal Declaration ہی کے الفاظ اور اصولوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ میرے لیے اور میرے عوام کے لیے اس سے بڑا اور کیا اعزاز ہوسکتا تھا کہ میں اس مناسب موقعے پر ان کی ترجمانی کر رہا ہوں۔

میں اپنے کلام کو مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے ہمکل امید کے، قول کے ساتھ ختم کرنا چاہوں گا جو میرے نزدیک اس صدی کا ایک عظیم ہیرو تھا:

''ہم فتح مند ہو کر رہیں گے!''

شکریہ!

☆☆☆

باقر نقوی

کم ڈے ینگ☆

نوبیل خطبہ

اعتراف کمال: جنوبی کوریا بالخصوص اور بالعموم مشرقی ایشیا میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے۔ اور شمالی کوریا سے امن کے حصول اور مصالحت کی کوششوں کے لیے۔

جلالت مآب، دودمان شاہی کے ارکان، عالی مرتبت خواتین و حضرات

ناروے کی نوبیل کمیٹی نے ۲۰۰۰ عیسوی کا امن انعام کم ڈے ینگ کو عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ انعام ان کی اس جد و جہد کے صلے میں دیا جا رہا ہے جو انھوں نے اپنی تمام زندگی جنوبی کوریا میں، بالعموم جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے، اور بالخصوص امن کے حصول اور شمالی کوریا سے مصالحت کے سلسلے میں کیا ہے۔ ہم ان کو تہ دل سے اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک سوال اٹھایا گیا تھا، ''کیا یہ انعام محض مصالحت کی کوششوں کے لیے دیا جانا قبل از وقت نہیں، اس لیے کہ یہ کوششیں تو ابھی شروع ہی ہوئی ہیں؟'' اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ کہ دو کوریائی ریاستوں کے مابین کم ڈے ینگ کی جانب سے انسانی حقوق کے سلسلے میں کی ہوئی کوششوں ہی نے ان کو اس انعام کا حق دار ٹھہرا دیا ہے۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ شمالی کوریا سے موافقت کے سلسلے میں ان کی پامردی، اور خصوصاً پچھلے برس کے دوران ان سے حاصل ہونے والے نتائج نے ہی اس انعام کے لیے کم ڈے ینگ کی حق داری میں نئے اور اہم ابعاد کا اضافہ کر دیا ہے۔

☆ جنوبی کوریا کے صدر کم ڈے ینگ، جن کو ۲۰۰۰ء کے نوبیل امن انعام سے نوازا گیا۔ ناروے کی نوبیل کمیٹی کے صدر نشین کی تقریر جو ۲۰۰۰ء کا امن انعام عطا کیے جانے کے موقعے پر ۱۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کو اوسلو میں کی گئی۔

بین الاقوامی امن کے سلسلے میں ہونے والی پسپائی ہی کے پیش نظر نوبیل کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہمیں اس بنیادی اصول پر ثابت قدم رہنا چاہیے "کہ کچھ نہیں کروگے، تو کچھ پاؤ گے بھی نہیں۔" لہٰذا امن کا یہ انعام صلہ ہے ان اقدامات کا جو اس وقت تک کیے گئے ہیں۔ بہرحال، جیسا کہ امن کے انعام کی تاریخ کے سلسلے میں ہوتا آیا ہے، اس برس بھی یہ انعام ہمت افزائی کے لیے دیا جا رہا ہے تاکہ امن اور موافقت و مصالحت کے طویل راستے پر قدم آگے ہی کی طرف بڑھتے رہیں۔

کسی حد تک یہ ہمت ہی کا معاملہ ہے کہ کم ڈے ینگ اپنے ارادوں پر پامردی سے قائم رہنے کی وجہ سے ہی پچاس برس کے دوران اٹھی ہوئی دشمنی کی دیوار کو توڑ کر بقائے باہمی کا ہاتھ اس سرحد کے پار تک بڑھانے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو شاید آج کی دنیا کی سب سے زیادہ نگاہ داشتہ سرحد ہے۔ ان کی شخصیت ایسی سیاسی ہمتوں کا نشان رہی ہے جیسی، بدقسمتی سے، دوسرے متنازعہ علاقوں میں اکثر نہیں پائی جاتیں۔ امن کا معاملہ بھی کچھ ہماری زندگیوں جیسا ہی ہوتا ہے جس میں ہم بلند و بالا کوہسار پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلا قدم ہی سب سے مشکل قدم ہوتا ہے۔ مگر آخری مسحور کن لمحات میں تو آپ کو بے شمار ساتھی مل جایا کرتے ہیں۔ اسٹے ونگر کے Gunnar Roaldkvam نامی ادیب نے ان کیفیات کو کتنی سادگی اور مناسبت سے اپنی نظم "آخری قطرہ" میں پیش کیا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ہم نے
پانی کے دو قطرے دیکھے
ایک، جو پہلا بن کر نکلا
دوسرا آخری قطرہ تھا

پہلا قطرہ سب سے بہادر
سب سے ہمت والا تھا

مجھ کو مگر اچھا لگتا تھا
آخری قطرہ بن کر گرنا،
وہ قطرہ جو آخر ہم کو
منزل پر پہنچائے
جہاں ہمیں آزادی ہو

لیکن میں اس سوچ میں گُم ہوں
پہلا قطرہ کون بنے گا؟

آج کم ڈے ینگ جمہوری جنوبی کوریا کے صدر ہیں۔ اقتدار کی منزل تک کا راستہ طویل، بہت طویل تھا۔ انھوں نے کئی عشروں پر محیط ایک آمرانہ حکومت سے بہ ظاہر ہارنے والی جنگ کی تھی۔ ان

سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ میں اتنی طاقت کہاں سے آئی۔ اب ایسے سوال کا جواب بھی سن لیجیے۔ ''میں نے آمرانہ حکومتوں کی مزاحمت میں اپنی تمام طاقت استعمال کی ہے، اس لیے کہ اس کے سوا عوام کی حفاظت اور جمہوریت کو تقویت پہنچانے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ میں خود کو ایک ایسا مالک مکان جیسا محسوس کرتا تھا جس کے گھر میں ڈاکو گھس آئے ہوں۔ اپنی حفاظت کی پروا کیے بغیر مجھے دراندازوں سے اپنے خاندان، اور مال و اسباب کی حفاظت کے لیے بھی جنگ کرنی تھی۔''

کم جب صدی کے پانچویں عشرے میں قومی اسمبلی کے چناؤ میں حصہ لے رہے تھے تو سرکاری امیدواروں کے علاوہ تمام امیدواروں کے خلاف سرکاری طاقت کا استعمال کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں کم قومی اسمبلی میں منتخب ہونے میں کامیاب تو ہو گئے مگر اس برس کی کامیابی دیرپا کامیابی نہیں تھی کہ تین دن بعد ہی ایک فوجی بغاوت برپا ہوئی اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ کم نے ہار نہیں مانی۔ تقریباً دس برس کی مسلسل ان تھک سیاسی جد و جہد کے بعد، بالآخر انھوں نے قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی۔ حزب اقتدار نے ان کو خریدنے کی پوری کوشش کر ڈالی مگر کم برائے فروخت شے نہ تھے۔

۱۹۷۱ء میں کم ڈے ینگ نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور تمام تر دھاندلی کے باوجود چھیالیس فی صد ووٹ حاصل کر لیے۔ فوجی حکومت کی لیے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ نتیجے کے طور پر ان کو طویل عرصے تک پہلے قید کیا گیا، انھوں نے گھر میں نظر بندی جھیلی اور پھر جاپان و امریکا میں جلاوطنی کے دن گزارے۔ ان کو اغوا کرنے اور جان سے مار دینے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ ان تمام آزمائشوں کے باوجود کم آمرانہ حکومت کے مقابلے میں اپنی بے باک مخالفت سے باز نہیں آئے۔

ناروے کی Storting کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے میں نے ۱۹۷۹ء میں جنوبی کوریا کا دورہ کیا تھا جس کے دوران کم ڈے ینگ کے حامیوں سے میرا رابطہ بھی ہوا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک کڑی کی حیثیت سے کم کے اسکینڈینیائی رابطوں میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

قید و بند کے سخت حالات میں بھی، کم ڈے ینگ نے زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکال لی تھی۔ وہ اپنی ناقابل شکست خوش امیدی کی وجہ سے قید خانوں میں حاصل ہونے والی خوشیوں کے بارے میں لکھتے بھی رہے۔ دینیات، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور ادب پر ہر قسم کی مشرقی اور مغربی کتابیں ان کے مطالعے میں رہتیں۔ انھوں نے اپنے اہل خاندان سے مختصر ملاقاتوں، قریب ترین دوستوں کے آنے والے خطوط اور ان کے جواب لکھ سکنے کے مواقع نکال کر اپنی مصروفیات کو دلچسپ بنایا۔ اس کے علاوہ، جیل کے اندر ہی ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین پر روزانہ ایک گھنٹا باغبانی میں صرف کرنے کی بھی انھیں اجازت ملی ہوئی تھی۔

کم ڈے ینگ کی کہانی ان جیسے دوسرے انعام یافتگان، بالخصوص نیلسن مینڈیلا اور آندرے

حتا روف کے تجربات سے بہت ملتی ہے۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی سے بھی، جن کو انعام تو نہیں ملا تھا، مگر وہ اس کے حق دار ضرور تھے۔ ذرا فاصلے سے دیکھنے والوں کو اس قسم کے ناقابل تسخیر جذبات کم ڈے ینگ کو ایک 'سپر ہیومن' کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اس نقطے پر بھی Laureate نہایت متین نظریے کے ساتھ کہتے ہیں، ''لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بہت حوصلہ مند انسان ہوں، اس لیے کہ میں چھ سات بار جیل جاچکا ہوں اور میں نے بارہا اپنی زندگی میں موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں آج بھی ویسا ہی بزدل ہوں جیسا کہ لڑکپن میں تھا۔ ان تمام تجربات کے باوجود جو مجھے اپنی زندگی میں ہوئے ہیں، مجھے قید و بند سے خوف نہیں آتا۔ مگر جب بھی مجھے اسیر کیا گیا ہے، میں خوف زدہ بھی ہوا ہوں اور پریشان بھی۔'' اس درجے کی خودبینی انسان کو ہمت کی ڈگر سے ہٹا نہیں سکتی!

کم ڈے ینگ نے ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۲ء کے صدارتی انتخابات میں بھی حصہ لیا تھا۔ اگر فوجی حکومت ان کے راستے میں نہ بھی کھڑی ہوئی ہوتی تب بھی، ایسے ملک میں جسے علاقائیت نے تقسیم کر رکھا ہو، ان پر الزام لگا دیا جاتا تھا کہ ان کا ایک غلط علاقے سے تعلق ہے۔ بالآخر، جد و جہد کی صعوبتوں سے تھک کر کم نے ۱۹۹۲ء کے انتخابات کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

مگر ۱۹۹۷ء میں کم ڈے ینگ کو ایک نیا موقع نظر آیا، اور ان کے سیاسی دشمنوں کے آپس میں شدید اختلافات کے باعث فوجی حکومت کا سب سے بڑا مخالف صدر چُن لیا گیا۔ یہ واقعہ اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ بالآخر جنوبی کوریا کو دنیا کی جمہوریتوں میں ایک مقام مل گیا تھا۔

نئے صدر کو انتقام کا خیال ضرور آیا ہوگا۔ اس کے بجائے، جیسا کہ نیلسن مینڈیلا نے کیا تھا، کم نے اپنی سیاسی شہ نشین میں درگزر اور مصالحت کے مضبوط تختے لگائے اور نیلسن مینڈیلا ہی کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ کم ڈے ینگ نے بھی درگزر کی راہ اپنائی، حتیٰ کہ ناقابل معافی حرکات کے بارے میں بھی دریا دلی دکھائی۔

جو کچھ ہوا وہ ایک سیاسی انقلاب تھا، مگر انقلاب کے بعد بھی پرانے دور کے کچھ نقوش باقی رہ جایا کرتے ہیں۔ جمہوری تناظر میں دیکھا جائے تو جنوبی کوریا کو قانونی اور حفاظتی نظام کی اصلاحات کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق جنوبی کوریا کے قید خانوں میں اب بھی طویل عرصے کے سیاسی سزا یافتہ محبوس ہیں۔ کچھ لوگ اصرار کرتے ہیں کہ منظم محنت کشوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں کم ڈے ینگ اُس جمہوری عمل کی تکمیل کریں گے، نصف صدی سے وہ جس کے سب سے بڑے داعی رہے ہیں۔

آج کل ایشیا میں انسانی حقوق کی موجودہ کیفیات کے بارے میں ایک اہم بحث جاری ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی حقوق کا شوشہ مغرب کا چھوڑا ہوا ہے جس کے استعمال کے ذریعے مغرب اپنی سیاسی اور تہذیبی برتری مسلط کرنا چاہتا ہے۔ کم اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے، اسی طرح

جیسے وہ اس خیال سے بھی انکار کرتے ہیں کہ انسانی حقوق کے کائناتی تناظر میں کچھ خاص قوم کے ایشیائی بھی ہوتے ہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر نوبیل کمیٹی نے بھی اس برس کے انعام کے فیصلے کے وقت کم کے ان اہم اقدامات کو پیش نظر رکھا ہے، مشرقی ایشیا میں انسانی حقوق کی ترقی کے سلسلے میں جو انھوں نے کیے ہیں۔ جس طرح ۱۹۹۶ء کے امن انعام یافتہ ہوزے راموس ہورتا نے، جو اس محفل میں بہ نفس نفیس موجود ہیں، کہا ہے، کم نے بھی مشرقی تیمور کے بارے میں شد و مد سے آواز اٹھائی تھی۔ مشرقی تیمور میں انسانی حقوق کے تحفظ کے استعمال کے لیے بین الاقوامی فوج میں اسی جنوبی کوریائی فوج کی شمولیت، جس کو چند برس قبل اپنے ہی ملک میں سیاسی حزب اختلاف کو دبانے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تھا، کم کا ایک بڑا علامتی قدم تھا۔

۱۹۹۱ء کی انعام یافتہ آن سان سوکی کی برمی آمریت کے خلاف جد و جہد میں بھی کم نے عملی طور پر مدد کی تھی۔ اس مرحلے پر ہم اس کو بھی یاد کرنا چاہتے ہیں، جس پر اپنا انعام وصول کرنے سے روکنے کے لیے ناروے کے سفر پر پابندی لگائی گئی ہے۔ بدقسمتی سے برمی حکومت ایک بار پھر آن سان سوکی پر اپنا دباؤ بڑھا رہی ہے۔

کم کو جنوبی کوریا میں وسیع اصلاحات کے پروگرام اور شمالی کوریا سے امداد باہمی کے عملی اقدام کے لیے، جس کو عام طور پر "sunshine policy" کا نام دیا گیا ہے، منتخب کیا گیا تھا۔ یہ اصطلاح ایک سیاح کے بارے میں Aesop کے لکھے ہوئے قصے میں استعمال کی گئی تھی جس نے تیز شمالی ہواؤں سے بچنے کے لیے اپنے جسم پر اپنا بھاری بھرکم لبادہ لپیٹ لیا تھا، مگر آخر میں سورج کی کرنوں سے ملنے والی بڑھتی ہوئی تمازت کے باعث اس کو اتارنا پڑا تھا۔

Sushine Policy اگر شمالی ہواؤں کو روکنے کے لیے نہیں تو کم از کم دونوں کوریائی ریاستوں کے درمیان امداد باہمی کے بڑھتے ہوئے تعامل کے ذریعے سرد مہری کو کم کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ کم ڈے ینگ نے صاف الفاظ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ جنوبی کوریا اپنے شمالی پڑوسی پر قبضہ کرنے یا اُسے اپنے اندر ضم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ہدف در اصل یہ ہے کہ دونوں ایک بار پھر ہم خیال ہو جائیں، اگرچہ دونوں یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے لیے ابھی بہت وقت درکار ہوگا اور بہت تیاریاں کرنی پڑیں گی۔

اس میں ذرہ برابر بھی شبہے کی گنجائش نہیں کہ دونوں کوریاؤں کے مابین 'دیتانت' اور آپس میں موافقت کے لیے ہونے والے عمل کے آغاز کا اصل محرک کم ڈے ینگ ہی رہے ہیں۔ ان کے کردار کا اگر (جرمنی کے سابق چانسلر) ولی برانٹ سے موازنہ کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، جن کے Ostpolitik نے دونوں جرمن ریاستوں کے درمیان تعلقات کو عام سطح پر لانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، جس کے لیے ان کو نوبیل امن انعام عطا کیا گیا تھا۔ محض برانٹ کی Ostpolitik ہی دونوں

ریاستوں کی یکجائی کی بنیاد نہیں تھی، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ۹۰-۱۹۸۹ء میں ہونے والے انضمام کی شروعات اسی سے ہوئی تھی۔ جنوبی کوریا کے نقطۂ نظر سے جرمنی کی یکجائی کا سیاسی پہلو خاصا کشش کا حامل ہے، مگر معاشیاتی پہلو کچھ ایسا ہے جو جرمنی کے مقابلے میں کوریا کو بہت گراں ہو سکتا ہے، اگر اس میں زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش کی گئی۔

پچھلے برس جون میں پیانگیانگ میں ہونے والی سربراہی ملاقات میں کم ڈے ینگ اور کم ینگ کے درمیان ہونے والی بات چیت محض ڈھیلے ڈھالے بیانات اور ہوائی خطابت سے کچھ زیادہ اہم رہی تھی۔ پچاس برس کی دوریوں کے بعد آپس میں ملنے والے خاندانوں کی تصویروں نے پوری دنیا پر گہرے اثرات مرتسم کیے تھے۔ یہ ملاقاتیں خواہ کتنی ہی کڑی نگرانی میں کیوں نہ ہوئی ہوں، خوشی سے نکلنے والے آنسو پانمن جام کی سرحدوں پر دیکھی جانے والی سرد مہری، نفرتوں اور مایوسیوں کے مقابلے میں بے حد متاثر کن تھے۔

شمالی کوریا کے لوگ ایک طویل عرصے نہایت مشکل حالات میں رہے ہیں۔ بین الاقوامی برادری، شدید سیاسی جبر کے باوجود زیادہ عرصے تک ان کی بھوک سے لاتعلق، اور خاموش نہیں رہ سکے گی۔ اس کے برعکس شمالی کوریا کے سیاسی رہنماؤں کے کردار کو دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت کی جانب اٹھائے جانے والے پہلے قدم پر آفرین کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

دنیا کے بیشتر حصے میں سرد جنگ کا عہد ختم ہو چکا ہے۔ دنیا بالآخر Sunshine Policy کے ذریعے جزیرہ نما کوریا میں سرد جنگ کی باقیات کو پگھلتے دیکھ سکے گی۔ اس میں وقت لگ سکتا ہے، مگر عمل شروع ہو چکا ہے، اور بلاشبہ آج کے انعام یافتہ کم ڈے ینگ سے زیادہ کسی نے اس عمل میں ہاتھ نہیں بٹایا ہے۔ گویا شاعر کے الفاظ میں "پہلا قطرہ سب سے بہادر، سب سے ہمت والا تھا۔"

خطبہ ☆

جلالت مآب، دودمان شاہی، ناروے کی نوبیل کمیٹی کے ارکان، عزت مآب مہمانان، خواتین اور حضرات!

انسانی حقوق اور امن کے لیے ناروے کی سرزمین ایک متبرک مقام، اور نوبیل کا امن انعام ایک متبرک پیغام ہے جو تمام انسانیت کو امن کے لیے خود کو وقف کر دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ میں اس اعزاز کے دیے جانے پر بے حد و حساب شکر گزار ہوں۔ مگر اس لمحے میرا ذہن کوریا کے ان بے شمار عوام اور ساتھیوں کی طرف منعطف ہے جنھوں نے اپنے آپ کو "برضا و رغبت جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی کے لیے، اور دونوں کوریائی ریاستوں کے انضمام کے خواب کو پورا کرنے کے لیے وقف کر دیا

☆ کم ڈے ینگ کا نوبیل امن انعام کی تقریب سے خطاب، اوسلو، ۱۰ دسمبر ۲۰۰۰ء

ہے۔ اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اعزاز ان ہی کو ملنا چاہیے۔

اس لمحے مجھے دنیا کے وہ بہت سے ممالک اور دوست بھی یاد آرہے ہیں جنھوں نے میرے عوام کی جمہوریت حاصل کرنے کی کوششوں میں اور کوریاؤں کے ملاپ کی جدوجہد کی فیاضانہ امداد فرمائی ہے۔ میں خلوص دل سے ان سب کا بھی شکر گزار ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ جون کے مہینے میں ہونے والی پہلی جنوبی شمالی کوریائی سربراہی ملاقات اور کوریاؤں کے درمیان ملاپ کی کوششوں کی ابتدا ان وجوہات میں سے ایک وجہ ہے جس کے لیے مجھے نوبل امن انعام سے نوازا گیا ہے۔

مہمانان گرامی!

میں آپ حضرات سے جنوبی شمالی کوریائی رشتوں کی دوبارہ بحالی کے عمل پر باتیں کرنا چاہوں گا، نوبل کمیٹی نے جس کو اس اعزاز کی توصیف کی بنیاد بنایا ہے۔ میں نے جون کے مہینے کے وسط میں شمالی کوریا کے قومی دفاعی کمیشن کے چیئرمین کم یانگ ال سے ملاقات کے لیے پیانگ یانگ کا سفر کیا تھا۔ میں گیا تو تھا بوجھل دل کے ساتھ، نہ جانتے ہوئے کہ کیا متوقع ہو سکتا ہے، مگر مجھے اس بات پر یقین تھا کہ مجھے اپنے عوام کے لیے اور جزیرہ نما کوریا کے امن کی خاطر ضرور جانا چاہیے۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ یہ سربراہ ملاقات کامیاب ہوگی بھی یا نہیں۔ تین سالہ جنگ کے بعد، نصف صدی سے تقسیم شدہ، جنوبی اور شمالی کوریا نے باہمی بدگمانیوں اور خاردار تاروں کے پار کی دشمنیوں کے سایے میں زندگی گزاری ہے۔

اس حالت خطر کو، جس میں ہم ایک عرصے سے تھے، امن اور امداد باہمی میں تبدیل کرنے کے لیے میں نے فروری ۱۹۹۸ء میں صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی Sunshine Policy کا اعلان کیا اور یکسانیت کے ساتھ، شمال سے، تین نکات پر منحصر مصالحت کی پیغام رسانی جاری رکھی۔ پہلا نکتہ یہ تھا کہ ہم اشتراکیت کے ذریعے یکجائی بھی قبول نہیں کریں گے۔ دوسرا نکتہ تھا کہ ہم شمال کے انضمام کے ذریعے یکجائی کی کوشش نہیں کریں گے۔ اور تیسرا نکتہ یہ تھا کہ جنوبی اور شمالی کوریا امن و آشتی، امداد باہمی اور ہم بودیت کے متلاشی رہیں گے۔ میرے خیال میں یکجائی کا اس وقت تک انتظار کیا جا سکتا ہے جب تک فریقین پھر سے ایک ہو جانے کے بارے میں آسودہ اور مطمئن ہوں، خواہ اس کے لیے کتنا ہی طویل عرصہ درکار کیوں نہ ہو۔ پہلے تو شمالی کوریا نے اس خیال سے مزاحمت کی کہ شاید Sunshine Policy اس کو سر کرنے کا ایک پُرفریب منصوبہ ہے۔ مگر ہمارا خلوص نیت سے اپنے ارادے پر قیام، اور دنیا بھر سے اس پالیسی کی وسیع پیمانے پر معاونت نے، جس میں ناروے جیسا نیک ذہنیت والا ملک بھی شامل تھا، شمالی کوریا کو اس بات پر قائل کر دیا کہ اس کو بھی اسی انداز میں جواب دینا چاہیے۔

پچھلے پچاس برسوں کے دوران شمالی کوریا نے جزیرہ نما کوریا سے امریکی افواج کے انخلا کو تنازعے کا بنیادی نکتہ بنا رکھا تھا۔ میں نے چیئرمین کم سے کہا، ''حقیقت تو یہ ہے کہ کوریائی جزیرہ نما دنیا

کی چار بڑی طاقتوں، ریاست ہائے متحدہ امریکا، جاپان، چین اور روس کے محاصرے کی کیفیت میں ہے۔ ہم جس قسم کے سیاسی جغرافیائی علاقے میں ہیں، اس جیسا علاقہ دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس میں جزیرہ نما کوریا پر امریکی افواج کی موجودگی، صرف آج ہی نہیں بلکہ دونوں ریاستوں کی یکجائی کے بعد بھی، ناگزیر ہوگی۔ ذرا یورپ کی طرف نظر کیجیے۔ NATO اتحاد تشکیل دیا جا چکا تھا پھر بھی امریکی افواج یورپ میں موجود تھیں تاکہ سویت یونین اور مشرقی یورپ کی طاقتوں کو طاقت آزمائی سے باز رکھا جا سکے۔ مگر اب، اشتراکی گٹھ جوڑ کے زوال کے بعد بھی، NATO اور امریکی افواج یورپ میں موجود ہیں، اس لیے کہ یورپ کے امن اور استحکام کے لیے آج بھی ان کی ضرورت ہے۔''

میری اس توضیح کو سن کر چیئرمین کم نے، حیرت انگیز طور پر، بہت مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ طویل عرصے سے اپنائے ہوئے شمالی کوریا کے مطالبے میں یہ ایک بڑی تبدیلی تھی، اور جزیرہ نما کوریا سمیت شمال مشرقی ایشیا میں امن کے تناظر میں ایک بامعنی پیش رفت۔

ہم نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ منقسم خاندانوں کے معاملات کو جلد سلجھایا جانا چاہیے۔ اس لیے سربراہی ملاقات کے بعد سے، فریقین ان کے دکھوں کا مداوا کرنے کے سلسلے میں مناسب اقدام کر رہے ہیں۔ چیئرمین اور میرے درمیان باہمی اقتصادیات کی ترقی کے فروغ پر بھی اتفاق ہوا۔ اس طرح فریقین نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے کوریائی ریاستوں کے درمیان اقتصادی ترقی بڑھانے، سرمایہ کاری کے تحفظ اور دوہرے ٹیکس سے بچاؤ کے لیے چار قانونی دستاویزات کی تیاری کا حکم جاری کیا گیا۔ اسی اثنا میں ہم نے شمال کو تین لاکھ ٹن کھاد اور پانچ لاکھ ٹن غذا کی انسانی اعانت بھی فراہم کی ہے۔ سربراہی اجلاس کے بعد سے کھیل کود، تہذیب اور فنون لطیفہ، اور سیاحت کے میدان میں تبادلے کی شروعات بھی ہو چکی ہے۔

مزید یہ کہ تناؤ کی کمی اور امن کی دیرپا بحالی کے لیے دونوں ریاستوں کے وزرائے دفاع نے ملاقات کی ہے، جس میں ایک دوسرے کے خلاف کبھی جنگ نہ کرنے کا عہد بھی کیا گیا ہے۔ انھوں نے جنوبی اور شمالی کوریا کے درمیان ریلوے اور سڑکوں کے ٹوٹے ہوئے رابطوں کو بحال کرنے کے لیے ضروری فوجی تعاون پر زور دیا۔

اس یقین پر کہ دونوں کوریاؤں کے درمیان امن کی بحالی کے لیے محض رشتوں کی استواری ہی کافی نہیں۔ میں نے چیئرمین کو امریکا اور جاپان سے بہتر رشتے استوار کرنے پر آمادہ کرنے کی پرزور الفاظ میں حمایت بھی کی ہے۔ پیانگ یانگ سے واپسی پر میں نے صدر کلنٹن اور جاپان کے وزیراعظم موری کو شمالی کوریا سے تعلقات کے فروغ کی ترغیب بھی دی ہے۔

میں نے اکتوبر کے آخری دنوں میں سیول میں ہونے والی تیسری ASEM سربراہی ملاقات میں اپنے یورپی دوستوں کو بھی ایسے ہی مشورے دیے تھے۔ شمالی کوریا اور امریکا کے درمیان، اور یورپ

کے بہت سے ملکوں اور شمالی کوریا کے درمیان حالیہ دنوں میں کچھ مثبت قدم اٹھائے گئے ہیں۔ میں پر امید ہوں کہ یہ اقدام جزیرہ نما کوریا پر امن کے فروغ میں فیصلہ کن اثر ڈالیں گے۔

خواتین و حضرات!

کئی عشروں پر محیط، جمہوریت کے لیے کی جانے والی میری جد و جہد کے دوران مجھے مسلسل اس تردید کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ مغربی طرز کی جمہوریت ایشیا کے لیے مناسب نہیں، اس لیے کہ ایشیا اس کی اساس سے محروم ہے۔ اس بات کا سچ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مغرب سے کہیں پہلے سے، عظمت انسانی کا احترام ایشیا کے نظام خیال میں موجود تھا، اور ہماری دانش کی روایات میں بھی اس کی جڑیں گہری تھیں۔ ''عوام ہی جنت ہیں۔ عوام کی خواہشات جنت کی خواہشات ہوتی ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا احترام کرو جیسے تم جنت کا احترام کروگے۔'' تین ہزار برس سے کوریا اور چین کی سیاسیات کا یہی مرکزی عقیدہ رہا ہے۔ پانچ صدی بعد ہندوستان میں بدھ مت نے انسان کی عظمتوں اور اس کے حقوق کی ارفع اہمیت کی تبلیغ شروع کی تھی۔

اور بھی بہت سے مروجہ نظریات اور ادارے تھے جنھوں نے عوام کو سب سے آگے رکھا ہے۔ کنفیوشس کے چیلے Mencius کا قول ہے'' بادشاہ جنت کا بیٹا ہوتا ہے۔ جنت اسے منصفانہ حکمرانی کے لیے بھیجتی ہے۔ اگر وہ ناکام ہوتا ہے اور عوام پر ظلم کرتا ہے تو جنت کی طرف سے عوام کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس سے نجات حاصل کرلیں۔'' اور یہ سب کچھ جان لاک کے Social Contract اور معاشرتی حاکمیت کے نظریات سے دو ہزار برس قبل ہو رہا تھا۔

[حضرت] عیسیٰ کی پیدائش سے قبل چین اور کوریا میں جاگیرداری کو ختم کرکے ضلعوں اور prefectures میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ سرکاری افسروں کی بھرتی کے لیے امتحانات کی شروعات کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔ ایک مستحکم جانچ پڑتال کے نظام کے ذریعے بادشاہ اور اس کے اعلیٰ افسران کی حکمرانی پر نظر رکھی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ ایشیا عقلیت اور منظم اداروں کی روایات کی دولت سے مالا مال تھا، جو جمہوریت کے لیے زرخیز مٹی فراہم کرتے تھے۔ مغرب کا کمال اداروں کی ترتیب میں تھا، جو ایک قابل تعریف کامیابی کے مترادف تھا جس نے تاریخ انسانی کو بہت فروغ دیا ہے۔

ایشیا کے ان ملکوں میں جہاں مظاہر کی روایات قدیم ہیں، مغربی جمہوریت کے بنائے ہوئے ادارے پھل پھول رہے ہیں، جیسا کہ کوریا، جاپان، فلپائن، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا میں صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ شمالی تیمور کے عوام نے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر، جن کو خون خوار جنگجو گروہوں سے شدید خطرات لاحق تھے، اپنی آزادی کے لیے انتخابات میں ووٹ دیا۔ میں مار (سابقہ برما) میں مادام آنگ سان سوکی اب بھی جمہوریت کی جدوجہد کرنے والے ہراول دستوں کی رہ نمائی کر رہی ہیں۔ ان کو عوام کے بیشتر حلقوں کی ہمدردیاں حاصل ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہاں بھی

جمہوریت غالب آئے گی اور منتخب حکومتوں کا دور واپس آ کر رہے گا۔

مہمانانِ گرامی!

میرا ایمان ہے کہ جمہوریت ہی وہ اصل قدر ہے جو انسانی عظمتوں کے لیے کام کرتی ہے کہ ہمیشہ اقتصادی ترقی اور سماجی انصاف کا یہی ایک قابلِ اعتماد راستہ رہا ہے۔

جمہوریت کے بغیر کسی ریاست کے اجتماعی وسائل بارور نہیں ہوتے، نہ معاشیات میں مسابقت ہو سکتی ہے اور نہ ملک میں ترقیات۔

بغیر جمہوری بنیادوں کے کسی قوم کا اقتصادی ڈھانچا ریت میں بنائے ہوئے محل کے مانند ہوتا ہے۔ لہٰذا جمہوریہ کوریا کے صدر کی حیثیت سے میں نے اپنے ملک کے جمہوری نظام کی ترقی کے لیے، منڈی کی معیشت کے لیے اور پیداواری خوش حالی کے لیے متوازی انتظامات کیے ہیں اور اسی پر میری حکومت کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں۔

اپنے مقاصد کی برآری کے لیے، پچھلے ڈھائی برسوں میں ہم نے ایسے اقدام کیے ہیں جو ہمارے ملک کے شہریوں کے جمہوری حقوق کی ضمانت دیتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے مالیاتی، تجارتی، عوامی اور محنت کش طبقات میں اصلاحات کے معاملے میں بھی ثابت قدم رہے ہیں۔ مزید یہ کہ، ہم نے بلا کسی تفریق کے، اپنے ملک کے تمام باشندوں کی، جن میں کم آمدنی والے طبقے بھی شامل ہیں، پیداواری خوش حالی اور انسانی محنت کے وسائل کی ترقی کے لیے کام کیے ہیں اور ان میں خاصی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔

کوریا ان اصلاحات کو جاری رکھے گا۔ ہم نے نہ صرف موجودہ اصلاحات کی کوششوں کو جاری رکھنے کا عہد کیا ہے بلکہ ایسی اصلاحات کی بھی منصوبہ بندی کی جارہی ہے جن کی کامیابی سے اکیس ویں صدی میں ہماری معیشت اول درجے پر فائز ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہم اپنی روایتی صنعتوں کی طاقت، bio-tech، برقیاتی اور معلوماتی وسائل کے میدان کے بے شمار امکانات کی یکجائی پر ارتکاز سے اپنے تمام اہداف حاصل کر لیں گے۔

اکیس ویں صدی میں آنے والا عہدِ دانش و اطلاعات بے اندازہ دولت کے عہد کی نشان دہی کر رہا ہے مگر اس میں ممالک کے درمیان تیزی سے بڑھنے والی مالیاتی خلیج کے خطرات بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ مسئلہ امن اور حقوقِ انسانی کے لیے بھی شدید خطرہ ہے، اور ہمیں نئی صدی میں اُن طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جو جمہوریت کو زیر کرتی ہیں، تشدد کے راستے اختیار کرتی ہیں۔ ہمیں امن اور انسانی حقوق کو درپیش نئے چیلنج کا اُن اقدامات سے مقابلہ کرنا پڑے گا جن سے اطلاعاتی خلیج میں کمی واقع ہو، ساتھ ہی ہمیں ترقی پذیر ممالک اور سماج کے فراموش کیے ہوئے طبقات کو نئے عہد میں اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہوگا۔

جلالت مآب، دودمانِ شاہی، خواتین و حضرات!

اجازت ہو تو میں کچھ الفاظ اپنی ذات کے بارے میں بھی کہوں۔ میری زندگی میں پانچ موقعے ایسے آئے جب میں نے آمروں کے ہاتھوں آنے والی موت کو قریب سے دیکھا تھا۔ چھ برس

میں نے قید میں گزارے، اور چالیس برس یا تو میں نظر بند رہا یا ملک بدری اور کڑی نگرانیوں میں۔ اپنے عوام کے سہارے اور دنیا بھر کے جمہور پسند دوستوں کی ہمت افزائی کے بغیر میں ان مشکلات کو جھیل نہیں سکتا تھا۔ میرے گہرے ذاتی یقین نے بھی مجھے قوت و ہمت عطا کی ہے۔

میں اس یقین کے سہارے زندہ رہا، اور زندہ ہوں کہ خدا ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اگست ۱۹۷۳ء میں، جاپان میں جلاوطنی کے دوران مجھے ٹوکیو کے ہوٹل کے کمرے سے، میں جس میں مقیم تھا، اس وقت کی جنوبی کوریا کی فوجی حکومت کے خفیہ ہرکاروں نے اغوا کر لیا تھا۔ اس خبر نے پوری دنیا کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ خفیہ ادارے کے گماشتے مجھ کو اپنی کشتی پر لے گئے جو ساحل کے قریب لنگر انداز تھی۔ انھوں نے میری مشکیں کس دیں، آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں اور کپڑا ٹھونس کر میرا منہ بند کر دیا تھا۔ اور اس وقت جب وہ مجھے سمندر کی لہروں کی نذر کرنے والے تھے، میری نظروں کے سامنے یسوع مسیح ظاہر ہوئے۔ میں ان سے لپٹ گیا اور اپنی جان کی بھیک مانگنے لگا۔ عین اس وقت مجھے موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لیے آسمان سے ایک طیارہ اترا تھا۔

میں تاریخ کے انصاف پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں فوجی حکومت نے مجھے موت کی سزا سنائی تھی۔ چھ ماہ میں قید میں رہا، اور موت کے دن کا انتظار کرتا رہا۔ موت کے خوف سے اکثر مجھ پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ مگر تاریخ کی اس حقیقت سے مجھے سکون ملتا تھا کہ بالآخر انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ اس وقت بھی تھا، اور آج بھی میں تاریخ کا ایک مشتاق قاری ہوں۔ مجھے علم ہے کہ ہر عہد میں اور ہر خطے میں، جو کوئی اپنے عوام اور انسانیت کی خاطر صالح زندگی گزارتا ہے، کامیاب نہ ہوا ہو، ہولناک انجام سے دوچار ہوا ہو، تب بھی تاریخ کی نگاہ میں وہ فتح یاب اور صاحب عزت ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی بد دیانتی سے وقت موجود پر حاوی ہو بھی جائے تب بھی تاریخ ہمیشہ اس کو شرمناک شکست خوردہ کی حیثیت میں یاد رکھتی ہے۔ اس میں کوئی رُو رعایت نہیں ہوا کرتی۔

جلالت مآب، دودمان شاہی، خواتین و حضرات!

امن کے نوبیل انعام کو قبول کرتے ہوئے، انعام کی عزت پانے والا ہر فرد کبھی نہ ختم ہونے والے فرض کا پابند ہو جاتا ہے۔ میں نہایت انکسار سے آپ کے روبرو عہد کرتا ہوں، جیسا کہ تاریخ کے بڑے لوگوں نے ہمیں سکھایا ہے اور الفریڈ نوبیل کی توقعات کے عین مطابق، میں اپنے ملک میں اور دنیا بھر میں حقوق انسانی اور امن کے لیے، اپنے لوگوں کے درمیان مفاہمت اور امداد باہمی کے لیے اپنی بقیہ زندگی وقف کرتا ہوں۔ میں آپ سے ہمت افزائی کی توقع بھی کرتا ہوں، اور ان افراد سے بھی امداد کا طالب ہوں جو جمہوریت کے فروغ اور ساری دنیا کے لیے امن کے خواہاں ہیں۔

شکریہ!

☆☆☆

نظمیں

سرشار صدیقی

اندمال

ایک بے نام، ویران
کم مایہ و نیم قد
سر بریدہ پہاڑی
جو پچھلے زمانوں سے
حدِ نظر کی طرح
صورتِ سنگ میل ایستادہ ہے
اس بے بضاعت پہاڑی کے پیچھے
نہ معلوم کتنے
طلوعِ سحر کے پیامی
اُجالوں کے حامی
نہ معلوم کتنے فلک بوس خورشید
شعلہ صفت آفتاب
اپنے بے فیض لمحات پر منفعل
زرد رُو، سرنگوں
روشنی اور روشن خیالی کے خوش فہم تابوت میں
شب کے عبرت نشاں مقبرے میں اُتر جاتے ہیں
اور آنکھوں کے سب زخم بھر جاتے ہیں

☆

سرشار صدیقی

تمثیل

ساحل تک آتے آتے
سرکش موجوں کا زور
ہوا ہو جاتا ہے
پھر یہ واپس جانے والی
مدّھم، زیریں لہریں
سطحِ سمندر کے سینے پر
تند ہوا کے پاؤں پکڑ کر
خاموشی کے مخالف رُخ پر
شور مچاتی، جھاگ اڑاتی
تیز قدم آتی موجوں کی پہنائی کا حصہ بن کر
اُن کا دامن تھامے
انگلی پکڑے
ساحل تک آنے کی لگن میں
سرکش موجوں ہی کا حصہ بن جاتی ہیں
اور اس صورت
جذب و نمو کی آویزش کا
دائرہ وار سفر جاری رہتا ہے

☆

سرشار صدیقی

زرد گیت

فصلیں کھیت کی مانگ بھریں
اور کھلیانوں کی گود
منڈی کے گودام بھریں
اور ساہوکار کی جیب
لیکن خون پسینہ دے کر
فصل اُگانے والے کے گھر
منڈلائیں آسیب

گھر میں ڈھلتی عمر کی بیٹی
اُڑ گیا جس کا روپ
گہرے بادل پڑ گئے ہلکے
مانگ میں بس گئی دھوپ
کچی دیواروں کے پیچھے
پکی عمر گنوائے
ہر آنے والے پھاگن سے
کیا کیا آس لگائے
لیکن جب بھی فصل کٹے تو
مہندی رچانے والی حسرت
چہرے پر ہلدی مَل جائے

☆

سرشار صدیقی

حُسنِ طلب

اپنی بے خواب آنکھوں کے کشکول لیے
آج ایک تخی داتا کے در پر
میں نے اپنے دل کی دھڑکن سے
دستک دے دی ہے

وہ آیا تو
میرے حرفِ سوال سے پہلے
میری ان بے خواب آنکھوں کو
تعبیروں کی بشارت دے گا
چھپے خزانوں سے بے مانگے
اپنے پیار کی دولت دے گا

سرشار صدیقی

بے لگام

کچی عمر میں
کچے پھل کھانے کی خواہش
ویسے تو معیوب نہیں ہے
لیکن
ہم سے نیم عقیدہ لوگوں کے مسلک کی رو سے
یہ خواہش ایسی بھی کوئی خوب نہیں ہے

کچی عمر میں
کچے پھل کھانے سے اکثر
دانت بھی کھٹے پڑ جاتے ہیں
کچے پھل بھی جھوٹے ہو کر
سڑ جاتے ہیں

☆

سرشار صدیقی

حرارت

کچی کلیاں
جن کو میری موجِ تنفس
بادِ صبا ہے
جن کے نمو کی راہ میں حائل
اک بے نام سا بندِ قبا ہے
جن کے سینوں کے پاتال میں
اَن جانے سرکش جذبوں پر
خواب آلودہ برف جمی ہے
جن کے بندِ قبا کھلنے میں
اک خودسر جھونکے کی کمی ہے
شام سے
میرے لمس کی حدت کے موسم میں
یہ کلیاں، یہ پیاسی کلیاں
اپنی تشنگیوں میں سمیٹے
خواہش کا منہ زور سمندر
میرے لہو کی شبنم پی کر
صبح سے پہلے کھل جاتی ہیں

☆

سرشار صدیقی

ترغیب

میں فرشتہ ہوں، نہ تم حور، نہ دنیا جنّت

یہ تو سیّارۂ تاریک، زمیں ہے مری جاں!
جرمِ اسلاف کی پاداش کا محبس ہے، جہاں
روزِ اوّل سے سزا کاٹ رہے ہیں انساں
وہ سزا جس کی نہ مدّت ہے نہ کوئی میعاد
یہ وہ زنداں ہے جو تا حشر رہے گا آباد
پھر ستم اور بھی بالائے ستم ہے کہ یہاں
نسلِ آئندہ بھی ہے وقفِ سزائے اجداد

اس خرابے سے نکلنے کا وظیفہ ہے وہی
جسے استادِ ملائک نے کیا تھا تعلیم
انتقاماً جسے ہم کہتے ہیں شیطانِ رجیم

یعنی اس قفلِ رگِ جاں کے لیے مثلِ کلید
فلکِ پیر کے بوسیدہ عقائد کے خلاف
آدمی کو ہے نئے عالمِ امکاں کی نوید

کون ہوسکتا ہے اس رازِ ازل کا محرم
ہم میں اب تک ہے وہی خلد کی خوئے آدم

گرچہ یاں سلسلۂ خدشۂ افلاک نہیں
پھر یہ کیوں ہے کہ یہاں حوصلہ بے باک نہیں

فرشِ خاکی پہ بھی افلاک کا چلتا ہے نظام
یعنی یہ "خوشۂ گندم" ہے زمیں پر بھی حرام

میں فرشتہ ہوں، نہ تم حور، نہ دنیا جنّت

کیوں نہ ہم پیروی آتشِ چالاک کریں
کُھل نہیں سکتا تو یہ بندِ قبا چاک کریں

خالقِ صبحِ ازل واقفِ رازِ "فیکون"
پھر ملے خوشۂ گندم سے یہ شاخِ زیتون
پھر اسی جرم کی پاداش میں ہم ہوں معزول
نئے سیّارے پہ ہو آدم و حوّا کا نزول
ہم زمیں زاد کی تجدیدِ بغاوت ہو قبول

شہریار

خواب دیکھنے والی آنکھیں

کتنی تیز تھی آندھی
آنکھیں ملتے ملتے سورج ڈوبا، شام
دور سے آتی آوازیں اور اُن کے پیچھے
رنگ رنگ کی پوشاکوں میں شور مچاتے
ریت بھرے دستانے پہنے ننھے بچے
ان کے پیچھے ان سے بھی کچھ چھوٹے بچے
ان کے آگے لمبے سایے— آدھی رات کے سناٹے
شبنم کے قطرے
خواب دیکھنے والی آنکھیں روتی ہیں
خواب دیکھنے والی آنکھیں کیا دیکھیں!

اسد محمد خاں

وداع کی نظمیں ☆

ا— دوست

تم کمال کے آدمی ہو!
میری سنہ بیاسی کی دریافت ہو تم

میں اپنے خدا کے پاس لے جانے کے لیے
سروں کا ایک ہار تیار کر رہا ہوں
سنہ بیاسی کی لڑی میں، میں نے تمھارا سر بھی
ٹانک لیا ہے
حساب کے دن، جب تخت کے رُو بہ رُو پہنچوں گا
تو یہ ہار دکھاؤں گا اور کہوں گا:
دیکھیے! یہ سب حساب رکھا ہے میں نے
وہ جگہ بری نہیں تھی...
بہت سے لوگ اچھے بھی تھے...

☆ وداع کی نظمیں— اطہر نفیس، رئیس فروغ، جمال پانی پتی، ثروت حسین، ذیشان ساحل، سیّد محسن علی اور کتنے ہی دوستوں کے لیے۔

۲— لوگ مرنے لگتے ہیں

یہ بڑھتی ہوئی عمر کی عطا ہے کہ چیزیں اور لوگ
سمجھ میں آنے لگتے ہیں،
زندگی کہیں کہیں سے واضح ہونے لگتی ہے
یہ بڑھتی ہوئی عمر کی سزا ہے
کہ دیکھتے ہی دیکھتے چیزیں بکھرنے لگتی ہیں
اور لوگ مرنے لگتے ہیں؛
زندگی پھر سے غیر واضح ہو جاتی ہے
میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ
یا تو میرے لیے چیزیں اور لوگ اتنے—
من موہنے نہ بنائے ہوتے
یا مجھے تھوڑا سا خود کفیل بنایا ہوتا
یا جب تک میں ہوں
میرے خزانے کو چھیڑا ہی نہ جاتا

۳— میرے شہد کے برتن

ہر بار جو میں دم لینے کو ٹھہرتا ہوں
میرے سر سے بادل کھینچ لیے جاتے ہیں
میں نے عافیت کے دنوں کی تلاش میں
شہد کی مکھی کی طرح کام کیا ہے
اور قطرہ قطرہ شہد اکٹھا کیا ہے

اب
ایک ایک کر کے میرے شہد کے برتن ٹوٹتے
جاتے ہیں

۴— کسی ایسے ہی موسم میں

میں نے ایک ترل چشمے میں ہاتھ بھگوئے تھے
ایک دھنک کو اُجلے رنگوں سے اپنی قوس کھینچتے دیکھا تھا

ابھی ابھی ایک پرندہ کھڑکی کے برابر سے
کچھ کہتا ہوا گزرا ہے
کئی برس ہوئے ایک چمکیلی آنکھوں والا ہرن
بالکل میرے پاس سے گزر رہا تھا
کہ میری بیٹیوں نے اسے دیکھ کے تالی بجا دی
بادل کے جس ٹکڑے میں دراڑ پڑ گئی تھی
ہفتے بھر کے چاند نے اس میں چھوٹا سا پیوند لگا دیا ہے

کسی ایسے ہی موسم میں ثروت☆ نے ایک ساتھ تین
نظمیں لکھی تھیں
سنا ہے میرا مجموعہ کمپوزنگ کے مرحلے میں ہے
رئیس فروغ!
بھائی!

☆ ثروت حسین

یہ سب باتیں میں اس لیے بتا رہا ہوں
کہ یہ سب باتیں میں تم سے کہنا چاہتا تھا
مگر اس دن جب تمھارے گھر پہنچا تھا تو تم
جا چکے تھے

۵— موت ہمارے درمیان کب نہیں تھی

موت ہمارے درمیان کب نہیں تھی
مگر یاد پڑتا ہے کہ ایک حیات آفریں آواز والا
بلند قامت آدمی
ہمیں اپنی اوٹ میں لیے کھڑا تھا...
وہ موت کی بدصورتی اور دہشت ناکی سے ہمارا
تعارف نہیں ہونے دیتا تھا
اب جو وہ ہٹ گیا ہے تو دیکھ لو،
جیسا جس کو دکھائی دیتا ہے
دیکھ لو—

۶— سلیم احمد کو ایک رپورٹ

کراچی ۲۱ر نومبر ۱۹۸۰ء
دوپہر دوپہر دوپہر
ہم سات آدمی جمال 'خان'☆ کے کمرے میں بیٹھے ہیں

☆ جمال پانی پتی

اس لیے کہ یہاں سے میل بھر دور
آپ کے راج ہنس کو کسی وانسرووَر لے جانے کے لیے تیار کیا جارہا ہے
(ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے)

مگر ہم ساتوں آدمی
ایک تیز سفید کپڑے اور ایک تیز سفید خوش بو کو
اُس لال کنول والے راج ہنس سے ایسوسی ایٹ
نہیں کر پا رہے
سیّد سلیم احمد! ہدایات کا انتظار ہے
رنگوں اور خوش بوؤں کی اس بے ربطی کے بارے میں
ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟
(رپورٹ ختم ہوئی)

۷ــــ دریا کے دونوں کناروں سے دُعا

دریا اپنے دونوں کناروں سے
تمھارے لیے سربلندی کی دعا بھیجتا ہے
شکریہ دوست
شکریہ!

یہیں کہیں کوئی بے نوا تھا،
کوئی 'حقیر و فقیر'

کہ تم نے مجھے
آواز
قامت
ماں
باپ
بہن
بھائی
مرشد
دوست
اور بہت سی خوب صورت چیزوں سے،
اور بہت سی قیمتی چیزوں سے خالی پایا...
اُسے خالی پایا
سو تم نے اُسے بھر دیا

اس مہرِ بے نہایت کے لیے
شہر کی ہوا
تمھاری پیشانی
تمھاری آنکھیں
تمھارے رخسار
تمھارے شانے
تمھارے ہاتھ
اور انگلیاں چومتی ہے

دریا اپنے دونوں کناروں سے
تمھارے لیے سربلندی کی دعا بھیجتا ہے
اے لکھ لُٹ!
تمھارا کہا نسلوں کے محیط میں گونجتا رہے

اے لکھ لُٹ!
تمھارا لکھا چمکتے ہوئے حرفوں میں لکھا رہے
اے لکھ لُٹ!
تمھارا نہ ختم ہونے والا وقت
کسی اطہر نفیس کی رفاقت میں گزرے،
کہ اس سے اچھی دعا
کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

☆

سحر انصاری

پرومیتھیس کا نغمہ

وہ آگ جس میں تجھے میں تلاش کرتا رہا
مرے ہی دل میں بسی تھی
اب اُس کے شعلوں میں
مجھے دکھائی دیا ہے ترا حسیں پیکر
ہوا جب آگ سے پہلا مکالمہ میرا
تو میں نے جان لیا
ہر آگ اتنی مقدس نہیں ہوا کرتی
ترے لبوں، تری آنکھوں کے رنگ ہیں اس میں
کھنک ہے اس میں نہاں، تیرے تازہ لہجے کی
تری ہنسی کی دھنک اس کی لو میں رقصاں ہے
ملا ہے حسن تجھے —— اور وہ بھی اتنا حسن
اسے سنبھال کے رکھنا خود اک قیامت ہے

یہ دل کی آگ ہے جس نے تجھے سنبھال لیا
ترے خیال کے جگنو ہیں پرفشاں اس میں
تری نزاکتِ احساس ہے تپش اس کی
ہے نیم شب میں گواہی کی طرح آویزاں
کہ جس سے ہوگئے روشن ترے بدن کے خطوط
یہ آگ میں نے چرائی ہے آسمانوں سے
ہر آگ اتنی مقدس نہیں ہوا کرتی

زبیر رضوی

ہمارے بعد

اے راہ روِ فردا
آوازۂ آئندہ
کیا جانے ملے تجھ کو کب ارضِ تمنائی
ہے لمبی مسافت کے اک دشت کی پہنائی
ساحل پہ سکوں رکھ دے
موجوں کے تبسم پہ آغازِ جنوں لکھ دے
ہم سونپتے ہیں تجھ کو یہ خوئے جہاں بانی
یہ زادِ سفر اپنا یہ عرصۂ امکانی
وہ دن کہ جو غرفوں سے چھن چھن کے اُترتے تھے
وہ دن کہ گلابوں کی خوش بو سے مہکتے تھے
وہ شامِ سر و ساماں
وہ محفلِ دل داراں
محرابوں میں قندیلیں
فانوس کی صورت میں آویزاں رہا کرتیں
طاقوں میں چراغوں کی تنویریں سجا کرتیں
صندل کی رداؤں میں
ریشم کی قباؤں میں
ارمان سنورتے تھے

دیوانے سے جذبوں کے لوبان سلگتے تھے
آواز کا اک لہرا سانسوں سے لپٹ جاتا
چپکے سے کوئی چہرہ کھڑکی میں چلا آتا
جس راہ میں چلتے تھے
جس سمت نکلتے تھے
انبوہ سیہ چشماں ہمراہ ہوا کرتا
تاروں کی جبینوں پر تحریر حنا ہوتی
زر دوز لباسوں میں موسم کے بدن سجتے
لفظوں کے کٹوروں میں معنی کے کنول کھلتے
تاریخ کی تشریحیں، تہذیب کی میثاقیں
انصاف کے میزاں میں رکھی ہوئی تعزیریں
قوموں کے تنزل کی آنسو بھری تحریریں
ہم جیسے گواہوں کی منصف سے جرح بحثیں
سب رائگاں جانے کا احساسِ زیاں ہوتا
جو کہتے وہ رد ہوتا، جو کرتے وہ رد ہوتا
تعمیر کی حسرت میں تخریب ملا کرتی
زنجیرِ درِ زنداں
اس لمبی مسافت کا تم آخری حاصل ہو
اے راہ روِ فردا — آوازۂ آئندہ
ہم سونپتے ہیں تجھ کو یہ خوئے جہاں بانی
یہ زادِ سفر اپنا — یہ عرصۂ امکانی!

خورشید رضوی

مرے دل میں کیا غم ہے

مرے دل میں کیا غم ہے
کیوں میرے دل کو
کسی طرح کی کامیابی لبھاتی نہیں ہے؟

یہ آنسو
جو چڑھتی ہوئی دھوپ کے رُو بہ رُو
کپکپاتے ہیں
اور داد پاتے نہیں ہیں
یہ کیوں میری آنکھوں کے حیراں مکیں ہیں؟

نہ دیکھے کی خواہش میں
دیکھے ہوئے سے گریزاں نگاہیں
کسے ڈھونڈتی ہیں؟

رضی مجتبیٰ

جھلک

موتیوں کی اک لڑی
غرفۂ تاریک میں
اور کبھی
ایک دستِ مرمریں
جس میں زلفِ خم بہ خم
کے سلسلے الجھے ہوئے
بیچ کی انگلی میں ہیرے کی دمکتی
شوخ سی انگشتری

جانے کس کی منتظر ہے
جانے کب اک برف سی ٹھنڈی ہوا نے لے لیا
اپنی بانہوں میں اسے
اب تو بس ہے موتیوں کی اک لڑی
یاد کی پہنائی میں

اور لبوں پر ایک لرزاہٹ بھی ہے
جس میں لفظوں کا ادھورا پن کوئی
لے رہا ہے سسکیاں

کون تھی وہ سوچتا رہتا ہوں میں
بے قرار و مضطرب
اور سماعت میں مری
گونجتا رہتا ہے شور...
شور زمیں
گنگناتا گیت گاتا گورکن
آپ میں اپنے مگن!

☆

رضی مجتبیٰ

بُلاوا

مری فصل ہو چکی ہے
سرِ سال خوردگی اب
ہے مرے لیے اگر کچھ
تو قوائے مضمحل کے
ہیں اجل گرفتہ لہجے
درِ بستۂ بدن پر
سنوں دستکیں فنا کی
یہ غروب کا سماں سا
سرِ ساحلِ سمندر
چلو اب دیے بجھا دیں
(کبھی دیپ خواہشوں کے)
چلو اب بچھائیں بستر
پئے خوابِ آخرِ شب
ہے رگوں میں چاپ جس کی

یاسمین حمید

نشاں مٹنے تلک

تو کیا ہم قبر پر پتھر لگائیں گے
پھر اس پتھر پہ اپنا نام لکھیں گے
نشاں مٹنے تلک

ہم یاد رکھیں گے
وجود اور ذات کا قصہ
کہانی فرد کی
ایک ایک کی تعمیر کا
تخریب کا موسم
تو کیا اس پر سند سچائی کی
کندہ کریں گے ہم
نشاں مٹنے تلک

ہم موت سے آگے نکل جائیں گے کیا
ہم بھاگتے جائیں گے کیا
انبوہ کے ہمراہ
اپنی ہی صدا کے دائرے میں رقص کرتے
زندگی کا ہاتھ چھوڑیں گے نہیں کیا ہم
نشاں مٹنے تلک

☆

یاسمین حمید

بہت کچھ کر لیا میں نے

ابھی دو چار لمحوں میں
بہت کچھ کر لیا میں نے

ستارے توڑ کر لائی
زمیں پر ان کو
آئندہ کے استقبال کی خاطر بچھایا
رات سے پیچھا چھڑایا

شہر کی گلیوں میں رقصِ دل کیا
غم کا قفس کھولا
پرندوں کو اڑایا

لفظ کو آواز دی
آواز کا چہرہ بنایا

کچھ ضروری خط لکھے
محتاط لہجے میں
کسی کارزیاں کی
آخری ترتیب بندی کی
نئے کاغذ کے ٹکڑوں سے نکلتی روشنی کو

اپنے اندر جذب کرنے کے
ہنر کو آزمایا

اور پھر یکدم
خوشی کی پھڑ پھڑاہٹ سے
کسی طوفان کو
تسخیر کرنے کے عمل میں
اپنی ساری انگلیاں کاٹیں
لہو کے رنگِ تازہ سے
کسی کے مرغزاروں کو سجایا

زندگی کے کھیل میں پھر
زخم کھانے کی کہانی بھی سنائی
ہارنے اور جیتنے کے مرحلے کیا ہیں
شکستِ جاں کی صورت میں
کہاں کے راستوں کی خاک
پیروں سے نہ اترے گی
یہ سمجھا، خود کو سمجھایا

پرانی میں
انھی دو چار لمحوں میں
کہیں گم ہوگئی

☆

یاسمین حمید

نجات

تمھارے بندی خانے میں
غلاموں کی قطاریں اتنی لمبی ہیں
تمھیں کیسے خبر ہوگی
یہاں دل کی ریاست کا
امیرِ محتشم اپنے سخن کے آبگینے سے
تمھاری خدمت عالی میں
اک نایاب تحفہ لے کے آیا ہے
تمھارا منتظر ہے

ظلم کے عادی
تمھارے بندی خانے کی حدوں میں پلنے والے
تم کو کیا بتلا سکیں گے،
ان کی تو باتیں

انھی کے خون کی گردش میں بہہ بہہ کر
کسی دستورِ بے آواز میں تحلیل ہو جائیں گی—
کیسی سرکش و چالاک بیداری ہے
جوان بے ضرر سوئے ہوؤں کو مطمئن رکھے ہوئے ہے!

دیکھ لو
مہمان اب بھی منتظر ہے
اور غلاموں کی قطاروں میں بھی اس کی وضع پر
سرگوشیاں ہونے لگی ہیں!

یاسمین حمید

کون ہے میرے شہر کا والی

جیسے درد سے بالکل خالی
سب لفظوں کے ہاتھ سوالی
بھوکے تن اور بھوکی آنکھیں
تھوڑا سالن ایک ہی تھالی
سونا چاندی روپ کی تہ میں
کانوں میں پیتل کی بالی
جنگلی پھولوں کے سایے میں
گدلا پانی کچی نالی
تن پر موسم کی پیلاہٹ
خوابوں کے اندر ہریالی
پوروں سے رستی ہے چاہت
پھولوں سے ڈرتا ہے مالی

آنسو ہے یا ریت کا ذرہ
خون کی رنگت کتنی کالی

ماں بچوں سے پوچھ رہی ہے
کس نے کس کو دی ہے گالی
کس نے سناٹے کو توڑا
کس نے توڑی کانچ کی پیالی
زہر کی پڑیا پھانک رہی ہے
شہد دلوں میں بھرنے والی
کہاں گئی وہ، ڈھونڈ کے لاؤ
جس کے رخساروں پر لالی
کتنا سوئے کتنا جاگے
کون کرے گھر کی رکھوالی
خلقت کس کے ہاتھ کو چومے
کون ہے میرے شہر کا والی

یاسمین حمید

تیسری آنکھ

آئنے، روز و شب کا چہرہ دیکھ
آئنے، گرد جھاڑ آنکھوں سے
آئنے، عکس کر وہ لو جس میں
خلق خوابوں کا اندراج کرے
ختم ہو جائے مدتوں کی تلاش

آئنے! دیکھ، میری جانب دیکھ
دیکھ سب کچھ مگر نہ کہہ کچھ بھی
دیکھ ایام کی سیاہی کو
گن وہ سارے نشان
جن سے مجھے
کوئی رغبت بھی اب نہیں، پھر بھی
جن کا پورا حساب رکھنا ہے

آئنے دیکھ، اُس طرف بھی دیکھ
جس طرف کچھ نہیں، خلا ہے بس
دیکھ، شاید تجھے نظر آئے
کوئی شے جو وجود چاہتی ہے
جو ارادے کی دسترس میں نہیں
جس کی تشکیل ہے مگر لازم

آئنے دیکھ اپنے آپ کو بھی
سوچ کیا کیا سما گیا تجھ میں
سوچ کیا دیکھنا ہے اب تجھ کو
سوچ کیا آب وتاب کی حد ہے
کیسے منظر کو عکس کرنے میں
تیری صورت کو مسخ ہونا ہے

ایوب خاور

اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی

اندھیرے کی مٹھی نہیں کھل رہی
اندھیرے کی مٹھی کسی سے نہیں کھل رہی
کہ برسا برس سے
اندھیرے کی مٹھی کسی سے نہیں کھل رہی
اندھیرے کی مٹھی میں بند ایک ڈبیہ ہے، ڈبیہ میں جگنو ہے اور حبس بے جا میں
پہرے داروں کے آپس کے جھگڑوں میں
ڈبیہ کی چابی کہیں گم ہوئی ہے
گما دی گئی ہے
کہ تالا لگا کر کے
چابی کو مٹھی کی درزوں کے اندر ہی سرکا دیا ہے کسی نے
کسی کو خبر ہی نہیں
یا پھر بتاتے نہیں ہیں
جو اس راز کو جانتے ہیں
میں جس پیڑ کی سبز پتوں بھری شاخ پر آ کے بیٹھا تھا

اب وہ سیہ ہو چکی ہے

دھواں اٹھ رہا ہے

اب اس پیڑ کی کچھ جڑوں سے دھواں اُٹھ رہا ہے

دھویں میں اندھیرے کی بھی سانس گھٹنے لگی ہے

نظر کچھ نہیں آ رہا

جس کی صورتِ حال میں

وہ جگنو بجھے جا رہا ہے

اندھیرا کثافت کی میلی چکٹ ایک چادر کے مانند

مجھ سے لپٹتا چلا جا رہا ہے

مرا دم گھٹا جا رہا ہے

شاعرِ نکتہ داں!

اے مرے رازداں!

کون فرعون ہے

جس کے جادوگروں نے

اندھیرے کی مٹھی پہ ایسا کوئی سخت جادو کیا ہے

کہ بینائی کے ساتھ دانائی بھی منجمد ہو گئی ہے

یہ جگنو جو بے حس اندھیرے کی مٹھی میں بند ایک ڈبیہ کے اندر بجھے جا رہا ہے

اگر مر گیا تو؟!

ایوّب خاور

ایک شجر زادے کی موت پر

اسے خود میں نے اپنے ہاتھ سے
مٹی میں بویا اور سینچا تھا
جوانی میں قدم رکھا
تو اپنے ساتھ کے سارے شجر زادوں میں سب سے خوب صورت تھا
ابھی پچھلے برس کی بات ہے
پارک کے چاروں طرف ایستادہ
اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر
وہ ہوا کے بازوؤں میں بازو ڈالے
تیز بارش میں نہاتا
والٹز ڈینسنگ (Walts Dancing) کر رہا تھا
اور اب اس وقت
میرے گھر کے بالکل سامنے ہی

سڑ رہی ہے اس کی لاش
بہت سے شاخچے، سوکھے ہوئے
اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں، چٹختی ہوئی
سبز، پیلے، زرد اور کچھ کچھ سنہری رنگ پتے
خاروخس
اور دھول، مٹی اور کچرا
جو بھی موسم کے مطابق وہ ہمیشہ زیب تن کرتا ہے
اب وہ اُس کے سر میں
گردن اور سینے کے کھرنڈوں اور نہایت بربریت
اور بہیمانہ صفت انداز سے کاٹے گئے شانوں پہ مرہم رکھ رہے ہیں
ایک دہشت سے بھری بے رونقی
پارک کے اندر بھی
باہر بھی
سلگتی دھوپ میں چڑمڑ سی ہوکر ہر طرف پھیلی ہوئی ہے
اور ہوا
جانے کہاں، کس باؤلی کی خشک گہرائی میں گر کر مرگئی ہے
بے ضرورت زندگی کی ساری آسائش بھی
آلائش بھی
دونوں مل کر
ایک کورے لٹھے کی ایک میلی سی چادر کے تلے سر جوڑ کر
اپنے زانوں پیٹتی اور بین کرتی جا رہی ہیں

شجر زادے کے پیروں کی بڑی چھوٹی بہت سی انگلیاں

اب بھی زمیں کے سینۂ زرخیز میں پیوست ہیں
گھٹنوں گھٹنوں اب بھی وہ اپنی جگہ پر ایستادہ ہے
مگر اُوپر کا دھڑ خود اُس کے اپنے قدموں میں اوندھا پڑا ہے
شجر زادہ
کمر سے کچھ ذرا نیچے سے ٹوٹا تھا
ہوا نے کچھ عجب دہشت بھرے خودکش بھنور باندھے تھے اُس کے گرد
اور پھر بربریت سے اٹی پاگل ہوا
اپنے ناخن
اس شجر زادے کی کھال اور ہڈیوں میں گاڑ کر بھنورائی تھی
اور شجر زادہ
اُسے یوں لگ رہا تھا
اس کی آنکھوں سے اندھیرا بہہ رہا ہے
اور لکڑی کے کنویں میں
موت
جیسے اُس کو اپنی بائیک پر لادے ہوئے گردش میں ہے
اچانک موت کی گردش کنویں کے دائرے کو اک طرف سے توڑ کر باہر کو نکلی
اور اُسی لمحے
شجر زادے کے کولھوں کی کھڑکتی ہڈیاں
اپنے شگافوں سے نکل کر کھال کی کھنچتی طنابوں سے الجھ کر رہ گئیں
شجر زادے کا دھڑ
سایے سمیت آہستہ آہستہ زمیں پر گر کے آخر بجھ گیا
شہر کے سارے دریچے، کھڑکیاں
اور دروازے مقفّل تھے

گلی کوچوں میں اُڑتی خاک میں شامل سرابوں اور خوابوں کے خس وخاشاک کو
پاگل ہوا
اپنی وحشی گردشوں کی شال کے لچکوں میں بھرتی
چیختی، چنگھاڑتی
مرکزی مسجد کے میناروں کو چھوتی اور اُس کے گنبدوں پر سے پھسلتی
گھوم کر مسجد کے زینوں سے اُترتی
صحن کے مرمر پہ
اندر کی صفوں
محراب و منبر
اور درو دیوار سے چپکے ہوئے
اور پھیتی پھیتی ہونے والی سرخ رُو پیشانیوں کی
ہڈیوں اور کھال میں اُڑ سے ہوئے سجدوں کے اوپر
ریت کی چادر بچھاتی، پھول والوں کی گلی میں مڑ گئی

ایک لمبی چپ
کئی دن پارک کے اطراف خیمہ زن رہی
زندگی اور اس کی آب و تاب
اس گلی میں کب پلٹ کر آئی تھی
یاد کرنے سے بھی یاد آتی نہیں
ہاں مگر اتنا سبھی کو یاد ہے
دوسرے ہی دن
شجر زادے کے شانے اور بازو
گردن اور سینے کی محرابوں کے خم
ہاتھ

اُن کی انگلیاں اور انگلیوں کے سارے ناخن
آریوں، کلہاڑیوں سے کاٹ کر
رات کی گہری اماوس سے نچڑتی اوس میں
ریڑھیوں پر لاد کر بھاگے تھے کچھ معلوم لوگ
مگر اس شہرِ بسمل کی کسی کُتوالی میں
اس سانحے کی ایف آئی آر اب تک نہیں کاٹی گئی

احمد صغیر صدیقی

تہی دستی

ہر ایک رات
گزر جاتی ہے مری یوں ہی
فلک پہ چاند ستارے سجائے
سوچ میں گم
سراب جانے کی خواہش سمیٹے سینے میں

ہر ایک دن
یونہی کٹ جاتا ہے مرا
بے رنگ
نواحِ جاں سے ابھرتی نہیں فغاں کوئی

میں ہوں
وہ ایسا تہی دست
جس کے پاس نہیں

کوئی بھی ایسا
کہ جس کی طلب مٹا دیتی
بکھیر دیتی مجھے
نوچ ڈالتی مجھ کو
کوئی بھی ایسا نہیں
جس کی چاہ کر دیتی
مرے وجود کے ٹکڑے
مری نمود کو خاک

میں کس کے واسطے تڑپوں
میں کس کو یاد کروں
گزرتی عمر میں بے سود زرد ہوتا ہوا
جو دستیاب نہیں اُس کو کھونا چاہتا ہے
کسی کے ہجر میں دل، روز رونا چاہتا ہے

☆

احمد صغیر صدیقی

شام نامہ

ہو گئی شام
فرصت کا وقت آ گیا
آؤ لکھیں کوئی خط
اُسی دل رُبا کو
وہ جس کا پتا ہم نہیں جانتے

ہو گئی شام
فرصت کا وقت آ گیا
آؤ کچھ دیر
آنکھوں کو نم ناک دل کو لہو پھر کریں
ایک خود ساختہ یاد کے نام پر

ہو گئی شام
فرصت کا وقت آ گیا
آؤ کچھ پھول رکھ آئیں پھر
اُس ہی دہلیز پر
جو کہیں بھی نہیں!

☆

صبا اکرام

آنے والا کل

کون ہیں جو
دن کے چہرے پر
اُجالوں کی چِتا سے
لے کے جلتی راکھ
کالک مل رہے ہیں،
دھندلکوں میں خوف کے
کھوئے ہیں سب محراب
مسجد کے،
اذانوں کی صدا انکھیلیاں کرتی
نہ اُن کو گدگداتی ہے
یہاں اب آتماؤں کے چمن
ویرانیوں کے کہر میں کھوئے ہیں
سارے پھول مرجھائے ہوئے
اور خوش بوئیں بے آسرا ہیں
جس طرف بھی جائیں
جلتے گوشت کی بُو
اپنی بانہوں کو پسارے
آنے والے کل کا
رستہ دیکھتی ہے!!

☆

صبا اکرام

وہ آخر کون ہے

یہ کیسی یاترا ہے
کھوج میں کس کی ازل سے
چل رہا ہوں
ٹھوکریں کھاتا ہوں
صحراؤں میں، جنگل میں
سلگتی دھوپ میں
لے کر رُوپہلی اور ٹھنڈی
چھاؤں کے خوابوں کی چھتری
میں چلا جاتا ہوں،
آندھی آئے تو
اَن دیکھے ہاتھوں کی کوئی زنجیر سی
تھامے ہوئے طوفاں سے لڑتا ہوں
جو بارش تیز ہو
تخئیل میں اپنے بسے
چھتنار برگد کے تلے
مٹی کا اپنا تن لیے

خیر و سکوں کی سانس لیتا ہوں
کہ پھر بارش کے تھمتے ہی
نکل جاتا ہوں اس کی کھوج میں
ان جانے رستوں کی طرف،
لیکن مجھے اس بار
رستے میں کوئی سایہ
ہیولا
یا اُجالوں کا کوئی ہالہ
نظر آیا تو پوچھوں گا
بتا دے
ایک مبہم سا تصور بھی نہیں جس کا
وہ آخر کون ہے؟!

☆

ضیاء الحسن

زندانی

میں پنجرے میں تنہا پڑا ہوں
رہائی کی کوئی بھی صورت نہیں ہے
میں نگران سے پوچھنا چاہتا ہوں
کہ باہر کا موسم ہے کیسا؟
یہاں تو بہت حبس ہے
باہر ہوا چل رہی ہے
کہ ہے موسم حبس اندر کی طرح؟

مجھے دھندلے دھندلے نظر آ رہے ہیں
کئی لوگ پنجرے کے باہر
وہ شاید مجھے دیکھتے ہیں
شاید انھیں میں بھی دھندلا نظر آ رہا ہوں
یہاں سے تو لگتا ہے
کچھ لوگ پنجرے میں ہیں
اور میں ان کو باہر کھڑا دیکھتا ہوں
مجھے تو یہ لگتا ہے جیسے
ہے یہ کائنات ایک پنجرہ
جہاں بھی میں جاؤں جہاں بھی وہ جائیں
میں پنجرے کے اندر

☆

ضیاء الحسن

تسلسل کا صحرا

گلستاں سے اڑا کر کون سے صحرا میں
لائی ہے ہوا مجھ کو
یہاں حدِ نظر تک ریت ہے
اور ماسوا کچھ بھی نہیں ہے
نہ کوئی راستہ ہے اور نہ منزل ہے
نہ منزل کا نشاں کوئی
ادھر جب دن نکلتا ہے
تو رہ جاتا ہے تپتی دھوپ کا سایہ
نہ پانی ہے، نہ ہے جائے اماں کوئی
فقط اک بے قراری ہے
جو رکھتی ہے رواں مجھ کو
مجھے بس چلتے رہنا ہے یہاں پر شام ہونے تک
مگر جب شام ہوتی ہے

میں تھک کر بیٹھ جاتا ہوں
ہوا مجھ کو کوئی لوری سناتی ہے
میں سو جاتا ہوں غفلت میں
ہوا طوفان بن جاتی ہے
بھر جاتی ہے کالی ریت
میرے حلق میں، کانوں میں، آنکھوں میں
میں گر جاتا ہوں شل ہو کر
ہوا میرے بدن سے اک نیا صحرا بناتی ہے
نہ جانے کس گلستاں سے
ہوا مجھ کو اُڑا کر
اس نئے صحرا میں لاتی ہے

☆

میر ظفر حسن

آخر

گھر سے جب نکلا تھا وہ
تن پہ اک جوڑا تھا بس
پر بدن میں ناچتی تھیں خواہشوں کی تتلیاں
خواہشوں کے اس سفر میں مڑ کے اُس نے پھر کبھی دیکھا نہیں
ایک دُھن دل میں لیے بڑھتا رہا آگے ہی آگے
ہر گھڑی چلتا رہا
نام تھا اُس کا کرم بخش — اب وہ کے بی ہو گیا
کے بی اپنے بیٹوں سے اکثر یہی کہتا رہا
روز و شب محنت مشقت سب تمھارے واسطے
یہ پلازہ اور بنگلے، مال و دولت سب تمھارے واسطے
بیٹے اُس کو دیکھتے احسان مندی کی نظر سے
خوش دلی سے حکم اُس کا مانتے
زیست کے پُر پیچ رستے پر یونہی چلتے ہوئے
ایک دن کے بی کی آنکھیں بند اچانک جب ہوئیں

یوں لگا جیسے کہ دنیا چلتے چلتے تھم گئی
ایک کونے میں کھڑے تھے اُس کے سب بیٹے اُداس
پھر عزیز آگے بڑھے، میت اٹھائی
اور قبرستان کی جانب چلے
دو قدم بس ساتھ چل کر بیٹے پھر پیچھے ہٹے
بی ایم ڈبلیو میں وہ اپنی بیٹھ کر کہنے لگے
سخت گرمی پڑ رہی ہے فل کروائے سی ذرا
پھر بڑا چھوٹے سے بولا:
"جاؤ، جا کر مولوی سے تم کہو جلدی کرے
اور سنو، کیا کر چکے ہو فون تم کیٹرنگ کے واسطے
قورمہ، بریانی، زردہ، فیرنی بھی چاہیے
کھانا اچھا چاہیے
شایانِ شان ابا کے ہو
اور کے پی بے خبر سب سے یونہی لیٹا رہا
دھوپ میں جلتا ہوا!

میر ظفر حسن

سال گرہ کے دن

آج پھر ماں نے مجھ کو فون کیا
اور بولی بڑے دُلار کے ساتھ
ہو مبارک تجھے یہ سال گرہ
ساری خوشیاں جہاں کی تجھ کو ملیں
دُکھ نہ کوئی ملے کبھی تجھ کو
میں کھڑا آئنے کو تکتا رہا
اپنے چہرے کو غور سے دیکھا
گرد سی جم رہی ہے چہرے پر
کتنی شکنیں پڑی ہیں ماتھے پر
وقت کی موج بہتی رہتی ہے
بہہ گیا اس میں میرا سارا جنوں
روشنی سے بھری مری آنکھیں
بجھ گئیں وقت کی ہواؤں سے
کیا ہے غم اور یہ خوشی کیا ہے
کیا حقیقت ہے کیا فسانہ ہے

کیا ہے ماضی یہ حال، مستقبل
رائگانی کے تپتے صحرا میں
اک گماں اک سراب ہوں گویا
بلبلہ کوئی جیسے پانی کا
اس میں معنی تلاش کیا کرنا
اب سوال و جواب کیا کرنا
یہ تذبذب یہ اضطراب ہے کیوں
اب کسی کا بھی انتظار ہے کیوں
آج پھر آئی میری سال گرہ
بے حساب آج میں شراب پیوں
ساری سوچوں کو منجمد کرلوں
بے خودی کی قبا میں چھپ جاؤں

حمیدہ شاہین

مشیت کا سفر

سمندر بے نیازی کے ہنر میں طاق ہوتا جا رہا ہے
لباسِ خاک جھاگوں جھاگ ہے
انفاس کی رو جھلملاتی، کھلکھلاتی ایسی سمتوں کو رواں ہے
جو اسی کے واسطے مختص ہیں
موجِ خوں لپکتی جا رہی ہے آسماں تک
جنوں گھر گھر کے آتا ہے، برستا ہے
بوچھاریں چاند سے خوابوں کا ماتھا چومتی ہیں
پکاریں مانجھیوں کی گونجتی ہیں
بھنور پڑتے ہیں محرومی کے، امیدوں کے چپّو ٹوٹتے ہیں
مصائب بادبانِ غم لگائے تیرتے ہیں
ہواؤں سے جھگڑتے، ڈگمگاتے، سمت سے ناآشنا
جیسے بڑے سے کینوس پر ایک نقطہ
جسے کچھ بھی بنا سکتا ہے کوئی
اُڑے پھرتے ہیں ڈار و ڈار خدشے

سیم گوں آبی پرندوں کی طرح نیلی فضا میں
دائرہ در دائرہ بھرتے اداسی

دعا کا راستہ رُکنے لگا ہے
نجانے کب کی ڈوبی کشتیوں سے "المدد" کی
سسکیوں جیسی صدائیں آ رہی ہیں

سماعت بھی زمانوں سے خفا ہے
مسلسل کچھ غلط سا ہو رہا ہے

کسی تاریک تہ سے
لفظ مایوسی کی گہری سبز کائی چیرتے اُٹھتے ہیں اوپر
کوئی نم ناک لے دھندلے افق پر ڈولتی ہے
ستارے کی طرح نغمہ فضا میں ٹوٹتا ہے
بدلتی جا رہی ہے روپ موجوں کی چٹائیں
جواہر پرورش کرتے صدف اپنی اُکھڑتی سانس کو ہموار کرنے میں لگے ہیں

بچھڑتے پانیوں کی ساحلوں سے جنگ میں
کیسے مرا ناپور ہے گا سرکشیدہ
یہاں ڈوبے پڑے ہیں اَن گنت نامی جزیرے
سمندر بے نیازی کے ہنر میں طاق ہوتا جا رہا ہے
بتاتا ہی نہیں ہے
مشیت کون سی جانب روانہ ہو چکی ہے

حمیدہ شاہین

ٹریفک جیم

ہیولے منجمد ہیں دائیں بائیں آگے پیچھے
ہم اپنی بے خیالی میں نکل آئے ہیں ایسی رہ گزر پر
جہاں جنبش کی گنجائش نہیں ہے
جہاں حرکت بہت مہنگی پڑے گی

کہیں اک انچ بھی ایسا نہیں ہے
جہاں پر چل سکے مرضی کا پہیہ
جدھر سرکا سکیں دل کی کوئی دیرینہ خواہش
جہاں سے مڑ سکیں سوچی ہوئی منزل کی جانب

دھواں ہے، شور ہے، ہارن پہ ہارن
جڑا بمپر سے بمپر
قطاریں ہی قطاریں کن فکاں سے لامکاں تک
عدم جیسے وجودوں میں کھڑے ہیں چپ چپیتے
شکن آلود ماتھوں، سرد نظروں کا ہجومِ بے کراں ہے
تحیّر خوف میں گھل مل گیا ہے

یہ شک ہونے لگا ہے
چلے بھی تھے کبھی ہم یا ہمیشہ سے رُکے ہیں

مسلسل بے یقینی، بے زبانی، بے زمانی
نہ کچھ سوچیں، نہ بولیں
نہ پوچھیں کیا ہے آگے
بدلتے ہیں اشاروں پر اشارے
ہری بتّی کو اپنی زرد آنکھوں میں بسائے
جہاں پر جو اَڑا ہے، بس کھڑا ہے

یہ کچھ پل ہیں جو صدیاں بن گئے ہیں
کہ صدیاں ہیں جو رستوں میں ڈھلی ہیں
گھڑی کی سوئیاں جو دائرے میں گھومتی ہیں
گماں ہوتا ہے شاید وقت آگے بڑھ رہا ہے
حقیقت کیا ہے، یہ کس کو پتا ہے

سماعت پاش، بے ہنگم، مشینی غل غپاڑا
بصارت کش نظارا
ہتھوڑے سے برستے ہیں حواسوں پر مسلسل اس ردھم سے
کہ بے سمتی کی دُھن بجنے لگی ہے
''کچل دو''، ''روند ڈالو'' کا ترانہ گونج اُٹھا ہے

حمیدہ شاہین

مس فٹ

میری ڈار کہاں تک اُڑتی
جسم سے جسم تلک اُڑنا منظور ہوا تھا
چھوٹے چھوٹے رستوں کا دستور بنا تھا
میری ٹولی کا منشور بدن سے آگے
سب لمبی پرواز کی بازی پر آمادہ
سب کا مسلک، بکی ہوئی پرواز میں شامل ہو نہیں سکتے
سب کی رائے، خواہش کے رستے سے جانا ٹھیک نہیں ہے
سب کا نعرہ، دنیا کی پرواہ نہیں ہے
ایسے میں پھر میری ڈار کہاں تک اُڑتی
جھونکا جھونکا جال بچھائے
بادل بادل قفس بنائے
فلک، فضائیں سب گہری سازش میں شامل
سو اب مل کر ڈھونڈ نکالیں
تھک جانے سے پہلے پہلے
گر جانے سے پہلے پہلے
کوئی اَن پہنچا سیّارہ، کوئی دور دراز جزیرہ
کوئی بھی اَن چھوئی گھاٹی
یا پھر — ایسا گہرا غار
جہاں پہ مکڑی جالا بُن لے

تسنیم عابدی

عوام

مرے چہرے پہ جو آنکھیں ہیں
وہ میری نہیں ہیں
ان آنکھوں سے وہی کچھ دیکھنا ہے
دوسرا جو کچھ دکھائے گا
بہت رنگین منظر ہے
مگر افسوس ہے اس کا
کہ پس منظر میں جو کچھ ہے
وہاں تک اب مری نظریں نہیں جاتیں
یہاں پتلی تماشا ہو رہا ہے
تماشا دیکھنے والوں کو
اتنا حق نہیں وہ پوچھ بیٹھیں
ڈور کس کے ہاتھ میں ہے
ناچنے والوں کو کتنا ناچنا ہے
کب اشارے پر قدم ہے

تماشا پیش کرنا ہے
تماشا دیکھنا ہے
اور کہاں یہ ٹھہر جانا ہے
یکایک بس یہاں اک مختصر وقفہ ہی ہوتا ہے
کہ جب اس ڈور کو اک ہاتھ سے
پھر دوسرے ہاتھوں میں جانا ہے
یہاں پتلی تماشا ہو رہا ہے
اس تماشے کے سبھی کردار بے بس ہیں

بشریٰ ہاشمی

شاید

ترا خیال جو آیا تو سج گیا منظر
زمیں پہ جیسے کوئی کہکشاں اتر آئی
دلِ حزیں میں جلیں انتظار کی شمعیں
ہوا بہار کی چلنے لگی بہر جانب
کھلے گلاب نگاہوں میں دُور دُور تلک
کہ جیسے رُخ سے کسی کے نقاب اٹھتا ہو
میں سوچتی ہوں کہ شاید اس ایک لمحے کو
اس ایک لمحے کو جس میں نہیں ہے غم کا نشاں
یہ ایک لمحہ کچھ ایسا دوام کر جائے
کہ عمر ساری اسی خواب میں گزر جائے

علی اکبر ناطق

جالا کاتنے والے

سوگ منایا سوگ منایا سوگ منانے والوں نے
اُس آنگن کا جس آنگن کی غم نے دھول اُڑائی ہے
اُن گلیوں کا جن گلیوں میں بھوت پھریں دوپہروں میں
گدلے پیڑوں کی ٹنڈ شاخیں سایہ سایہ چلتی ہیں
میلی آنکھوں والے اُلّو جن پر بیٹھ کے روتے ہیں
رات گئے تک آوازوں میں تلخ دھویں کا ایک غبار
لیکن مر گئے نوحہ والے کون بتائے ان کا ہاتھ

شور مچایا شور مچایا کالے تختوں والی نے
جنم جنم کے بھوکے بالک جس کی گود کا حصہ ہیں
کانپ کانپ کے ڈر جاتی ہے بھورے دن کی دیوی سے
پستانوں کو داب رہی ہے چُھپ کر درد کے ڈھیروں میں

آگ لگائی آگ لگائی سرد ہواؤں نے مَن میں
راکھ کا بستہ کر دیتی ہے سانس کے زندہ ریشوں کو
لیکن کون بجھائے اس کو یہ جنموں کی بھوکی آگ
کاتنے والے کات رہے ہیں جالا میری آنکھوں پر
دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں اور بہت خاموش

☆

علی اکبر ناطق

موتی

بادلوں میں مرے کچھ پرندے گئے
ایسے بادل جو اونچے ستونوں پہ تھے
پاک موتی تھے گویا پرندے مرے
میں نے پالا انھیں دل کی تنہائی میں
آنسوؤں کا جنھیں چوگ دیتا رہا
آنکھیں یاقوت کی اور پر دودھیا
وہ شکاری کی نظروں میں آئے نہیں
اب سنا میں نے سب وہ پرندے مرے
حوریں معصوم ہیں مالکِ خلد کی
موت سے ماورا زندگی کی امیں
شکر ہے میرے موتی ٹھکانے لگے

☆

علی اکبر ناطق

کلیسا

ایک کلیسا، جس کی بھیڑیں اُس کا رستا بھول گئیں
تنہا اک ویرانے میں وہ سرد ہوا سے ٹھٹھر گیا
کالی رات میں برف کے گالے مَن کا بوجھ بڑھاتے ہیں
سکڑ گئے ہیں پت جھڑ رُت سے دُھند میں لپٹے لال ستون
کھڑ کھڑ باجتے پیلے پتے دوڑتے ہیں دالانوں میں
لمحہ لمحہ گِر رہی ہے سانولے سالوں کی دیوار
شام ڈھلے میں پُرسا دیتے کانپتے بوڑھے زرد چنار
ایک کلیسا، جلی نہ جس میں چھ صدیوں سے اک قندیل
خواب ہوئے بپتسما والے اور یوحنا کی انجیل
دیواروں کو توڑ کے نکلے لمبی داڑھیوں والے پیڑ
خشک صلیبوں پر لٹکی ہے وقت کی ٹھنڈی کہنہ لاش
ٹوٹ گئیں سب کڑیاں چھت کی، بکھر گئے فانوسی ہار
صبح کی گھنٹی کھانس رہی ہے نیند میں شاموں کے ناقوس
ایک اُداس کلیسا جس کو گھیر لیا اندھیاروں نے
کوئی حواری آگ جلانے اب نہ یہاں پر آئے گا
مریم گود میں نور لیے پھر کس کا رستہ دیکھتی ہے؟

☆

شائستہ مفتی

دائمی سکھ

محبت دائمی سکھ ہے
کہ جس کو موت کی گھڑیاں
کبھی کم کر نہیں سکتیں
یہ موسم ایک بار آئے
تو پھر آ کر ٹھہر جائے
حسیں شاداب سی کلیاں
نگاہوں میں سما جائیں
تو پھر یہ مر نہیں سکتیں
خیالوں کی روانی میں
کہ جیسے بہتے پانی میں
کنول کھل جائیں خوابوں کے
تو قدرت مسکراتی ہے
اشارہ کر کے تاروں سے
چھلکتے آبشاروں سے
مدھر سرگوشیاں کر کے

ہمیں رستہ دکھاتی ہے
یہ رستہ کس قدر حیران کن منظر دکھاتا ہے
اسی رستے پہ انساں خود کو پہلی بار پاتا ہے
محبت کو سزا کہنے سے پہلے سوچ کر رکھنا
کہ جو اس سے بچھڑ جائے اُسے منزل نہیں ملتی
بکھر جائیں جو بن کر خاک، انھیں محفل نہیں ملتی
محبت دائمی سکھ ہے
یہ سکھ میں چاہتی ہوں تیری آنکھوں میں نظر آئے
کہ تو اس کائناتِ خواب کا ہم راز بن جائے

خطوط

مکتوباتِ احمد ندیم قاسمی بنام عبداللہ جاوید

مرتبہ عبداللہ جاوید

احمد ندیم قاسمی کے درج ذیل مکتوبات کے ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ نہ تو ان کے ذہن میں اور نہ ہی میرے، یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ ان خطوط کی طباعت یا اشاعت ہوگی۔ تخلیقی ادب سے ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ ان کی تحریر کے سمے ناظرین، قارئین یا سامعین پیش نظر نہیں رہے۔ ان خطوط کو میں نے اپنے نام وصول ہونے والے دوسرے خطوط کی فائلوں میں رکھا۔ افسوس کہ ان کو علاحدہ جمع کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ خطوط دو فائلوں میں سمائے۔ پرانی یعنی اولین فائل وقت کے گزرنے کے ساتھ پھٹ چھٹا گئی۔ دوسری قدرے محفوظ رہی لیکن خطوط اس طرح محفوظ نہیں رکھے جاسکے جس طرح رکھے جانے چاہئیں تھے۔ مسافرت اور خانہ بدوشی کی زندگی میں نہ تو میں خود ہی محفوظ رہ سکا اور نہ ہی میری چیزیں (سچ پوچھیے تو ذہن سے یہ خیال بھی نکل گیا کہ دنیا میں کوئی چیز میری اپنی بھی ہے اور تو اور، میں خود اپنا ہوں)۔ چناں چہ ندیم صاحب کے خطوط بھی، آدھے سے زیادہ گم ہوگئے۔ آج کل اس خط کی تلاش میں ہوں جو میرے نام ان کا ''آخری مکتوب'' کہلایا جاسکتا ہے۔

دستیاب خطوط میں سے بھی میں نے چند ایک الگ کردیے، جن کا تعلق معمولات روزمرہ سے تھا یا جن سے ان کی زندگی یا ان کی زندگی کی کسی جہت پر روشنی نہیں پڑتی تھی۔ ان خطوط کو بھی ''دیس نکالا'' دینا ضروری تھا جن میں ندیم صاحب نے صرف اس بے مایہ کا ذکر کیا تھا۔ اس کے باوجود میرا ذکر ملے گا، سو اس سلسلے میں قارئین کرام سے وسیع القلبی کی درخواست کے ساتھ معذرت۔ کہیں کہیں ایک دو فقرے غائب کرنے پڑے، قطعی غیر متعلقہ ہونے کا خیال کرکے۔

احمد ندیم قاسمی کے ان خطوط کو پیش کرنے کے ساتھ کسی نوع کے شخصی تعارف کی حاجت نہیں۔ قریب قریب ہر اردو داں ندیم صاحب سے واقف ہوگا، جہاں تک دنیائے شعر و ادب کا تعلق ہے۔ اردو کے علاوہ تمام قابل ذکر زبانوں کے شعر و ادب میں پاکستان کے اور اردو کے حوالے سے ندیم صاحب کا نام شاعر اور کہانی کار کے طور پر جلی حروف میں لکھا ہوا مل جائے گا۔ دنیا کی مختلف اہم زبانوں میں ان کے

افسانوں اور شعری تخلیقات کے تراجم مل جائیں گے۔ شعر و ادب کی تواریخ میں ندیم صاحب موجود ملیں گے۔ کمپیوٹر میں، انٹرنیٹ پر اور مختلف ویب سائٹس پر ندیم صاحب کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی کتابیں، ان کی شخصیت کی ہر جہت کی نمائندگی کرتی ہوئی دنیا کے کونے کونے میں دستیاب ہیں۔ ان کے فن اور شخصیت پر بھی کتابیں ملیں گی۔ مدرسوں اور کالجوں کی درسی کتابوں میں وہ موجود ہیں۔

جہاں تک شعر و ادب میں ان کے مقام کے تعین کا تعلق ہے، یہ آپ کا اور ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم میں سے جو کوئی بھی اس کام کا بیڑا اٹھائے، وہ اچھی طرح سوچ سمجھ لے، غلط بخشی کے جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے اور ادب میں یہ ایک نہایت سنگین جرم سمجھا جانا چاہیے۔ سچ پوچھیے تو ابھی تک اردو شعر و ادب میں فارسی شعر و ادب کی مانند ''تین بڑے'' ہی تسلیم کیے گئے ہیں اور وہ ہیں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ۔ ان تین بڑوں کے بعد میں فراقؔ کا نام لوں گا، کوئی صاحب (یا صاحبہ) فیضؔ کو رکھیں گے اور کوئی جوشؔ کو اور پھر ایک سلسلہ لگ جائے گا۔ ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، میرا جی، مجید امجد اور پھر فانی بدایونی، یگانہ کی جانب لوٹنے والوں کے ساتھ سوداؔ کو بھی یاد کرنا پڑے گا۔ عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی سب سے بچتے بچاتے اردو شعر و ادب کے صحن میں پھسل پڑیں گے۔ بخشش کی برسات ہوگی تو کیچڑ بھی ہوگا اور پھسلن بھی۔ کس کی مجال ہوگی کہ اس پھسلن کو روکے۔ شعر و ادب میں مقام کا تعین بالآخر وقت ہی کرتا ہے۔ ''آبِ حیات'' والے آزادؔ نے اپنے استاد ذوقؔ کو غالبؔ کے آگے لگایا لیکن آبِ حیات کا اصل جام غالبؔ کے حصے میں آیا اور کیوں نہ آتا، وہ تو آنکھوں سے بھی پینے کا ہنر جانتے تھے:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ذوقؔ کا ہاتھ بڑھا کا بڑھا رہ گیا۔ احمد ندیم قاسمی ایک بڑے مدیر جرائد کے طور پر اپنا نمایاں مقام بنا چکے ہیں۔ بچوں کے جرائد سے لے کر ''نقوش'' اور پھر ''فنون'' کی ادارت کر کے انھوں اس میدان میں مقام امتیاز حاصل کیا۔ عمر کی طوالت کا جبر، علالت کا تسلسل، مالی مشکلات کی رخنہ اندازی، حاسدوں اور دشمنوں کی خفی و جلی چیرہ دستیاں ان کی آخری سانسوں تک، ان کو ادارت کے فرائض ادا کرنے سے باز نہ رکھ سکیں۔ ان کے مکتوبات میں ''فنون'' کے حوالے سے غیر معمولی جذباتی رویہ ملتا ہے۔ ''فنون'' کے لیے ان کے دل میں ایک نوع کی پدرانہ شفقت ملتی ہے جو ہماری تاریخ ادب میں یادگار ہے۔ اپنے ایک خط کے مطابق ۲۲ر جولائی ۹۶ء میں لکھتے ہیں، ''بار بار ذہن پر دباؤ پڑتا ہے کہ رسالہ بند کردوں مگر پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی اولاد کا گلا کاٹنے کی سوچ رہا ہوں۔'' مدیر جریدہ کے طور پر میں ان کو حسرتؔ موہانی کے بعد اوّلین مقام پر دیکھتا ہوں جنھوں نے انگریز سرکار کی جیل میں چکی پیس لی لیکن اپنے پرچے کے ایک مضمون نگار کا نام افشا نہیں کیا۔ کالم نگار کے طور پر ان کے مقام کا تعین کرنا بے حد مشکل ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہ طور کالم نگار ان کو اس کرب سے بھی گزرنا پڑا کہ وقت نے ان کے قارئین ان سے دور کردیے ہیں۔ مکتوبات سے یہ بھی

پتا چلتا ہے کہ وہ آخری زمانے میں اس سبب سے بھی کالم لکھتے تھے کہ اس کی ''یافت'' سے ''فنون'' کا پیٹ بھرتے تھے۔ یوں ان کے کالموں کو دیکھا جائے تو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات ملک، قوم اور اردو زبان و ادب کے اطراف گھومتے تھے۔ ایک بار انھوں نے میرے ایک خط کو کالم کا موضوع بنایا جس میں، میں نے اس سلسلے میں دکھ کا اظہار کیا تھا کہ پاکستانی تارکین وطن اپنے بچوں کو اردو زبان کے ورثے سے محروم کر رہے ہیں، گویا وہ اپنے کالموں میں ہنگامہ خیز اور گرما گرم سیاسی و نیم سیاسی موضوعات کی جگہ صرف ایسے موضوعات چھیڑتے تھے جن کا تعلق دل کی چبھن سے ہوتا:

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

اُن کے ان مکتوبات میں افسانہ نویسی کا ذکر نہیں ملتا لیکن عمر کے مرحلہ آخر کے خطوط میں اپنے پاؤں کی تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ دو تین افسانے محض اس سبب سے ادھورے رہ گئے ہیں کہ دیر تک بیٹھ نہیں سکتے۔ بہرحال، بہ طور افسانہ نگار ان کے لیے یہی طمانیت کا باعث ہوگا کہ انھوں نے اردو ادب کو چند ایسی کہانیاں دیں جو اردو افسانے میں ''کلاسیک'' کا مرتبہ پا چکی ہیں۔ درج ذیل مکتوبات میں ان کی کتاب ''پس الفاظ'' کا ذکر ملتا ہے۔ وہ اپنی تنقیدی تحریروں سے بڑی حد تک مطمئن تھے۔ کتابوں پر تبصروں اور مقدموں کا ذکر نہیں ملے گا۔ گم شدہ خطوط میں کیا تھا اور کیا نہ تھا، اس پر بات کرنا مناسب نہیں ہے، بجز اس کے کہ میں اردو شعر و ادب سے ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لوں۔ ان مکتوبات میں احمد ندیم قاسمی کا ذکر ترقی پسند تحریک کے حوالے سے نہیں ملے گا۔ وہ آغاز ہی سے اس تحریک میں شامل رہے لیکن بنیاد ڈالنے والوں میں نہیں تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احمد علی، ملک راج آنند، سجاد ظہیر والے ہراول دستے میں نہ تو ندیم صاحب ہی تھے اور نہ ہی فیض احمد فیض وغیرہ البتہ اس تحریک کے آخری دستے کی سربراہی (پاکستان میں) ان کے حصے میں آئی۔ اس تحریک کا آخری منشور بھی ان کے دستخط سے جاری ہوا۔ اس تحریک کے سلسلے میں داخل زنداں ہونے والے آخری دستے میں بھی یہ شامل رہے۔ جس طرح اس تحریک کے چند سرگرم لیکن کم 'گرم' ارکان میں ان کا نام لیا جاتا تھا (مسلم لیگی ترقی پسند مشہور تھے) اسی طرح ان کے آخری منشور کو بزدلانہ کہا گیا۔ کسی کسی حلقے نے اس پر لے دے بھی کی۔ اس منشور کو بعد میں اس طرح سراہا گیا کہ اس کا اصل مقصد حکومت وقت کو تحریک پر پابندی لگانے سے روکنا تھا۔ اس منشور کے باوجود حکومت نے تحریک پر پابندی لگا دی، اس کے دفاتر نہ صرف سربہ مہر کیے بلکہ ہتھیا لیے (کراچی کے دفتر میں راتوں رات جوتوں کی دکان کھل گئی) تحریک کے تمام عامل کارکنوں اور عہدے داروں کو سلاخوں کے پیچھے کر دیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی کو کسی بھی حکومت وقت کے قصیدہ خوانوں میں نہیں دیکھا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ کسی بھی حکومت کے ساتھ انھوں نے ''آ بیل مجھے مار'' والا رویہ بھی نہیں اپنایا۔ آخر عمر میں ان کو اپنے لیے نہ سہی ''فنون'' کے لیے اہل ثروت کے اور اہل حکومت کے دست تعاون کی ضرورت تھی

لیکن دونوں اقسام کے افراد کے ساتھ ان کا رویہ مربیانہ نہ رہا۔ اسی سبب سے وہ مشکلات اور خاص طور پر مالی مشکلات میں گھرے رہے۔ اگر وہ کسی ایک طاقت ور بیوروکریٹ کے حلقہ بگوش بن جاتے یا کسی ایک امیر کبیر کی مصاحبی قبول کر لیتے تو ان کی ذاتی مشکلات اور ''فنون'' کے مالی مسائل چٹکی بجاتے میں حل ہو جاتے۔ اس پس منظر میں ان کا ''مجلس ترقی ادب'' کے معاملے میں طاقت ور بیوروکریٹس سے پنجہ لڑانا اور ڈاکٹر وزیر آغا سے معاملات بگاڑ بیٹھنا خاص غیر دانش مندانہ نہ سہی، خلاف مصلحت نظر آتا ہے۔ گویا ندیم صاحب الٹ پلٹ کر دیکھو تو بس نجھے دار ادیب اور شاعر ہی نکلتے ہیں۔ یہاں مصطفیٰ زیدی کا یاد آنا لازمی ہو جاتا ہے جن کو میں ایک اچھا شاعر + بیوروکریٹ خیال کرتا تھا، نرے شاعر ثابت ہوئے۔ ایک طاقت ور بیوروکریٹ کا اعمال نامہ دوسرے 'ملی بھگتیا' طاقت ور بیوروکریٹ کی خدمت میں پیش کیا، پاش پاش ہوئے، نوکری ہی سے نہیں، جان سے بھی گئے۔ ندیم صاحب پر شاید قدرت مہربان تھی، مجلس ترقی ادب کی نظامت کے ساتھ جان بھی بچ گئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو وہ پڑھا لکھا آدمی بھی مانتے ہیں لیکن ان کی جانب ''فنون'' کی مالی مشکلات کے ضمن میں دست طلب بھی نہیں بڑھاتے جب کہ ان کی رئیسی اور جرائد ادب پروری مسلّم تھی۔ ندیم صاحب کے ان تضادات کی وضاحت ان کے دستیاب مکتوبات (مجھ ناچیز کے نام) سے نہیں ہو سکے گی، البتہ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ان کی یہ شکایت ضرور ملتی ہے کہ اگر کوئی بھی، کسی بھی جگہ ڈاکٹر صاحب یا ان کی نگارشات کے ضمن میں کچھ الٹا سیدھا کہہ دیتا یا لکھ دیتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کی افواج قاہرہ ندیم صاحب پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ ان مکتوبات میں ڈاکٹر انور سدید کا نام بھی مل جائے گا، اسی تناظر میں۔

ندیم صاحب لمبی عمر پانے کے باوجود زندگی کی ایک نہایت کڑوی، نہایت کسیلی شاذ شاذ حالات میں قدرے میٹھی حقیقت سے ناواقف رہے یا اپنے آپ کو ناواقف رکھا کہ جس طرح معاملات عشق و محبت میں رقابت کا عنصر شامل رہتا ہے، اسی طرح پیشہ ورانہ زندگی میں حریفانہ رقابت کے وجود کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ندیم صاحب بھی حریفانہ رقابت کی زد میں رہے۔ مدیر جریدہ کے طور پر، شاعر اور ادیب کے طور پر، کالم نویس کے طور پر، تبصرہ نگار اور نقاد کے طور پر انھوں نے خاصا کام کیا اور خاصے حریف، حاسد، رقیب اور بدخواہ پیدا کیے۔ دشمنوں اور منافقوں کا پیدا ہو جانا تو ایک فطری امر ہے۔ یوں بھی کسی ادبی جریدے کی ادارت بجائے خود جھگڑا مول لینا ہے۔ ہر ''بزعم خود'' بڑا لکھنے والا اپنے نام کو ترتیب میں سب سے اول دیکھنا چاہتا ہے۔ مدیر بے چارہ کیا کرے۔ ایک کو خوش کرتا ہے تو دوسرا ناخوش اور ناخوشی کی بھی کوئی حد نہیں، شکر رنجی سے لے کر دشمنی تک پھیلتی ہوئی۔ ندیم صاحب نے ایک اور علت پال رکھی تھی۔ وہ ادیب گر بھی تھے۔ ''فنون'' کے کتنے لکھنے والوں کو اونچا اٹھایا، اس کا شمار نہیں لگایا جا سکتا۔ اس ضمن میں بھی جہاں ایک کا دل رکھا تو بہت سوں کا دل توڑ دیا۔ نتیجہ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ۔ ایسا بھی ہوا کہ آج جس کو خوش کیا، کل اس کو ناراض کر ڈالا۔ ندیم صاحب اور ''فنون'' کے بنائے ہوئے قلم کاروں میں جہاں چند ایک ان کے 'شبھ چنتک' ملتے ہیں تو کچھ کٹر دشمن اور بدخواہ بھی مل جاتے ہیں۔ ندیم صاحب اور ''فنون'' کی سرپرستی میں اونچے

اٹھنے اور پروان چڑھنے والوں میں قلم کاروں کے علاوہ قلم کارائیں بھی رہی ہیں۔ ہمارے معاشرتی مزاج کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہی وہ علاقہ ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی 'الفاروق' اور ندوہ کے معاملات سے فرصت نکال کر بمبئی میں عطیہ بیگم کو فارسی پڑھانے کی مصروفیت اپناتے ہیں۔ ''آب چو پائی''☆ اور ''گل گشت جو ہو''☆ کو حافظ شیرازی کے ''آب رکنا باد''☆ اور ''گل گشت مصلےٰ'' کے مقابل پیش کرتے ہیں لیکن یار لوگوں کو ان کی دستار فضیلت اچھالنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ مولانا کی بڑھتی ہوئی عمر کا لحاظ کیا جاتا ہے، نہ ہی ان کی فضیلت علمی کا خیال، دوسری جانب عطیہ بیگم کی شخصیت اور ان کے دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانش وروں بشمول علامہ اقبال سے قلمی اور علمی تعلقات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کتاب لائی جاتی ہے، ''مولانا شبلی نعمانی کی حیات معاشقہ''۔ ادب اور علم کی دنیا میں ایسی فضا تشکیل دی جاتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی جیسا محتاط اور نفیس مزاح نگار اور طنز کار بھی اپنی اولین کتاب☆ میں علامہ اقبال اور علامہ شبلی پر بیک وقت دو دھاری تلوار چلانے سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکا:

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ندیم صاحب کو تو اتنا شکر گزار ہونا چاہیے کہ یار لوگوں نے ان کو سستا چھوڑ دیا۔ ادب میں ان کے مرتبے کا لحاظ بھی کیا اور بڑھتی ہوئی عمر کا بھی۔ قابل ذکر قلم کاراؤں میں خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور نے ان کو لالہ کہنا شروع کیا۔ سب نے قبول کر لیا، پروین شاکر نے عمو جان بلایا، سو وہ بھی دبے قدموں گزر گئیں، البتہ جب منصورہ نے ان کو 'بابا' کا درجہ دیا تو ماحول ناسازگار ہو چکا تھا۔ ندیم صاحب حاسدوں، بدخواہوں اور دشمنوں کے حصار میں آ چکے تھے۔ نہ صرف وہ گھیرے میں آ چکے تھے بلکہ گھیرا مسلسل تنگ ہوتا جاتا تھا۔ ندیم صاحب اس صورت حال کو سمجھنے سے یکسر قاصر تھے۔ مکتوبات میں وہ منصورہ بٹیا کے لیے یہاں تک کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ قدرت نے ان کی کسی نیکی کے اجر کے طور پر ان کو منصورہ جیسی نعمت عطا کی ہے۔ وہ ان کی ذاتی ضروریات، غذا، لباس، علاج معالجے کا خیال رکھتی ہے۔ ان کو اسپتال لے کر دوڑتی ہے، اسپتال میں ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ان کے ''فنون'' کے لیے دوڑتی پھرتی ہے، ''فنون'' کے لیے سارے باہر کے کام کرتی ہے۔ اشتہارات کی فراہمی، پرچے کی کمپوزنگ، طباعت، پروف کی اصلاح، بائنڈنگ، ترسیل اور جانے کیا کیا۔ ندیم صاحب ''فنون'' کی ترتیب کا کام انجام دیتے ہیں۔ اب اگر وہ منصورہ کو نعمت خداوندی قیاس کرتے ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں۔ ''فنون'' میں اس کو اگر قدرے نوازتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کون سے غیر انسانی عمل کے مرتکب ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ امریکا کے دورے میں اگر منصورہ ان کے ساتھ جاتی ہیں تو کیا نہ جائیں؟ اس پورے قصے یا قضیے میں منصورہ کا ایک وصف جو واضح طور پر سامنے آتا ہے، اس کو میں 'اخلاقی جرأت' کا نام دوں گا، وہ بھی اس سبب سے کہ اس بے مثال وصف کو بیان کرنے کے لیے درست الفاظ کا انتخاب میرے بس کا روگ نہیں۔ منصورہ ایک بہادر شخصیت ہے۔

☆ چراغ تلے

اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو ندیم صاحب کو حالات کے حوالے کر کے اسلام آباد اپنے بھائی کے پاس دوڑ جاتی۔ ایسے میں عظیم بیگ چغتائی کا مشہور فقرہ سامنے آتا ہے، ''اے عورت! تیرا نام شہ زوری ہے۔'' ان مکتوبات کے آئینے میں ندیم صاحب اور منصورہ کا ایک مضبوط رشتہ سامنے آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس رشتے کی واضح تر اور حقیقت سے قریب تر تصویر ابھر کر آئے گی۔ مادیت کی اساس پر کھڑے ہوئے آج کے معاشرے میں کوئی رشتہ 'لین دین' کے عنصر سے یکسر خالی نہیں ہو سکتا، خواہ وہ خونی رشتہ ہو یا اکتسابی۔ ندیم صاحب کے قریب قریب سارے ذاتی نوعیت کے مفادات منصورہ سے وابستہ تھے۔ اگر منصورہ کے چند ایک مفادات ندیم صاحب سے جڑے بھی ہوں تو اس میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ ہر قسم کی جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کے بعد اس رشتے کا جو 'حاصل' رہتا ہے، وہ ہماری ادبی تاریخ میں 'مثالی' بھی کہلائے گا اور 'بے مثل' بھی رہے گا۔ ان دونوں نے تو بابا اور بیٹی کے رشتے کا نام دیا ہے۔ آپ کو پسند نہ ہو تو اس کو کچھ اور نام دے لیں یا پھر اسے 'انام' ہی رہنے دیں۔ آخر منصورہ کی 'خدمت' سے کوئی کب تک آنکھیں بند رکھ سکتا ہے۔

جہاں منصورہ احمد کی اخلاقی جرأت اور بہادری کو میں نے خراج تحسین پیش کیا ہے، وہاں ندیم صاحب کی اس ہمت کو بھی سلام پیش کروں گا جو انھوں نے ''عمر کے جبر'' کے برخلاف روا رکھی۔ ان مکتوبات کے ندیم صاحب اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ مصنوعی دانتوں سے کھانے میں دشواری ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر مسوڑھے زخمی ہو جاتے ہیں۔ کانوں سے اونچا سننے لگے ہیں، آنکھیں جراحی کے بعد سے دیکھنے لگی ہیں لیکن لکھنے پڑھنے میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ دیر تک بیٹھا نہیں جاتا، ٹانگیں اور پاؤں اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ان سب سے بڑھ کر 'دمے' کا عارضہ جس کو وہ کبھی ''سانس کی تکلیف''، کبھی ''ضیق النفس'' تو کبھی ''استھما'' لکھتے ہیں، ان کی روزمرہ زندگی کو لپیٹ میں لیے رہتا ہے۔ (وہ ایک مرتبہ دل کے حملے کے سے آثار کے تحت عارضۂ قلب کے مرکز میں داخل ہونا پڑا تھا) دمے کے علاج کے سلسلے میں ہر ممکن طریقہ علاج کو آزما بیٹھے تھے۔ آخر میں زیادہ انحصار ''نیزل اسپرے'' پر تھا۔ ایک ایسے ہی ''ان ہیلر'' کا بڑی طمانیت سے ذکر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کے استعمال سے پورا دن آرام سے گزر جاتا تھا۔ ان کا یہ ہلکا سا خاکہ خطوط کی مدد سے مرتب ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں نے ان کو آرام کا مشورہ دے رکھا تھا لیکن ''فنون'' کو ترتیب دینے کا کام وہ انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹروں نے ان کو ''اسٹریس'' سے بچنے کا مشورہ بھی ضرور دیا ہوگا لیکن وہ ''فنون'' کو جاری رکھنے کے لیے ہر طرح کی پریشانی اور فکر سے دوچار رہتے، کیوں کہ ''فنون'' کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اپنی آخری سانس تک وہ حالات سے نبرد آزما رہے۔ افسوس میری غفلت کے سبب ان کا میرے نام مکتوب آخر مجھ سے دور ہو گیا۔ اس سے قبل والے دو تین خطوط کے ساتھ، فی الوقت ان کا آخری خط ۸؍ مارچ ۲۰۰۶ء کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اس آخری خط کے آخر میں دعاؤں سے قبل وہ لکھتے ہیں:

''میں نے عمر سے ہار نہیں مانی۔ لڑائی جاری ہے اور بظاہر ابھی میں ہی فاتح ہوں۔''

۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء کو انھوں نے اپنی آخری سانس لی۔ اپنی اس آخری سانس تک انھوں نے عمر سے ہار نہیں مانی۔ لڑتے رہے اور ظاہراً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً بھی وہی فاتح رہے۔

پسِ تحریر:

میرے اس معروضے میں کسی صاحب کے بارے میں کوئی ایسی بات در آئی ہو جو کسی طور سے دل آزاری کا باعث بنی ہو یا میرے کسی خط میں یا اس مجموعہ مکتوبات میں ایسا کچھ ہو تو میں دست بستہ معذرت خواہ ہوں۔ اسی طرح میں احمد ندیم قاسمی کی جانب سے بھی یہی گزارش کروں گا۔ بطورِ خاص ڈاکٹر انور سدید اور جناب مجاہد بریلوی سے میری یہ عرض ہے کہ میں مرتبے میں ان حضرات سے کم ہوں، کیوں کہ محض ایک طالب علم ہوں، زیادہ کچھ نہیں۔ رہا ندیم صاحب کا معاملہ، وہ ادب کی ایک بڑی شخصیت تھے، اس سبب سے ان کا آپ سب پر کچھ حق بنتا ہے۔ ان کو ان کا حق دینے میں بخل سے کام نہ لیں، اختلافات کا باب جتنی جلد بند ہو جائے، مناسب ہے۔

☆☆☆

۹؍جنوری ۶۸ء

برادرم، آپ کا شکوہ بجا، مگر کیا کروں کہ مجھے مصروفیت ☆[۱] اور علالت کچھ کرنے ہی نہیں دیتی۔ یقیناً میرا فرض تھا کہ میں آپ کی غزلوں کے بارے میں آپ کو تفصیل سے مطلع کر دیتا۔ معذرت خواہ ہوں۔

آپ کی ایک غزل ''مشین ہو گئے سب یار'' اب کے ''فنون'' میں شامل ہے۔ آئندہ کے لیے مزید غزلیں بھجوائیے۔ ان شاء اللہ باقاعدگی سے درج ہوتی رہیں گی مگر مجھے انتخاب ☆[۲] کا حق تو آپ یقیناً دیں گے۔

مخلص

احمد ندیم

۲۳؍جنوری ۶۸ء

برادر عزیز، کرم فرمائی کا شکریہ۔

میرے خیال میں مجھے آپ کا ایسا کوئی خط نہیں ملا جس میں ڈاکٹر عاشق حسین کے متذکرہ مقالے کے بارے میں استفسار تھا۔ ویسے یہ مقالہ ہنوز شائع نہیں ہوا اور ڈاکٹر صاحب آج کل لندن میں ہیں۔

''اختلافات'' کے لیے آپ کی تحریر ملی۔ افسوس کہ تاخیر سے ملی، ورنہ اسی شمارے میں شامل کر لی جاتی۔ اس موضوع پر اب کے دو ایک خطوط درج ہیں۔ ویسے میں نے آپ کی تحریر کو آئندہ کے لیے رکھ لیا ہے، البتہ اجازت دیجیے کہ جہاں آپ ذرا ''شدید'' ☆[۳] ہو گئے ہیں، وہ حصے نرم کر دوں۔

مخلص

ندیم

۲۵؍تاریخ کو جواب روانہ کیا گیا ہے، ''بیاد اقبال'' کی ایک جلد علاحدہ روانہ کی گئی۔

—— عبداللہ جاوید

۳۰؍جولائی ۶۸ء

برادرم، تسلیم

مجھے آپ کی نظم ''ویت نام'' تو مل گئی تھی، مگر معاف کیجیے گا، وہ کچھ ایسی براہِ راست قسم کی تھی کہ میں نے اس کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھا۔

☆۱۔ ان کی زندگی کے دو محور تھے، مصروفیت اور علالت۔ مصروفیت کو انھوں نے تادمِ آخر نہیں چھوڑا اور علالت نے ان کو۔

☆۲۔ انتخاب کے حق سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ انتخاب کرنے کے لیے خود پڑھنے کی زحمت اٹھاتے رہے، تا عمر۔

☆۳۔ وہ یہ چاہتے رہے کہ اختلاف کے اظہار کا لہجہ نرم ہو، اس ضمن میں اکثر اوقات مجھے ان سے اختلاف رہا۔ بعض اوقات زیادہ نرمی سے ابلاغ غیر واضح ہو کر مجروح ہو جاتا ہے۔

آپ میری خاموشی سے کوئی غلط مفہوم اخذ نہ کیا کیجیے۔ میرے دل میں آپ کے خلوص کی بڑی قدر ہے۔

غزل نمبر کا دعوت نامہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ اپنی غزلوں کا بہترین انتخاب کریں گے۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے بارے میں اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو ضرور کہیے۔ مگر یہ امر پیش نظر رہے کہ اس وقت ڈاکٹر خورشید الاسلام[☆] اردو تنقید کی فصیل میں ایک زندگی بخش تازہ جھونکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علمی مباحث سے انھیں یقیناً خوشی ہوگی مگر انھیں خواہ مخواہ کی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

مخلص

احمد ندیم

۲۲ر جولائی ۶۹ء

برادرم، تسلیم

کرم فرمائی کا دلی شکریہ۔ نظم اچھی ہے، یہ ان شاء اللہ ''فنون'' میں شامل ہوگی۔ آپ کی کتاب کا اشتہار بھی آئندہ اشاعت میں درج کروں گا۔ اطمینان رکھیے۔

سالنامہ ''غالب نمبر'' پر تبصرے کا دلی شکریہ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مولانا مہر[☆۵] سید علی عباس[☆۶] اور مظفر علی سید کے مقالات پر اظہار رائے کے سلسلے میں آپ نے شدت پسندی برتی ہے۔ دیکھیے مولانا مہر ۷۵ برس کے نقاد ہیں اور انھیں قدیم انداز تنقید کے مطابق ہی لکھنا پڑتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ غالب کے بحر سخن میں سے کیسے کیسے موتی تلاش کر کے لے آئے ہیں۔ ہماری نئی پود کی شدید ضرورت سخن فہمی کی ہے اور یہ اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سید علی عباس ہمارے نقادوں میں بے حد پڑھے لکھے اور بے حد ستھرے ذوق کے بزرگ ہیں۔ ان کا مقالے میں ''دور کی کوڑی لانے'' کی کوشش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ تو ایک ایک لفظ کی ذمے داری قبول کرنے والے اہل قلم میں شامل ہیں۔ مظفر علی سید[☆۷] کے نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن ہے مگر آپ ان کے تبحر پر شبہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح سجاد باقر رضوی[☆۸] پر فقرے بازی اور لفاظی کا الزام بھی میرے لیے حیران کن ہے۔ میری رائے میں انھوں نے اختصار کے ساتھ غالب

☆۴۔ ندیم صاحب شخصیت پرستی میں کبھی کبھی غلو کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ مدیران جرائد اپنے اختلافی نوٹ کے ساتھ تحریروں کی اشاعت کی روایت قریب قریب ترک کر چکے ہیں۔

☆۵۔ میری یہ مجال کہ مولانا مہر سے گستاخی روا رکھتا لیکن ندیم صاحب کو میرا کچھ لکھنا ہی برا لگا۔

☆۶۔ سید علی عباس کی علمیت سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے لیکن کیا ایک پڑھا لکھا آدمی ''دور کی کوڑی'' نہیں لا سکتا۔

☆۷۔ مظفر علی سید صاحب کا علمی تبحر اپنی جگہ اور ان کا غیر منطقی نقطۂ نظر اپنی جگہ۔

☆۸۔ میں کیا کرتا، سجاد باقر رضوی کے مقالے میں اور تھا ہی کیا۔ ان کو بھی مقدس گائے بنالینا ندیم صاحب کی وسیع القلبی تھی۔

کے مطالعے کا تاثر بیان کر دیا ہے۔ بہرحال، میں جانتا ہوں کہ آپ کی رائے خلوص نیت پر مبنی ہے، اس لیے آپ کا ممنون ہوں ــــ دعاؤں کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

۲۱ر مارچ ۷۰ء

برادر عزیز، محبت

کرم نامہ ملا، شکریہ۔ نظمیں[9] عمدہ ہیں مگر ان میں عقائد پارینہ پر جو واضح طنز ہے، اس نے سوچ میں ڈال دیا ہے۔ آج کل کے حالات کا آپ کو علم اور اندازہ ہے۔ بہرحال، ان کے بارے میں فی الحال سوچتا ہوں اور غزل مئی کے شمارے میں درج کر رہا ہوں (اپریل کا شمارہ پرسوں سے پریس میں ہے)۔

آپ جس خلوص سے مجھے مخاطب کرتے ہیں، اس سے بہت متاثر ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

ان دنوں چار طرف سے مجھ پر حملوں[10] کی بھرمار ہے۔ جماعتِ اسلامی کے ''زندگی'' اور ''ندائے ملت'' اور اُدھر ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا رسالہ ''اردو زبان'' اور اس کے ''انور سدید'' جو مجھ پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے میں نے ان کی فصل میں اپنا گھوڑا چھوڑ رکھا ہے۔ شاید انھی حالات کے تحت میں نے ایک تازہ غزل میں یہ شعر کہا ہے:

حق بات پوچھنے کو نکیرین آئے ہیں
سچ بولنے کا مل تو چکا ہے صلہ مجھے

''موجِ صد رنگ''[11] مجھے آپ کی طرف سے بھی موصول ہوئی تھی۔ نادم ہوں کہ اب تک ریویو نہیں کرا سکا۔ کوئی مناسب شعر شناس نہیں مل رہا ہے۔ بہرحال یہ فرض پورا کروں گا۔

مخلص

احمد ندیم

۲۳ر اپریل ۷۰ء

برادر عزیز، تسلیم

کرم فرمائی کا شکریہ۔ آپ کے خط کا وہ حصہ ''اختلافات'' میں درج کر رہا ہوں جو ''فنون'' کے

☆۹۔ وہ نظمیں شائع ہونے سے رہ گئیں۔ ندیم صاحب نے شاید میرا بھی خیال رکھا تھا۔

☆۱۰۔ یہاں ندیم صاحب نے معجزانہ انکسار کے ساتھ زندگی کے ایک اذیت ناک مرحلے کی جانب اشارہ کیا ہے جو بھی طے نہ ہوا۔

☆۱۱۔ ''موجِ صد رنگ'' میرا اوّلین شعری مجموعہ ۱۹۶۹ء۔

اپریل کے شمارے پر تنقیدی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی رائے بہت جچی تلی ہے۔

نظم اور غزل دونوں عمدہ ہیں۔ "فنون"[☆۱۲] کے لیے رکھ لی ہیں۔ البتہ غزل کے دو اشعار خارج کر دیے ہیں (آپ نے مجھے یہ اجازت دے رکھی ہے)۔

۱۔ دوست ملنا نہ تھا، ملنا نہ تھا، تیرا ملنا

۲۔ راہ تو جانتے ہم بھی تھے مگر راہ نما

آپ کی غزل میں تین تبدیلیاں بھی ضروری ہیں۔ اس کی اجازت درکار ہے۔

۱۔ موت برحق ہے، نہ ہوتی تو بھی مر جاتا تھا

"تی تو بھی" کے بارے آزاد کرنے کے لیے یوں ہونا چاہیے:

موت برحق ہے، نہ ہوتی بھی تو مر جاتا تھا

۲۔ اس کو روکا؟ ارے نادان وہ رکتا کیسے

وقت کے ساتھ تھا وہ وقت کو ٹھہراتا تھا

اچھا ہے مگر یوں ہو جائے تو کیسا رہے؟

اس کو روکا؟ ارے نادان وہ رکتا کیسے

وقت کے ساتھ تھا، کیا وقت کو ٹھہراتا تھا

۳۔ "رات بھر رات" والے شعر کے دوسرے مصرعے میں آپ نے "رات کے رات" استعمال کیا ہے۔ کیا اسے "رات کی رات" نہیں ہونا چاہیے؟

محبت کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

۲۴ر اگست ۷۱ء

برادر عزیز و مکرم، تسلیم

آپ کی علالت سے سخت تشویش ہے۔ حیدرآباد[☆۱۳] میں آپ کو دیکھا تھا تو آپ ماشاءاللہ بہت صحت مند نظر آئے تھے۔ اب مسلسل آپ کی بیماری کی اطلاع ملتی ہے تو حیران اور دکھی ہوتا ہوں۔ آپ کے لیے دست بدعا ہوں اور آپ کی مکمل صحت کے مژدے کا منتظر ہوں۔

☆۱۲۔ ندیم صاحب نے میرے اشعار کی صحیح گرفت کی ہے۔

☆۱۳۔ حیدرآباد میں "یوم اقبال" کے ایک مذاکرے میں ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ حسن اتفاق کہ ہم دونوں نے ایک ہی موضوع پر مقالے پڑھے۔

''فنون'' آپ کی خدمت میں باقاعدگی سے جا رہا ہے۔[۱۴] اگر نہیں مل رہا تو ڈاک والوں کی گڑبڑ ہے۔

مخلص
احمد ندیم

---

۳۰ ستمبر ۷۱ء

برادرِ عزیز، شکر ہے کہ آپ کی صحت سنبھل رہی ہے۔ اس رفتار کو برقرار رکھنے کی کوشش کیجیے اور معالجوں کی ہدایات پر سختی سے عمل کیجیے۔

جواب میں تاخیر ستمبر کے مہینے میں لاہور سے باہر بعض ادبی تقریبوں میں مسلسل شرکت کی وجہ سے ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔

جابر صاحب کا مضمون[۱۵] میں نے محض تکلف میں چھاپ دیا۔ ان کا لہجہ میرے سلسلے میں واضح طور پر معذرتی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ شبہ کریں کہ مجھے اس مضمون میں دبایا گیا ہے، اس لیے میں اس کی اشاعت سے انکار کر رہا ہوں۔ یہ مضمون پڑھ کر بیشتر باشعور احباب، آپ کی طرح حیرت زدہ رہ گئے کہ میں نے اسے کیوں چھاپا! بہرحال، اگر آپ شاعری اور دلیل و منطق کے رشتوں پر کچھ لکھ رہے ہیں تو اسے ''فنون'' میں درج کر کے مجھے خوشی ہوگی۔

وزیر آغا صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں مگر حیرت ہے کہ ادھر ان کے فن یا ان کے نظریات سے کوئی اختلاف کرتا ہے، اُدھر ان کی افواجِ قاہرہ چار طرف سے حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں انور سدید وغیرہم نے جو گالیاں دی ہیں، ان کا تو آپ کو علم ہوگا۔ اس فضا میں سچی بات کہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔[۱۶]

آپ کی دو مختصر نظمیں تازہ شمارے میں آ رہی ہیں۔ دو تازہ چیزیں بھی مل گئیں، بہت اچھی ہیں۔ صرف ''اے رات'' کے ٹکڑے میں ''اے'' کی جگہ ''ے'' دب جانے سے پریشانی ہے۔ صرف ''ا'' باقی رہ جاتا ہے۔ اس کا کوئی بندوبست کیجیے۔ آپ کی صحتِ کامل کی دعا کے ساتھ۔

مخلص
احمد ندیم

---

[۱۴] قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سب مدیرانِ جرائد نے پرچے بھجوانے ترک کر دیے تھے لیکن ''فنون'' ملتا رہا اور ندیم صاحب پرسش حال کرتے رہے۔

[۱۵] اس زمانے میں شاید ہی کوئی مدیر جدید شاعر اپنی شاعری پر اس نوع کا مضمون شائع کرے۔

[۱۶] یہاں ڈاکٹر وزیر آغا کے پڑھے لکھے آدمی ہونے کا اعتراف بھی ہے اور ان کی افواجِ قاہرہ کا ذکر بھی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا بطورِ خاص تذکرہ ہے۔ ''دشنام طرازی'' روا رکھنے کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

۸؍جنوری ۷۶ء

برادرِ مکرم، السلام علیکم

کیا میں نے آپ کو "لسانی تشکیلات"[۱۷] کی رسید نہیں بھجوائی تھی؟ نہیں بھجوائی تو میں نے بڑا ستم کیا۔ بہت شرمندہ ہوں۔ مضمون مل گیا تھا۔ عمدہ مضمون ہے مگر بہت طویل ہے۔ کوٹے کی پابندی نے پرچے کو محدود کر دیا ہے۔ بہتر دنوں کے انتظار میں ہوں۔ جوں ہی کاغذ عام ہوا اور پرچے کی ضخامت میں اضافہ ہوا، یہ مقالہ ضرور درج ہوگا۔

آپ کے مرسلہ نوٹ آئندہ "فنون" میں درج کر رہا ہوں۔

آپ نے اپنی صحت کے بارے میں نہیں لکھا۔ دعا ہے اب آپ مکمل طور پر تندرست ہوں۔

مخلص

ندیم

۲۳؍اکتوبر ۷۶ء

محبِ مکرم، سلامِ شوق

شکر ہے عید کارڈ کے ذریعے آپ کا پتا معلوم ہوا۔ میں تو حیران تھا کہ آپ کہاں ہیں۔ پھر میں بھی اپنی بیٹیوں کی شادیوں کے فرائض میں مصروف رہا اور اُدھر کراچی کی طرف جانا ہی نہیں ہوا۔ خدا کرے آپ علالت کے چنگل سے نکل چکے ہوں اور پوری طرح صحت مند ہوں۔ آپ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟ کہاں ہیں؟ اور کیا یہ آپ کا مستقل پتا ہے؟[۱۸]

دعاؤں کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم

۱۵؍جولائی ۷۸ء

برادرم، سلامِ مسنون

رجسٹرڈ خط ملا تھا مگر رسید بھجوانے میں کوتاہی ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔ کچھ بیمار،[۱۹] کچھ

۱۷۔ میرا متذکرہ مضمون اپنی طوالت کی بنا پر "فنون" میں جگہ نہ پا سکا یا شاید اس کا قصور یہ تھا کہ اس میں ندیم صاحب کی شاعری پر بھی (قدرے مثبت انداز میں) بات کی گئی تھی۔ "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔

۱۸۔ اس خط میں ندیم صاحب کی صاحب زادیوں کی شادیوں کا صرف برسبیل تذکرہ ذکر ہے۔

۱۹۔ "کچھ بیمار، کچھ پریشان، کچھ مصروف۔" ندیم صاحب کے قبل ازیں دو محور مذکور ہوئے تھے۔ علالت اور مصروفیت، پریشانیوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن آپ نے دیکھا ان کی زندگی میں یہ تیسرا محور بھی ہمہ وقت موجود رہا۔

پریشان، کچھ مصروف رہا، افسانہ ذرا طویل ہے، اس لیے آئندہ کے لیے رکھ لیا ہے۔ غزلیں بھی ساتھ ہی ملیں۔ ان شاء اللہ درج ہوتی رہیں گی۔

احبابِ کراچی کی عافیت کے سلسلے میں سخت تشویش ہے۔ اس عروس البلاد کو کس کی نظر کھا گئی۔[۲۰☆]

آپ کی صحت کی دعا کے ساتھ۔

مخلص

ندیم

۲۴ر اپریل ۸۸ء

برادر عزیز و مکرم، محبت نامہ ملا، بے حد ممنون ہوں۔ میں نے عالی صاحب کا کالم تو اس ہڑبونگ کے حوالے سے پڑھا تھا۔ نہایت محبت سے لکھا گیا تھا مگر انور سدید اور مجاہد بریلوی کے مراسلات نظر سے نہیں گزرے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان دو مراسلوں کی فوٹو اسٹیٹ مجھے مل جائے؟ اور اگر آپ کا جوابی مراسلہ بھی شائع ہو گیا ہو تو وہ بھی۔[۲۱☆]

افسانے بھی مل گئے اور غزلیں بھی۔ آپ نے تو مجھے ایک دم بہت امیر بنا دیا۔

دعا اور محبت کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

۷ر دسمبر ۱۹۸۹ء

برادر مکرم، سلام مسنون

تاخیر سے جواب عرض کرنے کی معذرت۔ بے حد مجبور رہا۔ کاش آپ کا یہ نوازش نامہ وسط نومبر سے پہلے مل جاتا تو میں مرسلہ چیزوں میں سے چند ایک کو تو تازہ شمارے میں شامل کر لیتا۔ یہ شمارہ مرتب ہو چکا تھا۔ کاپیاں پریس پہنچ چکی تھیں۔ بس کاغذ خریدنے کا مرحلہ تھا اور یہی مرحلہ میرے لیے قیامت ہوتا ہے۔ بہرحال ہفتہ بھر میں بندوبست کر لیا ہے اور اب پرچہ ہفتہ بھر بعد پوسٹ ہوگا۔ مرسلہ عنایات کو آئندہ شمارے میں شامل کروں گا۔

☆۲۰۔ آشوبِ کراچی کا ذکر۔ کراچی اور اہلِ کراچی کے لیے ان کی تشویش۔ ''مشرقی پاکستان'' کے سلسلے میں بھی وہ بہت تڑپتے تھے۔

☆۲۱۔ انور سدید صاحب کا مذکورہ مراسلہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ مجاہد بریلوی صاحب کا خط روزنامہ ''جنگ'' میں پڑھا اور عالی جی کا کالم بھی۔ موصوف نے ندیم صاحب کا کامیاب دفاع کیا تھا۔ مجاہد بریلوی صاحب ندیم صاحب کے بارے میں صریح غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ان کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن پتھر ان کے ہاتھ میں بھی تھا۔

شعری مجموعہ اور تنقیدی مضامین یقیناً کتابی صورت میں شائع کیجیے۔ میں کیا اعانت کر سکتا ہوں۔ دیکھیے مکتبہ فنون تو میری غیر کاروباری طبیعت کی وجہ سے فلاپ ہو گیا۔☆۲۲ دوسری ناشرین مصنفین سے رقوم اینٹھ کر ان کے مجموعے چھاپتے ہیں۔ بزنس ہر طرف مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔ وہاں کسی ناشر سے بات کیجیے کہ وہاں سے بھی تو اچھی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

دعا ہے آپ بخیریت ہوں۔

مخلص

احمد ندیم

۹ر دسمبر ۸۹ء

برادرم، ابھی دو روز پہلے ایک عریضہ لکھا تھا۔ آج آپ کے کلام کو کاتب کے حوالے کر رہا تھا۔ نعت☆۲۳ میں ایک مقام پر آپ نے لکھا ہے

کسب زر کے ذریعوں کو

چند خاص ہاتھوں کی

''ذریعوں'' کا لفظ آپ کی منتخبہ بحر میں نہیں سما رہا۔ ذرا غور فرمائیے، پھر مجھے لکھیے۔

آپ کا خیر اندیش

احمد ندیم

(۵ر اپریل ۱۹۹۰ء)

برادرم، سلام مسنون

''اختلافات'' بر وقت مل گئے تھے۔ ہر اشاعت کے بعد مجھے آپ کے تاثرات کا بطور خاص انتظار رہتا ہے کیوں کہ اس میں آپ کا حسن ذوق اور وسعت مطالعہ جس شان سے جھلکتے ہیں، اس سے تحریر بہت بھرپور ہو جاتی ہے۔ پرچہ پھر طول کھینچ گیا ہے۔ ضخیم شمارے مرتب کرنے کی ایسی لت پڑی ہے کہ اب مختصر شمارہ قارئین کی طرح خود مجھے بھی نہیں جچتا۔ بہرحال، آپ کی متعدد نگارشات آنے والے شمارے کی زینت ہیں۔

کراچی میں آپ لوگوں کو جس کرب مسلسل کا سامنا ہے، اس کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ کیا

☆۲۲۔ یہاں ندیم صاحب اپنی غیر کاروباری طبیعت کا ذکر کر رہے ہیں۔ (صورت حال تو یہ ہے کہ تخلیق ادب ایک ''غیر پیداواری مصروفیت'' ٹھہرا دی گئی ہے) ہمارا خیال ہے منصورہ احمد نے اس کمزوری کا ازالہ کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ ندیم صاحب کی زندگی میں ان کے دخل کا ایک زاویہ یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا پتا یہی اصل محرک ہو؟

☆۲۳۔ ندیم صاحب نے اس نعت کو کتابت شائع کیا۔ وہ انا پرست نہ تھے۔

خوب صورت کاسموپولیٹن شہر تھا کراچی! جانے کس کی نظر کھا گئی۔ اللہ تعالیٰ سب کو راہِ راست دکھائے اور اس ملک کی بنیادیں کھدنے سے محفوظ رہیں۔☆۴۴

آپ کا

احمد ندیم

۲۰ر ستمبر ۹۱ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کے اس کرم نامے کا تو لطف آ گیا۔ آپ نے مجھے اتنی محبت سے یاد کیا ہے کہ سرشار ہو گیا۔ میری صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ شدید گرمی کی وجہ سے ذرا سی کمزوری ہو گئی تھی مگر اب موسم بدل رہا ہے، سو تندرست ہو جاؤں گا۔ میں نے زندگی بھر محنت کی ہے اور اس طویل محنت☆۴۵ کے لیے مجھے تو انائی آپ کے سے پیارے دوستوں کے خلوص سے حاصل ہوئی ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

''فنون'' ہفتے عشرے میں آ رہا ہے۔

مخلص

احمد ندیم

۲۰ر نومبر ۹۳ء

محترم و مکرم، آپ ایک مدت سے خاموش ہیں۔ خیریت سے تو ہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند رکھے۔ دراصل ایک بار آپ پر قلب کا حملہ ہو چکا ہے، اس لیے تشویش محسوس کر رہا ہوں۔ ممکن ہو تو اپنی خیریت سے مطلع کیجیے۔

''فنون'' کا دفتر پھر بدلنا پڑ رہا ہے،☆۴۶ اس لیے مجلس ہی کے پتے پر جواب دیجیے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا، میں اس ادارے کا ناظم ہوں۔

دعا کے ساتھ

مخلص

احمد ندیم

☆۴۴۔ اس خط میں ندیم صاحب آشوب کراچی کے آئینے میں پاکستان کی بنیادوں کو غیر محفوظ دیکھ رہے ہیں اور دست بدعا ہیں۔

☆۴۵۔ ندیم صاحب نے زندگی کس عیش میں گزاری ہے، اس کی جانب اشارہ ہے۔

☆۴۶۔ فنون کی خانہ بدوشی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے ملک میں ادبی جرائد پر کیسی ''غربت'' طاری رہتی ہے۔

۱۵ر نومبر ۹۵ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

یاد آوری کا شکریہ۔ ممتاز مفتی[حاشیہ ۲] کی "الکھ نگری" پر مضمون کہیں تو بھجوائیے گا، دل چسپ ہوگا۔ مرحوم عمر بھر مجھے کسی وجہ کے بغیر برا بھلا کہتے رہے مگر انتقال سے چند برس پہلے معافی نامہ لکھ بھیجا۔ تب ہماری خط کتابت بھی شروع ہو گئی اور ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ ان کے جانے کا افسوس ہے۔

پروین کے بارے میں مضمون کا شکریہ۔

"فنون" کے حالات (ظاہر ہے مالی حالات) نہایت درجہ خراب ہو چکے ہیں۔ اسی لیے سالِ رواں کا ایک ہی شمارہ شائع ہو پایا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تینتیس برس پرانے اس مجلے کو کیسے جاری رکھوں۔ آپ نے نمبر ۴۵ کا مختصر "حرفِ اول" پڑھا ہوگا۔

خدا کرے آپ کی آنکھیں اب ٹھیک ہوں۔ اس سلسلے میں پریشان ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔

مخلص

ندیم

۲۲ر جولائی ۹۶ء

برادرِ مکرم، خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ آپ کی طرف سے خط آنے میں اتنی تاخیر کبھی نہیں ہوئی۔ اس لیے آپ کی صحت کی طرف سے فکر مند ہوں۔ مطلع فرمائیے۔

"فنون" نمبر ۴۶ ملا ہوگا۔ نہایت محدود کرنا پڑا اور یوں آپ کے مضمون کے علاوہ کئی اچھے اچھے مضامین اور نوٹ روکنے پڑے۔ اگر صرف پروین بٹی کے بارے میں مضامین جمع ہو جاتے تو محشر کے سے عمدہ شاعر اور ظہیر وغیرہ کے ساتھ بے انصافی ہوتی۔ آپ سے بطورِ خاص معذرت خواہ ہوں۔

"فنون" کو آج کل شدید مالی بحران کا سامنا ہے۔ کاغذ کی گرانی ہوش رُبا ہے اور اس پر مستزاد پوسٹل کارپوریشن کی من مانیاں کہ جب ہم "فنون" کا ایک پرچہ امریکا بھجواتے ہیں تو پونے چار سو روپے کا پوسٹیج خرچ ہوتا ہے۔ یوں "فنون" کی صرف ترسیل پر ۲۲، ۲۳ ہزار اٹھ جاتے ہیں۔ اشتہاروں کا عالم ویسے ہی پتلا ہے۔ جو چھپتے ہیں، ان کے بل اول تو ادا نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو اتنی تاخیر سے کہ پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ بار بار ذہن پر دباؤ پڑتا ہے کہ رسالہ بند کر دوں مگر پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی اولاد کا گلا کاٹنے کی سوچ رہا ہوں۔ یوں ایک تکلیف دہ گومگو کا سامنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "فنون" اتنے لمبے

حاشیہ ۲۔ ممتاز مفتی کی اعلیٰ ظرفی تھی ورنہ یار لوگ تو عمر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ معافی مانگنا تو 'انا' کا مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ممتاز مفتی اردو کے 'خاص آدمی' ہیں۔ اگر بقول کے انھوں نے بیچ چوک میں بیٹھ کر پوتڑے دھوئے تو یہ ان کی ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ تھی۔ وہ ہمارے ادیبوں میں 'مجذوب' ادیب تھے۔

وقفوں کے بعد آپاتا ہے جب کہ دفتر اور وہاں کے دو تین ملازمین کا ماہانہ خرچ الگ بوجھ ہے۔[۲۸☆]

آپ سے دیرینہ تعلق ہے، اس لیے درد دل کا اظہار کر دیا ورنہ ۳۳ برس سے شائع ہونے والے رسالے کو بند کر دینے کی سوچنا بھی کرب ناک ہے۔

آپ کا دعا گو

احمد ندیم

۲ر ستمبر ۹۶ء

برادرِ عزیز

آپ کی طرف سے اتنی طویل[۲۹☆] خاموشی کا تجربہ ہی نہیں ہوا، اس لیے آپ کے سلسلے میں نہایت پریشان اور متشوش ہوں۔ کیا آپ اپنی خیریت سے مطلع کر سکیں گے؟

خیر اندیش

احمد ندیم

۱۲ر اکتوبر ۹۶ء

برادرِ عزیز و مکرم!

میں تو آپ کی صحت[۳۰☆] کی طرف سے فکر مند تھا کہ میری طرف سے تو کوتاہی ہو جاتی ہے مگر آپ ہمیشہ نہایت محبت اور باقاعدگی کے ساتھ یاد رکھتے ہیں۔ آپ کے گرامی نامے سے معلوم ہوا کہ آپ کینیڈا اور امریکا کے سفر پر تھے۔ وہاں سے مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ شاید کہیں کھو گیا۔ آپ نے اچھا کیا کہ غیر ممالک سے ہو آئے۔

آپ کی تندرستی کے لیے دعا گو ہوں۔

مخلص

احمد ندیم

☆۲۸۔ ادبی جریدے کو چلانا مشکل ہے اور بند کرنا سوا مشکل ہے۔ ''اولاد کا گلا کاٹنا'' کتنا اذیت ناک استعارہ ہے۔ میرے اللہ! کتنے جرائد کو بند ہوتے دیکھا ہے لیکن محض قاری کے طور پر۔ تو یہ ہوتا ہے رسالے کا بند ہونا۔ ندیم صاحب کو یہ دن دیکھنا نہیں پڑا۔ اس سے قبل وہ خود بند ہو گئے۔

☆۲۹۔ اس خط کو محض اس فقرے کی خاطر شامل کیا ہے۔

☆۳۰۔ وہ اپنی صحت سے زیادہ دوسروں کی صحت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔

۱۹/ اپریل ۹۷ء

برادرِ عزیز و مکرم

محبت نامہ ملا۔ آپ سے 'روٹھنے' کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان سے روٹھنا، موت کو دعوت دینے کے برابر ہے جن کے خلوص اور محبت پہ اعتماد ہوتا ہے۔ آپ مجھے ہر حال میں عزیز ہیں۔ میں آپ سے کیوں روٹھوں، یوں سمجھیے کہ افتادِ زمانہ نے گلا دبا رکھا ہے۔ ''فنون'' سے مجھے اپنی اولاد کی سی محبت ہے مگر مالی بدحالی نے حالات دگرگوں کر رکھے ہیں۔ کاغذ نہایت مہنگا ہے۔ صرف پوسٹیج پر تین ہزار خرچ ہو جاتے ہیں۔ چھوٹا سا دفتر بھی ہے جس کا کرایہ اور اس میں بیٹھنے والے اہلِ کاروں کے مشاہروں کا بندوبست بھی کرنا ہوتا ہے۔ ماضی میں میری مشاعرے بازی اور کالم نویسی یہ بوجھ سہار لیتی تھی۔[۳۱] اب مشاعروں میں شرکت کرنا دشوار محسوس ہوتا ہے اور کالم نویسی بھی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اشتہاروں کا عالم آپ دیکھتے ہوں گے۔ سب عارضی ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی تین چار کینسل ہو گئے ہیں۔ سرکاری اشتہارات ملتے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''فنون'' کی اشاعت میں طویل وقفے پیدا ہونے لگے ہیں۔ خدا خدا کر کے اب ایک شمارہ نکالنے کی سبیل پیدا ہوئی ہے۔ چناں چہ مئی میں یہ شمارہ آ رہا ہے۔ میرے لیے دعا کیا کریں۔ میں اب اسّی برس سے اوپر کا ہو رہا ہوں اور اگرچہ روزمرہ کے سب کام حسبِ سابق انجام دے رہا ہوں مگر اب تھک جاتا ہوں۔ البتہ میں اپنی زندگی میں ''فنون'' کی اشاعت بند کر دینے کی سوچوں بھی تو لرز جاتا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کیا کیجیے۔

آپ نے جن الفاظ میں میری تعریف کی ہے، ان کے قابل ہو کر دکھانے کا میرے پاس وقت نہیں بچا ہے۔ بہرحال محبت میں آپ کی حیرت انگیز استقامت میری بڑی توانائی ہے۔

کچھ اپنے بارے میں بھی لکھا کیجیے۔ اپنی صحت، اپنے مشاغل وغیرہ۔

دعاؤں کے ساتھ۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم

۸/ جولائی ۹۷ء

برادرِ عزیز و مکرم

یاد فرمائی کا شکریہ۔

☆۳۱۔ آپ نے دیکھا مشاعروں سے اور کالم نویسی سے جو کچھ مل جاتا تھا اس میں سے ''فنون'' کا پیٹ بھی بھرتے تھے۔ ان مشاغل میں کمی آئی تو ''فنون'' کا بوجھ اٹھانا مشکل تر ہو گیا۔ اگرچہ قدرے غیر متعلق ہے لیکن اس مرحلے پر احسان دانش کے اس خط کا خیال آ گیا جو مرحوم نے اپنی بیگم کو لکھا تھا۔ اس خط میں انھوں نے بیگم کو تسلی دلائی تھی کہ وہ فکرمند نہ ہوں۔ ایک مشاعرے کا دعوت نامہ آیا ہے، اس طرح ان کے کفن دفن کا خرچ نکل آئے گا۔

تازہ ''فنون'' اب تک مل چکا ہوگا۔ دو اشاعتوں میں طویل وقفوں کا سبب آپ پر واضح ہے۔ مشاعروں[۳۲] میں شرکت تو میں نے ایک حد تک ترک کر دی ہے کہ پاؤں میں تکلیف ہے اور میں دیر تک بیٹھ نہیں سکتا۔ کالم نگاری جاری ہے کہ کچھ یافت کی صورت نکل آتی ہے، ورنہ مجھے معلوم ہے کہ میرے ''مخالفین''[۳۳] میرے کالم پڑھتے ہی نہیں ہوں گے۔

امریکا سے ایک ہندو دوست نے مالی مدد کی اور میں پرچہ چھاپنے کے قابل ہو گیا۔[۳۴] میرا یہ دوست ادیب نہیں ہے۔ صرف اخلاص کی دولت لیے پھرتا ہے۔

آپ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ آپ اپنے متعدد فرائض ادا کر چکے ہیں اور جو دو ایک باقی ہیں، انھیں نبھانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اب گرمی کا زور دو ماہ بعد کم ہو جائے گا۔ تب آپ سے آپ کے تازہ کلام کی فرمائش کروں گا۔

دعا اور محبت کے ساتھ۔

مخلص

احمد ندیم

۲۳ر مارچ ۹۸ء

برادرِ عزیز و مکرم

گزشتہ عید پر تہنیت نامہ ملا تھا۔ بے حد خوب صورت تھا مگر آپ نے ''جناب پیرزادہ سید شاہ احمد ندیم قاسمی صاحب'' کے الفاظ لکھ کر مجھے چکرا ڈالا کہ میرے نام کے ساتھ ''پیرزادہ''[۳۵] کا لفظ تو آج سے نصف صدی قبل بعض مدیرانِ رسالہ لگا دیتے تھے۔ ''سید'' میں نہیں ہوں۔

اگر میرا ابتدائی نام ''احمد شاہ'' تھا تو اس کا سبب پیروں کے خانوادے سے تعلق تھا۔ میں نے شاہ کا لفظ اسی لیے ہٹا کر ''احمد ندیم قاسمی'' کا نام اختیار کیا کہ لوگ مجھے ''سید'' نہ سمجھ بیٹھیں۔ قاسمی کے لاحقے نے بھی پریشان رکھا کہ دارالعلوم دیوبند سے اس مضمون کے خط آنے لگے تھے کہ ہمارے دارالعلوم کا ایک فارغ التحصیل شخص مشہور ادبی شخصیت ہے (وہاں کے فارغ التحصیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وجہ سے قاسمی کہلاتے ہیں)۔ سو آپ کے خط میں اتنا طویل و عریض نام دیکھ کر آپ سے یہ پوچھنے کو جی چاہا تھا کہ

☆۳۲۔ پاؤں کی تکلیف کا ذکر۔

☆۳۳۔ کالم نگاری کا دکھ۔

☆۳۴۔ مولا کارساز ہیں۔

☆۳۵۔ ہمارے ندیم صاحب کسی زمانے میں پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی کہلاتے تھے۔ اصل نام نامی ''احمد شاہ'' تھا۔ پیروں کے خانوادے سے دامن بچایا تو دیوبندی مولویوں سے جڑ گئے۔

آپ خیریت سے تو ہیں! مگر پھر سوچا کہ وفورِ محبت میں آپ نے مجھے اتنے بہت سے خطابات سے نوازا ہوگا۔

آپ کا بہت سا کلام "سیپ" میں دیکھا اور خوشی ہوئی کہ آپ ماشاءاللہ ذہنی اور وجدانی طور پر active ہیں۔ آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم

۵ر اپریل ۹۸ء

محبِ مکرم

گرامی نامہ، عید کارڈ کی صورت میں ملا۔ نہیں میرے بھائی، اپنے "لمبے چوڑے نام"[☆۳۶] کا ذکر میں نے محض دل لگی کے لیے کیا تھا، ورنہ مجھے آپ کے خلوصِ نیت، آپ کی محبت پر کیسے شبہ ہوسکتا ہے۔ آپ کی طرف سے وہ القاب کسی پہلو سے بھی بارِ خاطر نہیں ہوا۔ مطمئن رہیے۔

اپنی صحت کے بارے میں آپ نے کبھی مطلع نہیں کیا۔ خدا کرے آپ پوری طرح صحت مند ہوں۔

"فنون" مرتب کر رہا ہوں مگر آپ نے اپنا سب کچھ دوسروں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس میں یہ کیسے عرض کروں کہ آپ اس شمارے میں سے غائب ہیں۔

دعا اور محبت۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم

۱۱ر مئی ۹۸ء

برادرِ عزیز و مکرم

سلامِ مسنون

خواجہ رضی حیدر کے بارے میں آپ کا مقالہ ملا۔ پرچے کی ترتیب کے آخری مراحل میں اس مضمون کی شمولیت دشوار ہے۔ آئندہ کے لیے محفوظ کرلیا ہے۔ آپ کی عنایت کا ممنون ہوں۔

میں پچھلے دنوں کچھ علیل رہا، اس لیے پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ تازہ شمارہ اس سال کا پہلا شمارہ ہوگا۔[☆۳۷]

☆۳۶۔ اس ضمن میں میری عذر خواہی کے جواب میں۔

☆۳۷۔ پرچے کی اشاعت کی تاخیر کا سبب مالی مشکلات کے علاوہ علالت۔

دعا ہے آپ مدتوں صحت مند رہیں۔

آپ کا
احمد ندیم

---

۲۴ دسمبر ۱۹۹۸ء

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا ۱۸ نومبر کا لکھا ہوا گرامی نامہ دو روز پہلے پڑھا۔ ۲۹ اکتوبر کو میں منصورہ بیٹی کے ہمراہ امریکا چلا گیا تھا اور وہاں کے آٹھ دس شہروں میں مشاعرے پڑھنے کے بعد واپسی ہوئی تھی۔ جواب میں مجبوراً تاخیر ہوئی، تاہم دلی معذرت۔

آپ نے ''طلوع'' پر مضمون کی صورت میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر تنقیدی میزان پر پورا اترے گا۔ اسے یقیناً ''سیپ'' کو بجھوا دیجیے۔ منصورہ آپ کی ممنون ہوگی اور میں بطور خاص شکرگزار ہوں گا۔

''اختلافات'' کے ضمن میں آپ نے جن اختلافات کا ذکر کیا ہے، وہ مجھے چند لمحوں کے لیے دم بخود کر گئے۔ میں نے سوچا کہ کیا عبداللہ جاوید صاحب کا سا وسیع المشرب اور وسیع المطالعہ فن کار بھی ایسا سوچ سکتا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ بعض جائز نکات سے قطع نظر، بیشتر مقامات پر آپ سے ایسی زیادتی سرزد ہوئی جس کی کم سے کم آپ سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

میرے لکھے ہوئے مقدمے پر سب سے پہلے لاہور کے بعض ''باشتیے'' معترض ہوئے تھے۔ اب میرے عزیز بھائی صاحب بھی اعتراض کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آخر مجھے بھی تو منصورہ کے فن پر کچھ کہنا تھا کہ وہ میرے ''فنون'' ہی کی پیداوار تھی۔ میں یہ دیباچہ بصورت مضمون کہاں چھپواتا۔ ذرا ادبی رسائل کی قطار پر نظر ڈالیے۔ کوئی بھی اس قابل نہیں تھا اور اگر کوئی تھا بھی، تو سال دو سال کا انتظار ممکن نہیں تھا۔ پھر اگر منصورہ میری بیٹی ہے تو مجھ سے حرفِ تحسین سننے کا حق کیسے کھو بیٹھتی ہے۔ اگر اس نے ''فنون'' کے انتظامات کو سنبھالنے اور رسالہ جاری رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ''فنون'' کی ترتیب کی بھی ذمے دار ہے۔ ''فنون'' صدفی صد میں مرتب کرتا ہوں اور کسی کو مداخلت کا حق نہیں دیتا۔ چناں چہ ''طلوع'' کے بارے میں لکھے گئے مضامین کو یک جا مرتب کرنے کا فیصلہ میرا اور صرف میرا ہے، مدیر منتظم کا نہیں۔ میں ''فنون'' کا مدیر ہوں مگر میں نے اپنے کئی حقوق پسِ پشت ڈال رکھے ہیں۔ شاعری ہو یا نثر، میں سب سے آخر میں درج ہوتا ہوں۔ پڑھنے والوں کے خطوط میں اگر میری تعریف ہوتی ہے تو میں اسے قلم زد کر دیتا ہوں۔ میرے بارے میں آپ کو شاید ہی کوئی مضمون ''فنون'' کے ۳۵ برس کے شماروں میں نظر آیا ہو۔ میری کتابوں تک پر تبصرے درج نہیں ہوتے۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ ان مضامین کو کہیں اور رسائل میں چھپنا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے آپ یہ سب نیک نیتی سے کہہ رہے ہیں مگر وہ کون سا رسالہ

ہے؟ جو منصورہ کے فن کے بارے میں حق بات کے اعلان کا متحمل ہو سکتا۔ آپ کو آج کے ادبی رسالوں اور ادبی حلقوں کی ذہنیتوں سے شاید کماحقہٗ آگاہی نہیں ہے۔ کتاب میرے نام معنون ہی مگر بیٹی نے یہ انتساب مجھ سے پوشیدہ رکھا۔ اس انتساب کا راز میرے دیباچے کی تحریر اور کمپوزنگ اور کتاب کی کاپیاں جڑنے پر کھلا اور اس مرحلے پر اسے بدلنا کتاب کی اشاعت میں مزید تاخیر کا سبب بنتا۔ ساتھ ہی اس دور بدذوقاں میں کون اتنی غیر جانب داری سے اعلان حق کر سکتا تھا۔

پذیرائی کے تحت جو تحریریں جمع ہیں (اور ابھی آدھی غیر مطبوعہ رکھی ہیں) وہ ۹۹.۹۹ فی صد بے ساختہ ہیں۔ ان میں سے کسی سے بھی "طلوع" پر لکھنے کی فرمائش نہیں کی گئی تھی۔ ممکن ہے، آرا کی حد تک میں نے کسی ایک آدھ دوست سے کہا بھی ہو مگر منصورہ نے تو اس سلسلے میں مسلسل خاموشی بلکہ درویشانہ بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ یہی تو حیرت انگیز بات ہے کہ جب سب کچھ اتنی بے ساختگی سے ہو رہا تھا تو مجھے یا بیٹی کو کسی سے فرمائش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اسلوب احمد انصاری صاحب اس وقت اردو کے واحد نقاد ہیں جن سے تنقید کا بھرم قائم ہے۔ وہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے صدر کی حیثیت میں ریٹائر ہوئے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ جو لوگ انھیں جانتے ہیں، یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلوب صاحب نے "طلوع" پر مضمون لکھا ہے، اور فرمائش کے بغیر لکھا ہے۔ اردو میں تنقیدی اصطلاحوں کی دردناک کمی ہے، اس لیے انھوں نے انگریزی اصطلاحات کا سہارا لیا ہے اور یہ بری بات نہیں ہے۔ ان اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنے کی ضرورت کو اجاگر کرنے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔

آپ اتنے اہم نقاد سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا انھوں نے کبھی کسی پرندے کو آمادۂ پرواز دیکھا بھی تھا؟ آپ کے سے مزاج کے فن کار کی طرف سے یہ سراسر زیادتی ہے۔ ضمناً میری ایک نظم "پابندی" کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل، چڑیا— اپنے پر تولتی ہے

آپ پوچھیں گے کہ کیا میں نے کبھی کسی چڑیا کو آندھی کے مقابل پر تولتے دیکھا بھی ہے؟ اگر پوچھیں گے تو زیادتی کریں گے۔

انتظار حسین، فتح محمد ملک اور آفتاب اقبال شمیم کی تحریروں کی پسندیدگی کا شکریہ، مگر الطاف فاطمہ پر اعتراض منصفانہ نہیں، کیوں کہ وہ نقاد نہیں ہیں۔ افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں اور وہ تنقید لکھیں گی تو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو چھپا کر نہیں لکھیں گی۔ اسے تاثراتی تنقید کہہ لیجیے۔

منو بھائی کی تحریر پر آپ کے اعتراض سے مجھے باقاعدہ دکھ پہنچا۔ آپ نے ان کی تحریر کو صریحاً زیادتی قرار دیا ہے جب کہ یہ صریح زیادتی آپ نے کر دی۔ یہ اخباری کالم تو پذیرائی کی بسم اللہ ثابت ہوا۔ میں نے ایک صبح اخبار میں یہ کالم پڑھا تو سرشار ہو گیا۔ بیٹی اس کالم سے بالکل لاعلم تھی، اس کے بعد دوسری

تحریریں وقتاً فوقتاً موصول ہونے لگیں۔

قیصر تمکین، عقیل روبی، شاہین مفتی، افتخار مغل، ریما خان، ادا جعفری اور پروین بخاری کے تنقیدی جملوں پر آپ کی تنقید پڑھ کر افسوس ہوا۔ نہ جانے آپ نے ان مضامین کا مطالعہ ذہن کی کس کیفیت میں کیا تھا۔ حق بات کا اعلان چاہے براہ راست ہو، چاہے گھما پھرا کر کیا گیا ہو، داد اور خیر مقدم کا مستحق ہوتا ہے۔ اور تنقید محض منفیت کے پرچار کو نہیں کہتے۔ خود آپ کا خوب صورت تنقیدی مضمون اثبات ہی اثبات ہے۔ پھر میرے عزیز بھائی، ان ''اختلافات'' کی کیا ضرورت تھی۔

محبت، پیار اور دعا کے ساتھ

آپ کا مخلص

احمد ندیم

۴ر جنوری ۹۹ء

برادرِ محترم و گرامی قدر

السلام علیکم

پہلے تندرستی و درازی عمر کی، مجیب الدعوات کی بارگاہ رحمت میں دعائیں، بعد میں تحریر سے نوازنے کا شکریہ۔ یہ شکایت اپنی جگہ کہ اب کی مرتبہ آپ نے ترسا ترسا دیا۔ ایک آدھ سطر سے بھی تسلی ہو جاتی ہے۔ وہ بھی دیکھنے کو نہ ملے تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ عزلت گزینی کے سبب عدیم الخبر رہتا ہوں ورنہ کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی آپ کی مصروفیات دستیاب رہتی ہیں۔

اختلافات کے ضمن میں آپ نے میرے خوب خوب لتے لیے ہیں، آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر۔ میں نادم ہوں، میری تحریر سے آپ کو دکھ ہوا۔ آپ سے دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔ پہلے آپ میری طرف سے ذہن اور دل صاف کر لیں اور پیار اور شفقت سے مسکرا دیں۔ بقول جوش:

آپ سے ہم سے رنج ہی کیسا
مسکرا دیجے صفائی ہے

پھر اس کی بھی اجازت عطا کریں کہ میں کچھ عرض کروں۔ آپ نے خود ہی یہ تحریر فرمایا ہے، ''میرے لکھے ہوئے مقدمے پر سب سے پہلے لاہور کے بعض 'بالشتیے' معترض ہوئے تھے، اب میرے عزیز بھائی صاحب بھی اعتراض کر رہے ہیں۔'' ہوا یہ کہ مجھے ان ''بالشتیوں'' کی تحریریں پڑھنے کو نہیں ملیں۔ البتہ مجھ سے گوشہ نشین تک بھی اعتراضات کی ایک گونج پہنچ گئی۔ ان ہی اعتراضات کو میں نے اختلافات کے تحت اپنے انداز میں، اپنی جانب سے، اپنی زبان میں پیش کیا۔ یہ بھی ہوا کہ لاہوری اعتراضات میں چند ایک کراچوی اعتراضات بھی لپیٹ لیے۔ آپ کو یہ بتانا ضروری ہو رہا ہے کہ آپ میری کمزوری ہیں۔ میں ذہن اور دل

سے یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ اردو کی ایک قد آور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ میں نے ابھی تک یہ بات محسوس کی ہے لیکن کہیں کہی یا لکھی نہیں کہ میں آپ کو حالی کا دوسرا جنم خیال کرتا ہوں۔ اور حالی کو میں شعر، تنقید اور شخصیت اور سیرت نگاری کا امام مانتا ہوں۔ حالی کی طرح آپ بھی مجھے رکھ رکھاؤ، احتیاط، انکسار اور نرمی کی تصویر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ان جذبات پر قدغن لگاتے ہوئے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جب ''فنون'' (جون جولائی اے۔) میں جابر علی سید کا مضمون چھپا تو میں نے آپ کی اجازت سے ''لسانی تشکیلات'' کے موضوع پر ایک مضمون محض اس لیے لکھا کہ میرے خیال میں جابر علی سید نے آپ کے دفاع میں جو کچھ لکھا، وہ آپ کے حق میں مفید نہیں تھا۔ آپ نے اپنے فطری انکسار اور احتیاط کی بنا پر میرے مضمون کو ''فنون'' میں جگہ دینے کی بجائے مدیر ''ادبی دنیا'' کے حوالے کیا۔ اسی طرح جب ''جنگ'' میں مجاہد بریلوی کا کالم آپ کے خلاف نظر سے گزرا تو میں نے اسی اخبار میں جواب دیا۔

اختلافات کے ضمن میں بھی جو کچھ لکھا ہے، اس کے عقب میں وہی 'نیت' کارفرما ہے۔ یاد رکھیے میں آپ کا بھائی ہی ہوں، ''برادر یوسف'' نہیں بصورت دیگر آسانی سے کسی دوسرے جریدے میں جو جی میں آئے چھپوا دیتا، آپ کو ارسال نہ کرتا — اسی طرح اگر میں منصورہ کی شاعری کو پسند نہ کرتا تو اس پر مضمون نہ لکھتا (مضمون آپ کو پسند بھی آگیا — میری خوش قسمتی ہے اور میں آپ کے پسند کرنے پر بہت مطمئن ہوا ہوں)۔ میری درخواست ہے کہ آپ اختلافات کو ایک بار پھر پڑھیں — مثال کے طور پر میرے یہ فقرات ''میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ منصورہ احمد کے بارے میں لکھا ہوا، ان کا ایک ایک لفظ ان کے سچے خیالات اور جذبات کا مظہر ہے۔ انھوں نے وہی لکھا جو محسوس کیا اور جو کچھ لکھا، وہ بلا جواز نہیں لکھا۔''

میرے ناچیز خیال میں کسی بھی تنقیدی تحریر کے کھرے ہونے کا اقرار، اعتراف اس سے زیادہ واضح طور پر نہیں ہو سکتا۔ برادر محترم ''بالشتیوں'' نے آپ کے مقدمے پر اعتراض تو کیے ہوں گے لیکن مقدمے کو تنقید کے اس بلند معیار پر نہیں رکھا ہوگا، اسی طرح آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ میں نے پرزور انداز میں اس تہمت کو رد کیا کہ پذیرائی کی تحریریں مانگی گئی تھیں۔ اس ضمن میں اپنا بھی ذکر کیا ہے، حسن طلب ہوتا تو مجھ سے بھی مانگا جاتا، اشارتاً ہی سہی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے صراحت سے یہ بھی لکھا ہے، ''یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ آخر ادارہ فنون ان تحریروں کا کیا کرتا؟ کیا ردی کی ٹوکری کا پیٹ بھرا جاتا؟ بہت سے بہت دو ایک خط جو منصورہ احمد کے نام موصول ہوئے تھے، آسانی سے خارج کیے جا سکتے تھے لیکن باقی کا کیا بنتا؟ بہر حال، پذیرائی کے تحت شائع کی جانے والی تحریروں کو خصوصی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔''

پروفیسر اسلوب انصاری نے جن انگریزی الفاظ کی بھرمار روا رکھی ہے، وہ اصطلاحات نہیں ہیں، ورنہ میری طبیعت بدمزہ نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں افسوس، میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میں اس رویے کو زیادتی گردانتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ اردو میں علاقائی زبانوں کے الفاظ، موزوں ہندی الفاظ کے شمول کو میں مستحسن سمجھتا ہوں لیکن کم کم ہونا چاہیے۔ انگریزی کے الفاظ اردو میں در

آگئے ہیں لیکن ان کے مزید شمول میں اگر اتنی زیادہ دریا دلی روا رکھی گئی جیسا کہ پروفیسر اسلوب انصاری نے روا رکھی تو آپ خود سوچیے آٹے میں نمک کی جگہ، نمک میں آٹے کی نوبت نہ آجائے گی۔ میں بھی انگریزی ادب کا پرانا ایم اے ہوں۔ نوجوانی میں انگریزی میں کہانیاں اور مضامین بھی لکھے اور چھپوائے بھی ہیں۔ انگریزی میں سوچ کر اردو میں لکھنے کے کٹھن مرحلے سے میں بھی گزرا ہوں، آج بھی بعض فقرے انگریزی ہی میں ذہن میں آتے ہیں۔ پھر بھی میں یہ کہوں گا اسلوب صاحب نے زیادتی کی ہے اور اس کے خلاف آواز اٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ایک اور بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اسلوب صاحب کی اردو نثر بے حد مرصع ہے۔ ایک جانب ایسی اردو اور دوسری جانب انگریزی لفظوں کی بھرمار—— ان میں سے بیشتر الفاظ کے مطالب ہمارے نقادوں نے خوش اسلوبی سے ادا کیے ہیں۔ ہر انگریزی لفظ کا متبادل تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مفہوم سے غرض رکھنی چاہیے—— اب آپ کا یہ سوال، ''آپ پوچھیں گے کہ کیا میں نے کبھی کسی چڑیا کو آندھی کے مقابل پر تولتے دیکھا بھی ہے؟'' نہیں، میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہیں کروں گا کیوں کہ آندھی کے مقابل چڑیا کو اڑتے دیکھنے کی جگہ آپ نے پر تولتے دیکھا ہے اور دکھایا ہے۔ 'چڑیا' علامت ہے۔ پر تولنا عزم و ہمت کو مہمیز کرنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جان دار متحرک تصویر ہے—— کوئی سوال اٹھایا نہیں جاسکتا—— آپ اگر یہ کہتے کہ آندھی سے معمور فضا میں پر تولتی ہے تو معاملہ دوسرا ہوتا۔ اسلوب انصاری صاحب نے تحریر فرمایا ہے، ''جیسے کوئی خوش گلو پرندہ اپنے فراواں کلبانگ کے ساتھ فضائے بسیط میں بال و پر کھولے آمادۂ پرواز ہو اور اس کے رنگ اور لس کو ہر ذی شعور قاری محسوس کرے۔'' یہاں محو پرواز پرندے کی تصویر کشی کی گئی ہے نہ کہ آمادۂ پرواز پرندے کی۔ آمادۂ پرواز پرندہ بال و پر پھڑپھڑاتا ہے۔ آپ کی چڑیا کی مانند پر کھولتا نہیں۔ پرندہ جب پوری طرح محو پرواز ہوتا ہے اور آمادۂ پرواز کے مرحلے سے آگے ہوجاتا ہے تب ہی وہ بال و پر پوری طرح کھولتا ہے۔ بھائی جان محترم! آپ کی چڑیا کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہی نہیں۔ انگریزی الفاظ اور پرندے کے علاوہ بھی اسلوب انصاری کا مضمون تنقید کم اور لفاظی زیادہ ہے۔ اگر منصورہ کی شاعری کا معترف نہ ہوتا تو اس مضمون کے مزید نکات پر زبان کھولتا۔ مجبوراً ان کا ذکر چھوڑ گیا۔ میں کیا کروں محترم، اسلوب صاحب کے مضمون میں ایسی کوئی چیز مجھے نہیں ملی جو ان کے مضمون کو معتبر بناتی۔ آپ معلوم کرلیں۔ انتظار حسین، فتح محمد ملک اور آفتاب اقبال شمیم سے یا کسی اور عزیز سے میرے قطعی کوئی مراسم نہیں۔ میری کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ میں آدمی کو نہیں اس کے کام کو دیکھتا ہوں، ناموں سے مرعوب بھی نہیں ہوتا۔ میں بھی انگریزی ادب کا وظیفہ یاب پروفیسر ہوں لیکن اپنے آپ کو پروفیسر نہیں کہلواتا۔ انگریزی، اردو اور فارسی ادب کا طالب رہنا چاہتا ہوں۔

آپ نے شاید میرے ان فقروں پر غور نہیں فرمایا، ''لیکن باقی اہل قلم کی تحریروں کو خراج تحسین، ادائیگی فرض اور ہدیۂ تبریک و اخلاص کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے اور پذیرائی کے تحت ان کی موجودگی بڑی حد تک متوقع'' اور جائز'' بھی لگتی ہے۔ تاہم کسی کسی تحریر پر انگلی نہ رکھنا میرے نزدیک

صاحبِ کتاب کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگا۔ یہ سوچ کر انتہائی معذرت کے ساتھ چند ایک ضروری گزارشات پیش خدمت ہیں۔ اس تمہید کے بعد اگر میں نے اپنا اختلافی نکتۂ نظر پیش کیا تو اختلافات کے شعبے میں اس کے شمول سے کسی کو کیا گزند پہنچ سکتا ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اگر کسی کو میری رائے نہ پسند آئے تو وہ آرام نال اس سے اختلاف کا اظہار کرسکتا ہے۔ اسی طرح بات آگے بڑھتی ہے۔ ادب میں کوئی بات حرفِ آخر کب ہوتی ہے؟!

آپ خود سوچیں الطاف فاطمہ نے منصورہ کی شاعری اور اس کے مزاج کے برخلاف باتیں لکھیں تو ادب کے ریکارڈ میں اس کو یوں ہی رہنے دیا جائے۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ منصورہ کے ساتھ زیادتی ہے، اسی طرح منو بھائی کی تحریر کا غلو بھی منصورہ کے حق میں نہیں ہے۔ ان کے مضمون میں جو انھوں نے دوسرے شعرا سے تقابل کیا ہے، وہ غیر ضروری ہے۔ ان شعرا کو بھی سمجھنے میں غلطی کا ارتکاب ہوا ہے اور منصورہ کو سمجھنے میں بھی۔

ایک بار پھر میں کہوں گا کہ میں نے اختلافات کے تحت جو کچھ لکھا، اس کے نتائج آگے چل کر آپ کے اور منصورہ کے حق میں بہتر ہوتے۔ بہرحال، آپ کو میری تحریر سے دکھ پہنچا۔ میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔ لہٰذا آپ بخوشی اس کو ردی کی ٹوکری کے حوالے کردیجیے —— اور مجھے دل سے معاف کردیجیے۔

اب ایک الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ پذیرائی میں منصورہ کے لیے آپ کی جو تین نظمیں شائع ہوئی ہیں، میں ان کو پڑھ کر ابھی تک سرشار ہوں۔ میرے جی میں تھی کہ ان پر کچھ لکھوں لیکن اب میں لکھتے میں خائف رہوں گا، حالاں کہ کسی اور جگہ چھپواتا بھی تو آپ کو ضرور دکھاتا۔ بہرحال یہ ضرور کہوں گا کہ مذکورہ نظمیں اردو شعری ادب میں خاصے کی چیز ہیں۔

ایک ضروری گزارش اور —— خواجہ رضی حیدر پر مضمون کے بارے میں آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ یہ بات ان کے علم میں آچکی ہے کہ میں نے ان کی شاعری پر اپنے ناچیز خیالات مضمون کی شکل میں "فنون" کو بھجوائے ہیں اور آپ نے درج کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسی سبب سے اور پریشان ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کراچی والوں کو آپ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ ویسے وہ مضمون میں نے رضی حیدر کو پڑھوایا نہیں۔

مختصر طور پر یہ ضرور بتائیں کہ امریکا میں آپ کے مشاعرے کیسے رہے؟

منصورہ کی نظموں کے حوالے سے بھی——

طوالت کے سلسلے میں معذرت، آپ کا بہت وقت لیا۔

آپ کا گرامی نامہ جس کو آپ نے ۲۶ دسمبر کو ڈاک کے حوالے کیا تھا، آج ۵ جنوری کو ملا۔

آپ کا مخلص بھائی

عبداللہ جاوید

---

۲۷ را پریل ۹۹ء

برادرم، سلام مسنون

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں پچھلے دنوں بہت علیل رہا۔ پھر مجھ سے ایک بے احتیاطی سرزد ہوگئی کہ محض ایک پرانے دوست کا دل رکھنے کے لیے ڈیرہ غازی خان کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے چلا گیا اور وہاں مسلسل چھ سات گھنٹے بیٹھنے سے اتنا تھکا کہ مجھ پر ضیق النفس کا شدید حملہ پڑ گیا۔ مجھے قریب کے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں آکسیجن لگائی گئی تو آدھ پون گھنٹے میں کیفیت کچھ نارمل ہوئی، مگر نقاہت شدید ہوگئی۔ آج بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کہیں آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں کہ چاہے مجھ سے کوتاہی ہو جاتی ہو مگر آپ کا سلسلہ مراسلت جاری رہتا ہے۔ پھر آپ بھی تو پرانے بیمار ہیں، اس لیے آپ کے سلسلے میں یہ تشویش بھی ہے۔ بہر حال میری استدعا ہے کہ فوری طور پر میری یہ دونوں تشویشیں دور کیجیے۔

دعا کرتا ہوں کہ آپ بخیر ہوں۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم

---

۷ رمئی ۹۹ء

برادر محترم و معظم

سلام نیاز

کل ڈاکیے نے آپ کا خط پہنچایا تو یوں لگا کہ میں زندہ ہوں۔

آپ کا یہ خیال درست ہے کہ میں کچھ زیادہ بیمار ہوں لیکن آپ نے یہ کیسے خیال فرمایا کہ میں آپ سے خفا ہوں۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر۔ ہر چہ از برادر محترم رسد نکوست — ٹی وی پر آپ کو دیکھا تھا، اس وقت بھی آپ کی طبع ناساز لگ رہی تھی۔ اگرچہ کہ آپ سیدھے بیٹھے تھے، جب کہ ایک دو شاعر حضرات تو قریب قریب دراز ہو رہے تھے۔ میں نے تی بی تی میں آپ کی آہنی قوت ارادی کو داد دی لیکن اچھا بھی نہیں لگا۔ آرام سے بیٹھنا آپ کا حق بنتا ہے۔ آپ ہیں کہ خود کو ہلکان کیے دیتے ہیں۔ کم از کم منیر نیازی ہی کو دیکھ لیتے — ڈیرے کے مشاعرے میں بھی یہی کچھ ہوا ہوگا، وہ بھی آپ کے بقول چھ سات گھنٹے۔ یہ اچھا ہوا کہ اسپتال میں آکسیجن دی گئی اور آپ کی طبیعت سنبھل گئی — آپ اپنا خیال رکھنا سیکھ لیں، براہِ کرم اپنے پرستاروں کی خاطر ہی سہی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اوپر آپ کو سائبان کی مانند قائم و دائم رکھے، آمین۔

چند روز ہوئے 'اردو' پر آپ کا کالم پڑھا۔ اردو کے طفیل میں بلند مرتبوں پر جاگزیں ہونے والوں نے کاش حق نمک ہی ادا کیا ہوتا تو یہ دن دیکھنے نہیں پڑتے۔ ریڈیو والے ایف ایم ون ہنڈریڈ سے

انگریزی لہجے میں اردو بلوا رہے ہیں، ٹی وی والے ناظرین کی جگہ ویورس سے مخاطب ہیں۔ پہلے اردو میں انگریزی ملائی جاتی تھی۔ اب انگریزی میں اردو ملاتے ہیں۔ ایک چینی یا جاپانی اردو داں خاتون نے اردو میں انگریزی الفاظ کی کثرت پر دکھ کا اظہار کیا تھا۔ اب دیکھیے انگریز بہادر اپنی زبان کے ساتھ اردو والوں کی زیادتی کے خلاف کب آواز اٹھاتے ہیں —

میں آپ کو برابر لکھ رہا ہوں۔ منصورہ کی کتاب پر مبارک باد کا کارڈ آپ کا بھی، منصورہ کو بھی۔ عید کارڈ، نئے سال کے کارڈ۔ پابندی کے ساتھ اس کے علاوہ چھوٹے بڑے خطوط۔ وقتے وقتے سے، جب سے تدریس سے قبل از وقت پیچھا چھڑایا۔ سی آئی ڈی والوں نے بھی میرا پیچھا چھوڑا — اور اب تو عرصہ ہوا اخباروں میں کالم جو کبھی کبھار چھپتے تھے، وہ بھی بند ہیں — اب تو ڈاک پر ڈاکا نہیں پڑنا چاہیے۔

ممکن ہو تو آپ ضرور لکھیں کہ آیا میرا وہ وضاحت نامہ بھی آپ کو ملا یا نہیں جو میں نے آپ کے ۲۴ر دسمبر ۹۸ء کے جواب طلب مراسلے کے جواب میں لکھا تھا۔ ۴ر جنوری کا خط تھا — موضوع ''اختلافات''۔ اس کے بعد بھی کوئی تین، خط آپ کی خدمت میں گزارے تھے۔ کیا یہ سب اور کارڈ وغیرہ آپ کو نہیں ملے؟ ضرور لکھیے۔

''فنون'' کے ملنے پر حسبِ معمول بے حد خوشی ہوئی۔ جستہ جستہ پڑھ رہا ہوں۔ معیار خاصا بلند ہے۔ ''فنون'' کی بزم میں عرصۂ دراز سے شامل نہیں ہو رہا۔ جلد کچھ بھیجنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک لگے تو جگہ دیجیے — ایک شکایت — آپ نے خواجہ رضی حیدر پر میرا مضمون اس ''فنون'' میں بھی شامل نہیں کیا — رضی حیدر اچھے شاعر اور یوں بھی دانش ور ہیں۔ آج کل قائداعظم اکیڈمی کے ناظمِ اعلیٰ (ڈائریکٹر) ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری تحریر معیار پر نہیں اتری۔ ایسا ہوا ہے تو مضائقہ نہیں لیکن بتائیے تو سہی۔ مجھ سے یہ کوتاہی سرزد ہوگئی ہے کہ مضمون بھیجا تو انھیں بتا دیا اگرچہ پڑھوایا نہیں — اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کلی اور درازیٔ عمر عطا کرے، آمین۔

احقر

عبداللہ جاوید

۱۸ر جون ۹۹ء

برادرِ گرامی قدر

السلام علیکم

اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں۔ 'ڈیرے' والے ضیق النفس اور اس کے مابعد اثرات سے مکمل طور پر مامون ہو چکے ہوں جس کا ذکر آپ نے ۲۷ر اپریل کے گرامی نامے میں کیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میرا ے رمنی کا معروضہ آپ کو ملا بھی یا نہیں۔ اگرچہ آپ کو رجسٹری یا ارجنٹ میل سروس سے ہی ڈاک

بھجواتا ہوں۔ ۴ار جنوری ۹۹ء کے طویل وضاحت نامے کے بارے میں بھی تشویش ہے۔ ۷ر مئی کے معروضے کے بعد بھی ۲۰ر مئی، ۳۰ر مئی اور پھر ۱۲ر جون کو منصورہ احمد کے نام (آپ کا مزاج مبارک معلوم کرنے کے لیے ایک خط ارسال کیا)۔ منصورہ والا خط واپس مل گیا ہے۔ ''دفتر عدم پتا چلا گیا ہے، لہٰذا واپس جائے۔'' اچانک خیال آیا کہ پہلے بھی ایسی صورت حال پیش آئی تھی اور آپ نے مجلس ترقیِ ادب، لاہور کا پتا استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ سو میں اسی مشورے پر عمل کرتے ہوئے 'مجلس' کے پتے پر آپ سے مخاطب ہوں۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کی خدمت کرنا تو رہا ایک طرف چند ایک حروف سپاس بھی پیش کرنے سے محروم رہا ہوں۔ جب سے آپ کی بیماری کا سنا ہے بار بار آپ ہی کا خیال آتا ہے، یوں اُس مہربان رب سے پوری توقع ہے کہ آپ تمام و کمال صحت و توانائی سے اپنے معمولات زندگی میں مگن ہوں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کی خیریت ''فنون'' کی خیریت سے ہٹ کر معلوم کروں۔ توقع ہے کہ ''فنون'' صاحب بھی مع الخیر ہوں گے اور طباعت و اشاعت کے مراحل سے بخیر و خوبی گزر رہے ہوں گے۔ تاخیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''کچھ'' برائے اشاعت منسلک کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھ رہا ہوں۔ البتہ خواجہ رضی حیدر پر فقیر کی تحریر عرصۂ دراز سے رُکی ہوئی ہے، اس کے لیے یاد دہانی ضروری ہے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی پڑ رہا ہے کہ یہ معاملہ ان کے علم میں ہے کہ ایسا کوئی مضمون آپ تک بھجوایا گیا ہے۔ خواجہ صاحب صحافی بھی رہے ہیں، شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید کے میدان کے مرد ہیں۔ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ قائداعظم اکادمی کے بھی سربراہ اور نائب سربراہ رہتے ہیں کیوں کہ روٹی دال کی دوڑ دھوپ کے باعث کسی جامعہ سے منسلک ہو کر ڈاکٹریٹ نہیں کر سکے، ورنہ قائداعظم پر ان کا کام ایک سے زائد ڈاکٹریٹ کا حق دار ہے۔ یوں بھی مسابقت کی اس دوڑ میں وہ لوگ پیچھے رہ ہی جاتے ہیں جو دوسروں کو کہنی مار کر آگے بڑھنے کی حد تک ''مہذب'' نہ ہوں۔

پتا نہیں کیوں، ایک سطر میں خیریت معلوم کرنے جگہ کافی ''نظر خراشی'' کر لی۔ معاف کیجیے۔ منصورہ کو جو خط روانہ کیا تھا، وہ بھی منسلک ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو تا عمر ہم سب پر سایہ فگن رکھے۔ آمین

آپ کا خادم و دعا گو

عبداللہ جاوید

۱۱ر جولائی ۱۹۹۹ء

برادر عزیز مکرم، دعا

آپ کے سب کرم نامے مل چکے ہیں مگر مجھے استھما کے پے در پے حملوں نے بے بس کیے رکھا۔ منصورہ بیٹی اسلام آباد میں اپنی علیل امی کی دیکھ بھال کے لیے گئی ہیں۔ ان کی امی اپنے بیٹے کے ہاں

ہیں جو وہاں ایک بینک میں افسر ہیں۔ بیٹی کی امی یادداشت کھو چکی ہیں اور ان کی پہچان ختم ہو چکی ہے۔ بیٹی وہاں ان کی خدمت کر رہی ہے۔ اگر آپ کا بیٹی کے نام کا خط آپ کو واپس مل گیا تو یہ پوسٹ مین کی زیادتی ہے۔ وہ "فنون" کی تمام ڈاک "فنون" کے نئے پتے پر دے جاتا ہے۔ نہ جانے خاص طور سے آپ کا خط کیوں واپس چلا گیا۔ "فنون" کا دفتر بدل لیا ہے۔[۳۸] پتا نیچے درج ہے۔ خواجہ رضی حیدر صاحب پر آپ کا مضمون تازہ شمارے میں شامل ہے اور یہ شمارہ ان شاء اللہ، اس ماہ کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔

آپ کی محبت میرا سرمایہ ہے۔ یقین کیجیے۔

آپ کا

احمد ندیم

۱۴ر دسمبر ۱۹۹۹ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

پرسشِ احوال کا دلی شکریہ۔ اب کے دمے کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ ویڑھ دو گھنٹے بعد ہوش بحال ہوئے۔ اس شدت کی وجہ سے دل بھی متاثر ہوا مگر زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ایک ہفتہ اسپتال میں رہا۔ اس کے بعد دو ہفتے گھر میں "آرام" کرتا رہا۔ اب نارمل ہوں مگر بہت کم زور ہو گیا ہوں۔ تین روز سے دفتر جانے لگا ہوں مگر کچھ دیر کے لیے۔ ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آخر خدا کے فضل کے علاوہ آپ کے سے بے لوث دوستوں کی دعائیں بھی تو میرے شاملِ حال ہیں۔[۳۹]

منصورہ بیٹی کی طرف سے سلام مسنون۔

آپ کا

ندیم

۱۲ر فروری ۲۰۰۰ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام محبت

آپ نے جو بھرپور قسم کا کارڈ مجھے بھجوایا تھا، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ تاخیر کی وجہ معالج[۴۰] حضرات کی ہدایات کے مطابق پڑھنے کے علاوہ لکھنے سے بھی پرہیز تھا۔ پھر "فنون" نمبر ۱۱۱ مرتب

☆۳۸۔ منصورہ کے بھائی کا ذکر، منصورہ کی والدہ کی بیماری کا ذکر، خود کی بیماری 'ایزتھما' کے متواتر حملوں کا ذکر اور ایک مرتبہ پھر "فنون" کے پتے کی تبدیلی کا ذکر۔

☆۳۹۔ ایک حملۂ مرض کا قدرے تفصیل سے ذکر۔۔۔ آخر میں یہ فقرہ کتنا قیمتی ہے، "مگر زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

☆۴۰۔ معالج حضرات نے لکھنے پڑھنے سے پرہیز کرنے کی ہدایات دیں، ان پر عمل بھی کیا لیکن "فنون" نمبر ۱۱۱ کی ترتیب سے باز نہیں آئے۔

کرنے کا مرحلہ آیا اور میں ہمیشہ کی طرح اس کام میں ڈوب سا گیا۔ اب پرچہ پریس کو بھجوایا تو یہ چند حروف لکھنے کی نوبت آئی ہے۔

آپ نے اظہار محبت کی انتہا کر دی کہ مجھے پوری صدی کا ''برادر'' نامزد کر دیا۔ شکریہ ادا کرنے کے الفاظ میرے پاس نہیں۔ بہر حال میں اسے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

اللہ آپ کو صحت مند اور خوش رکھے۔

منصورہ کی طرف سے آداب۔

آپ کا
ندیم

۱۷ر جنوری ۲۰۰۱ء

برادرِ عزیز و مکرم، محبت

آپ کہاں ہیں؟ عید کارڈ تو یقیناً ملا مگر اس سے پہلے آپ کہاں تھے اور اس کے بعد آپ کہاں ہیں؟ نہ آپ نے اپنا کلام بھیجا، نہ اپنی خیریت سے مطلع کیا۔ مسلسل خاموشی کے بعد عید کارڈ کا دھما کا یقیناً ہوا مگر یہ آپ کی خاموشی کا کوئی جواز مہیا نہیں کرتا۔ لکھیے کہ آپ کی صحت کیسی ہے اور دیگر حالات کیسے ہیں۔

تازہ ''فنون'' (نمبر ۱۱۳) روانہ ہو چکا ہے، مل گیا ہوگا۔

... بے چارہ ''فنون'' چل رہا ہے، چاہے گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہو۔[۲۱۲]

منصورہ اور ناہید بیٹیوں کی طرف سے آداب۔

آپ کا
احمد ندیم

۲۱ر اگست ۲۰۰۱ء

برادر گرامی قدر ندیم قاسمی صاحب

السلام علیکم!

ابھی تک کراچی جانا نصیب نہیں ہو سکا۔ صحت بھی گھڑی میں کچھ، گھڑی میں کچھ ہے۔ آپ کی صحت اللہ کرے ٹھیک ہو اور آپ کی زندگی کی گہما گہمی میں کمی نہ آئی ہو۔ کراچی کے پتے پر مطلع کرتے رہیں، کرم ہوگا۔ آپ کے پچھلے خط میں آپ نے ''فنون'' سپردِ ڈاک کرنے کی اطلاع دی تھی لیکن وہ ہنوز نہیں ملا۔ کل تک کراچی سے یہی اطلاع ہے۔ مناسب جانیں تو اب کی مرتبہ ڈاک والوں کے ہاں شکایت درج

[۲۱۲]۔ ادبی مجلے کے مدیر کے طور پر ندیم صاحب کی مجبوریاں۔

کروا دیں۔ رسالہ کراچی کے پتے پر وی پی کرا دیں، وہ لوگ وصول کر لیں گے۔

ایک افسوس ناک خبر یہ ہے کہ میاں ظہور وہرا حملہ قلب سے انتقال کر گئے۔ آپ ایک مختصر تعزیتی خط ان کے فرزند اکبر میاں عبدالرؤف وہرا کو ضرور ارسال کر دیں۔ پتا اس اشتہار میں ہے جو "فنون" میں شائع ہوتا ہے۔ خط قدرے ادبی اور پیارا سا ہو۔ رؤف بہت پیارے آدمی ہیں۔

اور کیا عرض کروں۔ جس طرح پاکستانی امریکی اور پاکستانی کینیڈائی لوگ اپنی اولاد کو پاکستانی ثقافت، زبان، رہن سہن، خور و نوش، اخلاق و آداب کے اقدار سے دور رکھ رہے ہیں یا دور ہوتے دیکھ رہے ہیں، اس پر دل دکھتا ہے۔ کل ہی ایک دعوت میں تیس سالہ جوان کو دیکھا جس کے اپنے دو بچے ہیں۔ نہ وہ اردو ٹھیک طرح سمجھتا تھا، نہ بول سکتا تھا۔ اس سے سب لوگ انگریزی بول رہے تھے۔ انگریزی بھی ایسی کہ ہر فقرے کے بعد وہ رائٹ رائٹ کہتا تھا، جیسا بدتمیز گورے یا کالے کہتے ہیں۔

دونوں بیٹیوں کو سلام۔

نیازمند

عبداللہ جاوید

---

۱۸ اکتوبر ۲۰۰۲ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام محبت

آپ ایک عرصے سے کینیڈا میں ہیں مگر آپ کینیڈا میں ہوں یا کراچی میں میرے لیے دونوں برابر ہیں کہ یہاں بھی تو آپ سے ملاقات محض خواب بن کر رہ گئی ہے۔ خدا کرے آپ تندرست ہوں۔ یہ ہونے، نہ ہونے اور ہوتے رہنے کا چکر ہر دانش مند دانش ور کے ساتھ ہے۔ اس پر عمر کا اپنا جبر[۴۲] ہے۔ مجھے دیکھیے کہ ماہ سوا ماہ بعد ۲۰ نومبر کو چھیاسی برس کا ہو جاؤں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ متعدد عوارض کے باوجود روزمرہ کے کام حتی الوسع باقاعدگی سے انجام دے رہا ہوں۔ منصورہ[۴۳] بیٹی نے "فنون" کے بھی "غیر ادبی" کام کمال سلیقے سے سنبھال رکھے ہیں۔ میرا کام صرف "فنون" مرتب کرنا ہے۔ کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، پرنٹنگ، پوسٹنگ وغیرہ کے بھی مرحلے بیٹی طے کرتی ہے اور ساتھ ہی میری ضروریات (لباس، غذا، دوا) کا بھی باقاعدگی سے خیال رکھتی ہے۔ آپ اسے اور ناہید کو پیار سے یاد کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتی ہیں اور آداب کہتی ہیں۔

میں اونچا سننے لگا ہوں۔ دمے کا مرض تین برس سے لاحق ہے، کچھ قلب کا عارضہ بھی ہے۔ پاؤں اور پنڈلیاں (گزشتہ دس گیارہ برس سے) نیم سن کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اب چند روز سے آنکھوں میں

☆۴۲۔ عمر کا جبر۔

☆۴۳۔ منصورہ بیٹی — "فنون" کے بھی غیر ادبی کام اور ندیم صاحب کی ذاتی ضروریات۔

موتیا اتر آ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اسی مہینے ایک آنکھ کا آپریشن بھی ہو جائے[☆۴۴] میرے لیے دعا کیجیے، میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ میں آپ کو اپنے گنے چنے کرم فرماؤں میں شمار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ابھی برسوں تک تندرست و توانا رکھے۔ تازہ کلام بھجوانے کا دلی شکریہ۔

آپ کا خیر اندیش
احمد ندیم

۴/ اپریل ۲۰۰۲ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

کل شام کو "حصارِ امکاں"[☆۴۵] کا پارسل ملا۔ کتاب اتنی خوب صورت چھپی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ اللہ مبارک کرے۔

بھلا میں کیوں خفا ہوں گا، اس مجموعے کے انتساب کا اعزاز کیا میرے لیے کم سامانِ فخر ہے۔ اللہ آپ کو خوش اور تندرست و توانا رکھے۔

میری ایک آنکھ کا آپریشن ہو چکا ہے۔ دوسری کا باقی ہے۔ وہ بھی اسی مہینے ہو جائے گا۔ سانس کا عالم وہی ہے۔ مرض میں دو تین بار inhaler استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مرض جیسے چٹ کر رہ گیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے، دعا چاہیے۔[☆۴۶]

میں "حصارِ امکاں" پر ضرور لکھتا مگر میں تو بے بس ہو کر رہ چکا ہوں۔ یہ خط بھی بڑی دشواری سے لکھ رہا ہوں۔ لکھنا پڑھنا چھوٹ گیا ہے۔ تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں کہ آخر عمر بھی تو چھیاسی برس سے بھی چار ماہ زیادہ ہو چکی ہے۔

بیٹیوں کو ان کی کتابیں پہنچا دی ہیں۔ جنت بہت آداب کہہ رہی ہیں۔

دعا اور محبت کے ساتھ۔

آپ کا
ندیم

۲۰/ اپریل ۲۰۰۳ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ نے اپنے مجموعۂ کلام "حصارِ امکاں"[☆] کو میرے نام سے منسوب کر کے میری بے حساب

☆۴۴۔ امراض کی تفصیل۔
☆۴۵۔ میرا دوسرا شعری مجموعہ
☆۴۶۔ آنکھ کی سرجری کا ذکر، سانس کا مرض مستقل صورت اختیار کر گیا ہے۔

عزت افزائی فرمائی ہے۔ یہ آپ کا اتنا بڑا کرم ہے جس کے سلسلے میں جذبۂ ممنونیت کے لیے الفاظ ڈھونڈتا رہ گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور قلبی و ذہنی لحاظ سے ہمیشہ کی طرح آسودہ رکھے۔

میں اللہ کی گرفت میں ہوں۔ بعض اوقات شدید تکلیف کا سامنا رہتا ہے مگر ''ان ہیلر'' مدد کرتے ہیں اور نارمل ہو جاتا ہوں۔ اپنے معمولات کسی حد تک جاری رکھے ہوئے ہوں کہ اگر گھر میں بیٹھ گیا تو بیٹھا ہی رہ جاؤں گا۔[حاشیہ ۲۷]

آپ کا
احمد ندیم

۲۴ر جولائی ۲۰۰۳ء

برادرم عزیز و مکرم، سلام محبت

کیا عرض کروں، کتنا شرمندہ ہوں کہ آپ کے دو قیمتی محبت ناموں کا فوری جواب عرض کرنے سے قاصر رہا۔ دراصل میں کچھ زیادہ ہی بیمار ہو گیا تھا۔ شام کا وقت تھا جب دفتر میں اچانک مجھ پر شدید نقاہت کا حملہ ہوا۔ میں نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ منصورہ بیٹی مجھے فوراً کارڈیالوجی کے اسپتال میں لے آئی۔ وہاں ایک رات بسر کی تو ڈاکٹروں نے کہا کہ مریض کا دل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اسے جناح اسپتال لے جاؤ۔ وہاں پانچ چھ روز رکھنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ میں ''لو بلڈ پریشر'' اور ''ڈی ہائیڈریشن'' کا شکار ہوں۔ بہرحال، علاج کے بعد مجھے گھر لایا گیا۔ چند روز یہاں آرام کیا مگر پوری زندگی جدوجہد اور تگ و دو میں بسر کی ہے، اس لیے بستر پر پڑے رہنا ناقابل برداشت ہو گیا۔ اب دو چار گھنٹے کے لیے دفتر جانے لگا ہوں اور کمزوری بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ میری اس شدید علالت کا آغاز اواخر مئی میں ہوا تھا۔ انہی دنوں (یعنی علالت سے قبل) کراچی سے دواؤں کا پارسل ملا اور میں نے فوراً شکریے کا خط لکھا۔ اگر یہ وہاں تک نہیں پہنچا تو میری بدقسمتی ہے۔ آج کل ڈاک کے سلسلے میں بڑا انتشار ہے۔ آپ کراچی لکھیں تو انھیں مطلع کر دیں کہ مجھے دوائیں مل چکی ہیں اور میں نے ان کی رسید بھیج دی تھی۔ اگر وہاں تک نہیں پہنچی تو میری بدقسمتی۔

ایلوپیتھک علاج کے ساتھ ہی میں مشہور ہومیو ڈاکٹر (ڈاکٹر مسعود مرحوم کے پوتے) کی تجویز کردہ دوائیں بھی استعمال کر رہا تھا۔ سوچا کہ ان کا کورس ختم ہو تو کراچی کی دواؤں کا استعمال شروع کروں گا مگر علالت کے حملے نے معذور رکھا۔ سب علاج رک گئے، نیا ایلوپیتھک سلسلہ شروع ہوا جو جاری ہے۔ کمزوری کچھ دور ہو جائے تو کراچی کا نسخہ استعمال کرنا شروع کروں گا۔ وہاں کی دوائیں میں نے محفوظ رکھ لی ہیں۔ سانس کی تکلیف کم ہو رہی تھی (اور میرے اندازے کے مطابق یہ ہومیو پیتھک دواؤں اور گرم موسم کا نتیجہ تھا) مگر برسات شروع ہو چکی ہے اور مرطوب ہوا نے پھر سے پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ دن میں دو

حاشیہ ۲۷۔ بیماری سے ہار نہیں مانی، آخر تک۔

لیکن بار سانس کی گڑبڑ ہوجاتی ہے اور inhaler استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔ ایک آنکھ کا تو کامیاب آپریشن ہوگیا تھا، دوسری آنکھ پر موتیا کا پردہ گہرا ہوچکا ہے مگر کمزوری کم ہو تو دوسرا آپریشن بھی کرالوں گا۔

آپ کی محبت سے سرشار ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرست اور مطمئن رکھے۔

''فنون'' ۱۱۹ شائع ہوچکا ہے اور کراچی کے پتے پر بھجوایا جاچکا ہے۔ میرے تنقیدی مضامین کی ایک کتاب ''پس الفاظ'' شائع ہوچکی ہے، آپ کو کیسے بھجواؤں؟ آپ پڑھیں گے تو خوش ہوں گا۔[۴۸]

منصورہ اور ناہید کی طرف سے آداب۔

آپ کا

ندیم

۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۳ء

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

خدا کرے آپ بخیریت واپس تشریف لا چکے ہوں اور آپ کی صحت بہت اچھی ہو۔

مجھے بھی اب خاصا افاقہ محسوس ہو رہا ہے۔ دمہ دن میں ایک آدھ بار اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتا ہے۔

شہناز کلینک سے مجھے جو دوا ملی تھی، وہ باقاعدگی سے استعمال کر رہا ہوں۔ آج دوسرے مہینے کی انیسویں پڑیا استعمال کی۔ گیارہ باقی ہیں۔ خدا کرے تب تک میں بہت نمایاں فرق محسوس کروں، جو اب تک نہیں ہوا۔

دعا کے ساتھ۔

آپ کا خیر اندیش

احمد ندیم

حسب ارشاد اہل قلم کے پتے بھجوا رہا ہوں۔ محمد ارشاد صاحب کو میں نے آپ کی مرسلہ کتاب[۴۹] بھجوا دی تھی جو انھیں مل چکی ہے۔۔۔ ندیم

۱۹/ دسمبر ۲۰۰۳ء

برادر عزیز و مکرم

میں تو ہر لمحے آپ کی واپسی کے بارے میں سوچتا رہا کہ کینیڈا کی قیامت کی سردی میں آپ کو خدانخواستہ کوئی تکلیف نہ ہوجائے۔ ڈاکٹر زارا صاحبہ نے لکھا تھا کہ آپ یکم دسمبر تک آ رہے ہیں۔ پھر ابھی

☆☆۴۸۔ شدید علالت اور علاج معالجے کی تفصیل اور ''پس الفاظ'' کی اشاعت۔

☆☆۴۹۔ ''حصار امکاں'' میرا دوسرا شعری مجموعہ۔

نے اطلاع دی کہ آپ چند روز کے لیے رک گئے ہیں۔ ظاہر ہے تشویش ہوئی کہ کیوں رک گئے ہیں۔ اب آج آپ کا خط ملا تو اطمینان ہوا کہ آپ بفضلِ خدا بخیریت ہیں۔ میں آپ کے کینیڈا تشریف لے جانے اور وہاں دیر دیر تک رک جانے کے پس منظر سے بے خبر ہوں، اس لیے تشویش رہتی ہے۔ اندازہ کر رہا ہوں کہ وہاں آپ کے صاحب زادے ہوں گے جو آپ کو روک لیتے ہیں۔ بہر صورت، میرا مسئلہ صرف یہ ہے کہ آپ بخیریت ہوں اور بخیریت رہیں۔

ڈاکٹر زارا صاحب نے مزید پندرہ دن کی دوا بھیج دی ہے۔ آج کل وہی استعمال کر رہا ہوں۔ جنوری کی دوسری تیسری کو یہ پندرہ دن ختم ہوں گے مگر ان کے ارشاد کے مطابق ۲۷، ۲۸ ہی کو انھیں اپنی صحت کے حالات لکھ بھیجوں گا۔ میں افاقہ یقیناً محسوس کر رہا ہوں اور خدا کرے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق میں اس موذی مرض سے چھٹکارا پا لوں، مگر ابھی تک دن میں ایک دو بار سانس کی تکلیف ہوتی ہے تو inhaler استعمال کر لیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے emergency کی صورت میں بھی ایک ننھی سی شیشی دوا سے بھری ہوئی بھیجی ہے، وہ ہر وقت پاس رکھتا ہوں۔

آپ نے شکاگو کے سفر کے بعد پاکستان کے خاندانوں کے بچوں کے جو حالات لکھے تھے، انھیں بنیاد بنا کر میں نے ''جنگ'' میں کالم لکھ دیا تھا۔ خدا کرے اس کا کوئی تو مثبت اثر ہو۔

آج کے خط میں منصورہ بیٹی کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ صد فی صد درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہوا ہے۔ بیٹی احترام کے جذبات کے ساتھ آپ کو آداب بھجوا رہی ہے۔ رسالے کی ادارت کے سوا، بیٹی نے میرے سب کام نہایت سلیقے سے سنبھال رکھے ہیں۔

میں ایک بیوروکریٹ[۵۰] کے طرزِ عمل کے خلاف مجلسِ ترقی ادب کی نظامت سے احتجاجاً مستعفی ہو گیا تھا مگر پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کو علم ہوا تو انھوں نے نہ صرف میرا استعفیٰ نامنظور کر دیا بلکہ متعلقہ افسر کو تبدیل بھی کر دیا اور مجلس ہی کے سلسلے میں میرے مطالبات بھی مان لیے۔ اس لیے فی الحال یہ ادارہ بھی چلا رہا ہوں، آپ کی دعا سے۔

میں آپ کے لیے سراپا دعا ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
احمد ندیم

۸ر فروری ۲۰۰۴ء

برادرِ عزیز و مکرم

خدا کا شکر ہے کہ آپ واپس تشریف لے آئے۔ دراصل میں نے کینیڈا کے انتہائی مغربی شہر (نام بھول رہا ہوں) میں ایک دو دن بسر کیے تو اندازہ ہوا کہ برف سے ڈھکے ہوئے مکانوں اور سڑکوں پر

حاشیہ ۵۰۔ کسی بیوروکریٹ سے ٹکراؤ — ''مجلس ترقی ادب'' کے پس منظر میں۔

زندگی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں، آپ مجھے بے حد عزیز ہیں، اس لیے جی یہی چاہتا تھا کہ آپ واپس آجائیں۔ جب برفیں پگھلیں تو بے شک واپس چلے جایئے گا۔

ڈاکٹر زارا صاحبہ کی عنایت ہے کہ وہ دوا بہت باقاعدگی سے بھجواتی رہیں۔ اب کے بھی دوا ملی مگر دو روز کے استعمال کے بعد مجھ پر ایک دم نزلے اور زکام اور کھانسی کا شدید حملہ ہوا۔ آج کل اسی عذاب سے گزر رہا ہوں۔ اسی لیے ہومیو پیتھک دواؤں کا استعمال بھی رک گیا ہے۔ ان شاء اللہ دو تین روز میں نارمل ہو جاؤں گا اور دوائیں استعمال کرنے لگوں گا۔ اس وقت، جب میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، باقاعدہ علیل ہوں۔ میرے سوادِ خط سے بھی آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے۔

دعا در کار ہے۔ اللہ کرے آپ بخیریت ہوں۔[☆۵۱]

آپ کا
ندیم

۱۰ر مارچ ۲۰۰۳ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ آپ کی تشویش ناک علالتوں کے بارے میں پڑھ کر شدید تشویش ہوئی۔ میں تو دعا کر رہا تھا کہ آپ کینیڈا کے برف زار سے نکلیں اور کراچی میں بے فکری اور صحت کے ساتھ رہیں مگر آپ تو یہاں آتے ہی بیمار ہو گئے۔ Vertigo تو بجائے خود نہایت تکلیف دہ مرض ہے۔ اس پر مستزاد ''پیس میکر'' لگوانے کا امکان! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ میں آپ کے لیے فکرمند بھی ہوں اور دعا بھی کر رہا ہوں۔[☆۵۲]

فروری کے آخر میں مجھے بھی اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں دس روز گزارنے کے بعد واپس آیا ہوں مگر بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ البتہ صحت بحال ہو رہی ہے، اگرچہ بحالی کی رفتار سست ہے۔ میں دو ایک روز سے گھنٹا ڈیڑھ کے لیے دفتر بھی جانے لگا ہوں کہ ''فنون'' کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔

منصورہ اور ناہید کی طرف سے آداب قبول کیجیے۔ اور ہاں، میں آپ کے کلینک کی ڈاکٹر زارا صاحبہ کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے ہومیو پیتھک دوا کی ترسیل میں کبھی تاخیر نہیں کی اور بروقت دوا بھجوائی۔ فروری کے دوسرے ہفتے سے میں نے مرسلہ دوا شروع کر دی تھی مگر فوراً علیل ہو گیا جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر زارا صاحبہ کی دوا موجود ہے، کل سے اس کا استعمال بھی شروع کروں گا۔ ان کی خدمت میں سلام۔

آپ کا
ندیم

☆۵۱۔ شدید علالت کے دوران بھی دوسروں کی دل جوئی کے لیے خط لکھا۔

☆۵۲۔ دورانِ علالت بھی دوسروں کی مزاج پرسی۔

بہ گرامی خدمت

جناب مشرف پرویز صاحب ☆۵۳

صدر، جمہوریہ پاکستان

اسلام آباد

تسلیمات، آداب، السلام علیکم!

میں ایک گوشہ نشین ادیب، شاعر، نقاد اور فری لانس جرنلسٹ ہوں۔ طبعاً بڑے درباروں پر دستک دینے سے گریزاں ہونے کے باوجود آج ملک کے سب سے اونچے اور سب سے عالی دربار پر کھڑا ہوں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ جناب احمد ندیم قاسمی بلا شک اردو کے سب سے بڑے ادیب، شاعر، نقاد، افسانہ نگار ہیں۔ عمر اٹھاسی سال سے اوپر ہے لیکن ''فنون'' کو ترتیب دیتے ہیں اور اللہ کے فضل سے دوسرے تخلیقی کاموں میں تن دہی سے مصروف ہیں۔ ایسے شخص بلکہ شخصیت کو ایک ادارے ''مجلس ترقی ادب'' لاہور سے نکال باہر کرنا ایک قومی سرمایے کو بے قیمت کرنے کے برابر ہے۔ عصر حاضر ہی نہیں، تاریخ ادب اردو آپ کے ایک اشارے کی منتظر ہے۔

زیادہ حد ادب۔

والسلام

احقر

عبداللہ جاوید

۲۱ر جولائی ۲۰۰۴ء

محترمی جناب عبداللہ جاوید صاحب، سلام مسنون!

میں مجلس ترقی ادب کی نظامت سے مستعفی ہو چکا ہوں، اس لیے اب میرا مستقل پتا اور ٹیلی فون نمبر بدل گئے ہیں، نوٹ فرما لیجیے۔ شکریہ! ☆۵۴

مخلص

احمد ندیم قاسمی

پتا: رسالہ ''فنون''، ۴۵۔اے، مزنگ روڈ، لاہور، فون: ۹۳۰۲۸۲۰

☆۵۳۔ وحشت میں نام بھی درست ترتیب سے نہیں لکھا۔

☆۵۴۔ بڑی عمر، علالت، مالی مشکلات اور حالات سے مسلسل نبرد آزمائی — قریباً دو برس بعد وہ کارزار زیست سے بھی مستعفی ہونے والے ہیں۔

۵ار اگست ۲۰۰۲ء

برادرِ عزیز و مکرم

خدا کا شکر ہے کہ آپ کا خط آیا۔ میں تو آپ کی خاموشی سے پریشان ہو گیا تھا۔ ایک ہی راستہ تھا کہ آپ کے دوست عبدالرؤف صاحب سے پوچھوں یا ہومیو پیتھک والوں سے التجا کروں۔ ادھر میں سخت آزمائش میں مبتلا تھا۔ ☆۵۵ چند بیوروکریٹ مجھ سے شاکی تھے، چناں چہ انھوں نے مجلس ترقی ادب کے شب و روز پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کیا اور اس نہایت مفید اشاعتی ادارے کا گلا گھونٹ دینا چاہا۔ چناں چہ مجھے اس ادارے سے الگ ہونا پڑا۔ اب میں ''فنون'' کے دفتر میں بیٹھا ہوں۔ کام صرف یہ ہے ''فنون'' مرتب کرتا ہوں، باقی سب متعلقہ کام بیٹی منصورہ ☆۵۶ نے کمال سلیقے سے سنبھال رکھے ہیں۔ صحت ☆۵۷ کمزور ہے مگر ابھی کام کرنے کا جذبہ باقی ہے۔ آپ نے صدر ملک کو خط لکھ ڈالا۔ یہ آپ کی بے حد و محبت ہے، ورنہ آپ کو اس طرح کے خطوط ☆۵۸ کا انجام معلوم ہے۔

خدارا اپنی ''گم شدگی'' اپنی ذات تک محدود رکھا کیجیے اور جو لوگ آپ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے بارے میں بھی سوچ لیا کیجیے۔

''فنون'' کے نئے شمارے (نمبر ۱۲۲) میں آپ موجود ہوں گے، ان شاء اللہ۔

نئی نے ''حصارِ امکاں'' احمد ندیم قاسمی ایوارڈ کے ججوں کو بھیج رکھی ہے۔ اس پر تبصرہ مجھ پر قرض ہے مگر پہلے میری صحت یابی کے لیے تو دعا کیجیے۔

''فنون'' پھر سے اپنے پرانے دفتر (۴۵۔ اے، مزنگ روڈ) میں آ چکا ہے۔ میاں چیمبرز کے پتے پر خط نہیں بھیج دیجیے۔

منصورہ اور ناہید کی طرف سے آداب۔

آپ کا دعا گو

احمد ندیم

۲۳ر اکتوبر ۲۰۰۲ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کی علالت کا پڑھ کر سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ آپ اتنی مدت تک کینیڈا میں

☆۵۵۔ اس سے قبل ایک بیوروکریٹ صاحب سے ٹھنی تھی۔ اب کی مرتبہ ایک سے چند ہو گئے۔

☆۵۶۔ ''فنون'' کی ترتیب کے علاوہ سب کام منصورہ نے سنبھال رکھے ہیں۔ ندیم صاحب اس کا ذکر مکرر کرتے ہیں۔

☆۵۷۔ ''ابھی کام کرنے کا جذبہ باقی ہے۔'' یہ جذبہ دمِ آخر تک برقرار رہا۔

☆۵۸۔ صدرِ پاکستان کے نام مجھ ناچیز کے خط کا ذکر۔

رہے۔ وہاں تو میڈیکل سائنس بہت ترقی یافتہ ہے۔ کیا وہاں آپ نے اپنا چیک اپ نہیں کروایا تھا۔ میں آپ کی صحت یابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ سچی بات ہے، آپ سے جو محبت ہے، وہ آپ کی علالت کے حوالے سے بے چین کر رہی ہے۔ اگر ممکن ہو تو مجھے اپنی صحت کے بارے میں مطلع کرتے رہیے۔

میں ان دنوں ٹھیک جا رہا ہوں۔ ایک نیا انہیلر آیا ہے۔ بہت قیمتی ہے مگر صبح کو استعمال کروں تو شام تک کافی رہتا ہے۔ اس کا استعمال مسلسل جاری رکھوں گا۔[۵۹]

"فنون" ۱۲۲ چھپ گیا ہے۔ اس میں آپ کی دو غزلیں اور ایک نظم شامل ہے۔ آپ یہ شمارہ دیکھ کر خوش ہوں گے۔

منصورہ بیٹی آپ کے خط کی آخری سطور سن کر بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ انھوں نے یقیناً میری آخری عمر میں میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ آپ نیا شمارہ دیکھیں گے تو خوش ہوں گے۔ ایک تو اس کا کاغذ اور اس کی معیاری طباعت — اور اس کے ساتھ بیٹی کے بہت محنت سے حاصل کیے گئے اشتہارات! یہ میری اور "فنون" کی خوش بختی ہے، بیٹی آداب کہہ رہی ہیں۔[۶۰]

مکرر دعا اور محبت کے ساتھ۔

آپ کا خیر اندیش

احمد ندیم

۱۲؍ جنوری ۲۰۰۵ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون!

آپ پھر کینیڈا چلے گئے اور اس موسم میں گئے جب کینیڈا میں بسنے والے ایشیائی اپنے اپنے ملکوں میں دو تین ماہ کے لیے آ جاتے ہیں۔ آخر کون سی مجبوری آپ کو بار بار کینیڈا کھینچ کر لے جاتی ہے۔ ظاہر ہے، وہاں آپ کے صاحب زادے مقیم ہوں گے۔ اس کے سوا کوئی سبب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کراچی میں علیل تھے۔ خدا کرے وہاں بہتر علاج کی برکت سے مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے ہوں۔ ممکن ہو تو مجھے اپنی صحت کی حالت سے مطلع فرمائیے۔

میں آج کل علالتوں میں مصروف رہنے لگا ہوں۔ قریب قریب ہر ماہ کسی اسپتال، کسی کلینک میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ آج کل قدرے افاقہ ہے۔ چناں چہ "فنون" ۱۲۳ مرتب کر کے پریس کے حوالے کر دیا ہے۔ میں رسالہ صرف ایڈٹ کرتا ہوں۔ باقی سارے کام منصورہ بیٹی نے سنبھال رکھے ہیں۔

☆۵۹۔ اپنی صحت یابی اور ایک نئے "ان ہیلر" کی جادوگری کا ذکر۔

☆۶۰۔ "فنون" شمارہ ۱۲۲ کا ذکر، عمدہ کاغذ، معیاری طباعت محنت سے حاصل کیے گئے اشتہارات، منصورہ بیٹی کی کارکردگی پر بے حد خوش معلوم ہوتے ہیں۔

میں جواب کا منتظر رہوں گا۔☆۹۱

آپ کا خیر اندیش

احمد ندیم

۷ر فروری ۲۰۰۵ء

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

آپ کا ارشاد درست ہے۔ مجھے دس برس پہلے کا اداریہ نہیں درج کرنا چاہیے تھا۔ کتے کی دم بارہ برس تک بھی نلکی میں رکھی جائے تو جب نکلے گی تو اٹھ جائے گی۔ دراصل مجلس ترقی ادب کی نظامت کے حوالے سے تمام زخموں کو نئے سرے سے چھیڑا گیا تھا، اس لیے میں نے یہ حرکت کی۔ معذرت۔☆۹۲

آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کینیڈا کیوں بھاگے جاتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی موسم تھا، اس برفانی ملک میں جانے کا؟ کیا وہاں آپ کے صاحب زادے مقیم ہیں یا کیا بات ہے؟ میں اس سلسلے میں بالکل لاعلم ہوں۔

بیٹی منصورہ نے بھی مجھے آپ کی طرح روکا تھا مگر مجھے دکھ زیادہ تھا، اس لیے غلطی سرزد ہوگئی۔ منصورہ تو میری توانائی ہے۔ اس نے گزشتہ ستائیس برس میں میری اس حد تک دیکھ بھال کی ہے کہ کوئی کا ہے کو بھی کیا کرے گا۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ وہ بہت جان دار اور مضبوط ہے۔ وہ آداب کہہ رہی ہے۔

ماہ ڈیڑھ ماہ سے کسی اسپتال میں نہیں گیا، اس لیے افاقہ محسوس کر رہا ہوں۔ اگرچہ موسم بہت سفاک ہو رہا ہے۔

دعا اور پیار کے ساتھ۔

آپ کا دعاگو

احمد ندیم

۳۱ر جنوری ۲۰۰۶ء

برادر عزیز و مکرم، سلام مسنون

خدا کا شکر ہے کہ آپ واپس تشریف لے آئے۔ کینیڈا اور امریکا میں ہزار سہولتیں ہوں مگر اپنے

☆۹۱۔ مجھ ہیچ مایہ کے لیے تشویش، کرم خاص، اپنی علالت اور ''فنون'' ایڈٹ کرنے کا ذکر، باقی کام منصورہ کے سر۔

☆۹۲۔ مجلس ترقی ادب کا معاملہ بھڑ کا چھتا ہوا۔ دس سال پرانے اداریے کو دوبارہ چھاپنا بھی مناسب اقدام ثابت نہ ہوا۔ رہا بیوروکریسی سے پنجہ لڑانے کا معاملہ، تو غنیمت جانیے کہ ندیم صاحب کے ساتھ نرمی برتی گئی ورنہ مصطفیٰ زیدی تو منصب کے ساتھ جان بھی گنوا بیٹھے تھے۔

ملک کی مٹی کی خوش بو تو اپنے ملک ہی میں دستیاب ہوتی ہے۔ خدا کرے آپ صحت مند ہوں۔

میں آپ کو اپنے دل کی باتیں لکھ دیتا ہوں، ورنہ عموماً خاموش رہتا ہوں۔ میری صحت آج کل ذرا سی بہتر ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق گھر میں آکسیجن کا بندوبست کرلیا ہے، سو جب بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ مشکل صرف ایک ہے کہ لکھنا دوبھر ہو چکا ہے۔ دو تین افسانے☆[۹۳] دو یا تین یا چار صفحات تک لکھ رکھے ہیں مگر ان کی تکمیل مشکل ہو رہی ہے۔ ویسے ذہن پر سب کچھ واضح ہے مگر لکھنے بیٹھتا ہوں تو تھکن ٹوٹ پڑتی ہے۔ ''فنون'' مرتب کر لیتا ہوں، یہی بہت ہے۔ باقی سارے کام بیٹی منصورہ نے سنبھال رکھے ہیں۔ قدرت نے مجھے یہ نعمت☆[۹۴] بخش کر مجھے میرے کسی نیک کام کا اسی زندگی ہی میں اجر دے دیا ہے۔

''عمر او نثر زیرہ''☆[۹۵] کے بارے میں آپ نے تفصیل لکھ دی ہے، میرے کام آئے گی۔ آپ کی نظم درج کرتے ہوئے یہ تفصیل بطور حاشیہ آئے گی اور یوں پڑھنے والوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔

دعاؤں اور محبتوں کے ساتھ۔

آپ کا

ندیم

۸/ مارچ ۲۰۰۶ء

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

یعنی آپ پھر سے امریکا یا کینیڈا تشریف لے گئے۔ ظاہر ہے اولاد کی کشش نے مجبور کیا ہوگا اور پھر آپ کا یہ ارشاد بھی درست ہے کہ کراچی میں اور امریکا میں رہنا ایک سا لگا۔ یعنی ''گلوبلائزیشن'' نے آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہرحال میری دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں، تندرست رہیں اور روحانی لحاظ سے آسودہ رہیں۔ مجھے اپنے بارے میں مطلع کرتے رہیے گا۔

میں نے عمر سے ہار نہیں مانی لڑائی جاری ہے اور بظاہر ابھی میں ہی فاتح ہوں۔☆[۹۶] آپ نے مجھے مولوی عبدالحق مرحوم☆[۹۷] کے خانے میں رکھا ہے تو یہ میری خوش بختی ہے۔

منصورہ اور ناہید آداب کہہ رہی ہیں۔

میری طرف سے بے شمار دعائیں۔

آپ کا

احمد ندیم

☆۹۳۔ دو تین افسانوں کو مکمل کرنے میں مشکلات، بیٹھ کر لکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

☆۹۴۔ منصورہ کا ذکر ایک نئے انداز میں۔

☆۹۵۔ میری ایک نظم۔

۱۵؍ مئی ۲۰۰۶ء

محبِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

آپ سے رابطہ برقرار رکھنا میرا معیارِ حیات ہے۔ میری طرف سے خاموشی کا کوئی دوسرا مفہوم آپ کے ذہن میں نہیں آنا چاہیے۔ یوں تو مجھے بے شمار اور بے حد و محبتیں حاصل رہی ہیں مگر بعض محبتیں ''خاص'' ہوتی ہیں اور میں نے آپ سے ہمیشہ ''خاص'' محبت محسوس کی ہے۔ دراصل اب بڑھاپا پوری شدت سے حملہ آور ہو چکا ہے۔ (میں آئندہ ۲۰؍ نومبر کو زندگی کے پورے نوے سال پورے کر لوں گا)

اب مہینے میں ایک بار تو ضرور اسپتال کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور اب کے تو پندرہ دنوں میں دو بار اسپتال جانا پڑا کہ دمے کا حملہ شدید تھا۔ ابھی چند روز پہلے اسپتال سے نکلا ہوں۔ ''فنون'' کی اشاعت میں بھی اسی وجہ سے تاخیر ہوتی رہی۔ (اب تو پرچہ چھپ گیا ہے اور آپ کو مل چکا ہوگا یا ملنے والا ہوگا۔ اس میں آپ کی بڑی نظم ''گراؤنڈ سیون'' شامل ہے)۔ چند روز گھر میں پڑے رہنے کے بعد اب دو تین گھنٹے کے لیے محض وقت گزاری کی خاطر دفتر چلا جاتا ہوں اور بہت نحیف ہو چکا ہوں۔ آپ کا خط آتا ہے تو اس میں بے لوث پیار کی جو خوشبو ہوتی ہے، وہ مزید زندہ رہنے پر اکساتی ہے۔ اللہ آپ کو صحت مند رکھے۔ میں آپ کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ بدخط ہو گیا ہوں کیوں کہ پوریں سن ہیں اور قلم ہاتھ سے نکل نکل جاتا ہے۔ منصورہ بیٹی میرا بڑا سہارا ہے۔ وہ آداب کہہ رہی ہے۔ ناہید بھی آداب کہتی ہے مگر وہ اپنے چار بچوں اور بہو اور ملازمت میں مصروف رہتی ہے۔

آپ کا

ندیم

☆☆☆

☆۶۶۔ زیادہ عرصے نہیں رہے، لیکن لڑتے رہے، ہار بھی نہیں مانی، جب تک رہے فاتحوں کی شان سے رہے۔

☆۶۷۔ میں نے اپنے خط میں مولوی صاحب کو ان کے حوالے سے مذکور کیا تھا۔

خصوصی مطالعہ

سیّد مظہر جمیل

''خدا سے بات کرتے ہیں'' پر ایک نظر

سحر انصاری کے پہلے مجموعے ''نمود'' کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فیض صاحب نے لکھا تھا کہ اس کا موضوعِ سخن وہ ہزار گونہ عذاب ہے جو ان دنوں جان مجنوں کو ہر لحظہ درپیش رہتا ہے۔ فیض صاحب نے عصری حسیت کی بنیادی شناخت ہی نا آسودگی کے کرب کو ٹھہرایا تھا جو انسانی رشتوں کی شکست وریخت اور ظلم و جبر کے دکھ جھیلنے والے ہر حساس اور باضمیر تخلیق کار کا مقدر بن گیا ہے۔ غم و اندوہ کی اس کربلا میں کہیں شاعر کی ذات لہولہو ہوتی ہے اور کہیں عقائد و روایات کے آثار منہدم ہونے لگتے ہیں۔ ''نمود'' کی شاعری کو خیال افروز سنجیدہ ذہن کی تخلیق اور جدید ادب و شعر میں ایک معتبر اضافہ قرار دیتے ہوئے فیض صاحب نے اس کے حزنیہ لہجے کی معنی خیز نشان دہی بھی کی تھی۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ''نمود'' کی نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار احساس ہوا کہ ہماری جدید نظم نگاری میں ایک فانی پیدا ہوا ہے، حالاں کہ فانی اور سحر انصاری میں ہر لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ یہاں میری داد اس فرق سے نہیں ہے جو غزل اور نظم کے صنفی تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دونوں کے یہاں غم کی کارفرمائی ہے، البتہ انداز اور رخ مختلف ہیں۔ فانی غم نواز شاعر تھے۔ سحر غم نواز نہیں، غم شناس شاعر ہیں، اس غم شناسی کی اُن کے یہاں کئی جہتیں ہیں جو عہدِ جدید کے علم و ادب کے گہرے مطالعے اور خود ان کی رسیدہ شعری شخصیت سے پیدا ہوئی ہیں۔ مذہب، اخلاق، سیاست اور جسم و جاں کی آمیزش اور آویزش نے آدمی کو کیا سے کیا بنایا اور کیا بنا رہی ہے۔''

سحر انصاری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات بہ طورِ خاص محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ ان کی شاعری آدمی سے آدمی کے اجنبی رہ جانے کے غم کی امین ہے اور اسی غم سے نمو پاتی ہے — یہ وجود کا غم ہے۔ اس نظامِ شمسی میں وجود کے یقین اور اعتبار کا غم ہے۔ تہذیبوں کے مٹنے، ریزہ ریزہ ہوجانے کا غم ہے، معاشرتی حد بندیوں کا غم ہے، سود و زیاں کے پیمانوں سے آدمی کی قدر و قیمت کو گھٹانے بڑھانے کا غم ہے — پروفیسر مجتبیٰ حسین نے رِلکے کی غم زدگی کا حوالہ بھی دیا تھا لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ سحر انصاری کی

شاعری کسی مابعد الطبیعیاتی یاسیت، محرومی اور مایوسی کی شاعری نہیں ہے بلکہ یہ فکرمندی اور بنی نوع انسان کے غم و آگہی کی شاعری ہے۔

''نمود'' کی شاعری پر فیض اور پروفیسر مجتبیٰ حسین کے تاثرات کی روشنی میں اس تازہ کتاب پر نظر ڈالیے تو لگتا ہے کہ شاعری کی حزنیہ فضا اور دردمندی کی وہ کیفیت جو ''نمود'' کی نظموں میں سرایت کی ہوئی تھی، یہاں ایک وسیع تر اور ہمہ گیر دائرے میں سفر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جس میں غم ذات ہی نہیں بلکہ نسل زیاں گزیدہ کے دکھ بھی ایک کائناتی آشوب میں ڈھل جاتے ہیں جن سے یک قطبی نظم عالم کی جبریت آشکارا ہوتی ہے۔ ایسی جبریت جو نام نہاد نئے ورلڈ آرڈر (New World Order) کے خود ساختہ خداؤں کی فسطائی انانیت سے پھوٹتی ہے اور جس نے اقصائے عالم سے قرن ہا قرن کی زائیدہ انسانی تہذیب اور پروردہ تمدن کے ایسے تمام آثار بھسم کر ڈالنے کی ٹھان لی ہے، جس سے غیروں کی سطوت و کمال کی شناخت قائم ہونے کا احتمال ہوتا ہو کہ یک قطبی نظم عالم میں صرف ایک ہی ایسے دستور، قاعدے، ڈسپلن اور ضابطے کی گنجائش ہے جس پر خداوندان نظم عالم کے فرامین تازہ کی مہر تصدیق ثبت ہو۔ چناں چہ عالمی سطح پر طاقت کے اس طاغوتی عدم توازن نے بنی نوع انسان بالخصوص تیسری دنیا کے نسبتاً کم زور، ناخواندہ، منتشر اور پس ماندہ لوگوں کو ایک نئے آشوب وجود میں مبتلا کر دیا ہے اور طرفہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان سگان خیرہ سر کی وحشت و بربریت سے نجات دلانے والی کوئی دوسری طاقت دکھائی نہیں دیتی۔

چناں چہ سحر انصاری کی نظم ''خدا سے بات کرتے ہیں'' اسی عالمی تناظر میں ایک صدائے احتجاج بن کر بلند ہوئی ہے۔ گزشتہ چند عشروں کے درمیان عالمی سطح پر انسانی المیے اور آویزش کی جو صورت پیدا ہوئی، اس نے عالمی ادب کو بھی متاثر کیا، جس کے واضح نقوش ہماری زبان کے فکشن میں بہ طور خاص دیکھے جا رہے ہیں لیکن شاعری میں اس طرز احساس و احتجاج کو جس طرح سحر انصاری نے سمویا ہے، اس کی مثال کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ یہ نظم بھی محض ایک سیاسی ردعمل کی شاعری ہو کر رہ جاتی، اگر سحر انصاری ایک تازہ بالیدگی سے اس کے لیے استعاراتی پیرایۂ اظہار اختیار نہ کرتے۔ ''خدا سے بات کرتے ہیں'' میں انھوں نے انجیل مقدس سے مستعار ایک ایسے استعارے کو مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے جو نہ صرف مابعد الطبیعیاتی حوالہ رکھتا ہے بلکہ بابل و نینوا کی تہذیب و تمدن کے تکمیلی کردار کا حامل ہونے کی بنا پر مشرق و مغرب کی شعریات میں خوب اچھی طرح جانا اور سمجھا جاتا ہے۔ چناں چہ عصر حاضر کے ایک شدید انسانی کرب اور تہذیبی آشوب کے اظہار کے لیے اس استعارے نے ندرت، معنویت اور تاثر پیدا کیا ہے۔

وہ بابل اور نینوا کی تہذیب ہی تو تھی جس کی وراثت عہد بہ عہد سرزمین عراق اور وادی فرات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے اردگرد آباد بستیوں کو منتقل ہوتی رہی ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اس کا شمار ہمیشہ ترقی یافتہ اور افضل ترین تہذیبوں میں ہوا ہے۔ وادی بابل کے لوگوں کو اپنی قادر الکلامی کا وہ غرہ تھا کہ انھوں نے خدا سے براہ راست کلام کرنے کے لیے مینار بابل کی تعمیر شروع کر دی تھی جسے عرش بریں تک

پہنچنا تھا کہ جہاں سے وہ خدا سے مکالمہ کرتے لیکن خداوند خدا کو ان کی یہ شوخ طبعی اور جسارت گوارا نہ ہوئی اور جب مینار بابل تکمیل کے قریب تھا، فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ مینار بابل کو منہدم کر دیا جائے اور پلک جھپکتے، تہذیب وتمدن کا کاخ بلند مسمار کر دیا گیا۔ اس کے پرشکوہ کنگرے کھیل کھیل ہو کر زمیں بوس ہو گئے اور ان کی زبان جس پر انھیں ہزار ناز تھا، ایسے ہی ٹکڑوں میں بٹ گئی جیسے ٹکڑوں میں مینار بابل منہدم ہوا تھا۔ چناں چہ "خدا سے بات کرتے ہیں" کے استعارے میں سحر انصاری نے نیو ورلڈ آرڈر کے بطن سے پھوٹنے والے بھیانک آشوب کی نہ صرف تصویر دکھا دی بلکہ اس وحشت آثار بربریت کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے۔ "خدا سے بات کرتے ہیں" میں جس طرح انھوں نے ان عناصر اور حقائق کو موضوع سخن بنایا ہے، اس نے اس نظم کو معاصر شاعری میں غیر معمولی اہمیت بخش دی ہے۔ ابتدائی مصرعوں ہی میں تہذیب بابل کی قدامت اور تاریخی اہمیت کے اشارے موجود ہیں، ملاحظہ کیجیے

نظر کے سامنے تاریخ بابل خوں چکاں آئی

شہیدوں کی زباں میں داستاں در داستاں آئی

یہیں نمرود نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی

یہیں فرزند آزر نے

دہکتی آگ کو گلزار کا مژدہ سنایا تھا

حمورابی، بنوکدنصر تھے آئین ساز اس کے

چھپے ہیں اس زمیں میں ریزہ ریزہ سارے راز اس کے

مقدر اس زمیں کا وقف نیرنگ زمانہ ہے

فرات اشک میں یا دجلۂ خوں میں نہانا ہے

یہاں پوری نظم کی تشریح کرنا مقصود نہیں کہ میں تو صرف اس نظم کے بعض اہم پہلوؤں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں جن سے موضوع سخن اور ندرت اسلوب کی نشان دہی ہوتی ہو۔ جب سحر انصاری آج کے عشتار بابل سے گلہ کرتے ہیں تو ان کا واضح اشارہ امریکا اور اس کی حاشیہ بردار قوتوں کی طرف ہے جو بزعم خویش آج کے عشتار بابل یعنی خداوندان حیات وممات ہیں:

مرے دل کو گلہ ہے آج عشتار بابل سے

اسے تو عشق پر اور جنگ پر یکساں ہی قدرت ہے

انھی پر عشق کو رد کر کے وہ کیوں جنگ کی خاطر

چلو ہم برج بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

اور پھر خیر وشر کی ستیزہ کاریوں کی طویل خوں چکاں داستان ہے جسے شاعر اشاراتی انداز میں بیان کرتا ہے اور وحشت و بربریت کے ہر واقعے پر برج بابل پہ جا کر احتجاج رقم کرنے کی آرزو کرتا ہے، آگے چل کر شاعر

یک قطبی دنیا کے خداوندوں کے دوغلے پن کو آشکار کرتا ہے۔ جب وہ ظالم کو پیش کرتے ہیں اور اسی کے اقدامات کو جواز بنا کر اسے مظلوم اور اس کی سفاکی کو امن پسندی قرار دیتے ہیں اور اپنی اس طاغوتی منطق کو بنیاد بنا کر نہتا کم زور اور پس ماندہ اقوام کو اپنی مطلق العنانیت کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں کہ ان کے شعلوں سے کچھ تو قوت و حرارت حاصل کی جاسکتی ہے:

جو گھر میں اک دیے کی روشنی کرنے سے قاصر ہوں
وہ دہشت گرد کہلائیں!
جو لمحہ بھر میں زندہ بستیاں تاراج کرڈالیں
وہ امن و آشتی و صلح کے ہم درد کہلائیں!

اور پھر—

سکت کس سمت سے ملتی ہے اب اقصائے عالم میں
کسی کو ظلم کرنے کی، کسی کو ظلم سہنے کی
ستم کاروں کے لشکر فتح پاتے ہیں تو کیوں آخر
رواں ہے بستیوں میں کس لیے سیلاب خوں آخر
جہنم سے زیادہ تند شعلے کیوں دہکتے ہیں
یہ بے تابوت لاشے کس کی آخر راہ تکتے ہیں
چلو ہم بُرج بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

اور آخر میں دنیا کے طول و عرض میں اس دوغلے پن اور تظلم کے خلاف انسانی ضمیر کی بلند چیخ اور صدائے احتجاج کی گونج بھی رائگاں جاتی دکھائی دیتی ہے لیکن شاعر اصرار کرتا ہے کہ قبل اس سے کہ ہماری زبانیں بھی اہلِ بابل کی طرح گنگ ہوجائیں، ہم برج بابل پر خدا سے بات کیوں نہیں کر لیتے کہ جب تک انسان کی احتجاجی صدا بلند کرنے کی صلاحیت باقی ہے وہ زندگی کے غم کدوں میں اپنی آواز سے اپنے وجود کا اثبات کرے اور اپنے ضمیر کو مردنی اور خاموشی سے محفوظ رکھ سکے:

چلو اُس وقت سے پہلے کہ ہم سب گنگ ہوجائیں
مبادا اپنے اپنے غم کدوں میں جا کے سوجائیں
ہمارے تیر مٹ جائیں، کمانیں چھین لی جائیں
مبادا پھر ہماری ہی زبانیں چھین لی جائیں
چلو ہم بُرج بابل پر خدا سے بات کرتے ہیں

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظم میں شاعر کا احساس محض ایک شاعرانہ کیفیت کا زائیدہ نہیں ہے بلکہ اس نظم کے موضوع، آہنگ اور اظہار کے اسلوب میں سحر انصاری نے اس عہد کے زندہ انسانی ضمیر کی

حیات آفریں آواز کو اس کی تمام تر قوت اور روشنی کے ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ اس آواز میں جبر و استبداد کے آہنی پنجوں میں لمحہ لمحہ قریب آتی موت کا سایہ بھی نظر آتا ہے اور وہ حزن بھی جو انسانیت کے اندوہ کا احساس پیدا کرتا ہے۔ سحر انصاری کی یہ نظم اپنے موضوع اور شاعرانہ اظہار کی سطح پر ایک نہایت عمدہ اور فکر انگیز تخلیق ہے۔ یہ ایک طرف اپنے عہد کے بہت بڑے انسانی تجربے کو بیان کرتی ہے۔ دوسری طرف شعری اظہار کی بلیغ تر سطح پر فکری و جذبی عناصر کو یک جا پیش کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک شاعرانہ معجزے کا درجہ پا لیتی ہے۔

☆☆☆

رضی مجتبیٰ

''خدا سے بات کرتے ہیں''—ایک جائزہ

کسی بھی شاعر کی شاعری پر بات کرنے سے پہلے کیا مضائقہ ہے اگر دہرا لیا جائے میلارمے کا یہ قول کہ شاعری خیالات سے نہیں لفظوں سے کی جاتی ہے،اور والیری کا یہ بیان کہ شاعری جس زبان میں کی جاتی ہے، وہ اپنی نفی کر کے غیرلسانی بن جاتی ہے اور ایک ایسی زبان کو جنم دیتی ہے جو کہ اس سے مختلف ہوتی ہے جس کو ہم اصل زبان کہتے ہیں اور جو ایک شاعرانہ کائنات کی تخلیق کرتی ہے۔ اس دنیا کو حقیقت اور خصوصاً اس حقیقت سے کیا نسبت ہے جسے سائنس حقیقت کہتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ہم اسے ہر شاعر کی شاعری کے لیے مثالی نمونہ (paradigm) نہیں بنا سکتے۔ اور ہم ہر شاعر کا کلام پڑھنے کے بعد ہی اس کا تعین کر سکتے ہیں کہ وہ سائنس کے نظریۂ حقیقت سے کتنا متاثر ہے۔ اور یہ بھی کہ کیا اس کا اس نظریے سے متعلق ہونا کسی نئی تکنیک کی ایجاد کی جستجو میں ہے یا نہیں۔ چوں کہ سحر انصاری کے یہاں بھی سائنسی سچائیوں کے تحت یا ان کی چھوٹ سے اُجاگر شعر پائے جاتے ہیں، اس لیے ہمیں آج تک کی حقیقت اور سائنس کے نظریے کے خط و خال سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ بشمول شمس الرحمٰن فاروقی مغرب کے دانش وروں اور نقادوں کی، اس ذیل میں چند آرا کا ذکر کرنا میری رائے میں شاعری کی مختلف جہتوں کے حسن اور ہنر اور معنویت کا شعور حاصل کرنے کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس شعور کو حاصل کرنے کے لیے ایک ایسے ذہن اور ادراک کی ضرورت ہے جو نئے نئے امکانات کو روشن کرے بلکہ ان کو روحانی دائرۂ نگاہ کے محیط میں مرتکز کرے۔ اور پھر ان امکانات کے اظہار اور انکشاف کے (جن میں حرف و بیاں، صوت و سکوت اور عروض اور ڈکشن شامل ہوں) ہر ذریعے کو کسی تازہ دم طائر کے شہپر کی قوت پرواز عطا کرے۔ ایسے ہی کچھ لوگوں کے اقوال میں، نیچے اپنے الفاظ میں درج کر رہا ہوں۔

آئی اے رچرڈز کہتا ہے کہ شاعر کا منصب ہرگز یہ نہیں ہوسکتا سائنس کی طرح کے بیانات رقم کرتا پھرے بلکہ چوں کہ اس کی دنیا ایک تخیلی دنیا ہوتی ہے، اس کو بس poetic truth یا شاعرانہ سچ کے

تابع ہوتے ہوئے بیان مماثل دینا چاہیے جسے وہ Psuedo-Statement کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ بیان اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے ترتیب پاتا ہے جو ہماری اکساہٹوں اور ہمارے رویوں کو از سرِ نو مرتب کرے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات جو اس نے کہی وہ یہ ہے کہ مماثل بیان، جس پر سائنسی بیان حقیقت کی طرح کوئی یقین نہیں رکھ سکتا، سائنسی بیان سے اس وقت تک متصادم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ناجائز اعتبارات یا عقیدوں کو داخل نہیں کرتے۔ اور ایسا کرنا شاعر کے تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ اسی خیال سے inspire ہو کر Aime Cesaire نے کہا کہ شاعرانہ علم سائنسی علم کے سکوت میں جنم لیتا ہے۔ اور آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ سائنسی علم حقیقت حاصل کرنے کے لیے انسان نے جن چیزوں کو قربان کر دیا، وہ ہیں خواہشات، خدشات، احساسات اور نفسیاتی ذہنی بیجاک بلکہ اس غیر ذاتی علم کو حاصل کرنے کے لیے انسان نے اپنے آپ کو غیر شخصی بنا لیا اور اپنی انفرادیت گنوا دی۔ اس بحران سے فرانس کو نکالنے والا شاعر بودلیئر تھا۔ اس کی شاعری کائنات میں سرایت کرتی ہے۔

اس کے بعد آندرے بریتوں کا یہ بیان کہ اس دنیا کی ہر چیز اس روحانی عالم کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں حیات و موت، حقیقت یا تخیل، رفتہ و آئندہ، قابلِ ابلاغ یا ناقابلِ ابلاغ، سب کچھ بغیر کسی تضاد کے منکشف ہوتا ہے۔ ایک اور اہم پہلو جو سحر انصاری کی شاعری کا ہے، وہ سیر و سیاحت اور انسان پر جغرافیائی ماحول کو مختلف تاریخی اور محسوساتی اور جذباتی زاویوں سے دیکھنے اور ان کو اپنی شاعری میں جذب کرنے کا ہے۔ اس حوالے سے وہ مایاکوفسکی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے وسیع مطالعے نے ان کو اگتھیو زیر اور جولیا کرسٹیوا کے نظریات سے روشناس بھی کروایا اور ان کے نظریات سے آگہی نے اُن کی شاعری کو وسعت بھی بخشی ہے۔ جہاں ورڈز ورتھ نے کہا ہے کہ "The world is too much with us" وہاں مایاکوفسکی نے اپنے ایک مقالے میں شاعر کا نام بتائے بغیر یہ مصرع نقل کیا ہے: "Let us bid farewell to the old world"۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان شاعر کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنے آپ کو جہاں چاہے جگہ دے۔ کیوں کہ شاعری جب معروضی ہوتی ہے تو بھی کسی سائنسی قانون کے تحت نہیں ہوتی۔

چوں کہ ''خدا سے بات کرتے ہیں'' میں سحر انصاری نے پہلے نظموں کو جگہ دی ہے، اس لیے ہم اُن کی نظموں ہی پر پہلے بات کریں گے، لیکن ایسا کرتے ہوئے ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر نظم پر ترتیب وار گفتگو کریں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم تمام نظموں پر گفتگو کریں۔ ہم ان نظموں پہ بات کریں گے جو ان کی شاعری کے خط و خال کو بہتر طور پر اجاگر کرتی ہیں۔ سب سے پہلے ''خدا سے بات کرتے ہیں'' پر بات کرتے ہیں۔ اس میں بُرجِ بابل انسان کی خدا تک رسائی کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس نظم میں نمرود کو اس شہر کا بانی بتایا گیا ہے، جو قدیم روایتوں کے عین مطابق ہے۔ مگر اس سلسلے میں کوئی اتفاقِ رائے نہیں۔ اگرچہ یہ بات نظم کی قدر و قیمت طے کرنے میں قطعی کوئی اہمیت نہیں

رکھتی لیکن یہ صرف اطلاعاً لکھا گیا ہے۔ قرآن شریف میں گو براہِ راست اس شہر کی بات نہیں کی گئی لیکن ہاروت اور ماروت کے قصے میں اسی شہر کی بات کی گئی ہے۔ اس شہر میں ساری قوموں کے ابلاغ کی ضرورت صرف ایک زبان تھی۔ روایت کے مطابق خدا کو اس میں انسان کی بالا دستی کا امکان نظر آیا۔ اس نے ساری قوم میں انسانوں کو بکھیر دیا اور ایک زبان کی جگہ ۷۲ زبانیں پیدا ہوئیں۔ خدا یوں قدیم روایت کے مطابق تفرقہ پیدا کرنے کا ذمے دار ٹھہرا (نقلِ کفر، کفر نہ باشد) سحر انصاری نے نظم کی جزوئیات میں خدا کو اس روایت سے ہٹا کر ایک علامتی قوت کی حیثیت دی ہے۔ اس نظم میں خدا سے بات کرنے کے امکان کو سحر انصاری نے خدا اور انسان کے درمیان مکالمے کا استعارہ بنا دیا ہے۔ اس دنیا میں بدی اور شر کی بالا دستی کی مختلف صورتیں دیکھ کر سحر انصاری بھی اقبال کی طرح شکوہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مگر ان کا شکوہ صرف مسلمانوں کے حوالے سے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے حوالے سے ہے، مگر اس شکوے کی ایک لطیف صورت یہ بھی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا سے اس کا جواز یا explanation طلب کیا جا رہا ہے لیکن شر کی اس بالادستی میں شاعر خود اپنی انفرادی اور اجتماعی شناخت چاہتا ہے جو خدا سے بات کیے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات صرف الفاظ ہی میں نہیں بلکہ ان patterns کی وساطت سے بھی کی جا سکتی ہے۔ نظم کے آخری بند میں زبان کے گم ہو جانے کا خدشہ، Solipsism یعنی نفس گزینی کا اندیشہ اور احتجاج کی خو، جو سب کچھ انسان اور انسانیت کے لیے ناگزیر ہے، خدا سے بات کرنے کو اپنے آپ سے بات کرنے میں بدل دیتا ہے۔ اور ملٹن کی Paradise Lost کا سرنامہ یعنی To justify the ways of God to man کی گونج بن جاتا ہے۔ نظم کے یہ ٹکڑے، ''ریزہ ریزہ سارے راز اس کے'' — ''سگانِ خیرہ سر'' — ''بے تابوت لاشے'' — ''رینگتے انسان''، ایسے استعارے ہیں جو ارض و سما کے درمیاں اسی مکالمے کا عکس نظر آتے ہیں جو خدا سے بات کرنے کے مترادف ہے۔ میں اس پوری نظم کو مائیکل انجیلو کی اس پینٹنگ کے، جس میں اس نے خدا اور حضرت عیسیٰ کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے دکھایا ہے، کے برخلاف ان کے قریب ہوتے جانے کے امکان کی تصویر سمجھتا ہوں۔ اس تمام نظم میں سحر انصاری کے لہجے یا الفاظ میں کہیں بھی کوئی اشتعال یا برانگیختگی نہیں پائی جاتی بلکہ ایک ایسا سرد سکون پایا جاتا ہے جو خود بدی کے ارتکاب میں دکھایا گیا ہے۔ اس مقام پر شاعر اپنے لہجے یا اپنی ذات کے بکھراؤ اور سمٹنے کا ایک ایسا سمبل بن جاتا ہے جو انسانی زندگی کی بہت سی متضاد صورتوں کی موجودگی کا جواز دکھائی دیتا ہے۔

اس نظم کے بعد میں ان کی نظم ''کولاژ'' پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ کولاژ فرانسیسی لفظ ہے یعنی Collage — جس کے معنی ہیں بے میل چیزوں کا مجموعہ۔ یہ نظم اسم با مسمّٰی کہلائی جا سکتی ہے۔ نظم مفرور مصرعوں سے شروع ہو کر ایک ایسے بیان پر ختم ہوتی ہے جو ہمیں بہت ہی mundane یعنی دنیاوی لگتا ہے لیکن جس میں تمام مفرور مصرعوں کا سراغ پایا جاتا ہے۔ نظم کسی مخلوط مرکب کی طرح نظر آتی ہے مگر شاعر نے بہت ہی ہنرمندانہ عیاری سے اس بظاہر depoemization یا نظم کو ردِ نظم کی شکل دے کر بھی

اس میں ایک chaotic order یا ایک نظم بے نظم ونسق کی تخلیق کی ہے۔ سحر انصاری کو کولاژ کتنا پسند ہے، اس کی گواہی تو ان کی ساری شاعری ہی دیتی ہے مگر اس نظم میں انھوں نے اپنی کولاژ پسندی کو جو پیکر دیا ہے، اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مختلف قافیے شروع سے لے کر آخر تک اس کولاژ کو ایک ایسا آہنگ بخشتے ہیں جسے تغزل نہ کہنا زیادتی ہوگی جیسے 'گداگر کا پیالہ'، 'ادھورا نوالہ'، 'رنگوں کا جادو'، 'لباسوں کی خوش بو'۔۔۔اور پھر ان قافیوں میں بُعد پیدا کر دیا گیا اور پھر نظم میں ایسے معاملی بیانات جیسے، چند صفحوں میں دنیا سمیٹے، یہ مصرعوں کے ٹکڑے تو روٹی کے ٹکڑوں سے بھی قیمتی ہیں، فن کی کوئی رنگین چادر، اپنے جسم پر لینے کو تیار نہیں، بھونکتے پھرتے کتوں کی خوش فعلیاں، دم ہلاتے ہوئے خواب ترک وطلب، جو اپنے اندر کولاژ کے جوہر کی چکار لیے ہوئے ہیں، اس لیے کہ سحر انصاری نے انھیں زندگی کے سائنسی اور خواب ناک احساس اور منطق سے آراستہ کر رکھا ہے۔ کثیر المناظری اور کثیر الکرداری قاری کو اور خود نظم کو کچھ اس طرح یک جا اور مجتمع کرتی ہے جیسے بُعد سیارگاں یا planatory isolation خلا کو خلا بناتا ہے۔

کولاژ چوں کہ بنیادی طور پر پینٹنگ سے تعلق رکھتا ہے جس کے خالق براک اور پکاسو سمجھے جاتے ہیں، اس لیے سحر انصاری نے نظم میں Goya کا ذکر کیا جو اگرچہ کولاژ سے کبھی بھی منسوب نہیں رہا لیکن جس کا ذکر اس ٹکڑے کو کولاژ میں اپنا رول ادا کرنے میں مدد دیتا ہے 'عورت گویا کا شاہ کار نہیں'۔ یہ بذاتِ خود کولاژ کو فروغ دیتا ہے۔ دراصل کولاژ بیک وقت سنجیدگی اور غیر سنجیدگی سے عبارت ہے اور بے ربط چیزوں کو باہم کرنے کا ایک فن ہے۔ کولاژ میں سحر انصاری پینٹنگ کی اس صنف کو شاعری میں متغیر کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اگر یوں کہا جائے کہ میتھیو آرنلڈ کے کہنے کے مطابق شاعری زندگی پر تنقید ہے تو کولاژ سے بہتر زندگی پر تنقید اور کیا ہو سکتی ہے جو بے میل اور بے جان متی کے جوڑے ہوئے تاتے کی طرح ہے۔ انحرافات اور ارتکاز کی بیک وقت تعبیر۔

سحر انصاری کی نظم یا نثری نظم ''سالگرہ کا تحفہ'' بھی کولاژ کی تکنیک کو اپنائے ہوئے ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے مجھے ٹی وی پر zapping کرنے کا سا احساس ہوا۔ یعنی ایک چینل سے دوسرے چینل پر تیزی سے جانے کا۔ اس نظم کا تعلق نظم کی ابتدا میں محبت کے حوالے سے know-how کی بات کرنے کی ادا سے بہت قریب کا ہے۔ اس میں جگہ جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال اکثر طنز بھرا اور کہیں کہیں تلخ جیسے کہ اس بند میں جس میں Nausea سے لے کر سنڈریلا تک کو استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سحر انصاری کی جدت خوئی، جدت جوئی اور جدت پسندی سب کو محیط ہے۔ اگر میں کہوں کہ سب کچھ alienation یعنی مغائرت کے شدید احساس کی وجہ سے ہوا تو غالباً میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا ہوں گا۔ اس میں کئی سوشل اور معیشت میں استعمال ہونے والے statements واوین میں لکھے ہوئے اس مغائرت کے احساس کو اور بھی کام گر بناتے ہیں۔ بندر اور بندریا کا ذکر ڈاروِن کی یاد دلاتا ہے اور پوری نظم کو خود شاعر کے پیدا ہونے سے لے کر اس نظم کو تخلیق کرنے تک کے زمانے کو ایک ایسا تحفہ بنا دیتا ہے جس سے شاعر ایک irony میں قید اور اس سے محظوظ ہوتا بھی نظر آتا ہے۔ اس نظم کے اسٹلز کو کسی تخیلی پروجیکٹر پر چلا کر

ہی اس کی حرکی سرشت سے واقف ہوا جا سکتا ہے۔ ان کی نظم ''قلوپطرہ'' کے اس حصے نے جس میں انھوں نے کہا کہ ''میں نے پہلے حسن کی تکمیل کو اس قدر گہری نظر سے نہیں دیکھا تھا'' مجھے انگریزی کے Metaphysical poets بالخصوص جون ڈن کی یاد دلائی۔ مجھے ان کی نظم ''خرام ناز'' نے زندگی کو ایک محبوبہ کی طرح دیکھنے کی ایسی ترغیب دی کہ میں عہد شباب کی یادوں میں کھو کر رہ گیا۔ ان کی باقی نظمیں چوں کہ ان ہی محاسن کو لیے ہوئے ہیں لہٰذا میں انھیں قاری کی اپنی valuation کی خاطر چھوڑ رہا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم اب سحر انصاری کی غزل کی طرف آتے ہیں۔

سحر انصاری کی غزل میں جن احساسات سے ہم دو چار رہتے ہیں، وہ تو تقریباً ہر جدید غزل گو کے یہاں پائے جاتے ہیں، مثلاً احساسِ تنہائی، بے آسرا پن، انسانی اقدار کی بے حسی سے پامالی کا دکھ، اور احساسِ مغائرت یا alienation۔ اپنے آپ سے، اپنی سوسائٹی سے اور کبھی کبھی خود اپنی شاعری سے (یہ بات سحر انصاری کے سوا اور کہیں نہیں دیکھی میں نے) ان کی شاعری یوں تو علامتوں اور استعاروں سے بھری پڑی ہے مگر کچھ استعارے خاص توجہ کے مستحق ہیں: مثال کے طور پر گھر، خواب، حرف و بیاں، آئینہ اور دریا اور بذات خود زندگی۔ جدید غزل ہی کیا روایتی غزل میں اس موضوع پر غزل کے اشعار پائے جاتے ہیں مگر جدید غزل میں اس کا اظہار نئے نئے اسالیب میں ہوا ہے اور اسی بات نے اسے جدید غزل کی پہچان بنا دیا ہے۔ سحر انصاری کی غزل کی ایک خاص بات جو مجھے نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کے اس دور میں انسانی ذات کی چھوٹ کا کوئی نوحہ یا اس پر سینہ کوبی کرتے ہوئے الفاظ نہیں ملتے بلکہ ایک باوقار قوتِ برداشت، ایک تحمل اور ایک انسانی وقار کو برقرار رکھنے والا شعور جو یقیناً ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے، اسے ہم شعروں کی ہیئت اور اس کے آہنگ میں بدرجۂ اتم پاتے ہیں اور یہ ہمیں بھی دورِ حاضر کی زندگی کے مسائل سے دلیرانہ نمٹنے کا شعور اور حوصلہ بخشتے ہیں۔ یہ ان کی غزل میں اخلاقی جمالیات کے ایک ایسے پہلو کو شامل کرتا ہے جو شاید ہی کسی جدید غزل گو شاعر کے یہاں اس طرح پایا جاتا ہو۔

کچھ سیاسی موضوعات بھی ان کی غزل میں پائے جاتے ہیں جو اس دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں مگر انھیں ہم اس تغزل سے جدا نہیں کر سکتے جس کا دامن سحر انصاری کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ محبت سحر انصاری کے یہاں تنہائی کا مداوا ہونے کی بجائے اس کا سبب ہے۔ ایک اور بات جو ان کے محبت کے سلسلے میں پائی جاتی ہے، وہ ہے عشق کی بے کسی اور بے چارگی۔ پھر اپنے داخل کے سلسلے میں کبھی کبھی ان کی شاعری ریمبو کے اس قول کی یاد دلاتی ہے کہ "I is another"، اس کو اسٹینر نے یوں کہا، "I is an other"۔ ان کی غزل جو موضوعات معروضی اور سائنسی حقائق سے متعلق ہیں، ان میں ابہام کا پایا جانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ سائنس کے ہاتھوں انسانی محسوسات اور ادراک کو معروضی تعین سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ان سب باتوں کو مستحکم کرنے کے لیے میں ان کی غزلوں سے اشعار تو پیش کروں گا ہی، مگر مجھے ان کے قاری کو یاد دلانا ہے کہ شاعری بین السطور میں پائی جاتی ہے، اسی لیے شعر کی ہیئت اور content میں لفظوں کے باہمی روابط، ان کے انسلاکات اور ان کی ایک دوسرے سے روشنی کو

مدِ نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ آیئے، اب سحر انصاری کے مختلف شعروں سے اوپر کی باتوں کی روشنی میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کسی بھی زخم کا دل پہ اثر نہ تھا
کوئی یہ بات جب کی ہے، جب چارہ گر نہ تھا

کوئی اس شعر کے جو گداز حسن و عشق کے حوالے سے سمو دیا گیا ہے، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دراصل چارہ گری ہی سے دردِ دل کو نمو اور فروغ ملتا ہے۔ ان لوگوں جن کو عشق و محبت کے معمولات میں محبوب کا ستم گر ہونا ہی عشق کے تجربے کو ایک عمیق جمالیاتی تجربہ بنانے کا سبب ہوتا ہے، یہ شعر تڑپا کے رکھ دینے کے لیے کافی ہے۔ مجھے یہ شعر لورکا کی نظم "خزاں کا گیت" کی وہ سطریں یاد دلا رہا ہے جن میں وہ کہتا ہے "Que sera del crozon, si elle amour ne tiene flechas?" جس کا ترجمہ جس قدر بھی ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ — دل کا کیا ہوگا؟ اگر محبت تیر نہ برسائے! (ممکن ہے سحر انصاری نے لورکا کی یہ نظم پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ احساسات اور خیالات بھی پرندوں اور پھولوں کے بیجوں کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں migrate کرتے ہیں) اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

بنائے جاؤں کسی اور کے بھی نقشِ قدم
یہ کیوں کہوں کہ مرا ہم سفر نہ تھا کوئی

اس شعر کی ساری خوبی دنیا کی انسلاکاتی کثرت مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں شاعر کا یہ کہنا کہ اپنے تنہا ہونے کا اعتراف کیوں کروں جب کہ میں رہ گزر پر کسی اور کے نقشِ قدم بنا کر یہ تصور کر سکتا ہوں، میرے ساتھ اور بھی کوئی سفر کر رہا ہے۔ شاعر کی catharsis کی حقیقت کا گہرا شعور رکھنے پر دلالت کرتا ہے۔ لفظ 'بنائے جاؤں' میں جو لطیف سا اشارہ آرٹ کے دل فریب ہونے کا اور ساتھ ہی mimesis کی دل فریبی کا ہے، اس کا تو جواب نہیں۔ عام بول چال میں ہم جب بھی کہتے ہیں، کیوں بنا رہے ہو، اس میں دوسرے کی عیاری کا احساس ہونے کے باوجود ہم خوش تو بہرحال ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی اور گریز پا بارکی کو جس طرح سحر انصاری نے اپنی گرفت میں لیا ہے، چاہے انھیں خود اس کی خبر ہو یا نہ ہو، اس کا جواب نہیں۔

اسی غزل کا ایک اور شعر جو الم ناک بھی ہے اور اپنی الم ناکی میں زندگی کا بھرپور استعارہ بھی ہے، وہ ہے:

عجیب ہوتے ہیں آدابِ رخصتِ محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

دنیا ایک محفل بھی ہے لیکن اس رخصت ہونے کے آداب (اس لفظ کے انتخاب کی جتنی داد دی جائے کم

ہے۔ اگر اصول کہہ دیا جاتا تو شعر کا سارا حسن معروضیت کی کثافت میں غلطیدہ ہو جاتا) بھی ہیں۔ اور ان آداب سے آشنائی ہی محفل میں شریک ہونے کے عارضی لطف اور تنہائی کے احساس سے بچنے کی ضامن ہے۔ جس کا گھر نہ ہو، اس کو بھی معلوم ہے کہ مجھے بالآخر محفل کے آداب بجا لاتے ہوئے محفل سے رخصت تو ہونا ہے ہی۔ غالب کا مصرع یاد آرہا ہے کہ:

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مگر 'عجیب ہوتے ہیں' کے ٹکڑے نے شعر میں جو استعجاب اور غم انگیزی کے عناصر کو داخل کیا ہے، اس سے یہ شعر زندگی کی بہ یک وقت سفاکی اور ہمدمی کا استعارہ بن گیا ہے۔ اس کے بعد میں ان کے ایک بہت خوب صورت شعر پر بات کر کے آپ کو دوسرے منقولہ اشعار کی قدر و قیمت مقرر کرنے کے لیے چھوڑ دوں گا، اس لیے کہ ہر قاری کے لیے کوئی بھی شعر اس معنی، مفہوم یا احساس اور جمال کا ترجمان نہیں ہوتا جو کسی دوسرے قاری (جس میں نقاد بھی شامل ہے) کی رائے میں ہوتا ہے۔ اور وہ شعر ہے:

میں ہوا کی طرح ٹھہرا تھا سرِ شاخِ گلاب
وہ بھی اپنے جسم کی خوش بو سے پہچانا گیا

اس شعر کو میرا جی چاہتا ہے کہ میں pure poetry کی مد میں شامل کروں۔ اس شعر کی شرح کرنا، گلاب کے پھول کی پتیاں نوچ کر اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرنے کے مترادف ہے۔ بہر حال میں چاہوں گا کہ اس شعر کو پڑھتے ہوئے قاری ہوا، ٹھہرا اور خوش بو کے استعاروں سے وہ کائنات تعمیر کرے جسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کے شعور کو (یا لاشعور کو) ہم زمان و مکان میں اپنے لیے ایک گھر بناتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ جب ہی ممکن ہے جب شاعر اپنے مشاہدے اور اس سے پیدا ہونے والے احساس کو آفاقیت بخشنے پر قادر ہو۔ اس شعر میں 'پہچانا گیا' کے لفظ سے اخفائے ذات کی خواہش کی نشان دہی کرتا ہے جو بہر حال اپنی انتہائی تجزیے میں ایک غم انگیز کاوش ہے۔ مگر اس غم میں مبتلا ہو کر نمود کی گرفت میں آنا ایک real presence بن جاتا ہے۔ اس شعر کو کہتے ہوئے انھوں نے یقیناً خود سے والیری کی طرح کہا ہوگا۔ "Sois sage'o ma Douleur'et" tiens-toi plus tranquilee یعنی اے دردِ دل، متوازن رہنے کی کوشش کر، اور اپنے آپ کو سکون کی قبا دے (میں اس ترجمے سے قطعی مطمئن نہیں۔ مگر کیا کیا جائے)۔ سحر انصاری کے وہ اشعار جن میں سائنسی انکشافات کو اپنے content میں شامل کیا ہے، وہاں ان کی قطعیت کو 'سنا ہے' یا 'معلوم ہوا' جیسے الفاظ کا استعمال کر کے اس کے اپنے احساس اور اعتبار سے منسلک کر دیتے ہیں اور وہ یوں poesis کا تابع رہ کر شعر کے تخیلاتی اور جمالیاتی ہالے میں شامل ہو جاتا ہے، مثلاً یہ دو شعر:

سنا ہے میں نے صدائیں کبھی نہیں مرتیں
پکارتے رہیں یارانِ رفتگاں سے کہو

اور پھر گواہی لائیں اپنے زندہ ہونے کی سحر
پھر کسی سنسان بستی میں صدا کرتے چلیں

دو اشعار میں سائنس جیسی قطعیت کا فقدان ہے۔ پہلے شعر میں یہ فقدان لفظ 'سنا' اور دوسرے میں 'لائیں' اور 'چلیں' کا امکانی لہجہ ان دونوں اشعار کو شاعر کی ذات کے حوالے سے مرکز جو بناتا ہے۔ اور آخر میں مجھے اس شعر کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے:

نہ وہ پہلی سی تڑپ ہے نہ وہ پہلی سی امنگ
دل کو کیا ہو گیا دلدار تک آتے آتے

اس ضمن میں میں بورس پاسترنک (Boris Pasternak) کے یہ دو مصرعے سنانا چاہتا ہوں:

All becomes dull, as you grow familiar
days pass,years pass, thousands and thousands of years

اب میں آپ کو سحر انصاری کے وہ شعر سناتا ہوں جو ان کے شاعری کے خط و خال کو اجاگر کرتے ہیں:

ہمیں خود اپنی نظر پر یقیں نہیں آتا
جو دیکھتے ہیں کسی کی نظر بدلتے ہوئے

اب کہاں لے جا رہی ہے جستجو تعبیر کی
کیا ہمارا ایک خواب رائگاں کافی نہیں

اڑا کے لائی ہے مجھ کو خیال کی خوش بو
تمھاری سمت ضرورت سے میں نہیں آیا

جانے کیوں رنگِ بغاوت نہیں چھپنے پاتا
ہم تو خاموش بھی ہیں، سر بھی جھکائے ہوئے ہیں

ہم تو اک حرف محبت سے بھی مر سکتے ہیں
تیر کیوں ڈھونڈ کے لاتے ہو نشانے کے لیے

کہاں ہر ایک کی قسمت میں ہے اجر عبادت بھی
جبینیں مل تو جاتی ہیں مگر سجدہ نہیں ملتا

ہجوم حرف و معنی ہے بہت اطراف میں پھر بھی
جو کہنا چاہتے ہیں، اس کا پیرایہ نہیں ملتا

آتے ہیں یاد پیچ و خم زندگی بہت
لیکن خیال کاکل و گیسو بھی کم نہیں

یہ شعر غالب کے شعر کی یاد دلاتا ہے:

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مگر اس پر سحر انصاری کے اسلوب کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ جیسے کہ ایذرا پاؤنڈ نے کہا کہ آپ چاہے جتنے بھی عظیم شعراء سے متاثر ہوں یا تو ان کا اقرار کیجیے یا پھر ان کی پردہ پوشی کا ڈھنگ سیکھیے اور اس ڈھنگ سے سحر انصاری نے اپنے مندرجہ بالا شعر میں خوب کام لیا ہے۔

بگی باتوں کے افسانے ہم سے کیا دہراتے ہو
بگی بات تو وہ بھی ہے جو لکھنے کے شائستہ نہیں

دوام مانگ رہا ہوں گزرتے لمحوں سے
ہے زندگی سے محبت ہی زندگی کا تضاد

رہ حیات میں سوچا نہیں سحر ہم نے
قریب پڑتی ہے منزل کہاں سے جاتے ہوئے

ان تمام منقولہ بالا اشعار کے آئینے میں آپ سحر انصاری کی غزل کے خط و خال بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں خود اپنے شعروں کی گونج بھی ملے گی اور مغرب کے کچھ شعرا کی بھی مگر یہ گونج سحر انصاری کا لہجہ اور رنگ لیے ہوئے ہے۔ پھر بھی اس میں آپ کو سحر انصاری کی شخصیت کہیں نہیں ملے گی۔ میں ان سے بالمشافہ کبھی نہیں ملا اور ان کی شاعری میں بھی ان کو دیکھ پانے کی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ ہر حقیقی شاعر کی شاعری اپنی ذات سے گریز میں پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ گریز کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرے تو شاعری اتنی ہی پُر اثر ہوتی ہے۔ سحر انصاری کی شاعری آپ کے سامنے ہے، لیکن کیا سحر انصاری بھی آپ کے سامنے ہیں، اگر آپ دیکھ رہے ہوں تو مجھے بھی بتائیے۔

☆☆☆

مبین مرزا

''کنجری کا پُل''— چند باتیں

گمان غالب ہے کہ ۱۹۸۶ء کے آخری دنوں میں کوئی دن تھا، ڈھلتا ہوا دن۔ مجلس ترقی ادب کے ایک کمرے میں جہاں یونس جاوید اپنے دفتری فرائض انجام دیتے تھے، بات چل رہی تھی یونس جاوید کے افسانوں کی۔ وہ اُن دنوں اپنے افسانوں کے دوسرے مجموعے ''آوازیں'' کی کمپوزنگ کی پروف خوانی کر رہے تھے، جو فیروز سنز کے زیر اہتمام اشاعت کے مراحل میں تھا۔ گفتگو کے دوران بات ناول کی بات ہونے لگی۔ ہم نے اُن سے کہا کہ آپ نے افسانے، ڈرامے اور طویل ڈرامے تو سب لکھ لیے، اب ناول لکھنا چاہیے آپ کو۔ انھوں نے ترنت جواب دیا، ''او نئیں یار، ابھی کہاں ناول۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا!'' ہم نے کہا۔

بولے، ''میرا خیال ہے، ناول تو آدمی زندگی میں ایک ہی لکھتا ہے— تو بس یار لکھا جائے گا آگے کبھی۔''

''وحدت کا معاملہ تو عشق میں ہوتا ہے۔'' ہم نے جواب دیا، ''آپ اسے ناول کی شرط کیوں بناتے ہیں؟''

بس یہیں گڑبڑ ہوئی۔ اس کے بعد گفتگو عشق اور وحدت کے مباحث کی طرف جا نکلی اور ناول کا ذکر بیچ میں ہی رہ گیا۔

اب جو یونس جاوید کا ناول ''کنجری کا پُل'' موصول ہوا تو یک بہ یک ذہن میں برسوں پرانا یہ مکالمہ خود بہ خود تازہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی کچھ اور سوالات ناول پڑھنے سے پہلے ذہن میں آنے لگے، مثلاً کیا یہ وہی ناول ہے جس کا تصور یا خاکہ اُس وقت یونس جاوید کے ذہن میں رہا ہوگا جب وہ ایک ہی ناول لکھ جانے کا مؤقف رکھتے تھے؟ کیا کوئی اہم، خاص یا بڑا تخلیقی تجربہ فن کار کے تخیل کی زمین سے ساری زرخیزی سمیٹ کر لے جاتا ہے اور اپنے پیچھے بانجھ پن چھوڑ جاتا ہے؟ وہ زمانہ جس کی سرشت مرکز گریز قوتوں سے مرکب ہے، کیا تخلیقی فنون میں منقسم اکائی کی صورت ظہور کرتا ہے؟ کیا آج کا تخلیق کار

اپنے کرداروں کو کسی زندہ حقیقت کے تعلق سے دریافت کرنے کے بجائے ان کے احوال کی مجہولیت کو فن بنانے سے دل چسپی رکھتا ہے؟ عہدِ جدید کے فن کار کا تمام تر سروکار کیا اب صرف زندگی کی اُفقی جہت سے رہ گیا ہے، عمودی جہت سے اُسے کوئی علاقہ نہیں؟ جدید ادب افراد، معاشرے اور تہذیب کے اَنفس کو مکمل طور پر نظرانداز کر کے کیا صرف آفاق کے سہارے بڑا ادب پیدا کرسکتا ہے؟ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان سب سوالوں کا جواب یہ ناول نفی میں دیتا ہے۔ کیوں اور کیسے، اس پر ہم ذرا آگے چل کر بات کریں گے۔

اصل میں یہ اور اسی نوع کے بعض دوسرے سوالات عہدِ جدید اور اس کے ادب وفن کی بابت کچھ وقت سے توجہ طلب رہتے ہیں۔ اس ناول کو دیکھ کر یہ سوالات ایک طرح کے ضابطہ دار تسلسل میں ذہن کو مہمیز دینے لگے۔ ناول کے مطالعے سے پہلے ان سوالوں کے ذہن پر اس طرح یورش کرنے کا ایک خاص سبب تھا— اس ناول کا عنوان ''کنجری کا پُل''۔ اصل میں یونس جاوید کے اس ناول کا عنوان اب تک کی اردو ناول کی تاریخ میں غیررسمی تو خیر ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک طرح کا کھُردرا پن لیے ہوئے بھی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ عنوان ایک طرح کی رومانی اپیل بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ اپیل اس عنوان کے پہلے لفظ کی پیدا کردہ ہے جو دراصل انسانی سائیکی سے بالعموم اور برصغیر کی معاشرتی نفسیات سے بالخصوص علاقہ رکھتی ہے۔ فکشن سے دل چسپی رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ برصغیر کے افسانوں یا افسانوی ادب نے دو کرداروں سے بطورِ خاص اعتنا کیا ہے اور وہ ہیں طوائف اور مرشد (صوفی)۔ یہ بجائے خود نہایت دل چسپ اور فکرانگیز مطالعہ ہے کہ دیکھا جائے کہ بہ یک وقت ایک سطح پر مماثلت اور دوسری سطح پر تضاد کا رشتہ رکھنے والے ان دو کرداروں نے برصغیر کی حیاتِ انسانی یا اُس کے social fabric میں جو رنگ اُبھارے ہیں، وہ اُس کی ہیئتِ اجتماعی کو تاریخ کے مختلف ادوار میں کیا وضع دیتے آئے ہیں؟ دیکھا جانا چاہیے کہ اُن کی انفرادیت تہذیب و معاشرت کے دائرے میں ظہور کرنے والی حیاتِ محض کی صورت گری کس طرح کرتی ہے؟ خیر، یہ ایک الگ موضوع ہے، ہم بات کر رہے تھے ''کنجری کا پُل'' کی۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس عنوان کا انتخاب ڈراما نگار یونس جاوید اور تہذیب و تاریخ کے محقق یونس جاوید نے مل کر کیا ہے، بلکہ ناول کے مطالعے کے بعد تو یہ بات پوری ذمے داری سے کہی جاسکتی ہے کہ صرف ناول کے نام پر ہی موقوف نہیں، پورا ناول اس تخلیق کار نے گاڑھا ہے جس کی اکائی ان دونوں کی ترکیب سے قائم ہوئی ہے۔ ناول نگار یونس جاوید کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اپنی ان دونوں جہتوں سے پورا کام لیا ہے اور امتزاجی کیفیت کے ساتھ لیا ہے۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ فن کار کے یہ دونوں رُخ پوری طرح اور آسانی سے باہم ملتے نہیں ہیں۔ ان میں سے اگر ایک قائمہ زاویے پر آتا ہے تو دوسرا خود بہ خود سرک کے منفرجہ زاویے پر چلا جاتا ہے۔ کبھی دانش ور یا محقق کا پلڑا بھاری تو کبھی ڈراما نگار کا۔ کبھی ایک کھلواڑ کرتا ہے تو کبھی دوسرے کا داؤ چل جاتا ہے۔ چناں چہ ہم آہنگی کا فقدان فن کار کی عاجزی اور فن کی ابتری کا نمونہ بن جاتا ہے، لیکن

یونس جاوید نے اپنی ان دونوں جہتوں سے سنبھل کر کام لیا ہے اور خوب لیا ہے۔

کیا مضائقہ ہے جو اسی رَو میں ایک ڈیڑھ بات اس ناول کی تکنیک کی بابت بھی ہو جائے۔ ویسے تو ہمارے یہاں اب تکنیک کو ستمہ بند نقادوں نے گھاس ڈالنا چھوڑ دی ہے (ایک تکنیک ہی کیا، ہر غور طلب اور بحث انگیز شے کو ڈالنا چھوڑ دی ہے کہ اب یہ گھاس خود اُن کے کام آنے لگی ہے) لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ فکشن کا تو اونٹ بیٹھتا ہی تکنیک کی کروٹ ہے۔ اگر تکنیک درست نہ ہو تو بڑے سے بڑے موضوع پر لکھا گیا ناول کوڑے کا ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب رہا تکنیک کا ماجرا، تو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ تکنیک الہ دین کے چراغ کا جن نہیں ہوتی کہ ایک بار ہاتھ لگ جائے تو عمر بھر کھیل تماشا چلتا رہے۔ یہ تو ہر بار اکھاڑے میں اُتر کے پہلوانی دکھانے اور داؤ آزمانے والا کام ہے۔ اگر نہ آزمایا جائے تو سورما چاروں شانے چت اور لنگوٹ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اس بات کو مثال سے سمجھنے کی ضرورت ہو تو ''اداس نسلیں'' والے عبداللہ حسین کا ناول ''نادار لوگ'' پڑھنے سے بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں یونس جاوید نے تکنیک سے بھی عمدہ کام لیا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ناول کے موضوع کی گمبھیرتا، کرداروں کے پیچھے کام کرتی زندہ حقیقتوں، معاشرے کی اجتماعی ذہنیت میں بار بار ظہور کرتی سفاکیوں، انسانی جبلت کی اندوہناکیوں اور تقدیر کے المیوں کو سہارنے اور ان سب کو کہانی کے سانچے میں اُتارنے کی جو سکت اس کے بیانیے میں ہمیں نظر آتی ہے، وہ دراصل اس کی تکنیک کی پیدا کردہ ہے۔ صیغۂ واحد حاضر کے بیانیے سے شروع ہونے والے قصے میں جب آگے چل کر راوی پہلے غائب ہوتا اور بعد میں روپ بدل بدل کر سامنے آتا ہے تو بادی النظر میں یہ ناول کا عیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ عیب اُس وقت ہنر میں بدل جاتا ہے، جب بل کھاتی کہانی ڈرامے، رپورتاژ، صحافت اور تاریخ کے عناصر کو سمیٹتے ہوئے صیغۂ واحد غائب (راوی) کا وہ narrative بن جاتی ہے جو برسوں بعد کے مستقبل کو اطمینان کے ساتھ اٹھا کر ماضی کے روشن دان میں لا رکھتا ہے۔ یہاں وقت کے سب دھارے آپس میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ خواب، عذاب اور سراب میں فرق ممکن رہتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ یہاں وقت کا پردہ ہی چاک نہیں ہوتا، آدمی کا اور اس کی زندگی کا حجاب بھی اٹھ جاتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس ناول کی معنویت میں اس کی تکنیک کا تجربہ خود ایک بنیادی کردار ادا کرتا مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس ناول کے موضوع کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُسی بنیادی سوال سے سروکار رکھتا ہے جس کی تفتیش صدیوں سے برصغیر کی کہانی کا مسئلہ ہے — یہ کہ انسان کی خواہش اور اس کے عمل کی سچائی ایک ہے یا پھر دونوں الگ الگ ہیں، عمل اور تقدیر کا باہمی رشتہ حقیقی ہے کہ اضافی اور تقدیر کے دائرے میں جبر و قدر الگ کیسے ہوتے ہیں اور اس حوالے سے جزا و سزا کا منطقی جواز کیا ہے؟ یہ سوال بڑا ہے، بہت بڑا۔ انسانی خواہش، اس کے عمل اور تقدیر کے سوال ویسے تو دنیا کے سارے بڑے ادب میں

کسی نہ کسی سطح پر ظاہر ہو کر رہتے ہیں، تاہم برصغیر کی کہانی نے اپنے تار و پود میں ظاہر ہونے والی مخصوص ذہنی ساخت اور فکری مزاج کی بنا پر اپنا سفر جبر و قدر کے سوالوں کی سرحد تک بڑھایا ہوا ہے، سو یہاں معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ اِدھر بات حدِ ادب سے نکلی اور اُدھر آدمی سوالوں کے برزخ میں جا پڑا — اور پھر پتا بھی نہیں چلتا کہ کب تشکیک کی آگ میں اور کب اس سے بھی آگے انکار کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ برصغیر نے بڑے کہانی کار اسی لیے پیدا کیے ہیں کہ اس کی مٹی میں سوالوں کا لوچ بہت ہے۔

یونس جاوید کا یہ مختصر ناول بھی سوالوں سے چھلکتا ہے، اور ان میں ایک سے ایک دبیز سوال ہے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں تو یہ کہنے میں باک نہیں کہ اس ناول کے سارے ہی اہم کردار اپنی جگہ ایک سوال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظہرہ مشتاق، فیروزے اور صبا زادی اگر ایک طرف جھونپڑی اور کٹیا سے چل کر محل تک پہنچتے ہوئے پرآسائش زندگی میں سیر آفاق کا سوال ہیں تو دوسری طرف اپنی داخلی جستجو اور باطنی مطالبے کے ہاتھوں اذیت و اندوہ سے گزرتے اور انجام تک پہنچتے ہوئے یہ تینوں عورتیں سیر انفس کے سوال میں ڈھل جاتی ہیں۔ اسی طرح ناول کے نمایاں مرد — دیوان عاشق حسین بخاری، جام مصدق، سلمان گوہر اور کاشف خان جس پر نگاہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ ہیئت اجتماعی یا تہذیب انسانی کے اُس ضمیر کا سوال ہے جس کی قلب ماہیت ہو چکی ہے، جس نے اپنے خیر کے جوہر کو شر کے چقماق سے خاکستر کر ڈالا ہے اور اپنی قدرت و اختیار کے ہاتھوں کائنات گیر برہنگی کا نشان بن چکا ہے۔ صرف افراد پر موقوف نہیں، اُن کے احوال اور وقت کے تغیرات تک اس کہانی میں سوالوں کی منہ زور موجیں بن کر اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، اس پورے ناول میں ایک مقام ایسا نہیں آتا جو اضطراب سے خالی ہو۔ حتیٰ کہ وہ مقامات بھی نہیں جنھیں ناول نگار نے جسم، جنس، شوق اور لذت کے sensuous بیان سے آراستہ کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ساری آرائش یونس جاوید نے بیانیہ کو قابلِ برداشت رکھنے اور حقائق کی بدصورتی کو دھیرج سے کھولنے کے لیے صرف ظاہر میں کی ہے، لیکن ان حالات اور واقعات کو دیکھیے، ان کی تہ میں بھی سوالوں کی چنگاریاں بھری ہوئی ہیں۔

برصغیر کی کہانی کے تناظر میں طوائف پرانا کردار ہے، سو ماننا چاہیے کہ اس کی کہانی نئی نہیں ہو سکتی۔ ہاں، اس کا تجربہ اور اس تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج مختلف ہو سکتے ہیں — لیکن یہ فرق محض کیفیات کے مختلف ہونے کی وجہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ اُس کی روح کے مطالبات کا فرق ہوگا۔ یونس جاوید نے ظہرہ مشتاق (طوائف) حضرت بابا عطار (روحانی مرشد کا التباس) جام مصدق، سلمان گوہر اور کاشف خاں (اقتدار، اختیار اور دنیا) کے روپ میں بے شک کردار ابھارے ہیں، لیکن یہ کردار حیاتِ انسانی کی متضاد اور سفاک صداقتوں کو گرفت کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے کرداروں کے ساتھ، دیکھا یہ گیا ہے کہ ایک مشکل پیش آتی ہے، کہ اُن کی تقدیر اور اُس کا رکھ رکھاؤ اس درجے بڑے اسکیل پر ابھرتا ہے کہ ان کے سامنے پورے کا پورا معاشرہ پچک کر رہ جاتا ہے۔ یونس جاوید نے ایسے سارے مراحل پر

کرداروں ہی کو نہیں، ان کے تقابل میں معاشرے کو بھی سمجھا ہے۔ اس طرح یہ کردار زندہ ہی نہیں بنتے بلکہ انسان ہی رہتے ہیں اور ان کا معاشرہ اپنے ردِعمل، فیصلے، لاتعلقی اور بے حسی میں ایک طرف ان کے قد کو ابھارتا جاتا ہے تو دوسری طرف اپنے خدوخال بھی پوری طرح نمایاں کرتا ہے۔ یوں کہانی حیاتِ محض کے زندہ تجربے میں ڈھل جاتی ہے — چناں چہ ناول کے اختتام پر کہانی کا ارتقا اختر یا قمر کو نئی زندگی دیے بغیر ہمیں مربوط نظر آتا ہے۔

اب آیئے ان سوالوں کی جانب، جن کا جواب اس ناول نے نہیں دیا اور ہماری تشنگی کا سامان کیا۔ انتظار حسین کہتے ہیں کہ بڑا کام جب پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے تو تخلیق کار کا تخیل اور خیال بنجر محسوس کیے بنا نہیں رہتا۔ یہ بات ٹھیک ہے اور فطرت کے اصول کے عین مطابق، لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے، دائمی نہیں۔ اس لیے کہ تخلیقی عمل ایک مسلسل سفر کا نام ہے۔ اس میں واماندگی کے وقفے تو بے شک آتے ہیں لیکن ترکِ سفر کا مرحلہ نہیں آتا۔ یوں بھی بڑا تخلیقی تجربہ فن کار کو کچھ سوالوں کے جواب ضرور فراہم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نئے سوالوں کی جستجو سے بھی ہم کنار کرتا ہے جو اسے نئے سفر کی تحریک دیتے ہیں۔ سو ہمیں امید ہے کہ یونس جاوید اس ناول کے بعد اپنے اس وہم سے نکل آئے ہوں گے کہ انھیں ایک ہی ناول لکھنا ہے۔ چناں چہ اب کل میں مزید کا تقاضا ان سے غلط نہ ہوگا۔ یہ تقاضا یوں بھی بجا ہے کہ مرکز گریز قوتوں سے مرکب اس عہدِ جدید میں آج کے تخلیق کار پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن سے integrated vision کی گواہی دے، یہ ثابت کرے کہ جن فن کاروں کو زندہ حقیقت کے تعلق سے کردار تخلیق کرنے آتے ہیں، انھیں مجہول احوال سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ ان کے فن میں زندگی صرف افقی جہت میں ظہور نہیں کرتی بلکہ عمودی جہت میں بھی اپنا انکشاف کرتی ہے — اور یہ کہ بڑے تجربے کی ہمت رکھنے والا ادیب اپنی تہذیب کے آفاق اور انفس دونوں کو بہ یک وقت سمیٹتے ہوئے نگارشِ فن کے معانی متعین کرتا ہے۔ یونس جاوید کا ناول ''کنجری کا پل'' ایک سطح پر اپنے دائرۂ اظہار میں ان نکات کا اثبات کرتا ہے۔ یہی پہلو ہے جو ان سے اس صنف میں مزید کارگزاری کے مطالبے کا جواز بنتا ہے۔

☆☆☆

مبین مرزا

''روشنی کم تپش زیادہ'' —— ایک تاثر

ادب بلکہ فنونِ لطیفہ کے تمام ہی شعبوں میں فحاشی یا اخلاقی احتساب کا مسئلہ دنیا کی لگ بھگ ساری تہذیبوں میں بحث طلب رہا ہے۔ آزادیِ اظہار کے حوالے سے اس کے حق میں بولنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی اور تہذیبی اقدار کے نمائندوں کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند اور احتساب کا مطالبہ کرنے والے بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ تاہم اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس رُخ سے دیکھنے والے ہوں یا اُس رُخ سے، وزنی دلائل و براہین کے باوصف شدتِ جذبات کا اس بحث میں کسی نہ کسی مرحلے پر اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ آج کی اس جدید دنیا میں کہ جہاں نئے ذرائع ابلاغ مثلاً ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ نے اخلاق و احتساب سے مادر پدر آزادی کا مکمل اعلان کر دیا ہے، ادب و فن میں فحاشی کے سوال کا تناظر بالکل بدل کر رہ گیا ہے —— لیکن یہ سوال ختم یا بے معنی بہرحال نہیں ہوا ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ سوال آئندہ تاریخ کے کسی موڑ پر ختم یا قطعی بے معنی ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں! اس لیے کہ گلوبل ولیج میں تہذیبوں کی انفرادی شناخت کے خطوط بے شک دھندلاتے نظر آتے ہیں، تہذیبوں کے اپنے اپنے نظامِ اظہار میں بھی ایک تبدیلی آئی ہے اور ان کی اقدار میں over-lapings بھی ہوئی ہیں لیکن تمام معاشروں میں اخلاقی ضابطہ آج بھی اپنے اثر کا ایک محکم دائرہ رکھتا ہے اور یہ اثر چوں کہ صدیوں کے تہذیبی اور تمدنی سفر کا حاصل ہے، اس لیے اس کا آسانی سے ختم ہو جانا ممکن نہیں۔ آزادی بمعنی عریانیت قدری معاشروں میں کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ آج کی انسانی زندگی کے ذہنی، جذباتی اور فکری منظرنامے میں فحاشی کے اس مسئلے کو ہمیں کس طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہیے اور اپنی تہذیب کے سیاق و سباق میں ہم اس کی نوعیت اور اہمیت کا مؤثر اور حقیقی انداز میں جائزہ کس طرح لے سکتے ہیں؟ یہ اور ایسے کتنے ہی دوسرے سوال ہماری فوری توجہ کے مستحق ہیں —— لیکن ان سوالوں پر غور کرنا آج اس قدر ہرگز سہل نہ ہوتا، اگر ممتاز صحافی علی اقبال کی کتاب ''روشنی کم تپش زیادہ'' ہمیں دستیاب نہ ہوتی۔

"روشنی کم تپش زیادہ" علی اقبال کی لگ بھگ تیس برس کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ اس کام کو دیکھ کر ہمیں دو باتوں کا فوری طور پر احساس ہوجاتا ہے، اول یہ کہ اس پورے عرصے میں کوئی وقفہ ایسا نہیں گزرا جب اپنے موضوع سے علی اقبال کی دل چسپی اور وابستگی کم ہوئی ہو۔ دوم یہ کہ تحقیق و تدوین کے اس کام کے لیے فنونِ لطیفہ کی جملہ اصناف میں وہ اس موضوع کے اظہار کی ہر ممکنہ صورت کے متلاشی رہے ہیں۔ علمی سطح پر کسی بھی موضوع کی چھان پھٹک کے لیے یہ دونوں باتیں بنیادی نوعیت کا کردار ادا کرتی ہیں اور سچ پوچھیے تو یہ وہ خصوصیات ہیں جو آج تحقیق کے میدان میں اُترنے والے لوگوں میں کم کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ کاتا اور لے دوڑی تو پرانا محاورہ ہے، یعنی پہلے بھی لوگ کام نمٹانے اور نام کمانے میں عجلت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوں گے لیکن آج تو عالم یہ ہے کہ کاتنے سے بھی پہلے لے دوڑنے کی صورتِ حال نظر آتی ہے۔

علمی مسائل میں جس صبر و سکون کے ساتھ تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے یہاں فی زمانہ اس کا سخت فقدان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آج کام کرنے والوں کا مسئلہ دراصل کام اور کام کی تکمیل سے حاصل ہونے والی تسکین اور لذت تو ہے ہی نہیں۔ اُن کی تو ساری توجہ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے نتائج اور مراعات پر ہوتی ہے۔ مستزاد اس پر ہمارے عہد کی اختصاص پسندی ہے کہ جس نے اختصاص کو تو اٹھا کر پس پشت ڈالا لیکن اکہرے پن کو خوب فروغ دیا۔ خیر، یہ جملہ معترضہ کا محل نہیں محض اس احساس کا اظہار ہے جو علی اقبال کی مرتب کردہ کتاب کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوا۔ اُنھوں نے جس مسلسل محنت اور دل جمعی کے ساتھ اپنے موضوع کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، وہ کھلے دل سے تحسین کا مستحق ہے۔

فحاشی کا مسئلہ یقیناً نیا نہیں ہے اور صرف مشرق یا مغرب کا بھی نہیں ہے۔ اس موضوع پر جیسا کہ ابتدا عرض کیا گیا، دنیا کی نئی اور پرانی اُن تمام تہذیبوں میں مباحث سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد میں کوئی مذہبی یا اخلاقی ضابطہ کارفرما رہا ہے۔ فن کار کے لیے اظہار کی آزادی کے باوصف یہ سوال مہذب معاشروں میں ہمیشہ غور طلب رہا ہے کہ اُس کا فن اُس کے عہد کی انسانی صورتِ حال پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ادب ہو یا مصوری اور ڈراما ہو یا رقص، فنون کے مواد اور پیرایۂ اظہار کی بابت سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ بڑے بڑے فن کاروں کا کام ان سوالات کی زد میں آتا رہا ہے۔ ان سوالات اور مباحث کی روشنی میں ہم انسانی تہذیب کے سفر اور مختلف حالات اور ادوار میں ان کے بدلتے ہوئے رجحانات کو سمجھ سکتے ہیں۔

"روشنی کم تپش زیادہ" کی مطالعاتی اہمیت دراصل اس کے وسیع دائرے کی وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے۔ علی اقبال نے اس کتاب میں نہ صرف مختلف فنون میں اٹھائی جانے والی بحثوں کا احاطہ کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی کیا ہے کہ مختلف ادوار اور مختلف تہذیبوں میں جن فن کاروں پر

ان کے فن اور اظہار کے مسائل پر معاملات آئین و عدالت تک پہنچے، ان کو بھی کتاب میں شامل کرلیا ہے۔ اس مواد کی ایک الگ دستاویزی اہمیت تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ اُن کے ذریعے ایک اور تناظر بھی ہمیں فراہم ہوجاتا ہے جو تہذیبوں کے معاشرتی نظام کی اخلاقی سطح اور احتسابی نوعیت کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

مختلف تہذیبی دائروں، ممالک کے نظامِ احتساب اور مختلف نظریات کے ادیبوں اور فن کاروں کے حوالے سے اس کتاب میں جمع ہونے والا مواد ہمیں ادب و فن کے قدری پہلوؤں کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے اور ان پر سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح انسانی تہذیب اور زندگی کے تمدنی ضابطے کو مختلف زاویوں سے اور کئی جہتوں میں دیکھنے سے اس مسئلے کی نوعیت کے حساس پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ علی اقبال نے ایک ذمے دار اور متین مرتب کی طرح مسئلۂ زیرِ بحث کے تمام زاویوں کو اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا لیبل لگائے بغیر پیش کیا ہے اور یہی علمی تحقیق کا خاصہ ہوتا ہے۔

علی اقبال نے اس کتاب کے آغاز میں جو مضمون "ابتدائیہ" کے عنوان کے تحت لکھا ہے، اس میں انھوں نے بعض سوالات قائم کیے ہیں، مثلاً:

— عریانی و فحاشی کے ان لفظی عفریتوں میں کیا معنویت مضمر ہے؟
— آیا اس کا کوئی تزئیاتی پہلو بھی ہے اور اس سے کوئی مفید کام لیا جاسکتا ہے؟
— فحش نگاری اور جنسی جرائم کے درمیان علت و معلول کا رشتہ منطقی پر ثابت ہوسکتا ہے؟
— کیا عریانی و فحاشی کے دیرپا اثرات ہوتے ہیں؟

اس مضمون کی اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اس میں صرف اس نوع کے سوالات ہی نہیں قائم کیے بلکہ اُن پر مختلف معاشروں کے تناظر میں غور کرتے ہوئے گفتگو بھی کی ہے۔ یہ گفتگو ہمیں بعض جوابات کی جانب لے کر بڑھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور سوالات سے دوچار بھی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اچھی اور فکر افروز کتاب ہمیں صرف مطلوبہ جوابات تک ہی نہیں لے کر پہنچتی بلکہ کچھ نئے سوالات بھی ہمارے ذہنوں میں پیدا کیا کرتی ہے۔ علی اقبال کی اس کتاب میں بلاشبہ یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ علم و فکر کی دنیا میں حرفِ آخر تو کوئی شے نہیں ہوتی لیکن اس کتاب کی بابت اتنی بات ذمہ داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والے نہ صرف اس کتاب سے صرفِ نظر نہیں کرسکتے بلکہ لگن اور محنت سے کام کرنے والوں کو بھی یہ کتاب ایک اچھی بلکہ قابلِ قدر مثال کے طور پر یاد رہے گی۔

☆☆☆

طنز و مزاح

صبیح محسن

کھیلو کرکٹ، بنو نواب

ہمارے بچپن میں کہا جاتا تھا "پڑھو گے لکھو گے ہو گے نواب، کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب۔" بزرگوں کی یہی نصیحت ہمیں لے ڈوبی۔ پڑھ لکھ تو لیا مگر نواب تو خیر کیا بنتے، اس قابل بھی نہ ہو سکے کہ نوابوں کے مصاحب ہی بن جاتے۔ ویسے اس میں قصور ہمارے بڑوں کا بھی نہیں تھا۔ بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ آنے والے زمانے میں گلی ڈنڈے کی جدید شکل یعنی کرکٹ کھیلنے والے ایسا عروج پائیں گے کہ نواب عمدۃ الدولہ بھی ان کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔

افسوس ہمیں اس بات کا بھی ہے کہ کھلاڑیوں کی قسمت کا ستارہ ان بلندیوں پر اس وقت پہنچا جب پانی ہمارے سر سے گزر چکا تھا یعنی ہم پڑھ لکھ کر اپنے آپ کو اچھی طرح خراب کر چکے تھے۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے تک تو کھلاڑیوں کو بھی اسی طرح خالی خولی تالیاں ملا کرتی تھیں، جس طرح شاعروں کو منہ زبانی داد و تحسین۔ لیکن ادھر ہم نے اپنی تعلیم مکمل کر کے نثر نگاری شروع کی، اُدھر کھلاڑیوں اور شاعروں، دونوں کے دن پھرنا شروع ہو گئے۔

صورت حال اب یہ ہے کہ ہمیں کھلاڑیوں اور شاعروں دونوں پر رشک آتا ہے۔ اگر کھلاڑی میچ کھیلنے کے لیے آئے دن آسٹریلیا اور انگلستان کے دورے پر ہوتا ہے تو شاعر بھی کبھی ٹورنٹو تو کبھی شکاگو، انٹرنیشنل مشاعروں کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ اور اگر کھلاڑی کو زمبابوے میں 'مین آف دی میچ' کا اعزاز عطا کیا جاتا ہے تو شاعروں کا بھی دبئی میں جشنِ تاج پوشی منایا جاتا ہے۔ ادھر ہم اپنے کندھوں پر ڈگریوں کا بوجھ اٹھائے اور بغل میں وہ ادبی رسائل دبائے جن میں ہمارے نثری شاہکار شائع ہوئے تھے، بہ حسرت و یاس اپنے ان حریفوں کو کامران و شادمان ہوتے دیکھتے رہتے ہیں۔

خیر، شاعروں سے تو ہم پھر کبھی نمٹیں گے، اس وقت ہمیں کھلاڑیوں کا ذکر کرنا ہے۔ ایک زمانے تک کھیل صرف اس لیے کھیلا جاتا تھا کہ صحت ٹھیک ٹھاک رہے۔ لپکنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا، لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ۔ پھر یوں ہوا کہ یہی لپکنا جھپٹنا شہرت کا زینہ اور دولت کا خزینہ بن گیا۔ کیفیت یہ ہوئی کہ باکی

کی ٹیم ورلڈ کپ جیت کر آئی تو بہ مرحمت خسروانہ ٹیم کے ہر کھلاڑی کو ہزار گز کے ایک پلاٹ کے حقوق مالکانہ مل گئے۔ اور جو کرکٹ کے ایک کھلاڑی نے میچ کی آخری گیند پر چھکا لگا کر میچ جتوا دیا تو سرکار کی طرف سے زمین کے پلاٹ کے نذرانے کے علاوہ کرکٹ کے کسی شائق کی جانب سے مرسیڈیز کار کے تحفے کا حق دار بھی ٹھہرا، اور قومی ہیرو تو خیر وہ ہیں ہی۔ مختصر یہ کہ شہرت، عزت، دولت، عظمت کیا نہیں ہے ان کے پیانے میں۔

کھیل ہمارے معاشرے میں رچ بس گیا ہے، خصوصاً کرکٹ کا کھیل۔ بچوں اور جوانوں کا کیا ذکر کہ ان کے تو ابھی کھیلنے کھانے کے ہی دن ہیں، حیرت تو یہ ہے کہ بوڑھے بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ہمارے ایک بزرگ ہیں، اسی کے پیٹے میں تو ہوں گے ہی۔ جب کرکٹ کا میچ ہو رہا ہوتا ہے تو وہ سارے کام چھوڑ کر اپنی آپریشن شدہ آنکھوں پر من من بھر کے شیشوں والی عینک لگا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر نماز کے سوا کسی اور کام کے لیے وہاں سے اٹھتے ہی نہیں۔

ایک دن ہم سے نہیں رہا گیا۔ پوچھ بیٹھے، ''حضرت! کرکٹ اور آپ!''

فرمایا، ''میاں صاحب زادے! اس میں استعجاب کیسا؟ ڈھونڈ لی ہے قوم نے فلاح کی ایک راہ۔ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہم بین الاقوامی سطح پر بھی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ تو پھر میں اس میں دل چسپی کیسے نہ لوں؟''

بات تو وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کرکٹ سے دل چسپی اب تو خواتین میں بھی پھیل چکی ہے۔ اس دور کی خواتین کو تو رہنے دیجیے کہ وہ تو ویسے بھی موقع بے موقع مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کا اعلان کرتی رہتی ہیں، ہم نے تو اگلے وقتوں کی ان بی اماؤں کو بھی کرکٹ میں غرق دیکھا ہے جن کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ہمارے ایک عزیز کی خوش دامن صاحبہ کرکٹ کے دنوں میں اپنا کھٹولا ٹی وی کے سامنے بچھا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ایک دن ہم گئے تو جاوید میاں داد کے ستانوے رن بن چکے تھے۔ خالہ کا کھٹولا ٹی وی کے سامنے خالی پڑا تھا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ آج کیا ہوا کہ خالہ کرکٹ نہیں دیکھ رہی ہیں کہ ہماری نظر سامنے کھلے دروازے سے ہوتی ہوئی دوسرے کمرے میں جا پہنچی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ خالہ مصلے پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر آئیں تو بولیں، ''دعا کر رہی تھی کہ سنچری بن جائے نگوڑے کی!'' اسی لمحے نگوڑے نے ہٹ جو لگائی تو گیند باؤنڈری لائن کے باہر اور بغیر دوڑے بھاگے نگوڑے کی سنچری مکمل۔

جب کرکٹ کا موسم آتا ہے (مگر کرکٹ کا موسم جاتا ہی کب ہے؟) تو ہر طرف اس کے متوالے اپنی ترنگ میں مست نظر آتے ہیں۔ سڑکوں پر کمنٹری سننے والے کان سے پاکٹ ریڈیو لگائے کھلے ہوئے مین ہول کے خطرے سے بے نیاز لپکے چلے جاتے ہیں۔ دکانوں میں دکان دار کمنٹری سننے میں ایسا محو کہ گاہک کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ دفتروں میں تو ہر شخص ایک سرشاری کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ نچلے عملے کا تو ذکر ہی کیا کہ انھیں تو ہمہ وقت کام نہ کرنے کا کوئی بہانہ چاہیے۔ ہم نے تو اسلام آباد میں اعلیٰ گریڈوں کے بڑے

بڑے فرض شناس افسروں کو بھی اس کیفیت میں دیکھا ہے کہ نظریں ٹی وی اسکرین پر ہیں۔ کان ریڈیو کی کمنٹری پر اور ان کا قلم ہے کہ فائلوں پر قوم کی تقدیر بدل دینے والے فیصلے رقم کرتا چلا جا رہا ہے۔

کھیلوں سے قومی سطح پر دلچسپی صرف کمنٹری سننے تک ہی محدود نہیں۔ کھیلوں کے فروغ کے لیے حکومت کی جانب سے کئی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں، اور کھلاڑیوں کو روزگار کے سلسلے میں بڑے پرکشش مواقع مہیا کیے گئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کھیل کے شعبے کو ہمارے معاشرے میں جو سرپرستی حاصل ہوگئی ہے اور کھلاڑیوں کو جس طرح ہمارے یہاں نوازا جا رہا ہے، وہ دوسرے شعبوں سے وابستہ افراد کے لیے باعث رشک ہی نہیں، بلکہ باعث حسرت بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے کہیں یہ نہیں دیکھا کہ کوئی بینک کسی افسانہ نگار کو گریڈ اول کا افسر مقرر کر کے یہ کہے کہ جناب آپ کا کام صرف یہ ہے کہ افسانے لکھتے جائیے یا کسی مصور کو کسی ہوائی کمپنی کے جنرل منیجر کے برابر کے عہدے پر فائز کر کے یہ گزارش کی جائے کہ آپ بس فن پارے تخلیق کرتے رہیے، ہم آپ کو اچھی ہی تنخواہ دیتے رہیں گے۔ لیکن کھلاڑیوں کے لیے ہر قومی ادارے کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی توجہ کھیل پر ہی مرکوز رکھیں۔ یعنی مزے بھی کمائیں اور نام بھی۔

ہمیں اس طرح کی تنقید کرنے والوں سے سخت اختلاف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اب بھی اس معاملے میں ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ ان کے یہاں تو اچھے کھلاڑیوں کے لیے دو خون بھی معاف ہیں۔ یقین نہ آئے تو امریکا کے فٹ بال کے ممتاز کھلاڑی او جے سمپسن کے مقدمے کی فائل دیکھ لیجیے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے وسط کی بات ہے، موصوف پر اپنی بیوی اور اس کے آشنا کے قتل کا الزام تھا۔ تقریباً ناقابل تردید شہادتیں بھی موجود تھیں لیکن جیوری اور جج نے قانون میں گنجائشیں ڈھونڈ نکالیں اور انھیں بری کر دیا۔

اس کے برعکس ہمارے یہاں اگر کبھی بے چارے ہاکی کے کھلاڑی وطن واپس آتے ہوئے دو چار چیزیں ڈیوٹی ادا کیے بغیر لانے کی کوشش کریں تو کسٹم والے فوراً دھر لیتے ہیں اور اگر کبھی کسی کرکٹر کے بارے میں شبہ ہو جائے کہ اس نے کسی سٹے باز سے match fixing کے لیے ساز باز کی ہے تو اخبارات آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اور تو اور خود ہمارا کرکٹ کنٹرول بورڈ بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ میچ کے سلسلے میں کسی غیر ملک میں قیام کے دوران اگر کبھی کوئی نوجوان کرکٹر رات میں دل بہلانے نکل جاتا ہے تو اُسے وارننگ مل جاتی ہے۔ اور اگر کبھی کسی کھلاڑی پر ممنوعہ دوائیں استعمال کرنے کا شبہ ہو جاتا ہے تو اُسے معطل کر دیا جاتا ہے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ان حالات میں ہم اپنے کھلاڑیوں سے بہترین کارکردگی کی توقع کس طرح کر سکتے ہیں؟ ہمیں اندیشہ ہے کہ اس معاملے میں ہم نے جلد اپنا رویہ نہیں بدلا تو کہیں اس رہے سہے آخری شعبے میں بھی عالمی حیثیت سے ہاتھ دھونے نہ پڑ جائیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

سفر ہوائی بمقابلہ ریلوائی

ہوائی جہاز کا سفر بڑے مزے کا ہوتا ہے، بشرطے کہ سرکاری خرچ پر کیا جائے۔ پلّے سے پیسے خرچ کر کے ہوائی سفر سے دل میں برے برے خیال آتے ہیں۔ جہاز کے اوپر اٹھنے سے پہلے ہی ہول اٹھنے لگتے ہیں۔ سفر کا آدھا لطف تو یہی سوچ کر غارت ہو جاتا ہے کہ اپنے پیسے خرچ کر کے سفر کر رہے ہیں، جہاز میں پیٹرول کم جلتا ہے، غیر سرکاری مسافر کا دل زیادہ جلتا ہے۔ بے چاری فضائی میزبان پانی اور شربت پروستے پروستے نڈھال ہو جاتی ہے مگر غیر سرکاری مسافروں کے دل کو تسلی نہیں ہوتی۔ ہر دم یہی خیال آتا ہے کہ نشست سخت ہے اور زمین و آسماں دونوں بہت دور۔

پھر ہوائی جہاز میں کچھ ایسی قباحتیں ہیں کہ اس کا سفر ہم جیسے "ریلوائی" (یہ لفظ ہم نے ریلوے سے بنایا ہے) کو راس نہیں آتا۔ مثال کے طور پر ریلوے کے اس لطف کا ہوائی جہاز کے پاس کوئی جواب نہیں جو ہر اسٹیشن پر اترنے، پلیٹ فارم پر ٹہلنے اور جب تک ٹرین کھسکنا شروع نہ کردے، کھوکھے سے چائے پیتے رہنے میں آتا ہے۔ ہم تو جب تک کھڑکی سے سر نکال کر ہر اسٹیشن کے نام کا بورڈ نہ پڑھ لیں اور اس کے مضافات کا نظارہ نہ کرلیں، بے کلی سی رہتی ہے۔ ہوائی جہاز کی کھڑکی سے سر نکالنا اگر ممکن بھی ہو تو نتائج کے اعتبار سے چنداں خوش گوار نہ ہوگا۔ آپ کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر دیکھتے رہیں، کسی اسٹیشن کے نام کا بورڈ کیا، اسٹیشن بھی نہیں آتا۔ ہاں اگر کپتان صاحب موڈ میں ہوئے تو اعلان کریں گے کہ "خواتین و حضرات! ہم اس وقت زمینی آفات و بلیات اور دیگر گھریلو و غیر گھریلو مسائل سے پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں، (کئی مسافر زیر لب الحمد للہ کہتے پائے جائیں گے) تھوڑی دیر بعد ہمارے بائیں طرف حیدرآباد آئے گا۔ ہم دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے اللہ نے چاہا ('چاہا' پر زور دیتے ہوئے) تو ایک گھنٹے اور چالیس منٹ کے اس وقفۂ نجات کے بعد اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اترنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

اب دائیں طرف بیٹھے ہوئے معصوم خواتین و حضرات یہ سوچ کر بائیں طرف والوں کو رشک

سے دیکھیں گے کہ نہ صرف حیدرآباد شہر کے حسین و ماہ جبین ان مسافروں کو ہاتھ اٹھا کر سلام الوداع کہہ رہے ہیں بلکہ دریائے سندھ کی اٹکھیلیاں کرتی لہریں ساحل مہران کو چوم کر بلیغ استعاروں کے ذریعے یاد اور پیغام بھی رہ نوردان شوق تک پہنچا رہی ہیں۔ جب کہ ادھر رہ نوردان شوق نے اس لیے منزل قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ لیلیٰ ہم نشیں تو کیا ہوتی، بادلوں اور دھند کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود کہیں اس کی جھلک تک نظر نہیں آ رہی۔ ادھر "دائیں بازو" والے (حسب عادت) دل بہلانے کے لیے مشروبات و ماکولات کے ساتھ وا حسرتا کہہ کر انصاف فرمانا شروع کر دیں گے۔ اتنی دیر میں ہوائی جہاز رحیم یار خان کے اوپر سے گزر چکا ہوگا اور لاہور کی سمت مائل بہ پرواز ہوگا۔ دریائے سندھ کی لہریں تو کیا خاک نظر آتیں، دریائے ستلج اور راوی میں اڑتی ہوئی دھول بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اس سے پہلے کہ آپ رحیم یار خان کے نام کا بورڈ دیکھے بغیر یہ فیصلہ کریں کہ یہ آ رہی ہے یا اسٹیشن۔ لاہور بھی کہیں پیچھے رہ جائے گا اور فضائی میزبان دھڑا دھڑ چائے کی پیالیاں سمیت کر مسکراتے ہوئے (غالباً مسافروں پر) اعلان کر دے گی "ان شاء اللہ تھوڑی ہی دیر میں ہم اسلام آباد کے فضائی مستقر پر اتر جائیں گے۔ حفاظتی پیٹی اور کمر کس لیجیے، کرسی کی پشت اور اپنی نیت ٹھیک کر لیجیے اور تمباکو نوشی کے علاوہ بدنظری اور غیبت سے بھی پرہیز کیجیے۔" جہاز ایک دھچکے کے ساتھ رن وے کو چھوتا ہے (یہ رن پنجابی کی نہیں ہے بلکہ انگریزی کا ہے)۔ غیر سرکاری مسافر تو یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہائیں! اتنی جلدی اتنا مہنگا ٹکٹ ختم ہو گیا؟ اور سرکاری مسافر بڑے کر و فر کے ساتھ "زیر مونچھ" مسکراتے ہوئے اپنا بریف کیس اٹھا کر جہاز سے اتر جاتے ہیں۔ جہاز کے دروازے پر ایک تیکھی سی فضائی میزبان ایک مصنوعی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ جانے والوں کو تپاک سے "اللہ حافظ" کہتی ہے۔ یہ اس کی ملازمت کا اور فرائض منصبی کا تقاضا ہے۔ بے چاری کیا کرے، لیکن جن لوگوں نے سفر کے دوران اسے زیادہ فرمائشیں کر کے دوڑایا ہوتا ہے، یہ ان کو زیادہ تپاک سے رخصت کرتی ہے اور ساتھ ہی اطمینان کی ایک سانس بھی لیتی ہے۔

ہوائی جہاز میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ کھڑکی سے سر اور آدھا دھڑ نکال کر جہاز کا اگلا یا پچھلا حصہ تک نہیں دیکھنے دیتے۔ ریل میں اکثر یہ لطف آیا کہ جب ریل نے ایک طویل نیم دائرے کی شکل میں مڑنا شروع کیا تو انجن سے لے کر آخری بوگی تک مع دیگر مسافروں کے کھڑکیوں سے نکلے ہوئے آدھے دھڑوں کے دیکھ لی، کیوں کہ باقی سب مسافر بھی اسی کار خیر میں مصروف ہوتے ہیں۔ ٹرین کے سفر میں اور بھی کئی آسانیاں ہیں، مثلاً جی چاہے تو ڈبے میں گنڈیریاں خرید لیجیے اور چوں چوں کر وہیں چھوک کے ڈھیر لگا دیجیے، ہر اسٹیشن پر اتر کر بلاضرورت صراحی یا کولر میں پانی بھریے اور بعد میں یہی پانی چلتی ٹرین کی کھڑکی سے سر نکال کر کلی کر کے بذریعہ ہوا بقیہ تمام مسافروں تک بہ حصہ مساوی بلا معاوضہ پہنچایئے۔ جی چاہے تو دوران سفر میں پھیری والوں سے کھٹ مٹھی گولیاں خریدیے۔ ہوائی جہاز میں گنڈیریاں نہیں بکتیں، صرف گولیاں دیتے ہیں، وہ بھی بیشتر کراچی کے سلیپنگ میں۔ بھرنے کے لیے پانی

کے بجائے صرف آہ ملتی ہے۔ پانی خود ہی بھر کر دیتے ہیں اور دوسروں تک بذریعہ ہوا پہنچانے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ جہاز میں تو آدمی عند اللہ ماجور بھی نہیں ہو سکتا۔

ٹرین میں کچھ لوگ ٹہلتے بھی ہیں اور ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں چلے جاتے ہیں، خاص طور پر اگر ٹکٹ چیکر آجائے۔ جہاز میں تو اپنی نشست سے اٹھنا ہو تو پہلے آس پاس والوں سے معذرت کیجیے۔ جہاز میں دو جانب کی نشستوں کے درمیان راہداری میں جگہ اتنی تنگ ہوتی ہے کہ اگر سامنے سے بدقسمتی سے (بعض لوگوں کے خیال میں خوش قسمتی سے) فضائی میزبان آرہی ہو تو شرعی حدود و قیود میں رہ کر گزرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور اگر اسی راہداری میں موصوفہ کھانے کی گاڑی بھی لیے کھڑی تبسم کی بجلیاں گرا رہی ہیں تو سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوتا ہے۔ کچھ صاحبان دل مسافروں کو تو شرعی حدود و قیود توڑنے کے لیے کھانے کی گاڑی جیسے بہانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہائے بے چاری بنت حوا! بقول حضرت علامہ:

میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

ہوائی جہاز کی تنگ دامانی اور تنگ ظرفی کا بیان کچھ وسعت چاہتا ہے، لیکن پہلے ٹرین کی کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کو ملاحظہ کیجیے۔ ٹرین میں آپ ٹانگ پر ٹانگ رکھے حالات حاضرہ پر ناقابل اشاعت تبصرہ کیجیے (اس قسم کے تبصرے اب بعض ٹی وی پروگراموں میں بھی ہونے لگے ہیں اور حساس والدین اسی لیے اپنے نابالغ بچوں کو ٹی وی پر ہونے والے مباحثے نہیں دیکھنے دیتے کہ مخرب اخلاق ہیں) یا پاؤں پسار کر اطمینان سے قوم کے مستقبل پر دل جلائیے۔ جی چاہے تو ہاتھ تا بہ حد امکان پھیلا کر انگڑائی لیجیے۔ جہاز میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا پڑتا ہے اور انگڑائی لینے سے قبل ہی مسکرا کر ہاتھ چھوڑنے پڑتے ہیں کہ جائے تنگ است و مردمان بسیار کا سماں ہوتا ہے۔ گھٹنے اگلی نشست کی پشت سے اس طرح بھڑے رہتے ہیں کہ اگر آپ اپنی نشست سے ذرا بھی پھسل کر آگے کو کھسکنے کی کوشش کریں تو اگلی نشست کا مسافر احتجاج کیے بغیر رہنا پسند نہیں کرتا۔

ایک بار ہم غلطی سے فوکر نامی ننھے منے سے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز کیا تھا، اچھی خاصی تنگنائے غزل تھی جس میں ہمارا قافیہ تنگ تھا۔ خطرہ تھا کہ اگر وسعت بیاں کے خیال سے انگڑائی لے لی تو پورا جہاز ہی بحر سے خارج ہو جائے گا۔ اس کم ظرف جہاز کی کل کائنات اتنی تھی کہ شروع کی نشستوں پر کی جانے والی غیبت لفظ بہ لفظ مع جوابی غیبت کے آخری نشست تک نشر ہوتی تھی۔ جہاز میں پاؤں پسارنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو اتنا وقت نہ ہوتا کہ آدمی پاؤں پسار سکے کیوں کہ جتنی دیر میں آپ ٹرین میں پاؤں پسار کر ہمراہیوں سے ان کے بال بچوں کی تعداد اور ان کی خیریت وغیرہ پوچھتے ہیں، اتنی دیر میں ہوائی جہاز منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

☆☆☆

تراجم

لیو پولڈ سینگھور☆/ اسد محمد خاں

خواب

روشنی کا ہاتھ راتوں کے دریچے کھول دیتا ہے
مرا دل طائرانِ صبح کی رنگیں نوائی سے
اچھوتی نغمگی سے جھوم اٹھتا ہے

وہ دیکھو خواب سے جاگا ہے افریقا
سیہ اور سانولا
جس کی صلابت رشکِ فولادِ سپید
اک لشکرِ تقدیس
سیلِ مشک رنگ
نوعِ انساں کی امیدوں کا مسیحا

جب نئی دنیا جنم لے گی تو افریقا پکارے گا
کہ "دیکھو آج بھی ہم ہیں!
کہ اس تخلیقِ ثانی کا خمیرِ لازمی ہم ہیں

☆ فرانسیسی کے ممتاز شاعر اور جمہوریہ سینیگال کے سابق صدر کی نظموں کا انگریزی سے ترجمہ

مشینوں کی تفنگ و تیر کی ماری ہوئی دنیا
ہمیں سے اُفتگی کا درس لے گی
اور ہمیں ہوں گے کہ جن کا نعرۂ مستی
سحر ہوتے یتیموں، ناتوانوں اور مُردوں کو جگا دے گا
حصارِ ناامیدی توڑ کر انساں کے سینے میں
امیدوں کی نئی شمعیں جلا دے گا!"

وہ آواز وہاں آئی
— صدا و صوت سے آزاد اک دھڑکن
کہیں دشت و جبل کے پار بستی میں
سکوتِ شام میں
اور دلدلوں کی نیند میں ہلچل مچاتی ہے
شگوفو تو مبارک ہو
یہ لوگو، سنو!
ہم کو نہ اب سردار ہونا ہے
نہ اب نوعِ بشر کا مالک و مختار ہونا ہے
ہمیں قلبِ تپاں بن کر
ہمیں الفاظ بن کر
کبھی قرنا و نَے بن کر
کبھی دل دوز لَے بن کر ابھرنا ہے۔
ہمیں اس عہد کی تعظیم کرنا ہے

☆

لیوپولڈ سینگھور / اسد محمد خاں

اور خواب کے بعد

مگر یہ خواب کیوں نکلا گیا ہے
مگر خورشید کیوں بجھنے لگا ہے
خدائے آفرینش اب کرم فرما
کرم فرما کہ میں اس رات کے سایے میں دم لے لوں
سوادِ عہدِ طفلی میں، سوادِ خواب میں پھر گھوم آؤں
پھر اپنے خواب دہراؤں
کرم فرما خدایا
اس شب زرّیں قبا سے
اس نگارِ مشک چہرہ سے
مری اس رات سے، اک دن
پھر آوازِ ڈھل پر رقص کرتا اک نیا عالم ہویدا ہو
نیا خورشید پیدا ہو

☆

لیو پولڈ سینگھور / اسد محمد خاں

نقاب

یہ شبیہیں، یہ نقاب
یہ نقاب
اک نقابِ سیاہ فام
اک نقابِ لالہ فام
اے سپید و سیاہ چہرے، اے نقابِ مستطیل
مظہرِ روحِ بشر — تجھ پر سلام!
اے نقابِ چہرہ ہائے بے نقاب
چہرہ ہائے بے شکن
اے نقش گر!
اپنے اس نقشِ حسیں کے نام پر
یہ بتا
اک صفحۂ قرطاس، اک قربان گہ پر سرنگوں
سرنگوں، خوار و زبوں، کیا میں ترا ہی نقش ہوں؟

☆

لیوپولڈ سینگھور/اسد محمد خاں

رات کی زندگی

میں نے دیکھا ہے اس رات کا بانکپن
میں نے دیکھا انھیں راحتِ شب کی تیاریوں میں مگن

میں نے اُن سے کہا:
''رات ہی صدقِ لمحات ہے،
رات کی ساعتیں بے بدل ہیں
کہ وہ لم یزل،
رات کے کوچہ و شہر میں
درد کی لذتوں سے گزرتے دلوں کو
نئی زندگی بخشتا ہے
نئی روشنی بخشتا ہے!''

☆

وِنداکرندیکر☆/ اسد محمد خاں

غدّار

بمبئی کی ایک گلی میں کہیں ایک مراقی رہتا ہے
جواب بھی قسم کھا کے کہتا ہے کہ
ہمالیہ جتنے اونچے ڈھیر پر
چاہے بحرِ ہند جتنا خون ڈال دو
(چاہے کچھ کرلو)
مٹھی بھر ہری گھاس بھی نہیں اُگنے کی

جب گلی میں کتنے بھونکتے ہیں
تو وہ کسی بے نام خوف سے کانپنے لگتا ہے
اور پیشاب کر دیتا ہے
(میرا خیال ہے)
مراقی کے بجائے اسے بزدل کہنا چاہیے

وہ صبح کے اخباروں کا پیش کیا ہوا
آتشِ سیّال کا روز کا راشن حلق سے
اتارتا ہے،

☆ مراٹھی کے ممتاز شاعر کی نظموں کا انگریزی سے ترجمہ

پھر اس گناہ کا کفارہ یوں ادا کرتا ہے کہ

بچوں کی لٹوں سے کھیلنے لگتا ہے،

گیتا پڑھتا ہے اور خود کو تنبیہ کرتا ہے کہ

"خبردار! ہتھیار کو ہاتھ نہ لگانا!"

جب وہ اپنی چھتری کھولتا ہے

تو اُسے

ایٹمی مشروم یاد آ جاتا ہے

اور وہ اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے کسی کے بھی

شانے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے

جب خاکی وردیوں میں جنگی نغمے سنتا ہے تو

کسی خصی کی مانند زنخے پن سے رونے لگتا ہے

(میرا خیال ہے)

خصی کے بجائے اُسے غدار کہنا چاہیے

— وہ اگرچہ بیدار ہوتا ہے —

مگر نیم "سن" کی دکالی کرتے ہوئے

ہذیان بکنے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ:

"کاش میں زندہ رہوں

اور پکاسو کی فاختہ کو آسمان میں اڑتا ہوا دیکھوں!"

☆

وِنڈا کرنٹڈ یکر / اسد محمد خاں

میں نے کچھ دیکھا ہے

میں نے دیکھا کوئی چیز ریزہ ریزہ ہوگئی ہے
محسوس کیا:
میرے پاس وہ لفظ نہیں کہ اس وسیع بے چارگی کو زبان دے سکیں
جو کروڑوں دماغوں میں پھٹ پڑنے کی منتظر ہے
وہ آنکھیں نہیں
جو کروڑوں آنکھوں میں مچلتے کرب کے بے چین کوندے کو تھام سکیں،
بازو نہیں کہ دنیا کے اس یتیم محافظ کو گلے لگا سکیں
جو پیدائشی پناہ گزیں ہے، بدنصیب ہے، گم گشتہ ہے
کسی کونے میں پڑا بسورتا ہے
میرے لیے کوئی صلیب نہیں ہے— کوئی صلیب نہیں!

میں نے دیکھا کوئی چیز ریزہ ریزہ ہوگئی ہے
میں نے سہ پہر میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھا:
بازار کے اندھے ہجوم
مین چڑھی کھولیاں
کیڑوں بھری گلیاں

ہڈیوں کے پنجر
آنکھوں کے گڑھے
سڑتے ہوئے لوگ جن میں مرنے کی بھی سکت نہیں،
دھواں دیتے لوگ جن میں بھڑک اٹھنے کا بوتا نہیں،
واویلا کرتے ہوئے لوگ جنھیں کڑ کنے کا یارا نہیں،

میں نے دیکھا کوئی چیز ریزہ ریزہ ہوگئی ہے
اور اس نے مجھے اپنے ایک ہی لشکارے سے اندھا کردیا ہے
مجھے اوڈیپس کی طرح وحشت میں ہنکا دیا ہے کہ حرامیوں کے پیچھے چلتا چلا جاؤں
میں نے محسوس کیا کہ خود میرے ذہن میں حسب نسب کا زہریلا درخت،
اس کے سایے کی پھیلتی ہوئی شاخیں ہیں:

اور لمبی شاخوں کا بوجھ
اور وہ پھل جو پک نہیں سکتے
پھول جو جل بجھے
اور اُن کے نیچے ایک سرد مقبرہ
میں نے دیکھا کوئی چیز ریزہ ریزہ ہوگئی ہے

☆

اروِن کولٹکر☆/ اسد محمد خاں

گھوڑا

بالکل نام کا گھوڑا
جس کا ماخذ اور پھیلاؤ کینسر کی طرح پوشیدہ
جس کا گوشت اور خون مٹی سے باغی
جس کے نراجی سفر کی کھوئی ہوئی وحشی آگ
حملے کی افواہ کی طرح تیز رفتار
جس کے قافیہ پیا سُم
روئی کی طرح کھرے اور سچے سُر میں بجتے ہوئے

مگر نمٹے ہوئے زمانوں کے گھسے پٹے تاج دار
— جن کی نیاموں میں لافانیت زنگ کھا رہی ہے —
(یہ آواز سنتے ہیں)
اُن کی بیماریاں یوں لرز اٹھتی ہیں
جیسے نقلی سکوں کی بپھرتی ہوئی دہشت گردی سے
معیشتیں لرز جائیں

☆ مراٹھی کے ممتاز شاعر کی نظموں کا انگریزی سے ترجمہ

وہ گھوڑے کی قافیہ پیما ٹاپوں کی اثر انگیزی محسوس کرتے ہیں
اور اپنی روایتی نیند سے جھنجھوڑ دیے جانے کے بعد
مسندوں سے دست بردار ہوتے اور فرار ہو جاتے ہیں...
بس تاریخ کی شاہ راہ پر
گھوڑے کے سفر سے بکھیرے ہوئے سکّے رہ جاتے ہیں...
دھماکا خیز سگریٹوں کی طرح
مہمل اور معصوم—

☆

انتون چیخوف/ نعیم صبا

تکمیل

کرسمس نزدیک آ گیا تھا۔ سمیرنوف اب تک پریشان اور مضمحل تھا جیسے اُس کے ذہن کو قرار ہی نہیں اور یہ غم ناک اداسی بہ ظاہر اُن لمحوں سے شروع ہوئی تھی جب پیٹرک کے مکان پر اُس سے سوال کیا گیا،" آپ یہ کرسمس کہاں گزارنا چاہتے ہیں؟"

سمیرنوف نے چند اسباب کی بنا پر جواب دینے میں تامل کیا۔

مہمان نواز نے جو ایک بلند قامت اور تیز وطرار عورت تھی، کہا،" آپ ہمارے یہاں کیوں نہیں آجاتے؟"

سمیرنوف کو غصہ آ گیا۔ کیا یہ رویہ اُس لڑکی کی طرح تھا جس نے اپنی ماں کے حکم کے مطابق ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور فوراً اپنی نظر کا رُخ پھیر دیا، جب کہ وہ ایک نوجوان اسسٹنٹ پروفیسر کے ساتھ محو گفتگو تھی۔

سمیرنوف کنواری اور نوجوان لڑکیوں کی ماؤں کی نظروں میں محبوب تھا اور اس بات سے وہ نفرت کرتا تھا۔ وہ اپنے کو ایک سن رسیدہ کنوارا انسان تصور کرتا تھا، حالاں کہ اُس کی عمر صرف چھتیس سال تھی۔ اُس نے روکھے پن سے جواب دیا:

"شکریہ! میں ہمیشہ یہ رات گھر ہی پر گزارا کرتا ہوں۔"

لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا، مسکرائی اور کہا،" کس کے ساتھ؟"

"تنہا۔" سمیرنوف نے جواب دیا۔ اُس کی آواز میں تعجب کی ایک ہلکی سی لہر تھی۔

"نوعِ انسان سے نفرت، کتنا عجیب طریقہ ہے یہ۔" بیگم پیٹرک نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

سمیرنوف کو اپنی آزادی پسند تھی۔ اُسے ان خیالات پر تعجب ہوتا تھا، جب کبھی اُس کے دل میں شادی کا ارادہ بھی پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے کا عادی ہوگیا تھا جو جدید طرز سے سجا ہوا

تھا۔ اُس کے ساتھ معمر اور خاموش مزاج، خدمت گزار ایک اور تنگ بھگ اُسی کی عمر اُس کی بیوی ویرا بھی تھی۔ وہ گھر کا کام کاج کرتی اور کھانا پکاتی تھی ـــ اور اُسے پورے طور پر یقین ہوگیا تھا کہ اُس نے صرف اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ اپنی پہلی محبت میں ثابت قدم رہنے کا متمنی تھا۔ حقیقت میں اُس کا دل زندگی کے تنہا اور بے مقصد روز و شب سے سرد ہو چکا تھا۔ اُس کی زندگی آزاد تھی۔ والدین عرصہ ہوا مر گئے تھے اور قریبی رشتے داروں میں اُس کا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ ایک آسودہ زندگی بسر کرتا تھا اور کسی محکمے سے منسلک تھا۔ وہ زندگی کے خوش آئند اور لطیف پہلو میں بہت لذت اور مسرت محسوس کرتا تھا، گو خود اُس کی نگاہ میں زندگی خالی اور بے مقصد تھی۔ اگر یہ روشن اور حسین خواب اُس کی زندگی میں نہ سماتا، جو اکثر اُس کے دل کی خاموش ویرانی میں ابھر آتا تھا، تو وہ اور بھی زیادہ تنہائی پسند اور خشک انسان بن جاتا۔

اُس کی پہلی اور آخری محبت ایک نوخیز کلی کی طرح کھلنے سے پہلے مرجھا گئی تھی اور اب بھی اکثر شام کی اداس تنہائی میں وہ خواب ـــ اداس اور حسین خوابوں کے دھندلکے میں کھو جاتا تھا۔ پانچ برس پہلے اُس کی ملاقات ایک حسین دوشیزہ سے ہوئی تھی جس نے اُس کے دل پر ایک دائمی نقش چھوڑا تھا۔ اُس کا چہرہ سرد لیکن لطیف و نازک تھا اور وہ کم زور شانوں، نیلی آنکھوں اور گھنگھریالے حسین بالوں والی دوشیزہ اُس کی نظر کو ایک آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی چال سبک اور آہستہ خرام تھی۔ اُس کی صاف، نرم اور لوچ دار آواز ایک چشمے کی روانی سے مشابہ تھی جیسے پانی سنگ ریزوں پر گرتا ہوا گنگنا رہا ہو۔

سمیرنوف ہمیشہ اُسے سفید لباس میں دیکھتا تھا۔ سفید کا نقش اُس کے خیال کے ساتھ بلکہ اس کے تصورِ محبت کا ایک جزو لاینفک بن گیا تھا۔ اُس کا نام ماریہ بھی اُسے پہاڑوں کی چوٹی کو ڈھکنے والے برف کی طرح سفید معلوم ہوتا تھا۔ وہ ماریہ کے والدین سے اکثر ملاقات کرنے لگا تھا۔ کئی موقعوں پر اُس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اُس کے سامنے اُن الفاظ کا اظہار کردے گا جو ایک دھاگے کی طرح دلوں کو دوسرے سے منسلک کردیتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ اپنی نظریں چرا لیا کرتی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی جھلک نمایاں رہتی تھی۔ اُسے کس بات کا ڈر تھا؟ سمیرنوف کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی۔ اُس کے چہرے کے نقوش میں ایک دوشیزہ کی ملاحت کی جھلک تھی۔ جب وہ سامنے آتا تھا تو اُس کی آنکھیں جھک اُٹھتیں اور اُس کے رخساروں پر حجاب کی ریشمیں چلمن لرز جاتی تھی۔

آخر ایک کبھی نہ بھولنے والی شام کو اُس کی تمنائیں بر آئیں اور ماریہ نے اُس کی باتوں کو سنا۔ بہار کا آغاز تھا اور درختوں نے دل کش اور سبز لباس زیبِ تن کیا تھا۔ شہر کے ایک فلیٹ میں ماریہ اور سمیرنوف دریائے والگا کی طرف رُخ کیے کھلے ہوئے دریچے کے پاس بیٹھے تھے، بغیر اس بات پر غور کیے کہ انھیں کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا چاہیے۔ وہ شیریں اور رومان آفریں گفتگو کرتا رہا جو اُس کے لیے خوف کا باعث تھی۔ اُس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی، پھر بھی وہ مسکرائی، پھر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے نرم و

نازک ہاتھ کرسی کے محراب دار بازو پر کانپ رہے تھے۔

''کل ـــــ!'' ماریہ نے آہستہ سے کہا اور چلی گئی۔

ہمیزنوف اُمید اور انتظار کے درمیان دیر تک بیٹھا دروازے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا جس کے دامان میں ماریہ چھپ گئی تھی۔ اُس کے دماغ میں خیالات تیزی سے چکر لگا رہے تھے۔ اُس کی نظر یاسمین کے ایک سفید پھول پر پڑی۔ اُس نے اسے اُٹھالیا اور اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیے یا اجازت لیے بغیر چلا گیا۔

وہ رات بالکل نہ سو سکا۔ دریچے کے پاس کھڑا تنگ و تاریک سڑک کی طرف دیکھتا رہا جو موہ دھر سے دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور وہ یاسمین کے سفید پھول سے کھیل رہا تھا۔ جب روشنی پھیل گئی تو اُس نے دیکھا کہ کمرے کے فرش پر سفید یاسمین کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ بات اُسے اور مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ اُس نے غسل کیا اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس نے دل کے اطمینان اور سکون کو پھر پالیا ہے اور وہ ماریہ سے ملنے چلا گیا۔

وہاں جاکر اُسے معلوم ہوا کہ ماریہ بیمار ہے۔ اُسے راستے میں کسی جگہ ٹھنڈک لگ گئی تھی اور پھر ہمیزنوف نے اُسے کبھی نہ دیکھا۔ دو ہفتے کے بعد وہ مر گئی۔ وہ اُس کی تجہیز و تکفین میں بھی شامل نہ ہو سکا۔ اُس کی موت نے اُس کے احساسات اور امنگوں کو مردہ اور بے حس کر دیا تھا۔ اب تک وہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا یا یہ ایک سہانا خواب تھا۔

اکثر رات کی تنہائی میں وہ اُسے خواب میں دیکھا کرتا اور پھر اُس کی تصویر آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگتی۔ ہمیزنوف کے پاس ماریہ کی کوئی شبیہ نہ تھی۔ کئی سال گزرنے کے بعد صرف ایک بار گزشتہ بہار کے موسم میں ایک ریستوراں کے دریچے سے یاسمین کے ایک سفید پھول کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں ماریہ کی تصویر اُبھری اور وہ اداس ہو کر نفیس اور لذیذ کھانے کے پاس تخیل میں ڈوبا رہا۔ اُس روز سے وہ شاموں کے دھندلکوں میں ماریہ کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب اُس پر غنودگی طاری ہوجاتی تو وہ خواب میں دیکھتا کہ وہ پاس آکر اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی ہے اور اُس کی طرف ارمان اور محبت کی شرمائی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے جن میں ایک لطیف گہرائی ہے اور جیسے وہ اُس سے کسی شے کی طالب ہے۔ کبھی اُسے احساس ہوتا کہ وہ ماریہ کی ملتجی نگاہوں سے مغلوب ہو رہا ہے اور وہ گھبرا جاتا۔

جب وہ پیٹرک کے مکان سے باہر نکل رہا تھا تو اُس نے بے چینی کے عالم میں سوچا۔

'وہ مجھے کرسمس کی مبارک باد دینے ضرور آئے گی۔'

یہ تنہائی اس قدر گراں اور تکلیف دہ تھی کہ اُس نے دل میں خیال کیا۔

'میں شادی کیوں نہ کرلوں؟ میں ان طویل راتوں میں تنہا نہ رہوں گا اور اس طرح تنہائی سے مجھے نجات مل جائے گی۔'

اس خیال کے آتے ہی اُس کے دماغ میں پیٹرک کی لڑکی اریتا کی تصویر کھنچ گئی۔ وہ حسین نہ تھی لیکن ہمیشہ بھڑکیلا لباس پہنتی تھی۔ سمیرنوف کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ اُسے پسند کرتی ہے اور اگر اُس نے درخواست کی تو وہ اس کی خواہش کو کبھی نہ ٹھکرائے گی۔

سڑک پر شور غل اور بھیڑ نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ پیٹرک کی لڑکی اریتا کے بارے میں اُس کے خیالات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔ اس کے علاوہ کیا وہ کسی دوسرے کے لیے ماریہ کی یاد سے بے وفائی کر سکے گا؟ اس کی نگاہ میں ساری دنیا اتنی حقیر تھی کہ اس کے دل میں زبردست خواہش ابھری کہ صرف ماریہ خوابوں کی وسعتوں سے نکل کر اس کے سامنے جلوہ گر ہو اور کرسمس کی مبارک باد پیش کرے۔

'لیکن...' اُس نے غور کرتے ہوئے سوچا، 'وہ مجھے پھر اسی طرح ملتجی نگاہوں سے دیکھے گی۔ میری اچھی اور معصوم ماریہ، وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا اُس کے نرم و نازک لب میرے ہونٹوں سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں...؟'

ماریہ کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اُس کے تخیل کے پردے پر رقص کرتی رہیں۔ اور ان تکلیف دہ خیالات کا سہارا لیے سمیرنوف سڑکوں پر ادھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا اور راہ چلنے والوں کے چہروں میں اپنی زندگی کے نقوش کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن مردوں اور عورتوں کے بھدے چہروں سے اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ اُس نے خیال کیا کہ کوئی انسان ان میں ایسا نہ تھا جس کے ساتھ خوشی یا محبت سے وہ کرسمس کی مبارک باد کا تبادلہ کرسکتا۔ کتنے بے قرار لب باہم مل جائیں گے... بھدے اور موٹے لب، الجھی ہوئی داڑھیاں اور شراب کی میٹھی خوش بو—!

اگر اس روز انسان کو کسی دوسرے کے لبوں کو چومنا ہے تو معصوم بچوں سے بہتر کوئی نہیں ہوسکتا۔ بچوں کے معصوم چہرے سمیرنوف کو بہت اچھے معلوم ہوئے۔

وہ کافی دیر تک ٹہلتا رہا اور جب وہ تھک گیا تو سڑک کے ہنگامے سے دور کر جا کے ایک ویران قبرستان میں چلا گیا۔ ایک زرد چہرے والے لڑکے نے جو ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا، سمیرنوف کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا اور بغیر کسی حرکت کے وہیں بیٹھا گھبرائی ہوئی نظروں سے اُسے تکتا رہا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں افسردگی اور غم کی جھلک تھی، ماریہ کی آنکھوں کی طرح۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اُس کے پاؤں بیٹھنے کے لیے بالکل ناکافی تھے بلکہ نشست گاہ کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ سمیرنوف اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کی طرف ہم دردانہ تجسس بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس تنہا چھوٹے لڑکے کے ساتھ چند باتیں ایسی تھیں جنھوں نے ماضی کے دل کش دنوں کی یاد کو اُس کے ذہن میں ابھار کر ایک انتشار پیدا کردیا تھا۔ دیکھنے میں وہ بالکل معمولی سا لڑکا تھا، پھٹے ہوئے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس۔ اُس کے چھوٹے سے خوب صورت سر پر ایک سفید فر والی ٹوپی تھی اور پاؤں میں میلا اور ٹوٹا ہوا جوتا۔

کافی دیر تک وہ وہیں پر بیٹھا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور غمگین آواز میں چیخنے لگا۔ وہ پھاٹک کے باہر دوڑ کر گیا اور سڑک پر ٹھہر گیا اور مخالف سمت چل کر پھر رُک گیا۔ اُس کی حرکتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے خود معلوم نہیں کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ وہ آہستہ سے ایسی آواز میں جسے وہ خود سن سکتا تھا، بڑبڑا رہا تھا اور اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے پھسل رہے تھے۔ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ ایک سپاہی آیا اور لڑکے سے پوچھا، وہ کہاں رہتا ہے؟

''راؤرگ کے مکان میں۔'' اُس نے بہت چھوٹے بچوں کی طرح لکنت بھری آواز میں کہا۔

''کس سڑک پر؟'' سپاہی نے پوچھا۔

لیکن لڑکا سڑک کا نام نہیں جانتا تھا اور بار بار یہی دُہراتا رہا، ''راؤرگ کا مکان۔''

سپاہی نے جو ایک خوش مزاج نوجوان تھا، ایک لمحے کے لیے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ آس پاس ایسا کوئی مکان نہیں ہے۔

''تم کس کے ساتھ رہتے ہو؟'' ایک مزدور نے جس کے چہرے پر حزن و ملال کی جھلک تھی، سوال کیا، ''کیا تمھارا باپ زندہ ہے؟''

''میرا کوئی باپ نہیں۔'' لڑکے نے بھیڑ کی طرف نم آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمھارا باپ زندہ نہیں، معصوم لڑکے؟'' مزدور نے متانت سے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا، ''کیا تمھاری ماں زندہ ہے؟''

''ہاں، میری ماں زندہ ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''اُس کا نام کیا ہے؟''

''ماں!'' لڑکے نے جواب دیا اور پھر ایک لمحے کے بعد سوچ کر بولا، ''کالی ماں۔''

''کالی ماں؟ کیا یہ اُس کا نام ہے؟'' افسردہ مزدور نے سوال کیا۔

''پہلے میری ایک گوری ماں تھی، لیکن اب میری ماں کالی ہے۔'' لڑکے نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا لڑکے، ہم لوگ تمھارے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش نہ کریں گے۔'' سپاہی نے فیصلہ کن انداز میں کہا، ''اچھا ہوگا اگر میں تمھیں تھانے پر لے جاؤں۔ وہ لوگ ٹیلی فون سے تمھارے رہنے کی جگہ معلوم کرلیں گے۔''

وہ ایک پھاٹک کے پاس گیا اور گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی ایک قلی سپاہی کو دیکھ کر اپنے ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے آیا۔ سپاہی نے اُس سے لڑکے کو تھانے پر لے جانے کو کہا۔ لیکن لڑکے نے کوئی بات سوچی اور چیخ کر بولا، ''مجھے جانے دو، میں خود ہی راستہ معلوم کرلوں گا۔''

کیا وہ قلی کے جھاڑو سے خوف زدہ ہوگیا تھا یا اُسے واقعی کوئی بات یاد آگئی تھی؟ خیر جو کچھ بھی

ہو، وہ اتنی تیزی سے دوڑ گیا کہ تقریباً سمیرنوف کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن فوراً ہی اُس کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ اپنی جائے رہائش کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش میں سڑک کے ایک کنارے سے دوسری طرف دوڑتا گیا۔ سمیرنوف نے اُس کا خاموشی سے پیچھا کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بچوں کے ساتھ بات کرنے میں کیا انداز اختیار کرنا چاہیے۔

آخر کار لڑکا تھک گیا۔ وہ ایک لالٹین کے کھمبے کے پاس رُک گیا اُس کا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ آنسو اب بھی اُس کی نیلگوں آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

''کیو لڑکے!'' سمیرنوف نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا، ''کیا تمھیں مکان نہیں ملا؟''

لڑکے نے اُسے اپنی اداس آنکھوں سے دیکھا اور یکایک سمیرنوف کو خیال آیا کہ وہ کس جذبے سے مغلوب ہوکر لڑکے کے تعاقب میں یہاں تک آیا تھا۔ اس ننھے منے لڑکے کے چہرے اور آنکھوں میں ماریہ کی مشابہت تھی۔

''تمھارا نام کیا ہے، اچھے لڑکے؟'' سمیرنوف نے نرمی سے پوچھا۔

''نورا'' لڑکے نے جواب دیا۔

''کیا تم اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہو، نورا؟''

''ہاں، ماں کے ساتھ... لیکن وہ کالی ماں ہے۔ میری ماں گوری تھی۔''

سمیرنوف نے خیال کیا کہ کالی ماں سے اُس کا مطلب گرجا کی پادری عورت سے تھا۔

''تم یہاں کس طرح کھو گئے؟''

''میں ماں کے ساتھ جارہا تھا اور ہم دونوں اسی طرح چلتے رہے۔ ایک جگہ پر اُس نے بیٹھ جانے اور انتظار کرنے کے لیے مجھ سے کہا اور خود کہیں چلی گئی۔ مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''تمھاری ماں کون ہے؟''

''میری ماں...؟ وہ کالی اور غصہ ور ہے۔''

''وہ کیا کام کرتی ہے؟''

لڑکے نے ایک وقفے کے لیے سوچا، پھر کہا، ''وہ قہوہ پیتی ہے۔''

''اس کے علاوہ وہ کیا کرتی ہے؟''

''وہ مکان میں رہنے والے کرایے داروں سے جھگڑا کرتی ہے۔''

''اور تمھاری گوری ماں کہاں ہے؟''

''وہ چلی گئی۔ اُسے لوگ تابوت میں بند کرکے لے گئے اور باپ بھی وہیں چلا گیا۔''

لڑکے نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

'میں اس کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟' سمیرنوف نے سوچا۔

یکا یک لڑکا پھر دوڑنے لگا۔ سڑک کے چند چوراہے طے کرنے کے بعد اُس کی چال مدھم ہوگئی۔ اُس کے چہرے پر بیم و رجا کی امتزاجی کیفیت نمایاں تھی۔

''یہی راؤرک کا مکان ہے۔'' اُس نے ایک پانچ منزلہ بدصورت، بوسیدہ اور خستہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیمرنوف سے کہا۔

اسی لمحے راؤرک کے مکان کے دروازے پر کالے بالوں اور کالی آنکھوں والی ایک عورت سیاہ لباس پہنے اور سر پر ایک کالا رومال باندھے ہوئے نمودار ہوئی۔ لڑکا خوف سے کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

''ماں!'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''تو یہاں کس لیے آیا کم بخت۔'' اُس نے چیخ کر کہا، ''میں نے تو تجھے بنچ پر بیٹھنے کو کہا تھا۔''

وہ اُس کی ضرور مرمت کرتی لیکن ایک شریف آدمی کی سنجیدہ اور پُر وقار صورت کو دیکھ کر جو اُس کی حرکتوں کا غور سے جائزہ لے رہا تھا، اُس نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔

''کیا تو کھیل کود اور دوڑ دھوپ کے بغیر آدھ گھنٹا بھی نہیں رہ سکتا۔ پاجی، میں تیری تلاش میں کتنی دیر سے حیران و پریشان ہو رہی ہوں۔''

اُس نے لڑکے کے چھوٹے سے ہاتھ کو اپنے بڑے اور بھدے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے دروازے کے اندر لے گئی۔

سیمرنوف نے سڑک اور مکان کے راستے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور چلا گیا۔

سیمرنوف کو ایرک پر اعتماد تھا اور وہ اُس کے صحیح فیصلے کو سننا پسند کرتا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے نورا کے بارے میں اُس سے ساری باتیں کہیں۔

''وہ لڑکے کو جان بوجھ کر چھوڑ گئی تھی۔'' ایرک نے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے کہا، ''کتنی مکار عورت ہے وہ۔ وہ لڑکے کو گھر سے اتنی دور لے گئی۔''

''کس بنا پر اُس نے ایسا کیا؟'' سیمرنوف نے سوال کیا۔

''یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس بدمعاش عورت نے خیال کیا ہوگا کہ لڑکا سڑکوں پر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہے گا، یہاں تک کہ کوئی اُسے اٹھا کر لے جائے گا... آپ ایک سوتیلی ماں سے اور کس بات کی اُمید کر سکتے ہیں۔ اُس کے لیے وہ لڑکا کس کام کا ہے؟''

''لیکن یہ ممکن تھا کہ پولیس اُسے پا لیتی۔'' سیمرنوف نے ایسے لہجے میں کہا جس سے عیاں تھا کہ اُسے اس بات کا یقین نہ آیا تھا۔

''شاید... لیکن اگر وہ شہر ہی چھوڑ دیتی تو پھر وہ کس طرح اُس کو تلاش کرتے؟''

سیمرنوف جواب میں مسکرایا، 'واقعی، ایرک کو ایک سراغ رساں افسر ہونا چاہیے تھا۔' اُس نے دل میں سوچا۔

جب وہ ایک کتاب لیے لیمپ کے نزدیک بیٹھا تھا تو اُس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اُس نے خواب میں معصوم اور گلاب کے پھولوں جیسی سفید ماریہ کو دیکھا۔ وہ آئی اور اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر نورا سے مشابہ تھا۔ وہ اُس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی بات کی اُس سے امید رکھتی ہو۔ اُس کی تاب ناکی اور التجا آمیز آنکھوں کی گہرائیوں کو دیکھنا میرنوف کے لیے باعث اذیت تھا۔ یہ بات ایک پہیلی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور کرسی کے پاس گیا جس پر ماریہ بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے رُو بہ رُو کھڑے ہو کر اُس نے بلند آواز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''تم کیا چاہتی ہو— مجھے بتاؤ؟''

لیکن اب وہ وہاں موجود نہ تھی۔

''یہ محض ایک خواب تھا یا واہمہ۔'' میرنوف نے افسردگی سے کہا۔

دوسرے دن میرنوف ادبی نمائش سے باہر آ رہا تھا کہ اتفاقاً اُس کی ملاقات پیٹرک کے گھر والوں سے ہو گئی۔ اور اُس نے ارینا کو نورا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

''بے چارہ لڑکا!'' ارینا نے آہستہ سے کہا، ''اُس کی سوتیلی ماں صرف اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

''اس کے بارے میں کامل یقین سے نہیں کیا جا سکتا۔'' میرنوف نے جواب دیا۔ اُسے یہ جان کر غصہ آیا کہ ایرک اور ارینا دونوں نے ایک معمولی واقعے کے بارے میں ایسا المناک نظریہ قائم کیا۔

''صاف ظاہر ہے کہ لڑکے کا باپ زندہ نہیں اور وہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اُسے بارِ گراں خیال کرتی ہے۔ اگر وہ اُس سے کسی معقول طریقے سے نجات حاصل نہ کر سکی تو وہ اُسے ضرور گھر سے نکال دے گی۔''

''تم ہر چیز کا قنوطی نظریہ قائم کرتی ہو۔'' میرنوف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کیوں نہیں اُسے اپنے پاس رکھ لیتے۔'' ارینا نے مشورہ دیا۔

''میں...؟'' میرنوف نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ تنہا زندگی گزارتے ہیں۔'' ارینا نے اصرار کے لہجے میں کہا، ''آپ کا کوئی رشتے دار بھی تو نہیں۔ کرسمس کے موقعے پر یہی نیک کام انجام دیجیے۔ کم از کم تبادلہ تہنیت کے لیے تو آپ کو ایک موزوں ہستی مل جائے گی۔''

''لیکن میں ایک بچے کی کیسے پرورش کر سکوں گا ارینا؟''

''اُس کے لیے آپ ایک نرس رکھ دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قسمت نے آپ کو یہ لڑکا عطا کیا ہے۔'' اور یہ کہتے وقت ارینا کا چہرہ سرخیوں سے دمک اُٹھا۔

میرنوف نے لڑکی کے تمتماتے ہوئے چہرے کو تحیر اور غیر شعوری انہماک سے دیکھا— اُس کا

دل گداز ہونے لگا۔ اور اسی شام جب ماریہ خواب میں پھر نظر آئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کمرے کی خاموشی میں یہ الفاظ نقرئی گھنٹیوں کی طرح بجتے ہوئے معلوم ہوئے۔

'وہی کرو جو وہ چاہتی ہے۔' اُس کے دل نے سرگوشی کی۔

سمیرنوف مسرور ہوکر نیند سے چونک اُٹھا اور اپنی خواب آلود آنکھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اُس کی نظر میز پر رکھے ہوئے یاسمین کے سفید پھول پر پڑی۔ 'یہ یہاں کس طرح آیا؟ کیا ماریہ نے اسے اپنی محبت کی یادگار کے طور پر رکھ چھوڑا تھا؟' — اور پھر یکایک اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ارینا سے شادی کرکے اور نورا کو اپنا لڑکا مان کر وہ ماریہ کی خواہش کو پوری کر سکے گا۔ اُس نے وفورِ شوق میں یاسمین کی معطر پنکھڑیوں کو کئی بار سونگھا۔ اُسے یاد آگیا کہ وہ اس روز خود ہی یہ پھول لایا تھا۔ فوراً ہی اُس نے سوچا، 'اس میں کوئی فرق نہیں کہ میں ہی اسے لایا تھا یا کوئی اور۔ اس بات کی علامت یہ ہے کہ میں اسے خرید کر لایا اور پھر بھول گیا کہ میں نے اسے خریدا تھا۔'

اور— صبح ہوتے ہی وہ نورا کی تلاش میں چل پڑا۔ وہ اُسے ایرک کے مکان کے دروازے ہی پر مل گیا اور اُس نے وہ جگہ بتائی جہاں وہ رہتا تھا۔ نورا کی ماں قہوہ پی رہی تھی اور ایک لال ناک والے کرایے دار سے جھگڑا کر رہی تھی۔ نورا کے بارے میں سمیرنوف صرف اتنی باتیں جان سکا۔

جب وہ تین برس کا تھا تو اُس کی ماں مرگئی تھی۔ اُس کے باپ نے اس سیہ فام عورت سے شادی کی تھی اور اُسی سال وہ بھی مرگیا۔ اس سیہ فام عورت کا جس کا نام پولینا تھا، اُس کا ایک سال کا اپنا بھی ایک چھوٹا بچہ تھا۔ وہ پھر شادی کرنے والی تھی۔ یہ شادی چند دنوں میں انجام پانے کو تھی اور اس کے بعد فوراً وہ دونوں ہنی مون منانے کسی دور دراز بیرونی علاقے کو جانا چاہتے تھے۔ نورا اُن کے لیے ایک اجنبی تھا اور اُن کی راہ میں حائل۔

''مجھے اس لڑکے کو دے دو۔'' سمیرنوف نے اپنی رائے پیش کی۔

''خوشی سے۔'' پولینا نے کینہ آمیز مسرت کے ساتھ کہا۔ پھر کچھ وقفے کے بعد بولی، ''آپ کو صرف اُس کے کپڑوں کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔''

اور اس طرح نورا، سمیرنوف کے مکان میں منتقل کردیا گیا۔

ارینا نے اُس کے لیے ایک نرس تلاش کرنے اور نورا کے فلیٹ میں لائے جانے کے سلسلے میں دوسری معلومات فراہم کرنے میں مدد کی۔ اس ضمن میں وہ سمیرنوف کے مکان پر آتی جاتی تھی اور اسی بنا پر وہ اُس کی نگاہوں کو مانوس معلوم ہونے لگی۔ ارینا کے دل کی راہیں اُس کے لیے کھل گئی تھیں اور اُس کی حسین آنکھیں شرگیں اور منور معلوم ہوتی تھیں۔ اُن میں تابانی تھی، ملاحت تھی۔ مجموعی طور پر وہ اُن خوبیوں سے معمور تھی جو ماریہ میں پائی جاتی تھیں۔

نورا کی گوری ماں کی کہانیاں ایرک اور اُس کی بیوی ویرا کے دل میں نقش کر گئیں۔ مٹنے کی ایک اداس شام کو اُس کو بستر پر سلاتے وقت انھوں نے پلنگ کے پاس چینی کا ایک سفید انڈا رکھ دیا۔

''یہ تمھاری گوری ماں کے یہاں سے آیا ہے۔'' ویرا نے کہا، ''لیکن اسے اُس وقت تک نہ چھونا جب تک کہ آفتاب نہ نکل آئے اور گرجا کی گھنٹیاں نہ بجنے لگیں۔''

نورا خاموشی سے لیٹا رہا۔ کافی دیر تک وہ خوب صورت انڈے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اُسے نیند آگئی۔

اور اسی شام کو سمیرنوف گھر پر تنہا بیٹھا رہا۔ آدھی رات کے قریب نیند کے ناقابلِ برداشت غلبے سے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ خوش ہوا کیوں کہ فوراً وہ ماریہ کو دیکھ سکے گا اور وہ خواب میں نظر آ گئی۔ سفید اور روشن لباس پہنے — ایک نور سا پھیلاتی ہوئی۔ اور گرجا کی گھنٹیاں اُس کی آمد کے ساتھ ہی گنگنا اٹھیں، ایک سرور انگیز لے میں — ایک حسین اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ وہ اُس پر جھکی اور... ایک ناقابلِ بیان مسرت!

سمیرنوف نے اپنے لبوں پر ایک نازک لمس محسوس کیا اور ایک نرم آواز نے آہستہ سے گل افشانی کی، ''مسیح کا ظہور ہوا ہے۔''

اپنی آنکھوں کو کھولے بغیر سمیرنوف نے اپنی بانہیں پھیلا دیں اور ایک نرم و نازک جسم اُس کی آغوش میں تھا۔ یہ نورا تھا جو اُس کے زانو پر چڑھ کر کرسمس کی تہنیت پیش کرنے آیا تھا۔

گرجا کی گھنٹیوں کی طرب ناک آواز سے لڑکا جاگ اُٹھا تھا۔ اُس نے سفید انڈے کو ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور دوڑ کر سمیرنوف کے پاس چلا آیا تھا۔

سمیرنوف کی نیند ٹوٹ گئی۔ نورا ہنسنے لگا اور سفید انڈے کو دکھاتے ہوئے بولا، ''گوری ماں نے بھیجا ہے۔'' اُس نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا، ''میں اُسے آپ کے حوالے کر دوں گا اور آپ اسے خالہ ارینا کو دے دیجیے گا۔''

''بہت اچھا پیارے! میں وہی کروں گا جو تم نے کہا ہے۔'' سمیرنوف نے جواب دیا۔

اُس نے نورا کو بستر پر سلا دیا اور سفید انڈے کو لے کر ارینا کے یہاں چلا گیا جو اُس کی گوری ماں کا تحفہ تھا لیکن اُس وقت سمیرنوف کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ تحفہ ماریہ نے اُسے بھیجا ہے۔

☆☆☆

اسٹیفن لیکاک / رؤف پاریکھ

بازی گر کا انتقام☆

شعبدے باز نے ہال میں بیٹھے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

''خواتین و حضرات! جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا، یہ کپڑا بالکل سادہ ہے۔ اب میں اس میں سے مچھلیوں سے بھرا پیالہ نکال کر دکھاؤں گا۔ جنتر منتر تنتر— جادو!''

پورے ہال میں حیرت سے پُر آوازیں ابھریں، ''کمال ہے بھئی، یہ کیسے ہوا؟''

لیکن آگے کی نشستوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے فطین صاحب نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب جھک کر سرگوشی کی، ''یہ— اس— نے— اپنی— آستین— میں— چھپا— رکھا— تھا۔ ہاں ہاں بالکل۔ یہ اس نے اپنی آستین میں چھپا رکھا تھا۔'' جواب ملا اور پورے ہال میں ہر شخص سرگوشی کرنے لگا، ''یہ— اس— نے— آستین— میں— چھپا— رکھا— تھا۔''

شعبدے باز نے کہا، ''اور اگلا جادو لوہے کے چھلّوں کا ہے۔'' اس نے لوہے کے بڑے بڑے تین چھلّے نکالے، ''آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تینوں الگ الگ ہیں لیکن جادو کے زور سے میں انھیں جوڑ دوں گا۔ جنتر منتر تنتر— جادو!'' کھن کھن کھن کی آواز سنائی دی اور لوہے کے تینوں حلقے ایک دوسرے کے اندر پھنسے ہوئے نظر آنے لگے۔ ہال میں بیٹھے لوگ مبہوت ہو گئے۔ لیکن فطین صاحب نے سرگوشی کی، ''ایسے— ہی— تین— چھلّے— اس— نے— آستین— میں— چھپا— رکھے— تھے۔'' اور پورا ہال سرگوشیاں کرنے لگا، ''ایسے— ہی— تین— چھلّے— اس— نے— آستین— میں— چھپا— رکھے— تھے۔''

☆ اسٹیفن لیکاک ۱۸۶۹ء میں انگلستان میں پیدا ہوا لیکن اس نے کینیڈا کی شہریت اختیار کرلی۔ مونٹریال کی میک گل یونی ورسٹی میں سیاسیات اور معاشیات کے شعبے کا سربراہ تھا۔ اس نے سیاسیات اور معاشیات پر بھی کتابیں لکھیں لیکن شہرت مزاحیہ تحریروں کی بدولت پائی۔ لیکاک کا مزاح تحریف (parody)، فارس (farce) اور تقلیب خندہ آور (burlesque) کے عناصر سے عبارت ہے۔ معاصر سماج کی حماقتوں اور بنے بنائے طور طریقوں اور خیالات پر اس نے گہرے وار کیے۔ ۱۹۴۴ء میں انتقال ہوا۔

شعبدے باز کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ لیکن اس نے کہا:

''خواتین و حضرات! اور اب ایک نہایت حیرت انگیز شعبدہ! میں کسی بھی ہیٹ سے جتنے چاہوں انڈے نکال سکتا ہوں۔ کیا کوئی صاحب اپنا ہیٹ مجھے عنایت کریں گے؟— شکریہ شکریہ! اور یہ دیکھیے۔ جنتر منتر منتر— جادو!''

اس نے ایک ایک کر کے سترہ انڈے اس ٹوپی سے نکالے۔ کچھ دیر تک لوگ اس شعبدے سے بہت متاثر نظر آئے لیکن فطین صاحب نے سرگوشی کی، ''اس— کی— آستین— میں— مرغی— ہے۔'' اور تمام ہال سرگوشیوں سے بھر گیا، ''اس— کی— آستین— میں— مرغی— ہے۔''

انڈوں والا شعبدہ بھی برباد ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی شعبدے دکھائے، لیکن سرگوشیوں کے ذریعے انکشاف ہوا کہ شعبدے باز نے لوہے کے حلقوں، مچھلی کے پیالے اور مرغی کے علاوہ اپنی آستین میں تاش کے پتوں کی کئی گڈیاں، ایک لمبی سی ڈبل روٹی، ایک گڑیا کا پالنا، ایک زندہ چوہا، پچاس سینٹ کا ایک سکہ اور ایک جھولنے والی کرسی بھی چھپا رکھی تھی۔

شعبدے باز کی ساکھ داؤ پر لگ چکی تھی۔ آخر اس نے قوت مجتمع کر کے محفل کے اختتام سے قبل ایک آخری کوشش کرنے کی ٹھانی۔

''خواتین و حضرات!'' اس نے کہا، ''اب میں پیش کروں گا آپ کی خدمت میں، ایک مشہور جاپانی جادو جو حال ہی میں ایک جاپانی جزیرے کے مقامی باشندوں نے مجھے سکھایا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اگلی قطار میں بیٹھے فطین صاحب کی طرف آیا اور کہا، ''جناب عالی! کیا آپ اپنی طلائی گھڑی مجھے عنایت فرمائیں گے؟''

فطین صاحب نے اپنی گھڑی شعبدے باز کو دے دی۔ ''کیا مجھے آپ اجازت دیں گے کہ میں اسے اس ہاون دستے میں ڈال کر کوٹوں؟'' اس نے اکھڑپن سے پوچھا۔

فطین صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرائے۔ شعبدے باز نے اس قیمتی گھڑی کو ہاون دستے سے بڑی بے دردی سے کوٹا۔ پے در پے ضربیں لگانے کی صدا ہال میں گونجتی رہی۔ ''اس— نے— اسے— اپنی— آستین— میں— چھپا— لیا— ہے۔'' فطین صاحب نے سرگوشی کی، ''اچھا جناب! کیا آپ اپنا رومال مجھے عنایت کریں گے؟ اور اجازت دیں گے کہ میں اس میں مشین سے سوراخ کر دوں؟'' اس نے فطین صاحب سے کہا، ''شکریہ، جناب شکریہ۔'' اس نے رومال لے کر اس میں بڑے بڑے سوراخ کر دیے اور رومال فضا میں پھیلا کر کہا، ''خواتین و حضرات! غور سے دیکھیے! اس میں کوئی دھوکا نہیں ہے۔ سوراخ آپ اپنی آنکھوں سے خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔''

فطین صاحب کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس پُر اسرار شعبدے نے ان کے اندر ایک تجسس پیدا کر دیا تھا۔ ''اور جناب کیا اب آپ اپنا قیمتی ریشمی ہیٹ مجھے عطا کریں گے اور مجھے اجازت دیں گے کہ میں اس پر

اُچھلوں کودوں؟ شکریہ جناب، بہت شکریہ!'' اس نے پھرتی سے ٹوپی پر اُچھلنا شروع کیا اور چند ہی لمحوں بعد اسے ایسا کر دیا کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔

''اور جناب! کیا آپ ریشمی ٹائی مجھے عطا فرمائیں گے اور مجھے اجازت دیں گے کہ میں اسے موم بتی سے جلا دوں؟ شکریہ جناب، شکریہ! اور اب آپ مجھے اپنا چشمہ عنایت فرمائیں گے اور اسے ہاون دستے میں ڈال کر توڑنے پھوڑنے کی اجازت دیں گے؟ شکریہ جناب، بہت بہت شکریہ!''

''کمال ہے بھئی! یہ جادو تو میری سمجھ سے باہر ہے۔'' فطین صاحب حیرت سے بولے۔

حاضرین کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ شعبدے باز نے فطین صاحب پر حقارت کی نظر ڈالی اور گویا ہوا، ''خواتین و حضرات! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ میں نے ان صاحب کی اجازت سے ان کی سونے کی گھڑی توڑ دی، ان کی ٹائی جلا دی، ان کا چشمہ توڑ ڈالا اور ان کے ہیٹ کو کچل دیا۔ اگر یہ مجھے اجازت دیں تو میں ان کے لباس پر رنگ برنگ پٹیاں رنگ دوں یا ان کے جوتے جلا دوں! کیوں کہ آپ کو تفریح اور مسرت مہیا کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ اور اگر یہ صاحب اس کی اجازت نہیں دیتے تو آج کی محفل اختتام کو پہنچی۔ خدا حافظ۔''

اس کے ساتھ ہی نہایت تیز آواز میں موسیقی بجنے لگی اور پردہ گرنے لگا۔ تماشائی اٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے سوچتے جا رہے تھے کہ واقعی کچھ جادو تو اس شعبدے باز نے ایسے دکھائے تھے جس میں چیزیں اس کی آستین میں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔

(اسٹیفن لیکاک کی کتاب Literary Lapses میں شامل مضمون
The Conjrer's Revenge کا ترجمہ)

☆☆☆☆

اختشام/کرن سنگھ

راحت

کچھ دن پہلے ایک دوپہر کی بات تھی۔

میں اور سردار صاحب بات چیت کے موضوعات اور ان کی تہ داریوں کو کھوجتے کھوجتے ملکی حالات اور سیاسی معاملات کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ ہم دونوں کے پاس کہنے سننے کو بہت کچھ تھا۔ میں اگر تیزی سے پھیلتی ہوئی عدم رواداری، مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی سے پریشان تھا تو سردار صاحب پنجاب کی روز بہ روز بگڑتی ہوئی صورت حال اور حکومت کی عمل داری نہ ہونے پر مایوس تھے۔ یہ باتیں کچھ انفرادی اذیت سے پیدا ہوئی تھیں، کچھ سنی سنائی ادھوری سچائی پر مبنی تھیں جو کسی انجام تک پہنچنے کی بجائے بگولوں کی طرح گھنٹوں دائروں میں گھومتی رہتی ہیں۔ بہت دیر تک میں اور سردار صاحب ایک دوسرے کو اپنے اپنے دکھ درد کہتے سنتے رہے۔

یوں دیکھا جائے تو سردار صاحب میرے بہت پرانے دوست یا واقف کار نہیں۔ جنوری یا فروری ۱۹۸۵ء میں میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں بھوپال شہر کا رہنے والا ہوں، یہ ملاقات اُس دردناک واقعے کے بہانے سے ہوئی تھی جس سے یہ شہر نو دریافت دنیا کا حصہ بنا۔ ویسے ایک ایسی جگہ کو یاد رکھا بھی کیوں جائے جس کی کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہاں کے پہاڑ، اُن کے لیے جنھوں نے غرور سے سر تانے پہاڑی سلسلے نہ دیکھے ہوں، اور تالاب اُس کا جو تال تلیا کا بھید نہ جانے۔ جنگل کٹ کر ختم ہو چکے اور موسم کا توازن بگڑ کر کسی ایسے شہر کا جس میں پانچ سات لاکھ افراد بستے ہوں۔ پہلے اس شہر کے متعلق یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ اس کی مٹی پیروں کو پکڑ لیتی ہے جو یہیں آیا، یہاں کا ہو کر رہ گیا مگر ایسا لگتا ہے کہ اس مٹی کی پکڑ ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ باہر سے آنے والے پلان تو یہی بناتے ہیں کہ یہاں بس جائیں گے مگر کوئی چیز ایسی ہے جو انھیں ایسا کرنے نہیں دیتی لیکن کسی جگہ کو اگر اہمیت ملنی ہی ہو تو وجوہ کی کوئی کمی نہیں، جیسے اس بھوپال شہر میں 'کلیر کاربائیڈ' آپ کے سامنے ہے، جو میری سردار صاحب سے پہلی ملاقات کا سبب بنا۔

''تب...!''

اس حادثے کو ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور شہر ابھی موت کی مضبوط گرفت میں تھا۔ چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی تھی، زندگی کی کوئی آہٹ بھی موت کا خطرہ بن کر سنسنی پھیلا دیتی تھی جس طرح جنازے میں شامل بھی لوگ چاہے ان چاہے اداس ہو جاتے ہیں۔ یہاں باہر سے آنے والا ہر کوئی چاہے وہ کوئی سماج سیوک ہو یا کوئی اور ذمے داری نبھا رہا ہو، وہ خود بھی اس شہر کے اجاڑپن اور اداسی کا حصہ بن جاتا تھا۔ سردار صاحب کی بھی یہی کیفیت تھی جو پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے اور کسی امریکی اتارٹی کے ساتھ گیس حادثے سے متاثرین کو معاوضہ دلانے کے لیے کام کر رہے تھے۔ میری ان سے ملاقات دلی کے ایک مشترکہ دوست کے توسط سے ہوئی تھی۔

''...اس ساری تفصیل میں جانے کا مت کہیے۔'' میرے ذاتی تجربے کو جاننے کی خواہش کے جواب میں، میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

بتاتا بھی کیا میں انھیں؟ متاثرین کی امداد کے نام پر جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سب سردار صاحب کے سامنے بھی تھا یا بعد میں جو کچھ ہوا وہ بھی اخبارات میں محفوظ ہے اور تاریخ کا حصہ ہے۔ وہ ہماری نظروں سے بھی گزرا ہے، اور کچھ اہم خبریں آپ نے بھی پڑھی ہوں گی... شہر کے لوگ تو خود اپنے ہی خاموش تماشائی تھے، ایک طرح سے ان کے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، بس سلسلے وار خاموش تصویر اتارتا ہوا کیمرہ۔ ان تصویروں کے ساتھ کمنٹری تو بہت بعد میں جڑی ہے۔

اب تو میں بھی اپنے احساسات کو شاعری میں ڈھال سکتا ہوں، دو چار جملے لکھ سکتا ہوں، کیوں کہ وہ موت اب میرے ماضی کا حصہ ہے۔ کچھ اپنے سوچ بچار، کچھ تجربے اور جو تھوڑا بہت پڑھا ہے، اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جب ایک شہر، جیسے بھوپال — مرتا ہے تو بڑے وسیع وعریض فلک پر اس موت کے نتیجے میں ہوتا یہ ہے کہ زندہ بچ جانے والے لوگوں کی امیدیں اور یقین ختم ہو جاتا ہے۔ جب کوئی خود اپنی مرضی سے مرتا ہے تو اس کے سامنے طرح طرح کے خیالات ہوتے ہیں جو اس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور اسے نڈر کرتے ہیں۔ لیکن جب یقین ہمیں تنہا چھوڑ کر خود فرار ہو جاتا ہے تو ہماری آرزوئیں اور امیدیں منہ موڑ لیتی ہیں اور ہمیں اپنی ہی نظروں میں بونا اور مشکوک کر دیتی ہیں۔ ایسا ہی اس (دسمبر 84ء کے) حادثے سے سردار صاحب سے ملاقات کے دوران ہوا تھا۔ یقین دم توڑ چکا تھا اور اس کی جگہ مایوسی، شک اور جھنجلاہٹ نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ نظم وضبط نامی ہر چیز کو تہس نہس کرنے کی شدید خواہش نے گھیر لیا تھا۔

''آپ جتنی چاہیں گے،'' میں نے سردار صاحب کو یقین دلاتے ہوئے کہا تھا، ''میں مدد کروں گا، آپ ایک اچھا کام کر رہے ہیں۔ میرا اسسٹنٹ آپ کے ساتھ رہے گا۔ کاربائیڈ کے ایریے میں جہاں گیس کا اثر سب سے زیادہ ہوا تھا، اس کے رشتے دار اور واقف کار رہتے ہیں۔ آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ مجھ سے یا میرے خاندان کے کسی فرد سے کلیم بھرنے کا نہیں کہیں گے۔''

''کیوں؟'' انھوں نے بات کو سمجھنے کے باوجود اچنبھے سے پوچھا، ''آپ لوگوں نے بھی تو کچھ

بھگتنا ہوگا؟"

رونا، گانا یا سوچ کر اپنے خیال کا اظہار کرنا، یہ سب کبھی کبھی آدمی کو تماشا بنا کر دیتے ہیں — اُس پل میں غصے ہو کر بھی سمجھانا چاہتا کہ آپ میری توہین کر رہے ہیں تو سردار صاحب کو سمجھا سکتا تھا۔

"اس کا معاوضہ دینے کی قوت کس میں ہے؟" یہ کہتے ہوئے میری آواز رندھ سی گئی... "کتنا دے دیں گے — پانچ لاکھ یا دس لاکھ؟ وہ کیا میری شرم ناتوانی کی قیمت ہو سکتی ہے؟ چھوڑیے، آپ وہ تو ایمان داری کے بغیر چاہتیں نا؟ وہ مل جائیں گے... مجھے اور میرے خاندان کو چھوڑیے۔"

ہماری نیت جانے کب اور کیسے طے ہوتی ہے۔ خود اپنا ایک ادھورا جملہ ہم کسی کے منہ سے پورا ہوتے سنتے ہیں اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایسی ملاقات آگے دوستی کی راہ پر لے جاتی ہے۔ مقابلے کے اس سلسلے کی طرف جس میں کوئی ایک ہی جیت رہ سکتا ہے۔ ابھی کچھ طے نہیں، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میری بات کے بعد خاموشی کے وقفے نے شاید ہمارے آئندہ کے تعلقات کو طے کر دیا۔ اس بات کے بعد جب ہم ملے تو زیادہ گرم جوشی سے۔ خاندان کے کلیم کا سوال خود ہی ہماری بات چیت سے خارج ہو گیا لیکن کچھ اور ملاقاتوں کے بعد کرکٹ، اسکواش اور اردو غزل پر بات کرتے کرتے مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ میں بنا اُن کے پوچھے یا یاد دلائے اس حادثے کے بارے میں اپنا بیان بہت خوف زدہ ہو کر جذباتی انداز میں تفصیل سے سردار صاحب کو سنا رہا ہوں بلکہ پوری روداد بیان کرنے کے بعد ہی مجھے اس کا احساس ہوا۔ ایسی کیا خاص بات تھی میرے پاس اُن کو بتانے کے لیے۔ حادثے کی رات کو دکھ اور تکلیف کے ایک گھنے درخت سے تشبیہ دیں تو میرا بیان تو ایک بہت ہی چھوٹی سی ہری کونپل کے برابر ہوگا۔ میرے خاندان میں سے اس حادثے سے مرا تو کوئی نہیں، البتہ کتنوں ہی کو موت کے منہ سے کھینچ کر لایا گیا۔ پورے خاندان کے درمیان ایک عجیب ناٹک جسے ڈرامہ کا میڈی سے کم کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

ہم سب دوغلے، جھوٹے، موقع پرست — دنیا کا گرے سے گرا لفظ استعمال کر لیں 'ہیں' مگر کیا اتنے؟ ہر طرف ناٹک چل رہا ہے۔ سب اپنے مُردوں کا مال کھانے اور بٹورنے میں لگے ہوئے ہیں، کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں۔ بس موقع ہاتھ لگ گیا ہے۔ مجبوری میں کیا گیا تو بڑے سے بڑا جرم سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن ایک موت کے شہر میں چھوٹے چھوٹے مالی فائدوں کے لیے، موت کے سرٹیفکیٹ سے، ڈاکٹر کے پرچے اور زمین جائیداد پر ناجائز قبضے تک، بازار گرم تھا۔ میں بتاؤں آپ کو، اس وقت اتنے ڈاکٹر تھے کہاں کہ مرتوں کے علاوہ کسی اور کی بات سنی جاتی۔ اسپتال یا کلینک جا کر پرچی بنوائی جاتی یا علاج کیا جاتا۔ اور آج تک حادثے کے اتنے برسوں بعد بھی یہ کام کیا اتنا ہی آسان ہے؟

میرے لیے تو کوئی مشکل نہیں ہے، دوستوں سے یا پیسے دے کر کہیں سے بھی سرٹیفکیٹ بنوا سکتا ہوں۔ کتنے ہی ضرورت مندوں کو بنوا کر دیا بھی ہے، لیکن یہ شہسواری کس پر۔ یہاں حکومت کے مقامی موت کے فرشتے ہوں یا یہ آپ کا غیر ملکی اناڑی، They are all in. for their pound of flesh۔

اور میں سرٹیفکیٹ بنوا دیتا ہوں کہ گیس سے میرے بدن کو گھن لگ گیا۔ اس سے مجھے کینسر ہو گیا۔ کینسر تو معصوم بیماری ہے۔ ان لوگوں کا آپ کیا کریں گے جو کبھی operation faith، تو کبھی فری راشن، دودھ، بریڈ کے نام پر لاکھوں روپے ہڑپ کر رہے ہیں۔ یہ اسپتالوں، دواؤں، سائنس دانوں، وکیلوں کا نانک کار بائیڈ کے عہدے داروں کی گرفتاری اور مقامی کرتا دھرتا کو من مانی کرنے کی چھوٹ، کتنی شرم ناک بات ہے، ایسا کم بخت شہر جہاں ماتم کرنے کے لیے بھی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ شریک نہ ہو پائیں۔

سچ سچ اُن دنوں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے خود پر قابو نہیں رہتا تھا۔ ویسے مجھ جیسے بڑے لوگ یہاں اگر ان تمام دھوکے بازی کے کاموں میں لگے ہوئے تھے تو ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے بڑے سے بڑے لمحے میں بھی توازن نہیں کھویا تھا اور یہ شہر اگر آج دوبارہ زندگی کے سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو یہ سب انھیں کی وجہ سے ہے۔ اُن لوگوں کو بھلے اس کا غم نہ ہو لیکن میرے اندر پیدا ہونے والی مایوسی مجھے یقین دلاتی ہے کہ ایسے لوگ ایک جدوجہد بھری زندگی گزاریں گے لیکن کل کو کوئی اُن کا نام لیوا بھی نہ ہوگا۔

میری آپ بیتی اور تلخ بیانی کو سردار صاحب نے گہری خاموشی میں ڈوب کر سنا۔ میں رُک کر ابھی سانس بھی نہیں لینے پایا تھا کہ اُن کی خموشی کا بند ٹوٹا۔

انتظامات!

انتظامات سے انھیں بے حد برہمی تھی۔ جس کی وجوہات اُس وقت تک مجھے اتنی تفصیل سے معلوم نہیں تھیں۔ وہ مجھے اندرا گاندھی کے قتل کے نتیجے میں پورے ملک اور دلّی میں بھڑکی ہوئی قتل و غارت گری کی تفصیل بتا رہے تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ یہ ایک نہایت ہٹا کٹا اور مضبوط ارادوں والا میرے تصورات سے بھی بالا شخص کسی پل بھی پھوٹ پھوٹ کر رو نہ پڑے۔ میں اُس کی روشن آنکھوں میں میلے کچیلے جلتے مکانوں کی لپٹیں اور پھیلتا ہوا دھواں دیکھ سکتا تھا۔ نفرت سے کہیں زیادہ ان دو چمکتی ہوئی آنکھوں میں ہم دردی تھی اور میرے خیال میں آج بھی کوئی رشتہ ہمیں کسی سے جوڑ سکتا ہے تو وہ ایک دوسرے کی ہم دردی ہی ہے۔ آپس کی بات چیت کے ان لمحوں میں، ہم دونوں ایک دوسرے کو ایک جیسے ہی دکھی لگ رہے تھے۔ باقی تمام خیالات اس احساس سے کم تر تھے۔

دیر تک خاموشی کے ساتھ میں سردار صاحب کو سنتا رہا اور وہ مجھے گھور کر ساری باتیں دُہرا دُہرا کر، جیسے خود کو ہی سنا رہے تھے، اُس دن ہم ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے تھے۔ یہ اپنائیت پھر اتنی بڑھی کہ دلّی لوٹنے سے ایک دن پہلے سردار صاحب نے اپنا حق جتاتے ہوئے مجھے دلائل کے ساتھ کہا کہ کلیم فارم نہ بھرنا بیوقوفی ہے۔ چاہے اس سے ملنے والا پیسا ہم بعد میں خیرات ہی کیوں نہ کر دیں، بہرحال ابھی اُسے غلط ہاتھوں میں جانے سے روکنا چاہیے۔

یہ کوئی کم زور لمحہ رہا ہوگا۔

آناً فاناً سارے کاغذات، میڈیکل سرٹیفکیٹ اور دستخط جمع کر لیے گئے اور اگلی دوپہر فلائٹ سے

سردار صاحب دلّی لوٹ گئے بکلیم فارموں کے ساتھ۔

کوئی پندرہ سال پہلے میں ایک میڈیکل اسٹور پر بیٹھتا تھا جسے جان پہچان والے زیادہ تر لوگ میرا ہی سمجھتے تھے۔ اس لیے مالکانہ عزت کے ساتھ ملتے تھے۔ یہ بیگاری کا دور تھا۔ اور یہ خود ایک الگ قصہ ہے لیکن وہاں ایک صبح مجھ سے ایک اجنبی چہرہ نمستے کہہ کر ملا۔ ایک معمولی آدمی جس میں پہلی نظر میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ سفید کھادی کے کپڑے جو زیادہ رہنے سے میلے ہو گئے تھے اور مونڈے ہوئے سر پر سفید کھادی کی ٹوپی۔ میڈیکل اسٹور کے پاس ہی شہر کا بڑا زنانہ اسپتال تھا جہاں پیدائش سے متعلق لوگوں کے ایک سے ایک عجیب وغریب سین دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی، اس لیے مجھے لگا کہ یہ بھی انھیں میں سے کوئی ہوگا۔

''پین چاہیے،'' اس نے میرے کیش بک پر رکھے پین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''چٹھی لکھنی ہے۔''

چھوٹی سی دنیا میں ایک بہت چھوٹی سی دکان پر بیٹھے ہوئے شخص کے بھی عجیب نخرے ہوتے ہیں۔

''خود لکھوگے؟'' پل بھر بعد میں نے پوچھا۔

اس کا چہرہ انکار کرتا ہے۔ ''برابر میں موجود فوٹو والے سے لکھواؤں گا۔'' کچھ لمحے اور بیت جاتے ہیں۔ میں اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہوں، ''آیئے میں لکھ دیتا ہوں۔'' میں غور سے دیکھتا ہوں تو وہ ایک تھکا ماندہ آدمی ہاتھ میں پوسٹ کارڈ دبائے ہوئے اور داڑھی کئی دنوں سے بڑھی ہوئی۔

وہ بولتا ہے تو میری انگلیاں قلم پکڑے ہوئے اپنی رفتار سے چلتی ہیں۔ دماغ تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ فلاں جگہ کے فلاں فلاں کو بعد عزت یا آداب معلوم ہو کہ ہم سب خیریت سے ہیں اور چار دھام کے سفر سے واپس آتے ہوئے فلاں جگہ فلاں آدمی کا چلتی بس سے گر کر انتقال ہو گیا اور اس کی آخری رسومات ہمارے پاس جو آخری رقم تھی، اُس سے کردیں۔ اور میں ریل گاڑی میں آگے یہاں بھوپال آ گیا ہوں۔ باقی سب لوگ پیچھے پیدل آ رہے ہیں، کل اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ملنے کا طے ہے۔ ہم وہیں رہیں گے جب تک کوئی پیسے لے کر نہ آئے گا۔ آخر میں خط لکھوانے والے کا نام اور گجرات میں کسی جگہ کا پتا لکھا۔

پوسٹ کارڈ لے کر وہ جانے ہی والا تھا کہ میں نے اُسے روک کر ساری باتیں تفصیل سے پوچھیں۔ اُس کا تعلق ایک کھاتے پیتے کسان خاندان سے تھا اور تیرتھ پر جاتے ہوئے بے جا خرچ اور چوری سے بچنے کے لیے لوگ کم سے کم پیسا لے کر نکلتے ہیں۔ اُس کے پیچھے پیچھے آٹھ لوگوں کا گروہ اگلے دن شہر پہنچنے والا تھا لیکن کارڈ پہنچنے اور کسی کو پیسے لے کر آنے میں تو وقت لگے گا، تب تک آپ لوگ کیا کریں گے؟

بےفکری سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا اور کہا، ''کچھ نہیں۔'' اسی لمحے میں نے طے کیا، قریب کے فوٹوگرافر سے، اسٹور پر نظر رکھنے کو کہا اور اُس آدمی کو لے کر گھر آ گیا۔ گھر پر جتنے بھی پیسے تھے (جو زیادہ نہیں سوا سو ہی تھے)، لا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ لمحہ اپنی چھوٹی سی دولت خرچ کرنے کا مجھے اتنی خوشی دے گیا جو زندگی میں بڑی سے بڑی رقم خرچ کر کے بھی شاید ہی ملی ہو اور میرے ساتھ وہ اجنبی اس لمحے

جتنا خوش تھا، اُس سے کہیں زیادہ حیران تھا۔

''آپ گھر تار دے دیجیے،'' میں نے اُس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ تب تک کچھ کام اگر ان پیسوں سے چل سکے...''

دکان کی طرف واپس لوٹتے ہوئے میرا دل بہت ہلکا تھا۔ میں خود سے خوش تھا، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے دن صبح کو بھی۔

اگلے دن جب وہ دکان پر آیا تو ہونٹ پان میں رچے تھے اور انگلیوں میں سلگتی سگریٹ دبی تھی۔ اُسے اس سکون میں دیکھ کر مجھے اور بھی اچھا لگا۔

باقی لوگوں کے شہر پہنچنے کی اطلاع اُس نے مجھے دی۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ کل پرسوں جب تک کوئی پیسا لے کر آئے، اُس کے پاس خرچے کے لیے کافی پیسے تھے۔ بنا شکریہ کہے اُس نے مجھے اپنی شکرگزاری پوری طرح محسوس کرا دی۔ ایک بات کی ضد بھی اُس نے کی کہ میں اپنا ڈاک کا پتا اُسے دے دوں۔

''کس لیے؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''میں گھر جا کر آپ کو پیسے بھجواؤں گا۔'' اُس نے کھلے دل سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن میں نے اُسے سمجھانا چاہا کہ یہ پیسے میں نے اُسے ادھار نہیں دیے ہیں، کل کو پردیس میں مجھ پر بھی ایسا وقت پڑ سکتا ہے۔ جب آپ کسی ضرورت مند کی مدد کریں تو یہ سمجھنا کہ آپ میرا یہ پیسا واپس کر رہے ہیں۔

وہ بہت پیار سے اپنی بات پر بہ ضد تھا اور میرے لیے اُسے یہ سمجھانا مشکل ہوتا جا رہا تھا کہ میں فضول کے شک اور آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

کبھی کبھی آپ کچھ ایسا بھی کرنا چاہتے ہیں جو صرف آپ کے اپنے سکھ کے لیے ہو۔ میں اُس سے یہ درخواست کرنا چاہتا تھا کہ ایسے سکھ کے تجربے سے وہ مجھے کیوں محروم رکھنا چاہتا ہے۔

اس کی بجائے اس کی بار بار ضد سے عاجز آ کر میں نے اُسے اپنا پتا دے دیا۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس کے بعد نہ تو مجھے کبھی وہ آدمی نظر آیا اور نہ اُس کے ذریعے بھیجا ہوا کوئی منی آرڈر، یا شکریے کا خط۔ ہو سکتا ہے اس بات کے پیچھے کوئی وجہ رہی ہو۔ کیوں کہ اُس آدمی کو صرف فراڈ ماننے کو میرا دل آج بھی تیار نہیں۔ اس سب کے باوجود اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس لمحے اپنا پتا لکھ کر اُسے دیتے ہوئے میں نے شاید کسی منی آرڈر کی آس باندھ لی تھی۔ اور ایک ایسی خوشی کو جو میرے دل ہی دل میں ہر لمحے بڑھ سکتی تھی، شک اور شرم کے احساس سے بدل دیا۔

سردار صاحب کو کلیم فارم بھر کر دیتے ہوئے بھی میں تقریباً وہی غلطی دُہرا رہا تھا۔

یادداشت سیاہ تختے کی طرح ہوتی ہے جس پر لکھا مٹ سکتا ہے اور مٹتا ہی رہتا ہے۔ اس لگاتار لکھنے اور مٹنے سے فرق یہ پڑتا ہے کہ سفیدی اور کالک ایک لمبے وقت تک آپس میں رگڑتے اور خاکی مٹی سے الگ بدلتے جاتے ہیں جس پر نیا لکھا ہوا بہت مشکل سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ہمارے سارے ذاتی تجربے بلیک

بورڈ پر سفید لکھاوٹ سے پیدا ہونے والے بھورے رنگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس لیے اس دوسری دوپہر تک پہنچتے پہنچتے جو سردار صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات کے تقریباً ڈھائی سال بعد آئی تھی، نہ تو میرے لیے کسی گیس، مائع اور آپریشن فیتھ میں کوئی نیا پن رہ گیا تھا، نہ اُن کے لیے 84ء کے فسادات یا آپریشن بلو اسٹار میں۔ دراصل یہ اتنی لمبی غیر حاضری کے بعد شہر آئے تھے کہ میں اُن کا اور یونین کاربائیڈ کا باہمی تعلق بھول ہی گیا تھا۔

اور اس بیچ...؟

اس دو یا تین دسمبر کی رات کے بعد یہ شہر مختلف قسموں کا راحت گڑھ بنا ہوا ہے۔ گیس حادثے سے حقیقت میں ہونے والے متاثرین کو چھوڑ کر جس کا جتنا دل اور حوصلہ ہوا، اس راحت نامی لنگر سے فیض اٹھاتا رہا ہے۔ بڑے اور چھوٹے جیسے لیڈر، وکیل اور بے سند ڈاکٹر سب یہاں تقسیم ہونے والی کروڑوں کی خیرات سے من چاہا حصہ وصول کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، کوئی حیرت کی بات نہیں۔

کیا بالکل شروع ہی میں گہری مایوسی نے مجھے اپنی جکڑ میں نہیں لیا تھا؟ اس کے بعد ہر واقعہ میرے پہلے احساس ہی کو اور زیادہ پختہ کرتا رہا ہے۔

وقوعے کو بھولنا یا نظر انداز کرنا ہی ممکن ہوتا تو دنیا کے سب سے بڑے کاروباری حادثے کو شہرت کبھی نہ ملتی۔ یہ احساس بہت دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ پچیس سو ہوں یا دس ہزار، مرنے کو تو ویسے ہمارے ملک میں قحط اور سیلاب ہی کیا کم ہیں۔ ٹریجڈی حقیقی معنوں میں تو وہ ہے کہ جو حادثے کے بعد اشارات دھیرے دھیرے سامنے آئے ہیں اور آئیں گے۔

ممکن ہے ــــ بہت ممکن ہے، میں بات بہت بڑھا چڑھا کر کہہ رہا ہوں کیوں کہ حادثے کے نتائج میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس شہر کے رہنے والے اسے اپنے لیے کوئی آفت سمجھنے لگیں اور ہر ایک خود کو گیس سے متاثر باتیں کرتے کرتے لوگوں کو اس رات کی تفصیل یوں رٹ گئی ہے کہ بات کا سلیقہ رکھنے والے وہ لوگ جو اس رات یہاں موجود نہیں تھے، اس حادثے کی تصویر کشی سے لے کر پیدا ہونے والی تکلیفوں تک کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ حقیقی متاثرین اپنے ناخن چباتے رہ جاتے ہیں۔ اعداد و شمار جو بھی کہتے ہوں اور آٹے میں نمک کے برابر ایسا ہوا بھی ہے کہ حقیقت میں دکھ اٹھانے والے یا فوت ہوجانے والے کے وارثوں کے آنسو پونچھے گئے ہوں لیکن میں بس اتنا ہی... میں تو دراصل اس سب کو سرے سے بھول ہی جانا چاہتا ہوں۔

اس دوپہر سردار صاحب کے دفتر میں قدم رکھا تو گرم جوشی کا وہی انداز ہمارے درمیان تھا جو گزشتہ ملاقات میں تھا۔ گلے ملنے اور خیریت معلوم کرنے کے بعد نادانی سے میں خود ہی پوچھ بیٹھا، ''بہت دن بعد آنا ہوا؟ خیر تو ہے نا؟''

وہ عدالت سے آ رہے تھے اور بہت جوش کے ساتھ جیسے ہی انھوں نے یونین کاربائیڈ، حکومت، اٹارنی جنرل، پٹیشن، کلیم اور ایسے ہی دوسرے الفاظ داغنے شروع کیے، میرے اندر کی گرم جوشی ٹھنڈی پڑ کر ختم

ہوتی چلی گئی۔ اب میں اُن کی بات سننے کا صرف ناٹک تو کر رہا تھا مگر بات چیت میں دل چسپی لینا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اُن کی باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ عدالت کی تازہ پیشی سے پھر اُمید پیدا ہوئی ہے کہ حق دار کو حق مل سکے گا۔ اسی لیے وہ اور ان کا غیر ملکی اتارنی یہاں آئے ہیں، انصاف پسند ہر شہری کا یہ فرض بنتا ہے کہ ایسا کام کرنے والوں کی مدد کریں۔ اُن کا یہ اصرار تھا حقیقت میں تکلیف اٹھانے والے جن لوگوں کے کلیم کو بنیاد بنا کر وہ کارروائی کرنا چاہتے ہیں، اُن میں، میں اور میرا خاندان شامل ہوں اور ایک بار میں پھر اُنھیں کچھ اور فارم بھر کر دوں۔

بیزاری دکھائے بنا میں نے فارموں کا بنڈل لے لیا اور وہ مجھے اُن کے بھرنے کا طریقہ سمجھانے لگے۔ بالکل معصوم بچوں جیسا اُن کا جوش و خروش میری سمجھ سے باہر تھا۔

''اتنے چپ کیوں ہیں؟'' میری حالت کو بھانپتے ہوئے وہ بولے، ''آپ سے تو امید کی کرن پیدا ہوتی ہے۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی اور سوچنے لگا کہ ہم جب بھی ملتے ہیں، اُس منحوس حادثے کی بات کیوں شروع ہو جاتی ہے۔

سردار صاحب ایک سنجیدہ خاموشی میں ڈوب گئے۔ آپ کو یوں نہیں سوچنا چاہیے۔ کہتے کہتے شاید اُن کو ہماری پہلی ملاقات اور میرا اُس وقت کا رویہ یاد آ گیا۔

''بڑی مایوسی بھری باتیں کرتے ہیں۔'' مجھے دلاسا دیتے ہوئے، انھوں نے چہک کر کہا، ''ارے جینئی مرنے سے برا کیا ہوگا، کچھ بھی نہیں ملے گا نا؟ تو کیا اس وجہ سے ہم کوشش بھی چھوڑ دیں!''

میں سخت لہجے میں کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ ضرور ملے گا مگر غلط طریقوں سے غلط لوگوں کو ملے گا جو اب تک بھی ملتا رہا ہے اور آگے بھی انھی کو ملے گا۔ تم جو کر رہے ہو، جانے اَن جانے، کچھ کیے جانے کے نام پر ایک بڑے فراڈ کا حصہ بن جائے گا! میں بیوقوف سہی لیکن فراڈ نہیں؟

ایک دم آپ کو کئی مہاتما یاد آنے لگتے ہیں، گوتم، یسوع مسیح وغیرہ اور شرمندگی سے آپ کے ہونٹ سل جاتے ہیں۔

''آپ تو...''

میری خاموشی کو سردار صاحب نے مصیبت مانتے ہوئے کہا، ''آپ تو طے شدہ بات کے مطابق فارم بھر کر اور فوٹو چپکا کر مجھے دے دیں، کچھ مل گیا تو ہم غریبوں میں بانٹ دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا، ''اب آئندہ چاہے ہم مون سون اور سوکھے پر بات کریں یا ایڈز کی بیماری پر، یہ کورٹ، کیس اور یونین کاربائیڈ زبان پر نہیں آئے گا۔ منظور ہے؟''

سردار صاحب نے ہامی بھرتے ہوئے گردن ہلا دی اور اُس کے بعد دیر تک ہم دونوں ملک کی سیاسی صورت حال کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے اور اپنی اپنی بے اطمینانی کو زبان دینے کی کوشش کرتے

رہے۔ یہ بات تھی کچھ دن پہلے اس دوپہر کی۔

دوسرے دن شام سردار صاحب اور اُن کے اناڑی کو واپسی کی فلائٹ لینی تھی۔ مگر اس سے پہلے وہ میرے دفتر آئے۔ میرے لیے غیر ملکی بس دو ہی قسم کے ہوتے ہیں۔۔۔ گورے اور کالے۔ یہ گورا سرخ و سفید شوخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تازہ برف کے گولے جیسے بالوں والا، گلے میں کیمرہ لٹکائے ایک امریکن تھا۔ اس کے تعارف کے بعد سردار صاحب نے کل دیے ہوئے فارم مانگے، خانہ پُری میں کچھ کمی رہ گئی تھی جو میں انھیں بتانے لگا اور کہا کل صبح رجسٹری یا کوریئر سروس سے بھیج دوں گا، تصویریں لگے ہوئے اور آدھے بھرے ہوئے فارموں کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ مجھے تاکید کرنے لگے، کل صبح ذمے داری ہے۔۔۔

''آپ کا فوٹو پرانا لگتا ہے؟'' اناڑی میری تصویر سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''چلو میں نیا کھینچ لیتا ہوں۔''

فلیش کا جھماکا اور میرا فوٹو کھنچ جاتا ہے۔

میں اچانک اُس سے کہتا ہوں، ''میری ایک درخواست ہے۔ برائے مہربانی میری اور سردار صاحب کی ساتھ بھی تصویر ایک کھینچ دیں۔''

سردار صاحب اور میں بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑے ہو گئے، ''ریڈی؟'' غیر ملکی نے پوچھا۔ فلیش کا جھماکا ہوا، تصویر کھنچ گئی۔

اُن کو الوداع کہنے کے لیے میں باہر تک آیا جہاں ہوٹل کی کار کھڑی تھی۔ یہ ہو کیا گیا ہے، اس قصبے نما شہر کو۔۔۔ جیسے ہی گوری چمڑی نظر آئی، فاقہ مست بچوں کے گروہ اکٹھے ہونے لگے، اس پر ستم یہ کہ ہاتھ میں کیمرہ، بے تکلفی اور مسخرے پن کا اظہار کرتے ہوئے بچے بہت خوش ہیں۔ مسکرانے کی کوشش میں اُن کے جبڑے پھٹے جا رہے تھے۔ کیوں کہ غیر ملکی کا کیمرہ لگاتار اُن کے فوٹو کھینچ رہا تھا۔

''جلدی کرو۔'' سردار صاحب نے ٹوکا، ''ہوٹل اور ایئرپورٹ کافی دور ہیں۔'' ایک منٹ سردار صاحب کی باتوں کو ان سنی کرتے ہوئے غیر ملکی مزے مزے سے بچوں کو نئے نئے پوز بتا رہا تھا اور طرح طرح سے کھڑے ہونے کے مشورے دے رہا تھا۔ ساتھ ہی رہ رہ کر فلیش کا جھماکا ہو رہا تھا۔

لمحے بھر کے لیے یہ سب مجھے عجیب سا لگا، جیسے میرے اندر ایک بھاری فلیش بڑے جھماکے سے جل اٹھا ہو۔ میں دیکھ رہا تھا غیر ملکی شخص بچوں سے پوز بدلوا رہا ہے لیکن کیمرے کا نہ تو شٹر دبا رہا ہے اور نہ ریل گھما رہا ہے۔ میں جھماکے سے چندھیا گیا ہوں اور کھڑا کا کھڑا ہوں۔ غیر ملکی سردار صاحب کے ساتھ کار میں بچوں کے ہلتے ہاتھوں کی الوداع قبول کرتا ہوا جا چکا ہے۔ میری آنکھوں میں ہر پل چکر آ رہے ہیں، میں سردار صاحب گلے میں بانہیں ڈالے، فلیش کا جھماکا، پھٹے حال بچوں کا مجمع، ہدایتیں دیتے ہوئے فوٹو کھینچنے کا ڈراما اور لطف حاصل کرتا ہوا وہ اناڑی لنگور۔۔۔

ایک گھٹیا سی گالی میری زبان تک آ کر رُک گئی۔ ایک بار پھر کوئی میرا فوٹو اتار کر لے گیا۔

سردار صاحب کا اور میرا فوٹو ہماری اپنی خواہش کے مطابق اور بچوں کا بھی اُسی طرح جیسے وہ چاہ رہے تھے۔
حق بہ حق دار اور میں؟... فراڈ!

دفتر واپس آ کر میں نے ٹیبل سے کلیم فارموں کا دستہ اٹھایا اور جھٹکے سے اُن کو پھاڑنے کی کوشش کی مگر کاغذ قیمتی اور بہت مضبوط تھے، میں انھیں نہیں پھاڑ پایا تو قینچی کی مدد سے باریک باریک کاٹ کر ٹوکری میں ڈال دیے۔ میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا، بالکل خالی دماغ لیکن اب کچھ کچھ ہلکا محسوس کرتے ہوئے...

☆☆☆
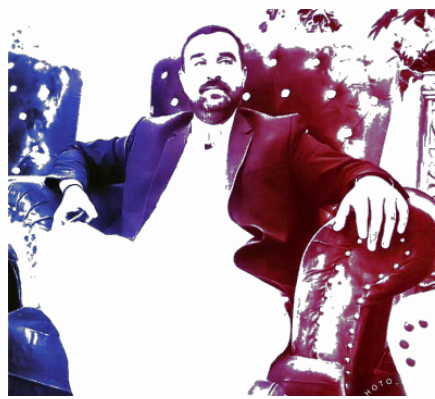
گیان پرکاش وِویک/ جاوید عالم

آواز

سب سے پہلے انھوں نے میرا ایکسنٹ بدلا، پھر تہذیب! ہم سب نوجوان تھے۔ اسمارٹ لڑکے، اسمارٹ لڑکیاں ــــ جسم انڈین، اسٹائل امریکن۔ ٹی بریک میں ہم سب چائے، کافی کے کپ لیے منڈیروں پر، میز، کرسیوں پر، یہاں وہاں بکھر جاتے۔ سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بناتے، ہنستے۔ ہم بے باک، بے فکر، بے لوث، بے غرض نظر آتے۔ ہم سپنے دیکھتے، سپنوں میں امریکا ہوتا۔ گیارہ ستمبر کے امریکا کو ہم یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم خوش حال، کھاتے پیتے، مال دار امریکا کا سپنا دیکھتے۔ من کرتا، ہم کیلی فورنیا میں ہوں، واشنگٹن میں، نیویارک یا پھر آیووا میں۔

ہمیں اپنا ملک نوحہ کرتا نظر آتا۔ یہاں کی ہر شے ہمیں فضول لگتی۔ ہر شے کے ساتھ ہم 'شٹ' ضرور جوڑتے۔ انڈین کلچر، شٹ! انڈین اموشنس ــــ شٹ! پتا نہیں یہ ہمارا فرسٹریشن تھا یا پھر نئے مزاج سے چھن کر آیا امریکا کا طلسم!

کبھی کبھی مغالطے کا پردہ ہٹتا، تب لگتا ایک ناٹک ہے جس میں ہم سب شامل ہیں۔ ہمارے کردار بھی عجیب تھے۔ فکرمند ہونے کے باوجود، بے فکر نظر آنے کے۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اس ناٹک سے کوئی باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ ہماری مجبوری، ہمارا لائف اسٹائل بن گئی تھی۔ یعنی رات کو جاگنا، دن میں نیند۔ امریکا کے ڈالروں نے ہمیں کیا سے کیا بنا دیا تھا، یعنی عفریت۔

شروع شروع میں بڑا ایڈونچرس لگا تھا۔ رات کو نوکری، پک اپ، سب کلنگ ینگ، ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، کمپیوٹر، ہیڈ سیٹ، کال، رپلائی، کسٹمر سروس، ٹی بریک، کھلا دالان، روشنیوں کا آبشار، ڈنر، میوزک، امریکیوں سے گفتگو ــــ ٹھیک ٹھاک سیلری! کال سنٹر!

پہلی بار تو میں سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ کال سنٹر کا کیا مطلب ہوا۔ دوسرے ملک (امریکا) میں بیٹھے کسی کسٹمر کی ڈیمانڈ کو ہم کیسے پورا کر سکتے ہیں؟ بعد میں آہستہ آہستہ کسٹمر سروس کے مفاہیم سمجھ میں آنے لگے تھے، جو پوشیدہ مطلب تھا وہ خلش پیدا کرتا تھا۔ یہ کہ امریکا کی ہر شے بڑی، ملک بڑا، لوگ

بڑے، کسٹمر بڑے اور ان کی خواہشات بڑی— ان کی خواہشات پوری کرنے والے ہم 'دیسی' لوگ چھوٹے— حقیر!

ایکسنٹ بدلا، تہذیب بدلی اور پھر نام۔ مجھے کہا گیا کہ میں کرس ہوں، کوئی تھامس تھا کوئی جان۔ میں 'کرس' بن گیا تھا یعنی امریکن۔ مجھے خوش ہونا چاہیے تھا مگر میں نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے میری پہچان چھین لی گئی ہے۔

میں سی سی او یعنی کسٹمر کیئر آفیسر، کل ملا کر یہ ٹیلی فون آپریٹر کی تھوڑی ترقی یافتہ شکل تھی۔ ہمیں اپنے ملک میں رہ کر ایک بہت مال دار، بدداس، لاپروا اور ڈالروں سے کھیلتے کسٹمر کی شکایات حل کرنی تھیں۔ وہاں کا کسٹمر 'بھگوان' تھا۔ بھگوان ناراض تو نوکری کی چھٹی۔

ڈیوٹی کے وقت ہم بے حد چوکنے، محتاط اور یک سو رہتے۔ ذرا سی لاپروائی سے کسٹمر ناخوش ہوسکتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہماری ساری نقل و حرکت 'بارج' ہوتی تھیں۔ ہم نے کسٹمر سے کیا بات کی، ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا، ہمارا ماحصل کیا رہا، سب باتیں ایک دیگر سیکشن کے لوگ سن رہے ہوتے۔ ہم ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولتے۔ اس کے باوجود غلطیاں ہو جاتیں، ہمیں پھٹکار ملتی۔

اب مجھے پتا چلا کہ کولیگ آپس میں مل کر پارٹیاں کیوں کرتے رہتے ہیں۔ ٹینشن کم کرنے کے لیے، جیسے اپنے ساتھ کوئی ناٹک کھیل رہے ہوں۔

کال سنٹر کی نوکری ناٹک ہی تو تھی۔ رات کی نیند... خواب... کہکشاں... ستارے... جگنو... ہماری زندگی سے بے دخل ہوئی چیزیں تھیں، پھر بھی ہم خوش تھے۔ کیوں کہ اس عظیم ملک کی عظیم بے روزگاری میں ہمیں نوکری مل گئی تھی۔

میں یعنی کرس! شروع شروع میں ہیڈ سیٹ لگائے کال سنتا، حیران ہوتا۔ کیسا ہے امریکی معاشرہ؟ ٹیلی فون بل زیادہ ہے تو کال سنٹر میں فون۔ ٹی وی پر فٹ بال میچ نہیں آ رہا ہے تو کال سنٹر کو فون۔ یہ لوگ کتنے آرام طلب ہیں، خود کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے، دقتوں کو جھیلنا انھیں آتا نہیں۔ ایک بات طے تھی، امریکی اپنی ذات سے پیار کرتے تھے یا پھر ڈالر سے۔ ادھر ہمارا ملک تھا— ہمارے ملک کے لاکھوں لاکھ لوگ، غریب لوگ، مصیبتیں جھیلتے، مشکلات سے لڑتے، زندگی کی بے حد تنگ گلی سے ہنسی کی پتلی سی لکیر کو ڈھونڈ نکالتے لوگ، بغل میں مذہب اور سر پر تصوف کی گٹھری لادے لوگ، دُکھوں کے کنبھ☆ میں جیون راگ کی تلاش کرتے لوگ!

رات بھر ہم ہیڈ سیٹ لگا کر کسٹمروں سے گفتگو کرتے۔ طے شدہ وقت میں ہمیں بات کرنی ہوتی اور کسٹمر کو 'سیٹسفائی' کرنا ہوتا۔ ہمارا رشتہ غیر مرئی تھا، آواز کا رشتہ آواز کے ساتھ۔ کبھی کبھی کوئی خوب صورت آواز سنائی دیتی، من کرتا اس سے دیر تک باتیں کریں، اس سے دوستی گانٹھ لیں لیکن ایسا کبھی نہیں

☆ کنبھ: بڑا مذہبی میلہ، جس میں لاکھوں عقیدت مند شرکت کرتے ہیں۔

ہوا تھا کیوں کہ ہمیں اپنی شناخت چھپائے رکھنا ہوتی۔

خوب صورت آوازوں سے ہمارا واسطہ کم پڑتا۔ اکثر غصیلی، بوکھلائی ہوئی آوازیں سنائی دیتیں۔ ان کی آواز کے رعب داب، ہیکڑی اور مغروریت سے پتا چلتا کہ یہ ہے امریکا اسٹاب! مغرور! خود پرست!

لیکن ایک رات— ٹی بریک کے بعد، میں نے اپنے دوست سندیپ کو بائے کیا۔ وہ دوسرے پروسیس میں تھا۔ ہم ٹی بریک میں ایک بار ضرور ملتے، پھر اپنے اپنے فلور پر، اپنی پروسیس میں چلے جاتے۔

میں نے ہیڈ سیٹ لگایا، کمپیوٹر کو لاگ آن کیا۔ تھوڑا گنگناتا رہا، من ہی من۔ میں نے بھگوان کو پرے کیا کہ کوئی اچھی کال ملے۔ اچھی کال کا ہمیں انسینٹو ملتا تھا۔

ایک لرزتی، بوڑھی سی آواز ابھری۔ آواز میں تکان تھی، ہانپتا تھا، جیسے آواز کئی ہزار میل چل کر آئی ہو۔

میں نے اس سے امریکن ایکسنٹ والی انگریزی میں پوچھا کہ اسے کیا چاہیے— کہ میں اس کی کیا ہیلپ کر سکتا ہوں... کہ میں کرس ہوں... کہ میں...

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی، ''یو آر سو پولائٹ! آئی تھنک یو آر انڈین۔''

میں سکتے میں آ گیا، جیسے میری آواز چھن گئی ہو یا جیسے میں چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں۔

لرزتی، کانپتی، بوڑھی آواز پھر ابھری، ''یو آر انڈین! بائی آل مینس یو آر انڈین۔''

میں کچھ دیر چپ رہا، پھر بے ساختہ، پتا نہیں کیا سوچتے ہوئے... یا کچھ بھی نہ سوچتے ہوئے میں بولا، ''یس میم... آئی ایم انڈین۔''

میں نے اپنی شناخت بتا دی تھی۔ میں نے کمپنی کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی، یہ غلط تھا، لیکن میں حیران تھا، بزرگ خاتون کو میرے انڈین ہونے کا کیسے علم ہوا؟ وہ لرزتی، بوڑھی آواز بڑی عاجزی سے بولی، ''فار گاڈ سیک... فون بند مت کرنا۔''

میں نے ہیڈ سیٹ کو کانوں پر لگا رکھا تھا۔ اُس کی آواز کے ہانپنے کو میں محسوس کر رہا تھا۔

میں سمجھ گیا تھا یہ کال ''فضول'' ہے۔ ایسی کال کو ہم جلدی سے ڈسکنیکٹ کر دیتے تھے۔ کمپنی کی ٹریننگ میں ہمیں ایسا ہی سکھایا گیا تھا، لیکن میں نے کال ڈسکنیکٹ نہیں کی تھی۔ بوڑھی آواز پھر ابھری، ''یہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ پلیز! میری بات سنتے رہنا۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی... مجھے ڈر لگ رہا ہے، تم فون کی لائن کاٹ دو گے۔''

پتا نہیں من کے بھیتر کون سے جذبے کا جوش تھا کہ میں نے فون کی لائن نہیں کاٹی تھی۔

وہ بول رہی تھی، ''میں چل نہیں سکتی۔ میرے گھٹنے جواب دے گئے ہیں۔ میرا فون بھی کٹ گیا، بل نہیں دے سکتی — بہت زیادہ تھا۔ مسٹیک تھی — کین یو امیجین، کتنی ٹربل ہوئی؟ یہ ٹارچر تھا — میں نہیں جانتی فون کا کنکشن کیسے دیا گیا۔ تھینکس کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ بٹ — پریوی ایس بل! اتنا زیادہ! میرے پاس کچھ نہیں۔ کیسے پے کروں گی؟''

اس نے گہری سانس لی۔ وہ بولتے بولتے رک گئی، جیسے اپنی بدحالی پر خود متزلزل ہو رہی ہو۔

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میری کال ''بارز'' نہ ہو رہی ہو۔ وہ ڈر اپنی جگہ تھا، لیکن بزرگ خاتون کا دکھ —!

''کچھ بھی نہیں میرے پاس۔'' کچھ پل بعد وہ پھر بولی، ''ریگلی مسٹر کرس میرے پاس کچھ بھی نہیں — تمھارا نام... تم انڈین ہو، پھر تمھارا نام... لیو اٹ، تم یقین کرو مائی سن — میرے پاس نہ ڈالر ہیں، نہ ہسبنڈ — ہسبنڈ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ہی از الائیو بٹ ہیز لاسٹ ہز میموری — وہ میرے گھر میں رہتا ہے، پر مجھے پہچانتا نہیں... کتنی اکیلی ہوں میں!''

مجھے لگا وہ سسک رہی ہے۔

ایک اکیلی، بوڑھی آواز، ڈری ہوئی۔ اپنے موجودہ وقت سے خوف زدہ!

''آپ کچھ کر سکتے ہیں میرے لیے؟'' کچھ وقت گزر جانے کے بعد سسکیوں کے بیچ اس نے کہا۔

میں چپ رہا۔ کاش، اس کے لیے میں کچھ کر سکتا۔

ایک عظیم ملک، نشے میں چور، خود پرست، مغرور، اربوں ڈالر کے ہتھیار فروخت کرتا، ایسی آوازوں کو چھپا لیتا ہوگا، گم کر دیتا ہوگا۔

وہ التجا کر رہی تھی، ''آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو کرس؟''

میں... ہزاروں میل دور بیٹھا، معمولی سا سی ای او اس کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ مجھے لگا میرے پیچھے کوئی آیا ہو جیسے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، ٹیم لیڈر تھا۔ وہ سختی سے بولا، ''ڈسکنیکٹ اٹ۔ پتا ہے تمھاری کال بارز ہو رہی ہے۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا، ہیڈ سیٹ اتارا۔ میں نے کہا، ''مجھے شک تھا، میری کال مانیٹر ہو رہی ہوگی۔''

میں ہیڈ سیٹ اتار چکا تھا۔ میرے کانوں میں اب بھی اس بزرگ خاتون کی آواز گونج رہی تھی۔ آئی ایم آل الون — ریگلی، آئی ایم آل الون۔ کال ڈسکنیکٹ مت کرنا — میں چاہتی ہوں، کوئی میری بات سنے...''

لیکن میں کال ڈسکنیکٹ کر چکا تھا۔ میری کال کی مانیٹرنگ ہو رہی تھی۔

ٹیم لیڈر غصے میں تھا اور میں دکھی۔

مینیجر نے مجھے بلایا، پوچھا، ''اس کال سے ہم نے کچھ 'ارن' کیا؟'' پھر خود بخود بولا، ''پروفیشنل ایٹی ٹیوڈ ہونا چاہیے۔''

میں چپ رہا۔ وہ پھر بولا، ''یہ وارننگ ہے آپ کے لیے، میٹر کو یہیں ختم کر رہا ہوں۔''

میں نے تھینکس کہا، اٹھا، چلنے لگا۔ اس نے رُکنے کے لیے کہا، میں نے حیران ہو کر مینیجر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا دکھ تیرنے لگا تھا۔ میں حیران تھا۔ وہ بولا، ''لسن! — آف دا ریکارڈ کہہ رہا ہوں۔ ایسی کال ہمارے لیے بے شک یوزلیس ہوتی ہے، بٹ ایسی کال ڈسکلیکٹ مت کرنا۔ پروفیشنل ایٹی ٹیوڈ کے علاوہ ایک پہلو انسانیت کا بھی ہوتا ہے۔''

میں اسے دیکھ کر من ہی من مسکرایا— سوچنے لگا، مینیجر ہے تو کیا ہوا، ہے تو انڈین ہی۔

☆☆☆

ذہن ساز دانش ور کے فکر افروز مضامین یک جا

مقالاتِ سراج منیر

مرتب: محمد سہیل عمر

قیمت: ۱۲۰۰ روپے

ناشر: اکادمی بازیافت، آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی۔ ۷۴۲۰۰
فون: 021-32751428, 32751324

ایک صدی کے نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کے تراجم

نوبیل ادبیات

مترجم: باقر نقوی

—قیمت—

۱۰۰۰ روپے (مجلد)

۵۰۰ روپے (غیر مجلد)

ناشر: اکادمی بازیافت، آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی۔ ۷۴۲۰۰
فون: 021-32751428, 32751324

تبصرے

تبصرے

نوبیل ادبیات (تراجم)، تالیف و ترجمہ: باقر نقوی، ضخامت: ۸۷۷ صفحات، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت، آفس نمبر ۱۰۷، کتاب مارکیٹ، اسٹریٹ نمبر ۳، اردو بازار، کراچی مبصر **علی حیدر ملک**

بعض شخصیات کی کثیر الجہتی لوگوں کو حیران اور کبھی کبھی پریشان کر دیتی ہے۔ باقر نقوی ایسی ہی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ وہ شاعر کی حیثیت سے تین شعری مجموعوں کے خالق، سائنس کے باضابطہ طالب علم نہ ہونے کے باوجود تین سائنسی کتابوں کے مصنف، بیمہ کی ایک کمپنی اور اس سے متعلق شخصیات کے تعارف پر مبنی کتاب کے مترجم اور الفریڈ نوبیل کی حیات پر ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ الفریڈ نوبیل کی زندگی اور کارگزاریاں قلم بند کرنے کے بعد انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ''نوبیل ادبیات'' جیسی ضخیم اور منفرد کتاب سامنے لے آئے۔

''نوبیل ادبیات'' بیسویں صدی میں ادب کا نوبیل انعام حاصل کرنے والے ادیبوں، شاعروں کے تعارف اور ان کے خطبات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ کتاب کا آغاز ۲۰۰۰ء میں ادب کا نوبیل انعام حاصل کرنے والے فرانس میں سکونت پذیر چینی ناول نگار گاؤ ژینگیان سے ہوتا ہے اور اختتام ادب کا پہلا انعام پانے والے فرانسیسی شاعر سلی پرودوہوم پر۔ یعنی کتاب کی ترتیب زمانی اعتبار سے اُلٹی ہے۔ نوبیل انعام دنیا کا سب سے بڑا انعام سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بھی دوسرے انعامات کی طرح اختلافات اور تنازعات سے مبرا نہیں۔ اس پر بھی بعض مخصوص مفادات اور سیاسی نظریات کے سائے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ اس کا پہلا انعام پانے والے شاعر کو آج دنیا میں تو کیا، اس کے اپنے وطن میں بھی کوئی نہیں جانتا جب کہ انعام سے محروم رکھے جانے والے اس کے ہم مقابل لیو ٹالسٹائی کی عظمت کو ساری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بیسویں صدی کا آخری انعام پانے والے ادیب سے بدرجہا بہتر لکھنے والے اردو سمیت دیگر کئی زبانوں میں موجود تھے اور اب بھی ہیں مگر قرعہ فال عوامی جمہوریہ چین کے باغی ادیب کے نام نکالا گیا۔ خیر، یہ دوسرے معاملات ہیں اور ان سے باقر نقوی کا کوئی تعلق نہیں۔

باقر نقوی نے جو کام کیا ہے، وہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں بھی نہیں کیا گیا۔ ان کی محنت اور ترجمے میں مہارت قابلِ داد ہے۔ وہ مشکل اور جامع کام کرنے کے قائل ہیں۔ ''نوبیل ادبیات'' اس کا واضح ثبوت ہے۔

کتاب کی ضخامت کے باوجود اکادمی بازیافت نے اسے نہایت سلیقے اور نفاست کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اگر اس میں نوبیل انعام یافتگان کی تصاویر بھی شامل کرلی جاتیں تو اور بہتر ہوتا۔

فضا اعظمی ـــــ سخن اور مطالعۂ سخن، مرتب: سلیم یزدانی، ضخامت: ۴۱۶ صفحات، قیمت: ۵۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت ـــــ آفس نمبر۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **علی حیدر ملک**

شاعر بے شمار ہیں۔ ان بے شمار شاعروں میں فضا اعظمی بھی شامل ہیں مگر وہ دوسرے شاعروں سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۱۰ء کے دوران اُن کی دس شعری تصنیفات ''جو دل پہ گزری ہے''، ''کرسی نامۂ پاکستان''، ''مرثیۂ مرگِ ضمیر''، ''تری شباہت کے دائرے میں''، ''آوازِ شکستگی''، ''عذابِ ہمسائیگی''، ''خاک میں صورتیں''، ''مثنوی زوالِ آدم''، ''شاعر، محبوب اور فلسفی'' اور ''مثنوی عذاب وثواب'' شائع ہوئی ہیں۔ ان تصنیفات میں یوں تو غزلیں اور مختصر نظمیں بھی شامل ہیں لیکن ان کی اصل پہچان ان کی طویل نظمیں ہیں۔ زیادہ تر کتابیں ایک ایک طویل نظم پر مشتمل ہیں۔

عقیل احمد فضا اعظمی ان شاعروں میں سے ایک ہیں جو محض برائے شعر گفتن شاعری نہیں کرتے۔ اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے۔ تاریخ کے مطالعے اور عصری حالات کے مشاہدے سے انھوں نے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان نتائج کو انھوں نے اپنی طویل نظموں میں پیش کیا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ـــــ کہانی بے ضمیری کی شروع روزِ ازل سے ہے۔ یا یہ کہ ـــــ تہذیبیں فنا ہوتی ہیں اخلاقی تعطل سے۔ ''عذابِ ہمسائیگی'' میں پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ، باہمی تعلقات نیز اُستواریوں اور کمزوریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس کا ترجمہ انگریزی، ہندی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں شائع کیا جانا مفید ثابت ہوگا۔☆

''فضا اعظمی ـــــ سخن اور مطالعۂ سخن'' فضا اعظمی کی شخصیت اور فکر وفن پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ بیشتر مضامین اُن کی کتابوں پر تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام مضامین اور تبصروں کو سلیم یزدانی نے جو معروف صحافی ہیں، یک جا کر کے کتابی صورت دی ہے۔ مرتب نے پیش لفظ میں فضا اعظمی کے فن اور اپنی مرتب کردہ اس کتاب کے محرکات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

فضا اعظمی کے فکر وفن کے تفصیلی، تجزیاتی اور تقابلی مطالعے کی گنجائش ہنوز موجود ہے۔ تاہم اپنے عہد کے ایک منفرد اور صاحبِ فکر شاعر کو سمجھنے کے لیے زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

☆ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور نئے ایڈیشن میں اردو کی نظم کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے۔ ناشر اکادمی بازیافت، کراچی ہے۔

۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ، مرتب: ڈاکٹر نجیبہ عارف، ضخامت ۲۵۹ صفحات، قیمت ۳۲۵ روپے، ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد، مبصر: **علی حیدر ملک**

اکیسویں صدی کا آغاز ایک بڑے سانحے سے ہوا۔ یہ سانحہ نیویارک کے جڑواں میناروں کا ہوائی حملوں میں زوردار دھماکے کے ساتھ زمیں بوس ہو جانا تھا۔ یہ سانحہ تو امریکا میں رونما ہوا مگر اس کے اثرات کم و بیش پوری دنیا پر مرتب ہوئے۔ سانحہ کیوں اور کیسے رونما ہوا اور اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ تھا، اس سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور امریکا کے سرکاری موقف کو متنازع سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اسے بہانہ بنا کر امریکا نے عراق اور افغانستان پر دھاوا بول دیا۔ کئی دوسرے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس کی لپیٹ میں آنے والے ممالک میں پاکستان کا نام سرِفہرست ہے حالاں کہ اس سانحے سے پاکستان کا کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی کوئی پاکستانی شہری اس میں ملوث تھا۔

اس سانحے نے پاکستان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور ادب کو بھی متاثر کیا اور اس حوالے سے بہت سی نظمیں اور افسانے وغیرہ تخلیق کیے گئے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں کو مرتب کر کے نہایت مبسوط اور پُرمغز مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مقدمے میں پاکستانی اردو افسانوں کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر تصنیف کیے گئے امریکی ناولوں کا بھی عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

''۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ'' میں بائیس افسانے شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں الطاف فاطمہ، مسعود مفتی، منشا یاد، خالدہ حسین، رشید امجد، مصطفیٰ کریم، نیلوفر اقبال، مبین مرزا، زاہدہ حنا، محمد حمید شاہد اور انور زاہدی وغیرہم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔ ان کی تحقیقی کتابیں اور مقالے علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ زیرِ بحث کتاب میں بھی انھوں نے اپنی ذہانت، محنت، مطالعے اور تجزیاتی صلاحیت کا بھرپور ثبوت فراہم کیا ہے۔

''۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ'' تاریخ کے ایک اہم سانحے، اس کے ہمہ جہت اور دُور رس اثرات پر لکھے گئے افسانوں کا ایک قابلِ قدر انتخاب ہے۔ یہ انتخابی مجموعہ اردو افسانے کی اہمیت اور وقعت میں اضافے کا موجب ثابت ہوگا۔ اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے کیوں کہ یہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بلاشبہ ایک اہم کام کیا ہے جس کے لیے وہ داد و تحسین کی مستحق ہیں۔

دُور و دراز، مصنف: رضی مجتبیٰ، ضخامت: ۲۷۲ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت — آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **علی حیدر ملک**

شاعری بلکہ پورے ادب میں مرکزی دھارے کے ساتھ ساتھ متوازی لہریں بھی چلتی رہتی ہیں۔ مرکزی دھارے تحریکات و رجحانات کے تابع ہوتے ہیں جب کہ متوازی لہریں انفرادی سوچ اور طرزِ اظہار کی

مظہر ہوتی ہیں۔ شہرت اور مقبولیت عموماً مرکزی دھارے سے وابستہ لکھنے والوں کے حصے میں آتی ہے۔ متوازی لہروں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو جاننے اور ماننے والوں کا دائرہ نسبتاً مختصر اور محدود ہوتا ہے۔ ہر دور میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ آج بھی ہو رہا ہے۔ آج جو لوگ متوازی لہر کے زیرِ اثر شعر و سخن میں مصروف ہیں، ان میں ایک نام رضی مجتبیٰ کا ہے۔ رضی مجتبیٰ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، باشعور اور باصلاحیت قلم کار ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''آبشار'' اور ''اجالوں کی اوٹ'' کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئے تھے۔ پھر ان کا کیا سیمون دبوار کی کتاب کا ترجمہ ''ایک پُرسکون موت'' اور سفرنامہ ''پیرس کے شب و روز'' منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے البیئر کامیو کے آخری ناول کا ترجمہ بھی ''پہلا آدمی'' کے نام سے پیش کیا۔ اب اُن کا تیسرا شعری مجموعہ ''دُور و دراز'' منصۂ شہود پر آیا ہے جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔

رضی مجتبیٰ کسی نظریے، کسی میلان یا کسی خاص اُسلوب کے مقلد یا پیروکار نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری کی اساس اُن کے اپنے مطالعے، تجربے، مشاہدے اور طرزِ کلام پر قائم ہے۔

وہ ایک مدت تک فرانس میں رہے اور فرانسیسی زبان و ادب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسی لیے اُن کی شاعری کے مواد اور اُسلوب میں فرانسیسی فضا اور شاعری سے استفادے کی بعض صورتیں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ہندی الفاظ کا استعمال بھی ان کے ہاں کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔ ''جیون میں پونم کا تہوار''، ''پیرس کے ایک باغ میں''، ''شہرِ بے خواب'' اور ''خود کلامی'' وغیرہ نظمیں خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ غزلیہ شاعری کے کچھ نمونے دیکھیے جن سے ان کے مزاج کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہم اپنے آپ ہی پیکر کے صید ہیں اے دل
رسا ہو دست تو بندِ قبا سے ڈرتے ہیں

ہستی کا یہ صحرا بھی بجتا ہے سرابوں سے
اک دور کا امکاں ہے منظر ہے قریں کا بھی

پھر تو کردہ بھی ہے ناکردی رضیؔ
ہے اگر سب کچھ خدا کے ہات میں

رضی مجتبیٰ کی شاعری کی تفہیم کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ شاعر کو کیا سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''شاعر'' ملاحظہ کیجیے:

آسماں کی نیلگوں محراب میں
اک مقید کہنہ سال
اور اک طوفانِ تُند

بند دروازے پہ جھٹکے مارتا
جس سے ہو کر بے نیاز
وہ رہا شعر و سخن کی مشق میں
دیکھتا دُور و دراز

مجموعے کا نام اسی نظم کے آخری مصرعے سے اخذ کیا گیا ہے جو کہ بہت بامعنی ہے۔

کہانی کی کہانی (کہانیاں)، ترتیب و تجزیہ: احمد اعجاز، ضخامت: ۲۰۸ صفحات، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد، مبصر: **علی حیدر ملک**

"کہانی کی کہانی" رشید امجد کی کہانیوں کے انتخاب اور تجزیوں پر مشتمل ہے۔ انتخاب اور تجزیے احمد اعجاز نے کیے ہیں۔ یہ دراصل کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر یہ کتاب "رشید امجد کے منتخب افسانے" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

رشید امجد عہد حاضر کے ایک ممتاز اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے تسلسل اور تواتر کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اب تک ان کے بائیس افسانوی مجموعے اور ان افسانوی مجموعوں پر مشتمل کلیات "عام آدمی کے خواب" شائع ہو چکی ہے جب کہ احمد اعجاز جواں سال افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔ افسانے سے ان کی وابستگی اور محبت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ایبٹ آباد میں اپنے گھر کا نام انھوں نے "کہانی گھر" رکھا ہے۔ اسے اسلام آباد میں محمد منشا یاد کے "افسانہ منزل" کی پیروی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ احمد اعجاز نے زیر نظر انتخاب میں یہ التزام رکھا ہے کہ رشید امجد کے ہر مجموعے سے ایک افسانے کا انتخاب کیا جائے۔ اس طرح "کہانی کی کہانی" میں بائیس افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانے کے بعد مرتب نے اس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ تجزیے بہت مفصل یا مبسوط نہیں ہیں لیکن ان میں اہم اور بنیادی باتیں کہہ دی گئی ہیں یا ان کی طرف اشارے کر دیے گئے ہیں جس سے کہانی کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔ انتخاب میں پہلی کہانی "ٹیمپ پوسٹ" اور آخری کہانی "فنا کی میں ڈولتے قدم" ہے۔

"رشید امجد کی کہانی کی کہانی" کے زیر عنوان پیش لفظ میں احمد اعجاز نے رشید امجد کے فن سے اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ تو درست کہا ہے کہ "ان کے ہاں جدید حسیت اور تمام جدید رویے پائے جاتے ہیں" مگر ان کا یہ خیال متنازع ہے کہ "ان کے ہاں اساطیری حوالہ زیادہ مضبوط نہیں کیوں کہ کامیاب علامت اپنے ماحول سے تشکیل پاتی ہے اور اساطیری علامتیں بعض مرتبہ اپنے عصری تقاضوں کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔"

"کہانی کی کہانی" کے ذریعے احمد اعجاز نے صرف رشید امجد ہی نہیں بلکہ جدید افسانے کے حوالے سے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ رشید امجد کی افسانہ نگاری اور جدید افسانے سے دلچسپی رکھنے والوں

کے لیے یہ ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ تاہم یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''کہانی کی کہانی'' کے بجائے کتاب کا پہلا نام ''رشید امجد کے منتخب افسانے'' ہی زیادہ مناسب اور بہتر تھا۔

مجید امجد کی شاعری اور فلسفۂ وجودیت (تنقید و تحقیق)، مصنف: ڈاکٹر افتخار بیگ، ضخامت: ۲۱۴ صفحات، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد، مبصر:
علی حیدر ملک

مجید امجد ایک معتبر اور انفرادیت پسند شاعر تھے مگر ان کی قدر شناسی ان کے انتقال کے بعد کی گئی۔ زیر تبصرہ کتاب بھی مجید امجد کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہی تصنیف کی گئی اور ابھی کچھ دنوں پہلے منظر عام پر آئی ہے۔ ''مجید امجد کی شاعری اور فلسفۂ وجودیت'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے: (۱) وجودیت کیا ہے؟ (۲) موضوعیت اور داخلیت مجید کی شاعری میں (۳) مجید امجد کی شاعری میں تصورِ موت اور احساسِ کرب (۴) بیگانگی اور مغائرت مجید امجد کی نظم کے تناظر میں، اور (۵) مجید امجد کا تصورِ حریت۔

وجودیت دورِ حاضر کا ایک اہم فلسفہ ہے۔ اس کا بانی اُنیس ویں صدی کے 'کیر کے گارڈ' کو تسلیم کیا جاتا ہے مگر اسے مقبولیت بیس ویں صدی میں حاصل ہوئی۔ فرانس کے ژاں پال سارتر نے اسے عروج پر پہنچایا۔ سارتر کے فلسفے کے اثرات دنیا بھر کے فلسفے اور ادبیات پر مرتب ہوئے جن میں اردو ادب بھی شامل ہے۔ لیکن ڈاکٹر افتخار بیگ کو شکایت ہے کہ ''مشرق اور خصوصاً پاکستان میں اس تحریک کو وہ پذیرائی نہ ملی جس کی یہ مستحق تھی۔''

وجودیت کی مختلف شکلیں اور مختلف مکاتبِ فکر ہیں۔ ان میں مشابہتیں بھی پائی جاتی ہیں اور مغائرتیں بھی۔ ان سب کا تفصیلی مطالعہ ایک الگ کتاب کا متقاضی ہوتا جب کہ مصنف کا مقصد یہ نہیں بلکہ اس فلسفے کی روشنی میں مجید امجد کی شاعری کا جائزہ لینا تھا۔ اس لیے اُس نے وجودیت کے مرکزی دھارے تک خود کو محدود رکھا ہے۔ مصنف نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مجید امجد کے ہاں وجودی حقیقت پر اعتقاد بڑا راسخ ہے۔ وہ فرد کی موضوعیت اور جذبے پر یقین رکھتا ہے اور نتیجتاً وہ وجود کی بے کراں صلاحیتوں کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ مجید امجد کے ہاں بیگانگی کا احساس بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ وہ فرد کے جوشِ عمل اور آزادی پر گہرا یقین رکھتا ہے۔

ڈاکٹر افتخار بیگ نے مجید امجد کی شاعری کا مطالعہ بہت گہرائی کے ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کتاب اعلیٰ درجے کا تنقیدی و تجزیاتی محاکمہ بن گئی ہے۔

مجید امجد ایک غیر معمولی شاعر تھے۔ ان کے فکر و فن سے آگہی کے لیے افتخار بیگ کی اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جو کبھی کبھی وجود میں آتی ہیں۔ افتخار بیگ کی اس کاوش کو سنجیدہ ادبی حلقوں میں یقیناً پذیرائی حاصل ہوگی۔

مابعد مرثیہ مرگِ ضمیر (طویل نظم مع انگریزی ترجمہ) شاعر: فضا اعظمی، ضخامت ۲۲۳ صفحات، قیمت ۳۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت — آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **نجم الحسن رضوی**

''مابعد مرثیہ مرگ ضمیر'' معروف شاعر سید عقیل احمد فضا اعظمی کی شعری تخلیق ہے جسے انھوں نے نظم کا نام دیا ہے مگر پڑھنے والوں کو یہ 'خاک و آتش' کے تصادم کی حکایت لگے گی۔ فضا اعظمی کے دیباچہ نگار سردار زیدی نے اسے ''ایک مضطرب دل کی پکار'' کہا ہے۔

فضا اعظمی صاحب نے حالیہ برسوں میں انسانی ضمیر کی 'وفات حسرت آیات' پر بڑے آنسو بہائے ہیں اور متواتر بہت سی ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں انسان کی بے ضمیری، بد خصلتی اور بے راہ روی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان نظموں کا سلسلہ جو ۱۹۹۶ء میں 'کرچی نامہ پاکستان' سے شروع ہوا تھا، ۱۹۹۹ء میں ''مرثیہ مرگ ضمیر'' کے بعد امسال ''مابعد مرثیہ مرگ ضمیر'' تک جا پہنچا ہے۔

تازہ نظم میں انھوں نے معاشرے کے مختلف طبقات اور کرداروں کے حوالے سے احتراقی بیانات قلم بند کیے ہیں اور گویا انھوں نے معاشرے کے اخلاقی ادبار کی ایک ایسی جامع رپورٹ مرتب کر دی ہے جس کا تاثر بہت گہرا اور الم انگیز ہے۔ یہ طویل نظم ہمارے زمانے کی انسانی صورت حال اور اس کے بڑے بڑے مسائل کو بہت خوب صورتی کے ساتھ عالمی سطح کے تناظر میں پیش کرتی ہے اور ہمیں سوچنے کے لیے بہت سا مواد پیش کرتی ہے۔ فضا اعظمی نے طویل نظم میں مسلسل اپنے فکری موضوعات کا اظہار کیا ہے اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع کی گئی ہے تاکہ اس کی رسائی قارئین کے زیادہ وسیع حلقے تک ہو سکے۔ ترجمے کا کٹھن کام بڑی مشاقی سے خود فضا اعظمی کی بیگم فرزانہ احمد نے سرانجام دیا ہے اور ترجمے کے اعلیٰ معیار کی تحسین کرتے ہوئے سردار زیدی صاحب نے لکھا ہے: ''ترجمہ ایک بیوی کی طرح ہے کہ اگر خوب صورت ہو تو وفادار نہیں ہوتی اور اگر وفادار ہو تو خوب صورت نہیں ہوتی لیکن یہ بات قابل ستائش ہے کہ مترجم نے اس قول کے برعکس نہ صرف نظم کے اردو متن سے کوئی واضح انحراف نہیں کیا بلکہ حتی الوسع نظم کی روح، اس کے اسلوب اور اس کے ڈکشن اور اس کی ساخت کو برقرار رکھا ہے۔ نظم کے بیشتر حصے نہ صرف اختصار کے بڑی خوبی سے انگریزی میں منتقل ہو گئے ہیں بلکہ اکثر اوقات اوریجنل نظم سے سبقت لے گئے ہیں۔''

میں ان کے اس بیان کی تائید کرتے ہوئے فضا اعظمی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ان کی بیگم نے اپنی وفا کا بڑا خوب صورت ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہر شاعر اتنا خوب نصیب کہاں ہوتا ہے۔ کتاب بہت خوب صورت چھپی ہے۔

مکالمے اور محاکمے (تنقید)، مصنف: سردار زیدی، ضخامت: ۳۲۸ صفحات، قیمت: ۳۵۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت ـــــ آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **نجم الحسن رضوی**

معروف شاعر، نقاد اور دانشور سردار زیدی کی یہ کتاب ان کے ایسے مکالموں، محاکموں اور مقدموں پر مشتمل ہے جن سے جہاں ایک طرف اردو ادب کی بعض اہم شخصیات اور ان کے تخلیقی کارناموں کے بارے میں آگہی کے چراغ روشن ہوئے ہیں، وہاں دوسری طرف بے شمار ایسے علمی اور فکری موضوعات کے بارے میں بھی سوچ کا در بھی کھلتا ہے جو عام طور پر ہماری ادبی محفلوں میں زیرِ بحث نہیں آتے۔

مکالمے، جائزے اور مقدمات کے عنوانات کے تحت سردار زیدی نے اپنی تحریروں کو اس کتاب کے تین حصوں کی زینت بنایا ہے۔ مکالمے میں مختلف ادیبوں اور دانش وروں کے اجتماعی انٹرویو شامل ہیں جن کا سلسلہ ایک ادبی جریدے کے تعاون سے شروع ہوا تھا۔ سردار زیدی کے مطابق منتخب احباب ادب کی اس کی محفل میں مہمانِ خصوصی کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا تھا جس میں سارے شرکائے محفل حصہ لیتے تھے۔ ان اجتماعی مکالموں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام سردار زیدی نے بڑی محنت سے کیا ہے اور مہمانانِ خصوصی کے بیانات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بعض سوالوں کے جواب بھی اپنے انداز میں دیے ہیں، ساتھ ہی ساتھ گفتگو کے دوران بعض تشنہ رہ جانے والے نکات کی وضاحت بھی کی ہے، اس طرح یہ مکالمے صرف مکالمے نہیں رہتے بلکہ مختلف موضوعات پر ایسے مدلل مضامین بن گئے ہیں جو تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

اس حصے میں جن نامور ادبی اور علمی شخصیات کے مکالموں کو جگہ دی گئی ہے، ان میں تابش دہلوی، ساحر لکھنوی، ضمیر نیازی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر اظہر حسن رضوی، ڈاکٹر اختر ظہیر رضوی، لطیف الزماں خاں، مسز شوکت مرزا، اسلام عماد، ارتضیٰ حسین اور ساحل قزلباش شامل ہیں۔

جائزے کے حصے میں انھوں نے سیّد احتشام حسین، علامہ ضمیر اختر نقوی، مسلم شمیم، نعیمہ ضیاء الدین اور دیگر مصنفین کی تخلیقی کاوشوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے محاسن کو اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح مقدمات کے حصے میں بھی سردار زیدی نے کئی شاعروں کے فن اور ان کی مطبوعات پر تفصیلی انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے، ان میں حسین انجم، ساحر لکھنوی اور فضا اعظمی شامل ہیں۔ کتاب اکادمی بازیافت کے روایتی حسنِ طباعت کی آئینہ دار ہے۔

مشرق و مغرب کے افسانے (تراجم)، مترجم: حمرا خلیق، ضخامت: ۲۶۴ صفحات، قیمت: ۴۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت ـــــ آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **نجم الحسن رضوی**

حمرا خلیق نے اس مجموعے میں شامل سب کہانیوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ اس میں انھوں نے تخلیقی شان پیدا کی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے جو انھوں نے اپنے

پیش لفظ میں لکھی ہے کہ انھوں نے اس کام کو ''اپنا فرض سمجھ کے'' اپنا لیا ہے اور اپنے ترجموں میں دو دیباچہ نگار ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے الفاظ میں ''اصل مصنفین کی ہم زاد ہونے کی شرط پر پوری اتری ہیں۔''

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس مجموعے میں مغربی مصنفین مثلاً موپاساں، گیبریئل گارشیا مارکیز، میری اسٹیوارٹ اور جیفری آرچر کے علاوہ کئی ہندی اور بنگلہ دیشی کہانی کاروں کی تحریریں بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے موضوعات میں بوقلمونی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

ثمر اخلاق نے ہر کہانی کا بڑی خوبی سے ترجمہ کیا ہے اور ان کی نثر کی روانی اور مکالموں کی برجستگی نے قاری کو کہانی سے لطف اٹھانے کا پورا موقع فراہم کیا ہے۔ ترجمہ سچ مچ میں بڑا کٹھن کام ہے اور جب تک مترجم کو دونوں زبانوں سے گہری واقفیت اور محاوروں اور روزمرہ پر پوری قدرت نہ ہو، ترجمے میں لفظی بمطابق اصل کی خوبی پیدا نہیں ہو پاتی۔

''مشرق و مغرب کے افسانے'' پڑھ کے مصنف سے پہلے مترجم کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہی اس کتاب کی خوبی ہے۔ طباعت کے اعتبار سے کتاب دیدہ زیب ہے۔

جون ایلیا — خوش گزراں گزر گئے (مضامین) ترتیب و انتخاب نسیم سید، ضخامت: ۱۸۰ صفحات، قیمت: ۳۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت — آفس نمبر ۱۰، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی،
مبصر: نجم الحسن رضوی

بارہ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ جسے نسیم سید نے ترتیب دیا ہے، اردو کے صاحب طرز شاعر اور نثر نگار جون ایلیا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے شائع کیا گیا ہے۔ ممتاز شاعرہ اور افسانہ نگار نسیم سید کینیڈا میں مقیم ہیں اور ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں اپنی ادبی سرگرمیوں اور تخلیقی کاوشوں سے شمالی امریکا میں اردو کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔

جون ایلیا اپنی باغی شاعری، بہترین نثر نگاری اور شان دار علمی پس منظر کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں نہایت منفرد مقام کے حامل تھے اور نسیم سید نے اپنے ابتدایے میں انھیں بجا طور پر ایک 'آباد شہر' کہہ کے یاد کیا ہے۔

اپنے عہد کے ایک نہایت حساس اور خردمند شاعر کی حیثیت سے جون ایلیا ہر طرح سے اس بات کے اہل ہیں کہ ان کے فن اور ان کی فکر کو نئی نسل سے متعارف کرایا جائے اور ان کے بارے میں تحقیق کے دریچے وا کیے جائیں۔ نسیم سید نے اس کتاب کو شائع کر کے صحیح سمت میں پہلا قدم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں اسی سال جولائی کے مہینے میں 'مسی ساگا' میں کینیڈین اردو رائٹرز فورم کی جانب سے 'جشنِ جون ایلیا' منایا گیا اور اس موقعے پر مشاعرے کے علاوہ ایک بین الاقوامی مذاکرہ بھی منعقد ہوا۔ یہ کتاب اسی جشن کی یادگار ہے۔

کتاب میں جن ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کو منتخب کیا گیا ہے، ان میں پروفیسر سحر انصاری،

رضی مجتبیٰ، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، اقبال حیدر، مبین مرزا، سلیم کوثر، خرم علی شفیق، مسعود عثمانی، عرفان ستار، شائستہ رضوی، عنبرین حسیب عنبر، علی زریون، فرحت شہزاد اور تسیم سید شامل ہیں۔

ان تمام مضامین میں جہاں جون ایلیا کی شاعری کی خصوصیات، ان کی طباعی، زبان دانی، منفرد لفظیات، صوتی آہنگ، منفرد مصرع سازی اور فکر جہات پر رائے زنی کی گئی ہے، وہاں ان میں ان کے خیالات، مزاجی کیفیات اور ذاتی معاملات کے حوالے سے بڑی دل چسپ، شگفتہ اور فکر انگیز باتیں بھی ملتی ہیں جن سے جون ایلیا جو سحر انصاری کے الفاظ میں 'خطِ مستقیم کی شخصیت' نہیں تھے، مجسم ہو کے ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ان کی شخصیت کے مختلف زاویے اور ان کے فن کے سارے خدوخال نظر میں ابھر آتے ہیں۔

ان تمام مضمون نگاروں نے جون ایلیا کی شخصیت اور ان کی شاعری کے حوالے سے اپنا تاثر بیان کیا ہے، صرف تسیم سید نے ان کی نثر کے بارے میں قلم اٹھایا ہے اور بڑا خوب صورت مضمون لکھا ہے۔ جون ایلیا کی نثر میں انشا پردازی کی بہترین خصوصیات ملتی ہیں اور اس کا ایک بہت اچھا نمونہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''شاید'' کے دیباچے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تسیم سید کی مرتب کردہ اس کتاب کو جون ایلیا کی شخصیت اور ان کے فن پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک خوب صورت تحفہ سمجھنا چاہیے۔

محور کی تلاش (سفرنامہ)، مصنفہ: سبوحہ خان، ضخامت: ۲۲۴ صفحات، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت — آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **نجم الحسن رضوی**

سبوحہ خان نے یہ سفرنامہ ذرا مختلف طریقے سے لکھا ہے۔ وہ پاکستان سے نکل کے امریکا، کینیڈا اور یورپ کے سفر پر روانہ ہوئیں مگر ذہنی طور پر یہیں رہیں اور ہر قدم پر انھیں اپنی زمین کے دکھ یاد آتے رہے۔ جہاں نوردی کے طویل تجربوں کے دوران جب انھیں طرح طرح کے لوگ ملے، اپنے بھی پرائے بھی تو وہ ان کے احوال سنتی اور اپنا احوال سناتی رہیں۔ وہ اجنبی دیاروں میں زندگی بسر کرنے والے تارکینِ وطن کے جسمانی، ذہنی اور روحانی تجربے اور مکاشفے کو اپنے شعور کا حصہ بناتی رہیں گویا ان کا سفر عام روایتی سفر نہیں تھا جس میں بس بدن سفر کرتا ہے۔ سبوحہ خان نے ایسا سفر کیا ہے جو خارجی اور داخلی دونوں سطح پر جاری رہتا ہے۔ یہ جسم کا ہی نہیں سوچ کا سفر بھی ہے۔

اس سفرنامے میں مقامات، شہر اور بستیاں اس طرح ابھرتے ہیں جیسے دیگر سفرناموں میں۔ مگر ان میں بسنے والے لوگ سبوحہ خان کو طرح طرح کی کہانیاں سناتے ہیں، ایسی کہانیاں جو ان کے جذباتی، سماجی اور معاشی آشوب سے عبارت ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سبوحہ خان کسی مقام پر اپنے وطن کو فراموش نہیں کرتیں اور وطن پرستی ان کی تحریر کا دل کش ترین وصف ہے۔ انھوں نے خوب صورت اور رواں دواں انداز میں اپنے احساسات و

جذبات کو قلم بند کیا ہے۔ ان کی تخلیقی شائستگی قابلِ قدر ہے اور سفرنامے کی فکری جہت اسے دوسری ایسی تحریروں سے مختلف بناتی ہے۔

کتاب کی طباعت نفیس اور قیمت بہت مناسب ہے۔

بند گلی میں شام (یادیں)، مصنف: توصیف تبسم، ضخامت: ۳۳۱ صفحات، ناشر: عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد

مبصر: **ڈاکٹر نجیبہ عارف**

توصیف تبسم کی یادوں پر مشتمل کتاب ''بند گلی میں شام'' کسی یاد محل کا منظر دکھاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں خرید و فروخت منع ہے۔ توصیف تبسم کو کیپٹل ازم سے کوئی لگاؤ نہیں اور ملوکیت سے بھی وہ گریزاں ہیں، اس لیے نہ تو آباؤ اجداد کی یادگاریں جمع کر بیٹھے ہیں، نہ انھیں فروخت کرنے کے درپے ہیں۔ بس اپنے دل کے عقبی صحن میں، خود اپنی عمر کے بیاسی سال کے تجربات، مشاہدات اور واقعوں کی دھوپ چھاؤں، روشنیاں اور سایے، اندھیرے اُجالے، پھیلا کر رکھ دیے ہیں۔ اب جس کا جہاں جی چاہے، آ کر بیٹھ جائے۔ دھوپ سینکے یا چاند کے الاؤ پر ہاتھ تاپے، اندھیروں کو چھوئے یا اجالوں سے بغل گیر ہو۔ ایسی چیزوں کی کہاں کوئی درجہ بندی ہو سکتی ہے۔ یادوں کی زنجیر کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ہم آغوش ہو کر خود کہیں گم ہو جاتی ہے۔ سمندر کی پہلی اور دوسری موج کے بیچ میں کیا ہوتا ہے کہ کوئی وقفہ کیا جائے۔ اسی لیے اس کتاب میں کہیں کوئی وقفہ ہے، نہ حد بندی، نہ ابواب، نہ عنوان، نہ سلسلہ وار مضامین۔ سو یہ ہے کہ جیسی کتاب توصیف تبسم نے لکھی ہے، اس میں ایسی شعوری حد بندیاں یقیناً ناروا معلوم ہوتیں۔

جوش صاحب نے تو نام رکھا ہے ''یادوں کی برات''، توصیف تبسم نے سچ مچ کی برات سجا دی۔ اور کمال تو یہ ہے کہ بالکل بغیر دولھا کے، یعنی وہ خود اس برات سے مکمل طور پر غیر حاضر ہیں۔ کہیں کہیں ان کے بارے میں بات ضروری ہوتی ہے مگر یہ بات وہ خود نہیں کرتے، ان کے احباب کی زبانی ہوتی ہے۔ کہیں کوئی خط، کہیں کسی مضمون کا اقتباس بتا دیتا ہے کہ توصیف تبسم بھی اس برات کا حصہ ہیں۔ دولھا کے طور پر نہیں، بالکل عام سے ایک مہمان کے طور پر۔ انھی منتشر ٹکڑوں سے ان کی شخصیت کا ایک اجمالی سا خاکہ بھی تیار ہو جاتا ہے مگر اس خاکے میں رنگ بھرنے کی کھکھیڑ انھوں نے نہیں اٹھائی اور یہ بڑے جگرے کا کام ہے، کہ اپنے اردگرد ابھرنے والے ہر ہیولے کی تو پوری پوری تصویر کشی کی جائے مگر خود اپنی تصویر کے خدوخال ادھورے ہی چھوڑ دیے جائیں۔ لوگ باگ تو یادداشتیں لکھتے ہی اس لیے ہیں کہ اپنی وہ تصویر دکھا سکیں جو خود ان کے خیال میں پرورش پاتی ہے۔ توصیف تبسم صاحب نے اس معاملے میں اس غیر معمولی نفس کشی سے کام لیا ہے کہ ان سے بازپرس کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آخر قاری کا حق بنتا ہے کہ جس کا نام پڑھ کر اس نے کتاب خریدی ہے، اس سے ملاقات بھی کرے مگر صاحبِ کتاب تو حدیثِ دیگراں کی چلمن کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''اس تالیف کا سب سے غیر اہم حصہ وہ ہے جو ذاتی حالات و واقعات سے

تعلق رکھتا ہے مگر شاید اس کے بغیر یادوں کی تجسیم ہو ہی نہیں سکتی تھی۔" گویا انھوں نے اس موجود اور "غیر اہم" مختصر سے حصے کے لیے بھی معذرت خواہانہ رویہ اپنائے رکھا ہے مگر جہاں تہاں اپنے اور دوسروں کے الفاظ کی مدد سے ہی سہی، خود اپنی جو جھلک دکھلائی ہے، وہ ایک متجسس مگر دھیمے مزاج کے انسان کی معتدل طبیعت، ہموار قدم رفتار اور قدرے بے نیازانہ طرزِ زیست کی چغلی کھاتی ہے۔ اس شخصیت میں تند و تیز جذبوں کی آگ ہے، نہ بہت اونچی اڑانوں کے خواب۔ خود اپنے ساتھ مفاہمانہ رویہ زندگی کی ایک قابلِ رشک صورت حال کو جنم دیتا ہے لیکن پیچیدگی تو یہ ہے کہ ان کے بارے میں یقین سے یہ دعویٰ یا کوئی بھی دعویٰ کرنا مشکل ہے، کیوں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں ایسا مواد ہی فراہم نہیں کیا کہ اس بارے میں کوئی بات یقین سے کہی جا سکے۔ البتہ اس بات پر وہ ضرور داد اور تشکر دونوں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے کئی ایسے شاعر دوستوں یا ہم عصروں کا کلام اس کتاب میں محفوظ کرلیا ہے جو اب صرف تاریخ کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسی طرح اس کتاب میں وقت اور جگہ کی حدود و قیود بار بار مٹتی ہوئی نظر آتی ہیں، جو قصہ اتر پردیش میں ضلع بدایوں کے ایک قصبے سہوان کے کیوڑے اور چنبیلی کے باغات کے ذکر سے شروع ہوتا ہے، وہ ۲۱ر نومبر ۲۰۰۰ء کو جذبی اور فراق کے ذکر پر اتنا اچانک ختم ہو جاتا ہے کہ لگتا ہے جیسے قصے کو جواں عمری میں دل کا جان لیوا دورہ پڑ گیا ہو اور وہ باتیں کرتے کرتے اچانک ایک طرف لڑھک کر خاموش ہو گیا ہو، جب کہ ابھی بہت کچھ ان کہا، ان لکھا باقی ہو۔ مگر ماضی سے حال تک کی اس چھوٹی سی گلی میں، کتنے ہی موڑ اور کیسے کیسے دوراہے ہیں۔ سہوان سے دلی اور دلی سے راول پنڈی کا سفر تو چلو خیر ایک زندگی کے قافلے کا راستہ بنا ہی تھا لیکن یہ جو مڑ مڑ کر دائیں بائیں اور نہ جانے کون کون سی سمت میں دیکھنے کی ادا ہے، اس نے ماضی کی اس گلی کو ایک وسیع و عریض میدان میں بدل دیا۔ یہاں لاہور اور کراچی بھی ہے اور واہ کینٹ اور پشاور بھی۔

مصنف تو ۱۹۲۸ء میں کہیں جا کر اس دنیا میں آئے تھے، مگر کتاب کا دائرہ اس سے کہیں پہلے موجود شخصیتوں کے چشم دید واقعات تک پھیلا ہوا ہے۔ دراصل اس میدان میں صرف مصنف ہی کی نہیں، اور بھی کئی لوگوں کی آنکھیں مصروفِ نظارہ ہیں۔ یہ کتاب ان کی نظر سے بھی دیکھتی ہے۔ چناں چہ کئی صفحات پڑھ جانے کے بعد کھلتا ہے کہ محوِ کلام مصنف نہیں، کوئی اور ہے۔ مصنف تو یہاں صرف گوش ہوش بنا بیٹھا ہے اور بعض اوقات یہ گوشِ ہوش بھی کسی اور کے گوشِ ہوش کا اک تسلسل ہے۔ روایانِ قصہ کا سلسلہ کہیں کہیں دراز بھی ہو جاتا ہے۔ اس تکنیک کا ایک فائدہ یہ ہے کہ زندگی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ بڑی حد تک خود مکتفی معلوم ہوتی ہے اور کسی ایک مصنف کے نقطۂ نظر سے بندھی بلکہ اس میں جکڑی ہوئی نظر نہیں آتی۔

ایک بات البتہ یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں راول پنڈی کی تقریباً ایک صدی پر محیط ادبی و سماجی فضا کا نہایت جامع اور مکمل تذکرہ ضرور رقم کر دیا ہے اور یہی اس کتاب کی نمایاں ترین صفت ہے۔ پرانے پنڈی شہر کے حدودِ اربعہ سے لے کر، وقت کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار، نئی تعمیرات، نئی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ شہر کی ہماہمی کا چہرہ، کھانے پینے کے معروف مقامات اور ان کی درجہ بندی،

مقبول تذکرے میں، شوقین حضرات کے اشغال، سواریاں، شام کی مصروفیات، ادبی تنظیموں کا بننا اور بکھرنا، درس گاہوں کی تعلیمی سرگرمیاں، ادبی مناقشے، دوستیاں، مخاصمتیں، گروہ بندیاں، جملے بازی، پھبتیاں، لطیفے، گالیاں، شوخیاں، شرارتیں، کیا ہے جو چھوٹ گیا ہو۔

اس سے صرف راول پنڈی اسلام آباد کی ادبی فضا کے تشکیلی مراحل کا عکس ہی نہیں بنتا بلکہ معاشرتی اقدار کے بننے بگڑنے، شہر اور ملک کی تہذیبی روایات کے جمنے بکھرنے اور آرٹ اور کلچر کے ماحول کی رنگا رنگ تصویریں اس کتاب کے متن میں نقش ہوگئی ہیں، خصوصاً شاعری اور شاعروں کے حوالے سے کئی دل چسپ باتیں تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ شاعروں کی شوخ چشمی، آپس کی رنجشیں، معاشی حالت، مسائل اور مصائب کے باوجود ان کی خود مختاری، خود پسندی، اپنی عظمت کا احساس، زندگی کے نظم و ضبط اور قرینے کو برملا رد کر دینے کی دیدہ دلیری، پیشہ ورانہ تقاضوں کو اک مصرعے میں ٹال دینے کی جہانت، جو طبیعت، خیال، مصرعے اور اشعار چرا لینے کی ادائے دلبرانہ، دشمنوں اور رقیبوں کو ہجو کی مار دے کر چت کر دینے کی حوصلہ مندی، اور خیال و خواب میں اک نئی حسین دنیا تعمیر کرنے کی آرزو مگر خود اپنے گرد و پیش سے بے پروائی اور بے نیازی، کیا ہے جو نہیں بتاتا کہ پاکستان کی ثقافتی روایات کن بنیادوں پر استوار ہوئی ہیں۔ اصلاح کے نام پر اساتذہ کا کلام مشاعروں میں پڑھ آنا، پرانے دواوین سے اساتذہ کی ہم طرح غزلوں سے ایک ایک شعر نکال کر غزل بنا لینا اور اپنے نام سے چھپوا ڈالنا، شاگردوں کا اساتذہ کے دیوان کے دیوان اشاعت کا بہانہ بنا کر اڑا لے جانا، گھریلو ذمے داریوں سے جی چرانا اور احباب محفل کی مدد کے لیے حد سے گزر جانا—— یہی وہ اجزا ہیں جن سے ہماری تہذیبی و ثقافتی زندگی کا ذائقہ بنتا ہے۔

اس کتاب میں کئی سچے اور سچے دلوں کے احوال ملتے ہیں۔ خود مصنف نے اپنی پردہ پوشی کے باوجود کئی اُجلے لمحوں سے ملوایا ہے۔ ایک ذکر نہیں ملتا تو خود ان کے اہلِ خانہ کا۔ البتہ اس کی تلافی کتاب کے انتساب سے کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ اسلوب نہایت دل چسپ اور پُر اثر ہے اور کتاب ایک مرتبہ شروع کر لینے کے بعد ختم کیے بغیر ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

سمندر راستہ دے گا (شاعری)، شاعرہ: نسیم سید، ضخامت: ۲۹۵ صفحات، قیمت ۳۰۰ روپے، ناشر اکادمی بازیافت۔ آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: خالد معین

میرے فن کار

مجھے خوب تراشا تو نے

آنکھ نیلم کی

بدن چاندی کا

یاقوت کے لب

یہ ترے ذوقِ طلب کے بھی
معیار عجب
پاؤں میں میرے
یہ پازیب سجادی تو نے
نقرئی تار میں
آواز گند ھادی تو نے
یہ جواہر سے جڑی قیمتی مورت میری
اپنے سامانِ تعیش میں لگادی تو نے

نظم کا یہ ٹکڑا ہے معروف شاعرہ نسیم سید کا۔ اس نظم میں انھوں نے عورت اور سوچنے، سمجھنے، محسوس کرنے والی جیتی جاگتی عورت کا بنیادی المیہ تحریر کیا ہے۔ یہ نظم ان کے تازہ مجموعے ''سمندر راستہ دے گا'' کی نظموں سے انتخاب کی گئی ہے۔ اس مجموعے کے نام ہی اندازہ ہو جاتا ہے، یہ شاعرہ عام روش سے ہٹ کر سوچتی اور لکھتی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ''آدھی گواہی'' اب سے بہت برس قبل شائع ہوا تھا اور اسی سے ان کے تخلیقی مزاج اور خاص اسلوب سے پڑھنے لکھنے والے آگاہ ہوئے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کینیڈا جیسے ملک میں رہتے ہوئے خالص تخلیقی رویوں کے ساتھ شاعری کرتی ہیں اور ان کے لیے شاعری کوئی جز وقتی مشغلہ نہیں بلکہ ہمہ وقتی مسئلہ نظر آتا ہے۔ پہلے مجموعے میں نسیم سید ایک منجھی ہوئی شاعرہ کے روپ میں دکھائی دی تھیں جب کہ تازہ مجموعے میں نظموں کے ساتھ غزلوں کی رم جھم نے انھیں ایک نئی شناخت بھی دی ہے۔

نسیم سید کو ممتاز ناقد اور شاعر محترم سحر انصاری نے دو دنیاؤں کی شاعرہ قرار دیا ہے اور ایسا ہے بھی، کیوں کہ ان کا دل تو مشرقی عورت کی طرح دھڑکتا ہے، مگر ان کا محسوساتی اور کیفیاتی دائرہ مشرقی مزاج کے ساتھ مغربی عورت کی جرأت مندی کا عکاس بھی ہے۔ تاہم یہ معاملہ محض فیشن اور تقلیدی روش کی پیروی والا نہیں لگتا۔ وہ ایک زمانے سے کینیڈا میں ہیں، اور اس حوالے سے انھوں نے روایتی شاعرات کی طرح صرف لگے بندھے شاعرانہ موضوعات ہی کو نہیں برتا بلکہ کئی ایسے جذبات و احساسات کو بھی شاعری میں برتنے کی کاوش کی ہے، جنھیں عام طور پر شاعرات برتتے ہوئے ہانپ جاتی ہیں۔ یہ ایک بڑا سوال ہے، موضوع کی قید تو یوں بھی شاعروں کو اپنے اوپر اگو نہیں کرنی چاہیے، مگر لگتا یہ ہی ہے کہ پاکستان سے امریکا اور دیگر ممالک جا بسنے والے شعرا و شاعرات نے وہاں کے کلچر اور ادب سے خود کو جوڑنے کی شعوری کوشش کم کم کی ہے، اسی لیے بیرونِ ملک مقیم اہلِ وطن کی شاعری نئے تجربات اور احساسات سے ہم رنگ و ہم آہنگ نظر نہیں آتی ہے۔ اس رخ سے دیکھا جائے تو نسیم سید اس بھیڑ سے قدرے جدا دکھائی دیتی ہیں اور ان کے شاعرانہ تجربات میں وہ تنوع بہ خوبی نظر آتا ہے، جسے کینیڈا جیسے نسبتاً کھلے معاشرے اور نئی تہذیب کی دین کہا جاسکتا ہے— اس حوالے سے خود نسیم سید کیا سوچتی ہیں، ''ہم جو محسوس کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟ جو سوچتے ہیں، کیوں سوچتے

ہیں؟ جیسے ہیں، ویسے کیوں ہیں؟ یہ تو ہمیں خود بھی پتا نہیں ہوتا، تو دوسروں سے اس کی وضاحت کیسے کریں۔ یہ نظمیں، غزلیں اپنے محسوسات کی بس ایک چھوٹی سی ڈائری ہے۔" دیکھا آپ نے، نسیم سید نے کس خوب صورتی کے ساتھ اپنا مقدمہ بھی بیان کر دیا اور خود کو اس بحث سے الگ بھی کر لیا۔ ایک اور رخ سے دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے نئے مجموعے کے بارے میں کیا کہتی ہیں، "آدھی گواہی" کے کٹہرے سے نکل کے "سمندر راستہ دے گا" کے یقین تک پہنچتے پہنچتے بہت سا وقت لگ گیا۔ گھر سے آفس جاتے ہوئے جو ایک لمبی سی سڑک "Matheson" ہے، اس پر سفر کرتے ہوئے بارہا میں نے سوچا، زندگی بھی کسی ایسی ہی سڑک پر محو سفر ہے۔ جب کہیں پہنچنے کی جلدی ہو تو سرخ سگنل راستہ روک لیتا ہے۔" یہ ہے نسیم سید کی شاعرانہ دنیا لیکن یہ دنیا اتنی سمٹی ہوئی نہیں بلکہ اس میں بلا کا پھیلاؤ ہے۔ یہ اور بات کہ ہر لکھنے والے کی طرح ان کے چند پسندیدہ موضوعات ضرور ہیں، وہ اپنی ذات و کائنات میں ایک مبتلا شاعرہ کی طرح سارے تماشے دیکھتی اور انھیں زخمی پلکوں کے ساتھ رقم کرتی رہتی ہیں۔ آیئے، اب نسیم سید کی کچھ نظموں پر اختصار سے نظر ڈال لیتے ہیں:

☆ کتابیں مجھ پہ ہنستی ہیں—

ادھر

وہ اس طرف

کمرے میں میرے،

ایک وہ جو برگزیدہ شیلف ہے،

واں روشنی فکر کا،

دن بھر عجب اک،

رمزیت آمیز و فکر انگیز سا،

ہنگامہ رہتا ہے،

ارسطو، کانٹ، ہیگل

اور پلوٹی نس کے جیسے

فلسفی مصروف رہتے ہیں

نہ جانے کیسی کیسی منطقی

بحثوں کو سلجھانے میں

الجھانے میں

گرہیں کھولنے

گرہیں لگانے میں

میں آتا بھرے ہاتھوں سے

ماتھے کا پسینہ پونچھتی
آنگن سے اور دالان سے اور صحن سے
مصروفیت کے ان گنت بکھرے ہوئے
لمحوں کو چنتی
پاس سے اُن کے
گزرتی ہوں
تو وہ اک برگزیدہ شیلف
اور اس پر دھری
ساری کتابیں
مجھ پہ ہنستی ہیں— (کتابیں مجھ پہ ہنستی ہیں)

ایک اور نظم:

☆اندر پت جھڑ بڑھتی جائے—
ہریالی کی کھوج میں
تنہائی کے شہر بسائے
تن پر سبزہ مہکے
اندر
پت جھڑ بڑھتی جائے (اندر پت جھڑ بڑھتی جائے)

یہ نظمیں یہاں ختم نہیں ہوتیں بلکہ ایک نئے موڑ کی جانب نکل جاتیں ہیں، ویسے نسیم سید زیادہ طوالت والی نظمیں لکھنے سے گریز کرتی ہیں اور یہ اختصار اور ایجاز ان کا ایک بڑا کمال بھی ہے۔ وہ ایک کیفیت، خیال اور جذبے کو وہیں تک برتیں ہیں، جہاں تک وہ ان کے لہو میں سرگوشی کرتا ہے اور اس دھمال کرتی بے خودی کو وہ بڑے قرینے کے ساتھ اپنی نظم بنالیتی ہیں۔ ان کو بلاشبہ نظم کی ایک اہم شاعرہ تصور کیا جانا چاہیے، اور ایسا ہے بھی، اردو شاعری میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، اور سارا شگفتہ کے بعد آنے والی شاعرات میں نسیم سیّد کا نام ایک نئے لہجے اور نئے اسلوب کے حوالے سے یقیناً قابلِ قدر ہے۔

اب ایک نظر ان کی غزلوں پر بھی ڈالتے ہیں، ایک بات تو یہ ہے کہ نظموں کی طرح نسیم سیّد نے اپنی غزلوں کی فضا کو بھی تازہ کاری کے ساتھ جوڑنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ نسیم سید غزل کے بنے بنائے کلاسیکل سانچوں سے کچھ آگے بڑھ کے بات کرنے کی خواہش مند ہیں مگر کیا کیا جائے غزل بڑی ظالم صنفِ سخن ہے، تاہم نسیم سیّد نے اپنے لہجے اور اسلوب کے ساتھ غزل کے جہانِ سخت میں بھی کچھ نہ کچھ پھول ضرور کھلا لیے ہیں اور انھوں نے بڑی ذہانت کے ساتھ اپنی

نظموں کی فضا کی پیوندکاری غزلوں میں بھی کی ہے۔ اب ان کے کچھ شعر:

ایک عریضہ، ایک دیا، اور پورے چاند کی رات
آدھی رات کا سناٹا اور پورے چاند کی رات

نظمیں لکھتی، مصرعے کہتی، موجیں اور پھر ان میں
کرتیں لگاتی کوئی صدا اور پورے چاند کی رات

کلام اس سے ہے مجھ کو جو ہم کلام نہیں
وہ دھوپ پھیلی ہے مجھ میں جو میرے نام نہیں

مجھے خبر تھی ترے تیر میری تاک میں ہیں
ہوا اب اڑان میں میرے کہیں قیام نہیں

بات بے بات یہ طعنہ یہ ملامت کیا ہے
یہ ہی ہوتی ہے محبت تو عداوت کیا ہے

ایک اس کے لیے کتنوں سے بڑائی لے لی
اب خدا جانے اسے مجھ سے شکایت کیا ہے

جب زمینوں سے ہی کوئی تعلق ہی نہیں
کوئی پوچھے ہمیں ہجرت کی ضرورت کیا ہے

یہ ہے وہ بصارت اور یہ ہے وہ نئے دور کی باشعور اور بالغ نظر شاعرہ جو جانتی ہے کہ نئی زمینوں پر ہجرت کے معانی کیا ہیں اور کس طرح ایک نئی زندگی، ایک نئے احوال، ایک نئی تہذیب اور نئی معاشرت کے ساتھ اپنی مشرقی اقدار اور مشرقی تہذیب کو یک جا کیا جا سکتا ہے اور کس طرح ایک نئے ماحول سے نئے تجربات اور نیا تخلیقی وژن مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کام کی سطحوں پر نسیم سید کے تازہ مجموعے ''سمندر راستہ دے گا'' میں قارئین کو دکھائی بھی دے گا...

بجھے رنگوں کی رونق (شاعری)، آصف رضا، ضخامت ۲۲۹ صفحات، قیمت ۲۵۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت—— آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: ابنِ عظیم فاطمی

گزشتہ برسوں میں جہاں عمومی مسائل میں اضافہ اور وسائل میں کمی کا رجحان غالب رہا ہے، وہیں شعری مجموعوں اور افسانوی مجموعوں کے علاوہ خودنوشت، سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور سفرناموں کی اشاعت کا سلسلہ بھی تیزی سے جاری ہے۔ ان میں بہت نثری اور شعری تخلیقات کے مجموعے دیارِ غیر میں بسنے

والے پاکستانی شعرا و ادبا کے ہیں جو نہ یہ کہ صرف قابلِ قدر ہیں بلکہ قابلِ ذکر بھی۔ اپنی مٹی سے دور رہ کر اپنی زبان و ادب سے محبت یقیناً مشکل اور قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ بھی ایسے ہی شاعر کا ہے جو امریکا میں مقیم ہیں۔ مجموعے کا انتساب ''اپنے خوابِ جمال کے نام'' ہے۔ پیش لفظ خود آصف رضا نے تحریر کیا ہے جب کہ مشترکہ مجموعہ ''دوبخنہ'' جس میں آصف رضا کی غیر مطبوعہ نظمیں اور رضی مجتبیٰ کی غزلیں شامل تھیں، کا پیش لفظ بھی ''دوبخنہ کا پیش لفظ'' کے زیرِ عنوان اس مجموعے میں شامل ہے۔

مجموعے میں شامل بیشتر نظمیں ہندوستان کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مجموعے میں شامل نظمیں مطبوعہ ہیں۔ مجموعے میں ۸۳ نظمیں اور ۱۸ غزلیں شامل ہیں۔ پیش لفظ میں شاعری کے جواہر اور شعری اسلوب کے بارے میں بھی بحث کی گئی ہے جب کہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ وہ اپنے کسی تجربے کو کسی طے شدہ شعری اسلوب کے سانچے میں ڈھالنے کے قائل نہیں ہیں۔ غزلوں سے نیم دلانہ وابستگی کے باوجود شاعر نے اچھے اشعار تخلیق کیے ہیں۔

نظم کا معاملہ مختلف ہے۔ خاصی طویل نظمیں بھی اس مجموعے کا حصہ ہیں جن میں ''نروان''، ''میری دختر''، ''ہرن''، ''بحر گرد''، ''ہمسایہ''، ''فوارہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں اپنے بڑے بھائی رضی مجتبیٰ کے نام دو نظمیں ''جنم کا رشتہ'' اور ''مٹی کے فوجی'' کے عنوان سے شامل ہیں۔ جب کہ مختصر نظمیں جیسے ''دلدل'' صرف چار مصرعوں کی ہے۔

اُفق پر دُور ہریالی کو سائے ڈھک رہے ہیں
پرندے کے ہوا کو پیٹنے پر تھک رہے ہیں
زمیں پر بانس کے نیزوں کا اک جنگل گھنا ہے
بڑھاتی اپنی کشتی جس کے دلدل میں فنا ہے

نظموں کے مطالعے سے ایک بات اور سامنے آتی ہے کہ ان میں ردیف کی پابندی کا خاصا خیال رکھا گیا ہے جب کہ یہ نظمیں پابند نظموں کے زمرے میں نہیں آتیں۔ ان نظموں میں لفظیات اور خیالات کا نیا پن بہت واضح ہے۔ شاعر کا مطالعہ اور تخلیقی ذہن ان نظموں کے پس منظر میں پوری طرح فعال نظر آتا ہے۔ آصف رضا کا اسلوب جدید شاعری کا لحن رکھتا ہے۔ ان کی تراکیب، مصرعوں کی ساخت، خیال کی رَو، اظہار کا انداز اور موضوعات کا دائرہ— ہر شے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے لیکن اُن کی سوچ اور مزاج پر نئی دنیا، اس کے مسائل اور اسلوبیات کا واضح اثر ہے جو شاعر کی قدرتِ کلام کا ثبوت ہے۔ غزل کے حصے میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ صرف ۱۸ غزلیں ہی شاملِ مجموعہ ہیں مگر سہلِ ممتنع میں کہے گئے یہ اشعار یقیناً قابلِ ذکر ہیں، مثلاً:

جمع کرتا ہے کیوں فرشتوں کو
کیا تجھے میرا اعتبار نہیں

زندگی ایک امتحان سہی
ڈر رہا ہوں کہ ہار بار نہ ہو

یاد اکثر تجھے گھبرا کے کیا کرتا ہوں
بھول جاؤں نہ تجھے مجھ کو یہ ڈر ہو جیسے

اس مجموعے میں شامل نظمیں شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے قارئین کو ان سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ان مسائل و معاملات پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں جس کے تحت یہ نظمیں تخلیق کی گئی ہیں۔

کلیاتِ قدسی (شاعری)، مصنف: شاہ زادہ اسد الرحمٰن قدسی، مرتب: ڈاکٹر محمود الرحمٰن، ضخامت: ۱۸۶ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: مکتبۂ قدسی، آستانہ قدسی، بھون، چکوال **مبصر: عزیز احسن**

حضرت شاہ زادہ اسد الرحمٰن قدسی رحمتہ اللہ علیہ (متوفی ۱۲، ذی الحجہ، ۱۳۹۷ھ، مطابق ۲۴ر نومبر ۱۹۷۷ء) ایک صوفی بزرگ تھے جن کا ہر لمحہ یادِ الٰہی میں گزرا اور جن سے روحانی فیض پانے والے بہت سے لوگ سلوک و معرفت کی منازل طے کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حضرت قدسی کے مراتب عالیہ اور فیضانِ جاوداں کے احوال کو ڈاکٹر محمود الرحمٰن (کلیاتِ قدسی کے مرتب) نے اپنی کتاب ''قلندرِ زماں شاہ زادہ اسد الرحمٰن قدسی رحمتہ اللہ علیہ'' میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''کلیاتِ قدسی'' میں منظرِ عام پر آنے والا کلام گو کہ بہت قلیل ہے کیوں کہ کتاب کے کل صفحات ہی ۱۸۶ ہیں، لیکن معیار کے اعتبار سے یہ کلام بہت بلند ہے اور اپنے مافیہ (content) کے حوالے سے انتہائی درجہ اثر انگیز۔ ''کلیاتِ قدسی'' پر نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ حضرت قدسی نے مابعد الطبیعیاتی مسائل کو مجازی تجسیم کے عمل سے گزار کر اس طور بیان فرمایا ہے کہ مجاز پسند اور حقیقت جُو قارئین اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کلام سے محظوظ ہو سکیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا حسنِ ازل کے جلووں نے مے خانے پہ پرتو ڈالا ہے
کیوں آج یہ کھنچ کر آئی ہے اک دنیا بزمِ رنداں میں

سرِ بام اس کو بلا لیا مرے ذوقِ جلوہ پسند نے
مگر آنکھ حسن سے جب ملی یہ ہوا کہ چھا گئیں حیرتیں

کھینچتی ہے پھر مجھے رنگینیِ گل باغ میں
میرے کانوں میں چلے آتے ہیں پیغامِ قفس

زندگی بھر خانۂ صیاد تھا اور عندلیب
ہو بہ ہو تھا زیست کا انجام انجامِ قفس

وہ حسن، شہرت ہے جس کی سب میں، کبھی تو صرف نگاہ کر دے
یہ تیرا پردوں میں چھپ کے رہنا کہیں نہ مجھ کو تباہ کر دے!

آخری شعر کا دوسرا مصرع تو اتنا بلیغ ہے کہ اس کی پوشیدہ معنویت کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ انسانی تاریخ پر نظر ڈالیے تو ہر عہد، ہر خطے، ہر دیار اور ہر قریے میں ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں افراد، اقوام اور انسانی گروہ محض اس لیے بھٹک کر منزل کھو بیٹھے اور یقیناً تباہ و برباد ہو گئے کہ خالق کائنات نے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا ہے۔

''کلیات قدسی'' میں غزلیات کے ساتھ ساتھ نظموں کی بہار بھی جوبن پر نظر آتی ہے۔ حضرت کی تمام نظمیں پابند ہیں اور اس حقیقت کی غماز ہیں کہ جناب قدسی نے کائنات کا مشاہدہ بھی حقیقت الحقائق کی لقا کی جستجو میں کیا ہے۔ شیفتہ نے کہا تھا:

یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا
یاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا

حضرت قدسی کے تمام کلام میں کائنات کا مشاہدہ اسی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہوا نظر آتا ہے۔

حضرت قدسی کے احوال، شعری مرقعوں کی دل آویزی اور کلام کی اثریت، اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ قلم کی جنبشوں کو محدود کیا جائے لیکن تبصرے کے تقاضے بہرحال غالب ہیں، اس لیے حضرت قدسی کے چند اشعار پر اپنی بات مکمل کرنے کی سعی کرتا ہوں:

میں شعلۂ عشقِ دل ستاں ہوں — سرمایۂ سوزِ جسم و جاں ہوں
ہر چند کہ وہم ہوں گماں ہوں — آئینۂ معنیِ نہاں ہوں
اجمالِ مفصلاتِ تاریخ — فہرستِ صحائفِ زماں ہوں
بخشی ہے خدا نے سرفرازی — گو خاکِ قدومِ بندگاں ہوں
کیوں مجھ کو کہیں نہ قدسی الاصل — میں شانِ نمودِ قدسیاں ہوں

اتنی اچھی اور جاوداں قدر کی حامل کتاب مرتب کرنے پر میں ڈاکٹر پروفیسر محمود الرحمٰن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اک ٹکڑا دھوپ کا (افسانے)، مصنف: اسد محمد خاں، ضخامت: ۱۹۶ صفحات، قیمت: ۲۷۵ روپے، ناشر: القا پبلی کیشنز، 12-K، مین بلیوارڈ، گلبرگ ۲، لاہور، مبصر: **عنبرین حسیب عنبر**

اسد محمد خاں کو کسی نئے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں۔ اُن کے نام اور کام دونوں سے ہمارے

عہد کی خوب شناسائی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اسد محمد خاں نے اردو افسانے کے قاری کو اپنے فن کے طلسم سے جو ''کھڑکی بھر آسمان'' دکھایا تھا اب اُس پر ''اک ٹکڑا دھوپ کا'' نمودار ہو چکا ہے، اور اس کی چمک میں اسد محمد خاں کی فنی مہارت ہمیشہ کی طرح بھرپور انداز سے نمایاں ہے۔ یہ کتاب بارہ یعنی ایک درجن کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چند مختصر ہیں اور کچھ طویل۔ لیکن صاحب جس طرح گلاب کے بے شمار باغات جس خوش بو سے مہکتے ہیں، گلاب کا ایک پھول بھی اُسی نوع کی خوش بو سے معطر کرتا ہے، اسی طرح اسد محمد خاں بھی کہانی مختصر لکھیں یا طویل، اُس کہانی میں اُن کی تمام فنی خوبیاں اپنا اظہار کرتی ہیں۔

''اک ٹکڑا دھوپ کا'' میں درجن بھر کہانیاں اپنے عہد، مقام، موضوع، ٹریٹمنٹ، غرض کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یقیناً ایک ہی کتاب میں اتنی متنوع کہانیوں کو یک جا کرنا اسد محمد خاں کا ہی حصہ ہے۔ اس کتاب میں وہ قاری کو اپنے مخصوص انداز میں دنیا بھر کی سیر کراتے ہیں۔ کبھی تاریخ کے جھروکے میں جا کھڑے ہوتے ہیں تو کبھی حال کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک پیر کراچی میں تو دوسرا بھوپال میں۔ ابھی جے پور میں تو ابھی برما میں۔ گویا کہ ایک اُڑن کھٹولا ہے جس میں وہ قاری کو بٹھائے الف لیلوی انداز میں دنیا جہان کی سیر کروا رہے ہیں۔ مگر ان کا کمال یہ ہے کہ وہ سیر کے دوران قاری کا ہاتھ اس مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں کہ وہ ذرا بھی بھٹکنے نہیں پاتا۔ اس کے لیے اُن کا آزمودہ نسخہ یہی ہے کہ وہ اپنی کہانی کے موضوع اور مقصد کے عین مطابق انداز اور لہجہ اختیار کر لیتے ہیں اور کچھ اس طرح کہ لہجے اور انداز کی ہم آہنگی اوّل تا آخر قائم رہتی ہے۔ یہی لہجہ اور انداز کہانی میں وہ حسن پیدا کر دیتا ہے جو اُسے نثر پارہ نہیں رہنے دیتا بلکہ کہانی بنا دیتا ہے۔

ان کہانیوں میں اسد محمد خاں اپنے کرداروں، پلاٹ اور اُن کی فنی ترتیب سے بھی تنوع پیدا کر دیتے ہیں اور چوں کہ وہ بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، اس لیے کہانی کا بنیادی حسن اس لہجے اور انداز میں کھونے کے بجائے اور نکھر کر قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔

''اک ٹکڑا دھوپ کا'' اسد محمد خاں کی کہانیوں کا ایک اور اہم مجموعہ ہے، اس پر تبصرہ تو ہو چکا مگر اس کا تجزیہ قاری اور ناقد پر دو سطح پر ابھی باقی ہے جو اس مجموعے کا حق ہے۔

قاری، مصنف کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، اُن متحرک واقعات اور مناظر سے گزرتا ہے، جیتے جاگتے کرداروں سے ملتا ہے، اُن کے کلچر سے آگاہ ہوتا ہے، اُن کی دل چسپ گفتگو سنتا ہے۔ یہ گفتگو اس قدر دل چسپ ہوتی ہے کہ بقول پروفیسر سحر انصاری ''اسد محمد خاں کے افسانوں میں مختلف کرداروں کی سماجی حیثیت اور ماحول کے مطابق گفتگو اور مکالموں کی زبان سے گزرنا ایک لسانی عجائب گھر کی سیر کرنے کے مترادف ہے۔'' آیئے، ''اک ٹکڑا دھوپ کا'' میں موجود 'لسانی عجائب گھر' کی کچھ جھلکیاں دیکھتے چلیں:

> سنو ڑے! او بدنصیب! ہم لوگ کو بھوکا پیاسا کیوں مارتے ہو۔ او جہنم کے کیڑے!
> اڑے ہم لوگ کو مردوں کی طرح جان دینا بی آتا ہے، ایکی بار میں گولی مار کے

خلاص کرو نہیں — ابی جو مارنے کا پلان نہیں ہووے تو پانی دیو، کچھ کھانے کو دیو،
کافر کی اولاد! (وارث)

یہ رحامی، گھر میں گھس کے، پستول دکھا کے میری بچی سے زور، زبردستی کرتا تھا۔
میں تو جیل کرادوں گی اس سوّر کے تخم کو۔ (چھوٹے بور کا پستول)

عورت نے گایا: "موگل جوجیس سب سانجھی جنے! میرا بھیّا اکیلب ہی ٹھاڑ!"
سب عورتوں نے دُہرایا: "میرا بھیّا اکیلب ہی ٹھاڑ! میرا بھیّا سر جیتی ٹھاڑ!"
یعنی اُدھر مغل گنتی میں ساتھ ہیں، پر ادھر میرا بھیّا اکیلا ہے — اور جیت کے
کھڑا ہے۔ (وارڈ کا اڈّا)

یہاں جھلکیوں پر اکتفا کرنا پڑا ہے ورنہ "اک ٹکڑا دھوپ کا" میں خاصا وسیع لسانی عجائب گھر موجود ہے۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ اس لسانی عجائب گھر میں بھی قدموں کی رفتار وہی رہتی ہے یعنی رواں دواں مکالمے جو کہانی کے آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ایسی فطری بے ساختگی کے ساتھ آتے ہیں کہ کہیں آرائش یا بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔

اسد محمد خاں کی ایک اہم خصوصیت "اک ٹکڑا دھوپ کا" میں بھی پوری طرح نمایاں ہے اور وہ خصوصیت عصری حسیت ہے جو کسی بھی مقام، عہد کی کہانی کو ہماری کہانی بنا دیتی ہے۔

ان کہانیوں میں کہیں ہماری ملاقات ایسے انسانوں سے ہوتی ہے جو برے ہونے کے باوجود انسانی نفسیات کے عین مطابق دوسروں کو برا اور خود کو اچھا کردار ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں وہ عام لوگ ملتے ہیں جو آج میڈیا کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، اُس کے ذہن سے سوچتے اور اُسی کی زبان بولتے ہیں، یہ بے چارے اصل حقائق سے کوسوں دور ہونے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ باخبر ہیں۔ یہاں انسانیت، دوستی، مروت اور انسانی اقدار کے پاس دار ہمسایے بھی اُجالے کی طرح موجود ہیں تو ذرا ذرا سے ذاتی مفادات کی خاطر انسانیت کے مقام سے گرے ہوئے کردار تاریکی کا پتا بھی دیتے ہیں۔ مگر یہ تمام کردار ہمارے عہد کے جیتے جاگتے کرداروں میں ڈھلے ہوئے ہیں، اسی لیے کہیں بھی کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

اسد محمد خاں کی ان کہانیوں کی ایک اہم بات یہ ہے جو اُن کے طرزِ تحریر کی ایک اور اہم خصوصیت بھی ہے کہ وہ اپنے کرداروں، موضوعات یہاں تک کہ اختتام پر بھی کوئی حتمی فیصلہ صادر فرمانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ایسی فضا میں کہانی کا اختتام کرتے ہیں کہ حقیقی زندگی کی طرح اختتام کے کئی امکانات موجود رہتے ہیں۔ قاری اپنی فکر اور تجربے کی روشنی میں ان کے مطالب نکال سکتا ہے یعنی اسد محمد خاں اپنے قاری کی ذہانت پر پورا یقین رکھتے ہیں اور E. B. White نے کہا تھا کہ "جو شخص اپنے قاری کی ذہانت پر شبہ کرے،

وہ بھی اچھا نہیں لکھ سکتا۔'' گویا ان کہانیوں کے اچھا ہونے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

بریکنگ نیوز (۱۱ ۹ سے تا حال عصری سیاست کا منظر نامہ)، مصنف: سلیم یزدانی، ضخامت: ۴۲۰ صفحات، قیمت: ۱۵۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت، ۷۔ا۔ کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: عنبریں حسیب عنبر

''بریکنگ نیوز'' یہ وہ لفظ ہے جو آج کچھ دیگر الفاظ کی طرح بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورت — غرض کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں رہا۔ یہ لفظ اشارہ ہے کسی نہایت اہم خبر کا، جو متقاضی ہو کہ اسے پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ فوری طور پر عوام تک پہنچا دیا جائے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً یہ بریکنگ نیوز عوام کا سکون بریک کرنے اور ہلچل مچانے کے لیے استعمال ہوتی ہے کیوں کہ اس میں سچائی اور دیانت داری سے زیادہ خبر پہنچانے میں سبقت لے جانے کی دوڑ اہم ہو چکی ہے اور اس کا نتیجہ اہم شخصیات کے انتقال کی غلط خبروں سے لے کر گائے کے ٹرین کی پٹری پر آ جانے تک کی ''بریکنگ نیوز'' ہماری بصیرت اور شعور کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن زیرِ مطالعہ کتاب ''بریکنگ نیوز'' اپنی سچائی اور دیانت داری کے ساتھ اس لفظ کا حق پوری ذمے داری سے ادا کرتی نظر آتی ہے۔

''بریکنگ نیوز'' عصری سیاست کا منظر نامہ ہے جو معروف افسانہ نگار، ڈراما نویس، نقاد، سیرت نگار اور سیاسی تجزیہ نگار سلیم یزدانی کے کالموں سے تشکیل پاتا ہے۔

سلیم یزدانی ایک طویل عرصے سے کالم لکھ رہے ہیں جو اس سے پہلے بھی کتابی شکل میں آ چکے ہیں اور پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ اب یکم جنوری ۲۰۰۴ء سے ۱۵ جون ۲۰۱۰ء تک کے روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہونے والے کالموں کا یہ انتخاب ''بریکنگ نیوز'' کے نام سے پیش کیا گیا ہے اور سچ پوچھیے تو کتاب پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے مختلف تصاویر کو یک جا کر کے عصری سیاست کے منظر نامے کا ''پزل'' مکمل کر دیا گیا ہو۔ یوں تو اخبارات میں کالم 'کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے' کے مصداق خبر کی وضاحت اور تجزیے کے لیے لکھے جاتے ہیں مگر سلیم یزدانی جیسے تخلیقی ذہن، سیاسی شعور، دردمند دل رکھنے والے اسے کہیں آگے کی شے بنا دیتے ہیں۔ آج سیاست کسی مخصوص حلقے یا فہم و فراست رکھنے والوں تک محدود رہنے والا موضوع نہیں رہا ہے بلکہ ہر سطح، ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگ اس میں میڈیا کی بدولت براہِ راست شامل کر لیے گئے ہیں۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور متوجہ رکھنے کی ہوس نے عام آدمی اور حقیقت کے درمیان فاصلے پر مبنی ایسا قریبی تعلق پیدا کر دیا ہے کہ عام آدمی بچے کی طرح خوش ہے کہ چاند اس کے ساتھ اور سامنے ہے مگر دراصل وہ اس کی حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ سلیم یزدانی جو بابا فرید گنج شکر کے خانوادے سے ہیں، وہ عام آدمی کے دل اور ذہن میں بیک وقت اترنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کالم پڑھتے ہوئے قاری بار بار یہ کہتا ہے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ مگر سلیم یزدانی کی ذہنی صلاحیتیں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ وہ اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہیں اور

اپنے وژن سے اس کے نتائج قبل از وقت دیکھتے ہوئے ایسی تجاویز بھی پیش کرتے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو نہ صرف مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ پاکستان کو نیک نامی کا راستہ بھی مل سکتا ہے۔

اس کتاب میں شامل کالموں کو تین ابواب میں تقسیم کر کے تین عنوانات دیے گئے ہیں جو ''پاکستان — ۲۱ ویں صدی کا وژن''، ''خارجہ اُمور'' اور ''نیو امریکی ورلڈ آرڈر'' پر مشتمل ہیں۔ یہ کالم سلیم یزدانی کی مصری حیثیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ ہر اس موضوع پر قلم اٹھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں جو آج کے پاکستانی عوام سے کسی نہ کسی سطح پر متعلق ہے اور ان کے کالموں میں تنوع اور تازگی بھی برقرار رہتی ہے۔ اپنی تحریر میں سلیم یزدانی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور کام لیتے ہیں اور اس طرح ایسے چمک دار فقرے لکھتے چلے جاتے ہیں جو اپنے انحصار، ایمائیت، جامعیت اور دل کشی میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ یوں دریا کوزے میں بند بھی ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنی روانی بھی برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پانی کی سطح کے نیچے کچھ اور ہنگامہ ہو رہا ہوتا ہے۔
>
> (''حد سے گزر جانے کا رجحان'')
>
> سرحد کا ٹپہ ہو، سندھ کا جھومر ہو، صوفیانہ زمزمے ہوں، کافیاں ہوں، یہ کومل سُروں کی دنیا ہے، نہ ان میں تشدد کا عنصر ہے، نہ چیخ پکار ہے۔
>
> (''بامقصد میڈیا پالیسی کی ضرورت'')
>
> کٹھ پتلیاں تماشا دکھا رہی ہیں، ڈوریاں ہل رہی ہیں۔ خوف اس بات کا ہے کہ یہ ڈوریاں غیروں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہیں۔ میں جانتا ہوں میرے ہم وطن اُمید کا دامن نہیں چھوڑیں گے۔
>
> (''نوشتۂ دیوار'')

سلیم یزدانی نے خود بھی اُمید کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا ہے، وہ محض سنسنی پھیلانے کی خاطر عوام کو مایوسی کے اندھیروں میں دھکیلنے کے قائل نہیں۔ وہ ہر تعصب سے بالاتر ہو کر ہی لکھتے ہیں جو انھیں سچ اور درست محسوس ہوتا ہے۔ اُن کو دراصل ٹر کی یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ سیاسی منظرنامے میں ہمیشہ عوام سب سے بڑی طاقت ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے اسی طاقت کو اپنے قلم کی روشنائی بنا لیا ہے۔ وہ اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کے لیے نہیں لکھتے بلکہ عوام کی آواز بننے کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اسی لیے یہ کتاب صرف سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات عامہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پاکستان کے عام آدمی کے لیے بھی احساس کی دولت اور فکر کی روشنی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

امیر اللغات (لغت) جلد سوم، مؤلف: امیر مینائی، تدوین: ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ضخامت: ۳۲۳ صفحات، قیمت: ۳۰۰ روپے، ناشر: شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، مبصر: **عنبرین حسیب عنبر**

''امیر اللغات'' معروف شاعر، نعت گو، عالم، فقیہ، انشا پرداز، زبان داں اور لغت نویس امیر مینائی

کی مرتب کردہ ہے۔ امیر اللغات کی دو جلدیں اس سے قبل پاکستان سے سنگ میل پبلی کیشنز (لاہور) نے ۱۹۸۹ء میں یک جا کر کے شائع کر دی تھیں۔ اس لغت کی تیسری جلد جو ''ب'' پر مشتمل ہے، غیر مطبوعہ تھی اور اب ایک سو پندرہ برس بعد پہلی مرتبہ شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور سے شائع ہوئی ہے اور اس کی تدوین کا سہرا معروف ادیب اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے سر ہے۔

''امیر اللغات'' کا شمار کئی اعتبار سے اردو کے اہم لغات میں ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ''امیر اللغات'' ابتدائی اردو لغات میں سے ایک ہے جو نواب کلب علی خاں سے سر الفریڈ لائل (لیفٹیننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ و چیف کمشنر اودھ) کی فرمائش پر ۱۸۸۴ء میں امیر مینائی سے کہہ کر آغاز کروائی گئی اور ۱۸۹۱ء میں اس لغت کا پہلا حصہ شائع ہوا جو الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ پر مبنی تھا اور ضخامت ۳۱ صفحات تھی۔ اس جلد اول کو سراہا گیا۔ لغت کی دوسری جلد ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی جس پر مولوی سید احمد دہلوی مؤلف ''فرہنگ آصفیہ'' نے ''امیر اللغات'' کے نمونے پر سرقے کا الزام عائد کیا جو بعد میں غلط ثابت ہوا۔ ''امیر اللغات'' کی تیسری جلد کا قلمی نسخہ نواب امیر مینائی کے بعض باذوق اور اہل علم افراد کی تحویل میں رہا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک سو پندرہ برس گزر جانے کے باوجود محفوظ رہا۔

اس لغت کی اہمیت کا ایک اہم سبب اس کے مؤلف ''امیر مینائی'' ہیں جو اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے اور عربی، فارسی اور اردو پر دسترس رکھتے تھے۔ اس جلد میں بھی ان کی محنت، ریاضت اور مہارت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اور سب سے اہم سبب وہ ہے جس کی طرف لغت کے فاضل مرتب ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے توجہ دلائی ہے کہ اس لغت میں بعض ایسے الفاظ اور نادر اسناد آ گئے ہیں جو کسی لغت میں نہیں۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ امیر اللغات محض تین جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ بات ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اپنے دلائل سے بتائی ہے کہ امیر مینائی کے حالات، صحت اور پھر وفات نے انھیں اس اہم اور نادر کام کو مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔

''امیر اللغات'' جلد سوم میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اس لغت میں موجود بعض اسناد و تحاریر کی تصحیح بھی کی ہے اور جہاں ضروری محسوس کیا، وہاں الفاظ و مرکبات پر اعراب بھی لگا دیے ہیں۔ انھوں نے املا کا جدید اسلوب اپنایا ہے اور بعض ساقط الوزن مصرعوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس لغت میں مقدمہ از مرتب بھی نہایت اہم نوعیت اختیار کر گیا ہے، کیوں کہ اس مقدمے میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اس لغت کے خصائص اور جلد سوم کی کمیوں اور کوتاہیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لغت کا املا ''پیچیدہ'' بنا دیا گیا ہے تاہم مرتب نے یہ نشان دہی بھی کی ہے کہ اکثر الفاظ کا املا امیر مینائی کی تحقیق اور وسعت مطالعہ کا بھی ثبوت ہے۔ اور یہ بھی کہ الفاظ کی اصل اور صحیح تلفظ کے لیے تحقیق اور چھان پھٹک کے معاملے میں کی گئی امیر مینائی کی محنت کو سراہا جانا چاہیے۔

''امیر اللغات'' جلد سوم کی یہ اشاعت ایک بڑا کارنامہ ہے، کیوں کہ اس کی اشاعت میں کی

مسائل درپیش تھے جو بڑی محنت سے دور کیے گئے اور اس اشاعت کو ممکن بنایا گیا۔ اس جلد کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اردو ادب نے کیسی بڑی بڑی شخصیات پیدا کیں اور اُن میں سے اکثر کو وہ داد و تحسین نہ ملی جس کی وہ حق دار تھیں۔ اس جلد میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے اور آج اردو کی بگڑتی صورت میں تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ آج قحط الرجال کے اس عہد میں بھی ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر رؤف پاریکھ جیسے اذہان ہمارے درمیان موجود ہیں جن کی محنت، اخلاص، ذہانت، مطالعہ اور کام کی لگن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور ''امیر اللغات'' کے خطوط پر کوئی جدید لغت تیار کی جاسکتی ہے جو ''الف'' سے ''ے'' تک اردو کے اساتذہ، طلبہ اور عام آدمی کے لیے یک وقت رہ نما ثابت ہوسکے اور اردو لغات میں ایک معیاری لغت کا اضافہ ہوسکے جو ہم سب کے لیے باعث افتخار ہوگا۔

راگ رُت، خواہش مرگ اور تنہا پھول (ادیبوں میں خودکشی کے محرکات اردو ادب کے خصوصی حوالے سے)، مصنف: ڈاکٹر صفیہ عباد، ضخامت: ۳۸۳ صفحات، قیمت: ۴۰۰ روپے، ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، مبصر: **عنبرین حسیب عنبر**

ایک تخلیقی ذہن کے لیے دوسری کئی حقیقتوں کی طرح ''موت'' بھی اپنے روایتی معنی نہیں رکھتی اور تقریباً ہر تخلیقی ذہن اس کی بابت سوچتا، اپنے انداز سے موت کو سمجھتا اور پیرایۂ اظہار میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض تخلیقی اذہان کے لیے موت بھی ایک جمالیاتی رُخ رکھتی ہے اور ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ بعض تخلیق کاروں نے بہ صد شوق موت کو گلے لگانے کے لیے خودکشی کی ہے۔ تاہم یہ اصول سب پر لاگو نہیں ہوتا۔ تخلیق کار خواہ مغرب کا ہو یا مشرق کا، اُس کی خودکشی کے آگے ہمیشہ ایک سوالیہ نشان رہا ہے اور ایسے زرخیز ذہنوں سے مکمل استفادے کے لیے اس سوالیہ نشان کو حل کرنا از حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر صفیہ عباد کی ایسی ہی ایک کوشش ''راگ رُت، خواہش مرگ اور تنہا پھول'' کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری (Ph.D) کے لیے لکھا گیا تھا جو اب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر صفیہ عباد نے سب سے پہلے خودکشی کے ممکنہ مفاہیم اور اُن کی وضاحتیں پیش کی ہیں۔ پھر خودکشی کرنے والے عالمی ادیبوں کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بعد اردو کے اُن ادیبوں پر تحقیق کی ہے جنھوں نے خودکشی کی۔ اس کے بعد ایک اور رُخ سے اردو ادب کے ایسے شعرا پر تحقیق کی گئی ہے جنھوں نے خودکشی تو نہیں کی لیکن زندگی گزارنے کی جو ڈگر اختیار کی، وہ خودکشی کو جاتی تھی۔ اور پھر سب سے آخر میں ادیبوں میں خودکشی کے محرکات، اُن کا تجزیہ اور نتائج پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دل چسپ اور فکر انگیز کتاب ہے۔

ڈاکٹر صفیہ عباد کا خیال ہے کہ عالمی سطح پر ادیبوں میں خودکشی کے واقعات انیس ویں اور بیس ویں صدی میں زیادہ رونما ہوئے ہیں۔ ان ادیبوں اور اُن کے حالاتِ زندگی، کامیابی و ناکامی وغیرہ پر نظر

دونوں میں تو حیرت انگیز بات محسوس ہوتی ہے کہ اس قطار میں مشرقی معاشرے کے ادیب بھی کھڑے ہیں اور مغربی معاشرے کے ادیب بھی، نوجوان بھی ہیں، جوان بھی اور عمر رسیدہ بھی۔ اسی طرح خواتین بھی موجود ہیں اور حضرات بھی۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ مشرقی معاشرے میں شاعر، ادیب سے روا رکھی جانے والی ناقدری خودکشی کا محرک ثابت ہوتی ہے تو پھر مغربی شاعر اور ادیب اس صورت حال سے کیوں دوچار ہوتے ہیں؟ اگر عورت اظہار کی پابندیوں، مجبوریوں اور تخلیقی ذہن رکھنے کے جرم کی سزا بھگتنے سے اُکتا کر یہ راہ اختیار کرتی ہے تو پھر مرد کے ساتھ تو یہ مجبوریاں نہیں ہیں۔ اگر کسی ناکامی یا ناکافی صلے کے باعث یہ اقدام اٹھایا جاتا ہے تو پھر ایسے شعرا اور ادیبوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو ذاتی اور تخلیقی زندگی میں کامیاب رہے۔ کئی ایسے نام ہیں جو ہنس مکھ اور زندہ دل تھے یعنی قنوطیت بھی خودکشی کا لازمی جزو نہیں ہے۔

اس تحقیق میں صفیہ عباد نے محض موجود مواد پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ حقائق جاننے کی جستجو میں وہ ممکنہ حد تک شاعروں اور ادیبوں کے اہل خانہ، دوستوں اور ہم عصروں سے بذات خود ملی ہیں اور خودکشی کے اصل محرکات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں صفیہ عباد نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ کئی مرتبہ ادیبوں کی خودکشی کو حادثاتی موت کا نام دے دیا جاتا ہے یعنی کئی نام اس فہرست میں مزید شامل ہیں مگر ان کی خودکشی منظر عام پر نہ آنے کی وجہ سے ان کا نام درج نہیں کیا جا سکتا۔ اس تحقیق میں شامل کچھ نام ایسے ہیں جن کے بارے میں شواہد کہتے ہیں کہ وہ بچپن سے خودکشی کا میلان رکھتے تھے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے خودکشی کی کوشش ناکام ہونے کی صورت میں بار بار اس کوشش کو دہرایا تا وقتیکہ وہ موت کو گلے لگانے میں کامیاب نہ ہو گئے۔

یہاں ایک اہم سوال ذہن میں یہ بھی اُبھرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہر تخلیقی ذہن موت کو سوچتا اور لکھتا ہے۔ لہٰذا کچھ شاعر یا ادیب ایسے بھی ہوں جنھوں نے غصے یا مایوسی کی وقتی کیفیت میں خودکشی کا ارتکاب کیا ہو اور بعد میں اُن کے ایسے اشعار کو یوں سمجھا جائے کہ اُن کے لیے موت میں جمالیاتی کشش تھی، لہٰذا ایسا دانستہ اور بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا؟ خیر، سوالات تو اور بھی کئی ہیں جن کے جوابات تلاش کرنا بہت ضروری ہے مگر اس اہم تحقیق کے لیے کافی مواد "رائگاں رُت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول" میں موجود ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ادب سے وابستہ لوگوں اور طالب علموں کی توجہ حاصل کرے گی بلکہ ہر سوچنے والا ذہن اور حساس دل اسے پڑھنے کی طلب محسوس کرے گا۔

اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (تنقید)، مرتب: ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ضخامت: ۱۱۲ صفحات، قیمت: ۲۲۰ روپے، ناشر: مقتدرہ قومی زبان، ایچ۔۸/۴، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد، مبصر

عنبرین حسیب عنبر

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

گنجینۂ معنی تک پہنچنے کا طلسم یقیناً الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ الفاظ جو ہر زبان کی اساس مانے جاتے ہیں۔ کسی زبان کے الفاظ و معنی کے طلسم کدے تک پہنچنے کی کنجی ''لغت'' کو کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ کنجی تکمیل کے ایک مسلسل اور دائمی عمل سے گزرتی ہے جو یقیناً سہل نہیں، کیوں کہ زبان کوئی جامد شے نہیں اور پھر ''اردو'' زبان — جو ایک لشکری زبان ہے جس میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور اب انگریزی کے بھی بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں کئی سوال ذہن میں پیدا ہوتے رہے ہیں، مثلاً یہ کہ مستعار الفاظ کے معاملے میں اصل کی پیروی کی جانی چاہیے یا استعمال کی؟ ان الفاظ کا معیاری تلفظ کیا ہوگا؟ کیا مستعار الفاظ میں معنوی تصرف ممکن ہے؟ اور اب جب کہ جدید لسانیات میں تشکیلی نظریے (transformational theory) پر خاصی بحث ہو رہی ہے جس کے تحت جملے کی نحوی صحت (grammaticalness) کا معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ الفاظ جو فعل، صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، اپنی معنویت کے اظہار کے نئے طریقے تلاش کر رہے ہیں، اسی طرح جدید لسانیات میں لفظ کے بجائے معنیہ (phoneme) کو معنی کی پہلی یا بنیادی اکائی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ یقیناً لغت نویسی دشوار سے دشوار تر ہو چکی ہے اور اس کارِ دشوار میں اشتباہات و اغلاط کا رہ جانا بھی خارج از امکان نہیں۔ تاہم لغت نویسی کی تفہیم کو عام کرنے سے اس کارِ دشوار کو کچھ سہل بنانے کی ایک کوشش گزشتہ دنوں مقتدرہ قومی زبان نے کی ہے۔ ''اردو لغت نویسی'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ کتاب اردو لغت نویسی کی تاریخ، اس کام میں پیش آنے والے مسائل اور ان کے تحت پیدا ہونے والے مباحث پر مشتمل ہے اور اس کے مرتب اردو انگریزی کے نام ور ادیب اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر رؤف پاریکھ ہیں۔ ویسے تو یہ کتاب لغت نویسی کی تفہیم عام کرنے کی نیت سے مرتب کی گئی ہے مگر اس میں موجود مواد اردو کے طالب علموں کے لیے عموماً اور اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے خصوصاً دل چسپ ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ کیسی کیسی نادر و نایاب شخصیات اردو زبان و ادب کو میسر رہی ہیں جو اپنی ذات میں ادارہ تھیں اور انھوں نے ایسے کارنامے انجام دیے جو آج اداروں کے بس میں بھی نظر آتے۔ ان مضامین سے اردو کی ابتدائی لغات، فرہنگِ حامدیہ، فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور فرہنگِ نور سے لے کر ترقی اردو بورڈ (موجودہ اردو لغت بورڈ) کا لغت تک تمام اہم لغات کے حوالے سے مسائل و مباحث کو چھیڑا گیا ہے جن کی روشنی میں آئندہ کیا جانے والا کام یقیناً پہلے سے بہتر ہو سکتا ہے۔ پھر کئی الفاظ ان کے معنی اور تلفظ جن کے بارے میں ابہام پایا جاتا ہے، ان مضامین سے اُسے دور کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی سب سے اہم اور دل چسپ بات اس میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا کردار ہے۔ عموماً کتابوں کو ترتیب دینے میں مرتب کا کردار خاموش شراکت دار کا ہوتا ہے جو کسی موضوع پر میسر اہم اور بہترین مضامین کو یک جا کرنے کی ذمے داری اُٹھاتا ہے اور ابتدا میں اس کی غرض و غایت بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے لیکن اس کتاب میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا کردار متحرک شراکت دار کا ہے۔ انھوں نے پوری کتاب میں

جہاں جہاں وضاحت اور درستی کی ضرورت محسوس کی ہے، اُسے حواشی میں بیان کرتے رہے ہیں، اس طرح نہ صرف قاری کی معلومات میں دُگنا اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ مضامین پرانے ہونے کے باوجود ان حواشی کے سبب آج کے دور کے مضامین لگتے ہیں یعنی مرتب نے ان مضامین کو نہ صرف یہ کہ یک جا کرنے کی ذمے داری پوری کی ہے بلکہ انھیں update کرنے کا فریضہ بھی احسن طریقے سے انجام دیا ہے۔ گویا اس کتاب سے لغت نویسی کے ساتھ کتاب مرتب کرنے کی تفہیم بھی عام ہوتی ہے، مثلاً ''تاریخ و تعارف'' کے باب میں مسعود حسن رضوی ادیب جب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

مولانا آزاد مرحوم ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں:

> ''خالق باری'' جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے، کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔

تو ڈاکٹر رؤف پاریکھ اس کی درستی حواشی میں یوں کرتے ہیں کہ:

> آزاد کی یہ بات شیرانی کی تحقیق سے غلط ثابت ہوئی ہے، نیز اس زمانے میں اس طرح کے نصابات بالعموم دو سو اشعار تک محدود ہوتے تھے۔

اسی طرح ''اصول و مسائل'' کے باب میں سید قدرت نقوی لغت کار کے اوصاف میں لکھتے ہیں کہ:

> الف کی بہ لحاظ صوت اقسام کا جاننا بھی ضروری ہے۔ الف (ا) اصل ہے، الف ممدودہ (آ) دو الف کا مجموعہ ہے۔ اس لیے پہلے کی تعریف و استعمال درج لغت کرنے کے بعد الفاظ کی تختی الف ممدودہ (آ) یعنی دو الف (اا) سے کرنی چاہیے یعنی لغت کا پہلا لفظ ''آ'' ہو، اس کے بعد ''آب'' تا ''آیہ'' اس کے بعد ''اب'' سے سلسلہ قائم کیا جائے، ان باتوں کا علم ہو۔

تو ڈاکٹر رؤف پاریکھ یہاں مصنف سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> مصنف کی اس رائے سے ہم بہ صد احترام اختلاف کرتے ہیں۔ عام طور پر اردو کی لغات میں الف ممدودہ (آ) سے شروع ہونے والے الفاظ کا اندراج پہلے ہوتا ہے اور الف (ا) سے شروع ہونے والے الفاظ کا بعد میں۔ البتہ اردو لغت بورڈ کی لغت میں اس کے برعکس ہے اور یہ درست بھی ہے کیوں کہ جب الف ممدودہ (آ) کو دو الف (اا) کے برابر مان لیا تو گویا یہ مرکب حرف تہجی ہو گیا۔ لہٰذا جس طرح بھ کو مرکب حرف تہجی مان کر اس کی تختی ب کے بعد آتی ہے، اسی طرح الف ممدودہ (آ) کو بھی بعد میں اور الف (ا) کو پہلے آنا چاہیے۔

اسی طرح تنقیدی مباحث میں طاہر محسن کاکوروی کے مضمون میں ایک جگہ جب وہ لکھتے ہیں کہ:

> نور اللغات ــــ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ (عم۔ مثل)

تو ڈاکٹر صاحب حاشیے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہاں ''عم'' سے مراد ''عوام کی زبان'' ہے۔

غرض یہ کہ اس کتاب میں سیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود ہے اور اُمید ہے کہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ اور مقتدرہ قومی زبان آئندہ بھی ایسے اہم اور سنجیدہ موضوعات پر کتابیں منظرِ عام پر لاتے رہیں گے۔

صنفِ سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا (تحقیق و تنقید)، مصنف: ڈاکٹر سید تقام حسین جعفری، ضخامت: ۴۲۹ صفحات، قیمت: ۵۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت — آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: پروفیسر قیصر نجفی

اردو شعر و ادب کی بعض اصناف، جن پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا، صنفِ سلام ان میں سے ایک ہے۔ اگر دیکھا جائے تو مرثیہ اور سلام دونوں اصنافِ سخن ہم عمر بھی ہیں اور لازم و ملزوم بھی — اس کے باوصف اربابِ نقد و نظر نے سلام کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مرثیے کی خوش نصیبی کہ شبلی نعمانی جیسے فاضل نقاد کی نگاہِ انتخاب میر انیس پر ٹھہری اور انھوں نے جہاں قلم روئے سخن پر انیس کی حاکمیت کا اعلان کیا، وہاں مرثیے کے سر پر صنفِ سخن کا تاج بھی رکھ دیا۔ کتاب ''صنفِ سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا'' کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ڈاکٹر سید تقام حسین جعفری کی شکل میں سلام کو بھی ایک شبلی مل گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ شبلی صنفِ سلام پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کی تحریک دینے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تقام حسین کی اردو زبان و ادب سے وابستگی ایک استاد کے ساتھ ساتھ ایک مصنف کی حیثیت سے بھی تھی۔ ہمارے نزدیک کتاب ''صنفِ سلام اور اُس کا عہد بہ عہد ارتقا'' لکھ کر ڈاکٹر تقام حسین ایک ادبی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے سلام کی تحقیق و تنقید میں دقتِ نظر سے کام لیا ہے، بالخصوص سلام نگاروں کی تاریخی دور بندی اور ان کے نمونہ ہائے کلام کی فراہمی جیسے دشوار گزار مراحل طے کر کے ایک کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ کتاب مختلف عنوانات کے تحت آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، جن کے حواشی و حوالہ جات مصنف کی وسعتِ مطالعہ پر دلالت کرتے ہیں۔ ان ابواب میں سے ایک باب بہ عنوان ''الشعراء تلامیذ الرحمن''، تحقیق و تنقید کے یکسر ایک نئے رُخ کو سامنے لاتا ہے۔ قبل ازیں اساتذہ کی رہنمائی کے بغیر تخلیقی عمل کے مراحل سے گزرنے والے قلم کاروں کے لیے الگ سے باب قائم کرنے کی روایت نہیں ملتی۔ ڈاکٹر تقام حسین جعفری نے اس حوالے سے یقیناً ایک نئی جہت کی سمت نمائی کی ہے۔

ڈاکٹر تقام حسین چوں کہ اردو کے ایک استاد تھے، لہٰذا مجموعی طور پر ان کا اسلوبِ اظہار مدرّسانہ ہے۔ سلام کی تعریف، سلام کی خصوصیات، سلام کے موضوعات، سلام کے تاریخی پس منظر حتیٰ کہ اشعار کی تشریحات تک میں، ہر جگہ وہ بین السطور ناقد کے بجائے ایک مدرّس کا تاثر دیتے ہیں۔ البتہ نمونۂ کلام کی، ہر شعر کے حوالے سے تفہیم کا عمل مستحسن اور قابلِ ستائش ہے۔ خصوصاً مماثل شعر کا حوالہ دوآتشہ کا سرور ہوتا ہے۔

امرِ واقعی یہ ہے کہ "صنفِ سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا" کے تمام تر مشمولات میں ڈاکٹر قتدار حسین جعفری نے غیر ضروری تفصیلات کے اندراج سے گریز کیا ہے اور حتی الوسع مندرجات میں اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے ہر سلام نگار کا نمونے کے طور پر صرف ایک سلام منتخب کیا ہے۔

مختصر "صنفِ سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا" ایک ایسی تحقیقی کاوش ہے، جو کئی رخوں سے اس اہم اور بڑے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کی رہ نمائی کرے گی اور انھیں اس کام کو آگے بڑھانے کی تحریک دے گی۔

خواب، ہوا اور خوشبو (شاعری) /جمیل الرحمن/ضخامت: ۲۰۸صفحات، قیمت: ۳۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت — آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی/مبصر: **ابن عظیم فاطمی**

جمیل الرحمن کے مجموعے "خواب، ہوا اور خوشبو" کا انتساب اول اردو زبان کے جید عالم، عظیم ناقد، شاعر خوش نوا، بے مثال ادیب اور نابغہ روزگار شمس الرحمن فاروقی کے نام ہے جن کے تنقیدی افکار نے شاعر کے ادبی رویے کو ایک نئے اعتماد سے ہم کنار کیا جب کہ انتساب ثانی اپنی شریک حیات ماریہ رحمن کے نام ہے جس نے شاعر کے اندر موجود شاعر کو مرنے نہیں دیا۔

جمیل الرحمن نے اردو نظم کی عظیم روایت کو اپنے انفرادی تناظر میں سمجھا اور برتا ہے۔ دھیمے لب و لہجے کا یہ شاعر کہیں بھی بلند آہنگ نہیں ہوتا۔ اس مجموعے میں مختصر اور طویل ۱۲۰ نظمیں شامل ہیں جب کہ سات نثری نظمیں بھی ہیں۔ ہماری نئی نظم میں جدید زندگی اور اس سے وابستہ تمام تر تضادات کا سراغ ملتا ہے جیسے شاعر کا ردِعمل، تخلیقی تجربہ، طرزِ احساس وغیرہ، فکر کی مربوط نظامِ فکر کے اشارے کم کم ملتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا تخلیق کار کسی حد تک الجھ کر رہ گیا ہے۔ جمیل الرحمن کے ہاں انفرادیت کے ساتھ ساتھ متعین روحانی جدوجہد، واضح تخلیقی توانائی، فن کارانہ مہارت اور دانش ورانہ فکر کی تجلی بہت روشن ہے۔ مجموعے کا نام ہی فطرت کے وہ عظیم احسانات ہوا اور خوشبو سے کشید کیا ہوا جو ہر فطرت خواب سے ہم آواز و ہم آہنگ ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر مسلسل ہجرت کے مراحل سے گزرنے کے باوجود اپنے وطن کی مٹی، ہوا اور خوشبو سے فکری طور پر دور نہیں ہو سکا ہے۔ چناں چہ یہ نظمیں ایک جہان خواب سے بے وطن کی گئی نسل کی روداد سفر ہے۔ نظم "چوری" ایک مختصر سی نظم دیکھیے:

دھیان کی راہ گزار سے نکلوں
میں اب اوپر جاؤں
آسمان میں گھات لگاؤں
چوری کرلوں سبھی ستارے
شاپنگ بیگ جھلاتا آؤں!

ایک اور نظم "تم لب تو ہلاؤ" ملاحظہ کیجیے:

بہری ہے ساعت
یہاں لنگڑی ہے آواز
ٹھہرو مرے دمساز!
کس سمت سے آئے ہو
کدھر قصد سفر ہے
ساکن ہو کسی وحشت میں
یا شہر میں گھر ہے
کیوں آبلہ پا پھرتے ہو
یہ کیسا ہنر ہے
قیدی ہو کہ وحشی ہو کہ درویش ہو پیارے
تم کون ہو کچھ جینے کا احساس دلاؤ
اس چپ سے بھرے شہر میں تم لب تو ہلاؤ

یہ اور ایسی بہت سی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمیل الرحمن گو جسمانی طور پر وطن سے دور ہیں مگر دل وطن کی مٹی، وطن کی فضا اور آب و ہوا سے لمحے بھر کو بھی لاتعلق نہیں ہوتا۔ "تجاہل" کے عنوان سے یہ مختصر نظم:

جب آنگن میں بارش اتری
دیواروں پر پھول کھلے
برسوں بعد تجھے دیکھا تھا
جان بوجھ کر نہیں ملے!

جمیل الرحمن انتہائی سادگی کے ساتھ بڑی گہری باتیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ شاعری کی مختلف اصناف میں اب تک پانچ مجموعے تخلیق کر چکے ہیں۔ اپنی نظموں میں بھی غزل کا سا لطف پیدا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ نظم اور غزل کو یکساں اہمیت دینے والے شعرا میں کم کم ایسے ہیں جو نظم کی لفظیات کو ہیئت کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کر لیتے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمیل الرحمن کا یہ مجموعہ سنجیدہ ادبی حلقوں سے یقیناً پذیرائی حاصل کرے گا۔ عمدہ سرورق اور طباعت سے آراستہ یہ مجموعہ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

خالی ہاتھ (افسانہ)، مصنف: اے خیام، ضخامت: ۲۷۴ صفحات، قیمت: ۱۶۰ روپے، ناشر: میڈیا گرافکس، اے۔۷۷، ۹، سیکٹر ۱۱۔اے، نارتھ کراچی، مبصر: **ابنِ عظیم فاطمی**

کچھ لوگ میری طرح صرف بولتے ہیں اور کچھ لوگ ایک ایک لفظ کی حرمت کے ساتھ بولتے ہیں۔ ان ہی میں اے خیام شامل ہیں۔ میں ان کے یا ان کی کتاب کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوں کیوں کہ ان کے افسانوں کا معیارِ تحریر تو خود ان کا مستند حوالہ ہے۔ ان کے سچے اور کھرے فن کار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ پہلے پہل انھوں نے بھی اظہار کے لیے شاعری کا سہارا لیا، مگر جب اس بات کا اندازہ ہوا کہ اس میدان میں وہ کچھ جس طرح وہ کہنا چاہتے ہیں، نہیں کہہ سکتے تو انھوں نے فکشن کو اپنا ذریعہ اظہار منتخب کر لیا۔ یہ بات ۱۹۶۲ء کی ہے جب انھوں نے افسانہ لکھنے کا آغاز کیا اور ۳۱ سال کے بعد پہلا مجموعہ ''کپل وستو کا شہزادہ'' کے عنوان سے ۱۹۹۳ء میں منصۂ شہود پر آیا جس میں شامل افسانے اس زمانے کے مخصوص اثر کے ترجمان تھے۔ یہ ان کے مزاج کے perfectionist اور selective ہونے کی دلیل ہے۔ مگر یہ کوئی فارمولا بھی نہیں ہے کہ کم لکھنے والے ہی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بات اپنے اپنے مزاج اور انداز کی ہے۔ ان کے ہاں کہانی موجود ہوتی ہے۔ وہ کہانی جو برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیا بھر کے لیے غیر معمولی کشش رکھتی ہے۔ کہانی جو انسان کے جذبۂ تجسس کو بیدار کرتی ہے، اسے اُبھارتی ہے اور اس کے فطری جذبے کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ یہ سب کچھ انسان میں نامعلوم کو جاننے کی خواہش کا ہی کرشمہ ہے جو ماں کی گود سے لحد تک ساتھ ساتھ محوِ سفر رہتا ہے۔ اب ایک طویل عرصے یعنی بارہ سال کے وقفے سے دوسرا مجموعہ ''خالی ہاتھ'' کے عنوان سے لائے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ ''خالی ہاتھ'' میں جس پر وہ ایک معاشرتی کرب سفر کر رہا ہوتا ہے جو ان کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ اس کہانی میں معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں پر انھوں نے اپنا ہاتھ رکھا ہے۔ blessing in disguise کی ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ ''صدی کی آخری کہانی'' پہلی کہانی سے بالکل مختلف ہے اور اسی طرح یہ کہانی ایک الگ موضوع پر الگ ٹریٹمنٹ کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک نومولود بچے کے لیے دعا کا انداز ملاحظہ فرمایئے جو بڑی معنی آفرینی پیدا کرتا ہے: ''جو کچھ زندگی میں، میں نے دیکھا... خدایا! اسے وہ سب کچھ نہ دکھانا''

''نجات دہندہ'' محبتوں کی شدت سے بھرپور کہانی ہے جس کے اظہار کے لیے ایک لمبے عرصے کا انتظار کرنا پڑا، اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے محبوب یا اپنی بیوی کی نجات کا سامان مہیا کیا۔ ''بے زمین'' کی کہانی ایک فلسطینی مجاہدہ کی بے بسی کے گرد گردش کرتی ہے اور الفاظ کے اندر چھپی ہوئی دوسری کہانی بھی جو ساری دنیا کے آزادی پسند لوگوں کے المیے کو بیان کرتے ہوئے کیوں، کیا اور کیسے جیسے بہت سے سوالوں کو بھی جنم دیتی ہے۔ ''چہار درویش'' میں عراق کے پس منظر میں جنگ اور بے تیغی کے پس منظر میں ایک چڑیا اور اس کے دو بچوں اور گھونسلوں کے استعارے سے جس خوف ناک منظر کی عکاسی کی گئی ہے، اس منظر کے ہم میں سے اکثر لوگ چشم دید گواہ بھی ہیں اور چہار درویش کی طرح بے بس بھی۔

''نامراد'' میں گھر میں کام کرنے والی ایک جوان لڑکی کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کو بڑے نفسیاتی انداز میں افسانے کی شکل دی گئی ہے جس کے سحر میں قاری تا دیر گرفتار رہتا ہے۔ ''اٹھتے پیر کا مزار'' توہم پرستی،

کمزور عقائد اور قبر پرستی کے حوالے سے یہ کہانی برصغیر کے ہر علاقے کی کہانی ہے۔ اس جال سے نکلنا بہت ہی مشکل بلکہ اکثر اوقات ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسی مجاوری کو ہی ذریعہ معاش بنانا پڑتا ہے جس سے اس کہانی کا کردار حتی الامکان راہِ فرار کی خواہش اور کوشش کے باوجود ناکام رہتا ہے۔

''تجدید'' انسانی نفسیات کے حوالے سے ایک بھرپور کہانی ہے جو اختتام تک قاری کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔

''ہر فن مولا'' گزشتہ سالوں کے ایک مسئلے سے متعلق ہے جب شہر گولی، بارود اور بوری بند لاشوں کے حوالے سے دنیا بھر میں جانا جاتا تھا۔ حکومتی اہلکار اپنے کام دکھایا کرتے تھے اور متوازی غیر حکومتی اہل کار جنھیں وحشت گرد کہا جاتا تھا، اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ کسی کی جان، مال عزت آبرو محفوظ نہیں تھی۔ اس سارے منظر کو اپنے مخصوص انداز میں بہت آسان طریقے پر لکھا گیا ہے مگر درپردہ ان کا فن اور پس پردہ کہانی بھی اپنا سفر اچھوتے طریقے پر طے کرتی ہے۔

''انکشاف'' مغربی معاشرے کی آزادی کے حوالے سے بہت اچھی بُنت کے ساتھ لکھی گئی ہے جو ہر لمحہ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اور آخری چند سطور میں جو انکشاف ہوتا ہے، وہی اس کہانی کا حسن بھی ہے اور عنوان بھی۔ ''وارث لاوارث'' برصغیر میں نوابوں کی عمل داریوں اور غیر صحت مند معاشرتی بگاڑ کی کارروائیوں کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے۔ ''ایک بہت لمبی رات'' ہندوستان کے خاص پس منظر میں آدی باسیوں اور ہندو مسلم معاشرتی تناظر میں لکھی گئی ہے اور کہانی اپنے اختتام تک قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے آخری جملے میں اپنا مدعا بیان کرتی ہے تو وقت جیسے کچھ دیر کے لیے رُک جاتا ہے اور اس جملے کی شدت میں کھو جاتا ہے۔ ''بالکل اسی طرح ہو سکتا ہے.... رات بھر میں تم اتنا سا ایک تکیہ نہیں پھلانگ سکے تو اس نالے کو کیسے پھلانگو گے....''

''وائلڈ لائف'' مغرب کی طرف دیکھنے والوں اور مغربی ممالک کی شہریت اختیار کرنے کی کوششوں میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے والوں کے پس منظر میں انتہائی عبرت انگیز اور دردناک کہانی اسی روانی اور بیان کی اسی ندرت کے ساتھ لکھی گئی ہے جو اے خیام کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ ''انٹرنیشنل پارک'' میں بین الاقوامی طور پر ترقی پذیر ممالک کا کس طرح استحصال کیا جا رہا ہے، روزگار کی تنگ دو انسان کو کیا کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اشرف المخلوقات جانوروں کی بولیاں، ان کے انداز و اطوار بلکہ ان کا روپ دھارنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ چڑیا گھر کے انتظامات اور معاملات میں اندرونِ خانہ کیا کیا کچھ ہوتا ہے اس کی بھی بڑی خوب صورت تصویر کشی کی گئی ہے۔

''گنی پگ'' میں جو بہ ظاہر سائنس اور تحقیق سے متعلق ہے مگر اس میں باریک نکتہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک، ترقی یافتہ ممالک کے تجربہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اسے افسانے کی شکل دینا بڑا مہارت کا کام تھا۔

اے خیام کرداروں کے حوالے سے کافی کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنا کام زیادہ تر ''وہ'' سے نکال لیتے ہیں جو کہنے کو تو آسان ہے مگر واقعات کے بیان میں یقیناً دشواریاں بھی پیدا کرتا ہے۔ ان کے تمام افسانے ان کی مشکل پسندی، بھرپور واقعہ نگاری اور تاثرات بیانی کے آئینہ دار ہیں۔ میری رائے میں یہ مجموعہ

ادبی حلقے میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ تادیر اپنا اثر قائم رکھنے میں کامیاب رہے گا۔ یہ بات بھی اے خیام نے کتاب کے دیباچے کے طور پر "میرا ادبی نظریہ" نامی مضمون میں جو کچھ کہا ہے وہ در حقیقت ان کے اس مجموعے اور ان کی فکشن نگاری کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

اُن سے بات کریں (انٹرویوز) مرتب: علی حیدر ملک، ضخامت: ۲۵۲ صفحات، قیمت: ۳۰۰ روپے،
ناشر: میڈیا گرافکس، اے۔۵۵ فاریسٹ ۱۱، اے۔ ناظم آباد کراچی۔ مبصر: ابن عظیم فاطمی

ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے فکر انگیز مکالمات پر سنجیدہ توجہ کم ہی دی گئی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سی باتیں جو تحریر میں نہیں آ پاتیں، ان تک رسائی مکالمات کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ تحریر سے ذہن تک تو رسائی ہو جاتی ہے لیکن شخصیت تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ اکثر اچھے قارئین اپنے پسندیدہ ادیبوں شاعروں کی شخصیت کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے متعلق بھی کچھ سوال ان کے ذہن میں الجھتے رہتے ہیں جن کے جواب کے لیے وہ متجسس رہتے ہیں۔

بعض اہل دانش کے نام سے تو ہم واقف ہوتے ہیں لیکن ان کے کام تک رسائی آسان نہیں ہوتی، مکالمات کے ذریعے ایسی شخصیات کے کام، ان کی دانش اور ہنرمندی سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے انٹرویو لینے والے شخص میں بھی کچھ صفات کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے کہ:

> ... قارئین، سامعین اور ناظرین کے سامنے کسی شخصیت یا موضوع کے ایسے ابعاد لائے جائیں جو ان کی نظر سے اوجھل ہوں اور ان کی معلومات میں اضافہ اور ذہن کے افق کو روشن کریں... چناں چہ اعلیٰ پائے کے انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ شخصیت بلند مرتبہ، ذی علم اور اپنے شعبۂ فن کی ماہر ہو۔ اس کا مشاہدہ گہرا اور مطالعہ وسیع ہو اور جس موضوع یا مسئلے پر اس سے بات چیت کی جا رہی ہو اس کے ہمہ جہت اظہار پر اسے قدرت ہو۔ اسی طرح انٹرویو لینے والے کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ جس شخصیت کے ساتھ گفتگو کرے اس کے علمی، فکری اور فنی منظر اور پس منظر سے آشنا ہو، جس موضوع کو زیر بحث لائے اس کے مثبت اور متنازعہ زاویوں سے واقف ہو اور پھر سوال اس طرح اٹھائے کہ شخصیت کا باطن نکھر کر سامنے آ جائے، موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہے...

اس روشنی میں ہم علی حیدر ملک کے انٹرویوز کے مجموعے "ان سے بات کریں" کو دیکھتے ہیں کہ جن شخصیات سے انٹرویو لیے گئے ہیں وہ ادب کی معمولی یا عام شخصیات نہیں ہیں، یہ اردو ادب کے انتہائی مستند اور جید اساتذہ، مصنفین، اکابرین اور اہل دانش ہیں۔ اس کا فوری اندازہ کتاب کی فہرست میں موجود چالیس مشاہیر کے ناموں پر سرسری سی نظر ڈالنے سے بھی ہو جاتا ہے جن میں کرشن چندر سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک شامل ہیں۔

یہ چالیس شخصیات جن کے انٹرویو اس مجموعے میں شامل ہیں، اردو ادب کی بڑی بلکہ بہت بڑی اور اہم شخصیات ہیں۔ ان سے مکالمے میں یہ خدشہ بعید از قیاس نہیں تھا کہ انٹرویو لینے والا مرعوب ہو کر شاید ان کے ذہن تک رسائی نہ حاصل کر سکے اور وہ سب کچھ کہنے پر انھیں آمادہ نہ کر سکے جن تک قاری پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ انٹرویو لینے والا بھی صاحب نظر ہو اور اس شخصیت کے بارے میں بہت وقیع معلومات رکھتا ہو جس کا انٹرویو لیا جا رہا ہو۔ علی حیدر ملک میں یہ صفات موجود تھیں اور اسی لیے وہ ان شخصیات سے مرعوب ہوئے بغیر بے تکلفانہ گفتگو کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور انھیں کھل کر گفتگو کرنے پر آمادہ کر سکے ہیں۔

اردو زبان و ادب کے ان نام ور اہل دانش سے ایک ہی طرح کے سوال نہیں کیے گئے ہیں۔ ان سے ان کے متعلقہ شعبوں کے حوالے سے باتیں کی گئی ہیں اور ان کی شخصیت اور فن سے متعلق مختلف زاویوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے ادبی اور عصری مسائل کے حوالے سے بھی باتیں کی گئی ہیں اور بحثیں چھیڑی گئی ہیں۔ بعض شخصیتوں سے ان کو منسوب کچھ غلط فہمیوں کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے، جن کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جن ادبی اور عصری مسائل کے حوالے سے بحثیں چھیڑی گئی ہیں، وہ بے حد معلوماتی ہیں اور ذہن کو روشن کرتی ہیں، مثلاً ایک انٹرویو میں علی حیدر ملک 'اکیسویں صدی کے بارے میں اندازے، خدشات اور پوشیدہ امکانات' پر ڈاکٹر جمیل جالبی کو تفصیلی گفتگو پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ایک بڑا موضوع تھا جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت عالمانہ گفتگو کی ہے، اور سنجیدگی سے غور و فکر کرنے والوں کو نئی راہیں سجھائی ہیں۔

ان انٹرویوز میں علی حیدر ملک نے بعض ادبی تحریکات کو بھی موضوعِ گفتگو بنایا ہے اور ان ادبی تحریکات پر مختلف دانش وروں کی آرا سامنے آئی ہیں۔ علی حیدر ملک نے صرف مصنف کی شخصیت کو ہی مدنظر نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی بہت اہم تحریروں پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید کی بہت اہم کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے حوالے سے ایک خصوصی انٹرویو ڈاکٹر انور سدید سے لیا ہے اور خاص طور پر صرف اس کتاب کے حوالے سے ہی باتیں کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ایک اہم سوال یہ تھا کہ ان کے نزدیک اس کتاب کو لکھنے کا جواز کیا تھا؟ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں جو ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں شامل نہیں تھیں وہ اس گفتگو میں سامنے آئی ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔

انٹرویو کے لیے شخصیات کے انتخاب میں بھی علی حیدر ملک نے کسی تعصب سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ مختلف رجحان اور نظریہ رکھنے والی شخصیات سے گفتگو کی ہے اور ان کے خیالات کا پورا پورا احترام کیا ہے۔ انھوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ گفتگو کو ریکارڈ کیا اور قاری تک پہنچایا۔ ان شخصیات سے ایسی کوئی بات منسوب نہیں کی جو انھوں نے نہیں کہی۔ اپنے سوالات کے ذریعے علی حیدر ملک نے ان شخصیات کو اُکسایا ضرور، لیکن جھنجھلاہٹ کی فضا نہیں پیدا ہونے دی جو کبھی کبھی غیر متوازن سوال کرنے

کی صورت میں پیدا ہو جاتی ہے اور مرکزی شخصیت کی دل آزاری کا سبب بنتی ہے۔

ادب کے ساتھ ساتھ صحافت اور خصوصی طور پر ادبی صحافت سے بھی علی حیدر ملک کو ہمیشہ سے دل چسپی رہی ہے۔ افسانہ نگار، تنقید نگار اور ترجمہ نگار کی حیثیت تو مسلم ہے ہی، ادبی کالم نگاری بھی ان کا ایک پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اس کتاب ''ان سے بات کریں'' کے ذریعہ ادبی صحافت میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک مستقل جگہ بنالی ہے۔

نرک (ناول)، مصنفہ نسیم انجم، ضخامت ۲۲۳ صفحات، قیمت ۳۰۰ روپے، ناشر میڈیا گرافکس، اے۔ ۷۷۵، بلاک ۱۱۔ اے، نارتھ کراچی، مبصر ابن عظیم فاطمی

نسیم انجم کے افسانوں کے دو مجموعے اور دو ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے پہلے ناول ''کائنات'' کے مطالعے سے تو میں محروم رہا لیکن یہ دوسرا ناول ''نرک'' میں نے بڑی توجہ سے پڑھا بلکہ اس ناول نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کیے رکھی۔ اس توجہ کا اصل سبب اس کے موضوع کا نیا پن، گہرا مشاہدہ بلکہ ایک ریسرچ ورک اور بھر ٹریٹمنٹ ہے۔ افسانے اور ناول کے موضوعات اکثر انچھوتے نہیں ہوتے لیکن فن کار کا قلم اسے ایسا رنگ دیتا ہے کہ اس میں نیا پن محسوس ہوتا ہے۔ اب اگر موضوع واقعتا انچھوتا ہو اور اس نئے پن کو پورے فنی رچاؤ کے ساتھ بروئے کار لایا جائے تو قاری پر ایک حیرت انگیز اور خوش گوار تاثر قائم ہوتا ہے۔ نسیم انجم کے ناول ''نرک'' کا موضوع ایسا ہی ہے۔

ہیجڑے ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہیں اور دیکھا جائے تو یہ اس ہمدردی کے مستحق ہیں جس ہمدردی کے مستحق قدرتی طور پر اپاہج افراد ہوتے ہیں۔ قدرت نے انھیں نہ مرد بنایا ہے نہ عورت۔ یہ عجب کی محرومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ہر اعتبار سے معتوبی پن کا شکار ہیں لیکن پھر بھی محنت کرتے ہیں، ناچتے گاتے ہیں، خوشیاں بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی طرح اپنے پیٹ بھرنے کا سامان کرتے ہیں۔

ہیجڑوں کی بھی کئی اقسام ہیں۔ کچھ تو پیدائشی ہوتے ہیں اور کچھ بنائے جاتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو اس مقصد کے لیے اغوا بھی کیا جاتا ہے اور کچھ غلط صحبتوں میں پڑ کر اس ٹولی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہیجڑوں کے کئی سروکار ایسے ہیں جو بڑے پُر اسرار ہیں اور یہ اسرار منکشف نہیں ہو پاتے۔ نسیم انجم کے مدنظر یہ تمام باتیں تھیں، انھوں نے نہ صرف ان سے گفتگو کی بلکہ ان سے متعلق تحریروں کا بھی مطالعہ کیا۔ پرانی قدروں کے مسمار ہونے کے باعث اب ان ہیجڑوں کے اطوار میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ اب خوشیوں کے مواقع پر وہ رسائی حاصل نہیں کر پاتے اور بھیک مانگنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ چھندر کو کسی طور روٹی تو کمانا ہی ہے۔ وہ باعزت زندگی بسر کرنے کی کوئی سبیل بھی کریں تو انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لوگوں کا رویہ انھیں دوبارہ وہی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے حالات کی ایک صورت یہ بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی ان کی ٹولی سے نکلنے کی سعی کرے یا غداری پر آمادہ ہو تو وہ انتہائی خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ ہیجڑے کسی نہ کسی انداز میں نسیم انجم کے ذہن کے کسی گوشے میں سمائے رہے۔ انھوں نے ان کے کردار کو اپنے ذہن میں خوب رچایا بسایا، ان کے اطوار، ان کے رہن سہن، ان کے انداز گفتگو، چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق، ان کی زندگی کے مصنوعی پن، ان کی زندگی کے خلا کو پوری توجہ اور ہم دردی سے محسوس کیا۔ ان ہیجڑوں کی زندگی کے بہت سے سروکار ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے یا پھر اتنے غور وفکر کی ہم نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ''نرک'' میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں اور کسی کھردرے پن کے بغیر، محض حقیقت نگاری کے طور پر نہیں بلکہ فنی رچاؤ کے ساتھ۔

یہ سب کچھ یک طرفہ نہیں اور اس قوم کے لیے محض ہمدردی سمیٹنا مقصد نہیں بلکہ ان کی شقی القلبی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اپنی برادری میں اضافے کے لیے کچھ منفی طریقہ کار بھی وہ اپناتے ہیں، مثلاً چھوٹے بچوں کا اغوا، ان پر ظلم ڈھا کر اپنے طور طریقے مسلط کرنا اور نربان کرنا وغیرہ ایسی مثالیں ہیں جن سے ناول نگار کا غیر جانب دارانہ رویہ سامنے آتا ہے۔

ناول کا کینوس افسانے کے مقابلے میں خاصا وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے صرف ایک نکتے تک محدود رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ ایسا شجر ہے جس میں شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں اور ہر شاخ کے ساتھ انصاف کرنا ہوتا ہے۔ ''نرک'' میں اور بھی کردار ہیں اور بہت سے دیگر مسائل بھی سر ابھارتے ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ سر اٹھاتا ہے تو انسان غلط روپ اختیار کر لیتا ہے۔ والدین کی سرزنش یا سخت گیری بھی اولاد کو غلط راہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ ماں کی ممتا بھی دل گرفتہ کرتی ہے اور کچھ دوستوں کا ہرجائی پن اور کچھ دوستوں کا ہم دردانہ رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ باپ کے سخت رویے کا خمیازہ بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کا پچھتاوا بھی۔ پھر ایک باپ ایسا بھی ہے جو اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی بیٹی کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میری مندرجہ بالا رائے ناول ''نرک'' کے متن کے تناظر میں ہے، کرداروں کو فرداً فرداً زیر بحث نہیں لایا گیا۔ لیکن دانش اور ثانیہ کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ دانش اور ثانیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ثانیہ ایک بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ دانش بے روزگاری اور باپ کے سخت رویے سے تنگ آ کر ہیجڑوں کے ساتھ رہنے لگتا ہے اور بہت حد تک اسی زندگی پر قانع ہے۔ لیکن ثانیہ سے پھر ملاقات ہوتی ہے اور وہ اسے دوبارہ زندگی کی طرف کھینچ لاتی ہے اور اس میں جینے کی اُمنگ پیدا کرتی ہے۔ ثانیہ کا باپ دانش کے معاملات سے واقف ہے اور وہ دونوں کی شادی کر کے ملک سے باہر بھیج دیتا ہے۔ یہ معاملہ خاصا غیر منطقی اور غیر فطری ہے۔ کوئی بھی باپ، خواہ کتنا ہی کشادہ دل کیوں نہ ہو اور اپنی بیٹی سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتا ہو، دانش کے حالات سے واقف ہونے کے بعد اس حسنِ سلوک کا متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ثانیہ ایسے شخص کے حصول میں کوئی دل چسپی رکھ سکتی ہے۔

ناول میں کچھ اور بھی واقعاتی غلطیاں راہ پا گئی ہیں لیکن ان سے ناول کی بنیاد متاثر نہیں ہوتی۔ سب کچھ انتہائی مربوط ہے۔ نسیم انجم نے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو اچھوتا بھی ہے اور ذرا سا نازک بھی۔

انھوں نے ان نزاکتوں کو محسوس کیا ہے اور بڑی چابک دستی سے نبھایا ہے۔ اکثر چیزیں واضح ہیں اور کچھ غیر واضح لیکن جو غیر واضح ہیں، وہ زیریں سطح پر موجود ہیں اور انھیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نسیم انجم کو یہ ناول ''نرک'' اپنے موضوع کے اچھوتے پن، اور مشاہدے کی گہرائی اور وسعت کے سبب ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اضطراب (شاعری)، نسیم آرا، ضخامت: ۲۰۵ صفحات، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر: اشارات جبلی کمشنر، اردو بازار، کراچی، مبصر: **سلمان صدیقی**

شعور و آگہی سے جو اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ اظہار کا راستہ تلاش کرتا ہے اور فرد اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق اظہار کے راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ اس ضمن میں قلم و قرطاس کا استعمال اندر کی اس گھٹن اور اضطراب سے نمٹنے کا سب سے مہذب ذریعہ ہے اور شعری اظہار اس کا ایک مرغوب وسیلہ۔ معاشرے کا ایک تہذیب یافتہ فرد اسی طرح اپنی ذات کا کیتھارسس کرتا ہے۔ گزشتہ عشروں میں شعری اظہار میں بہت سے تجربات کیے گئے۔ یہ تجربات خیال کی سطح پر بھی ہوئے اور اصناف کی سطح پر بھی۔ کچھ رد ہوئے اور کچھ کی پذیرائی کی گئی۔ مگر ان تجربات کے نتیجے میں ایک بات بہت کھل کر سامنے آگئی اور وہ یہ کہ اردو شاعری میں غزل کی شعری روایت کو جو ہماری ادبی سماجیات میں تمکنت کا درجہ اختیار کر گئی ہے، کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خلاق ذہن اپنے تخلیقی اظہار کے لیے کسی صنف سخن کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی فطری افتاد طبع اور کسی صنف سخن کی طرف اس کا جھکاؤ، اس کے اظہار کو سیال مائع کی طرح اس صنف کے برتن میں ڈھال دیتا ہے۔ نسیم آرا کے شعری مجموعے ''اضطراب'' میں شامل کلام غزل کی اسی زندہ و جاوید شعری روایت سے جڑا ہوا ہے جو ہر ذہنی سطح کے قاری کے ذوق شعری کو تسکین دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی اسی مترنم بیانیے میں گندھی نظر آتی ہیں جو اگرچہ اب متروک ہوتا جا رہا ہے مگر جس میں بڑی شاعری کی گنجائش آج بھی موجود ہے۔ شعری مجموعے ''اضطراب'' کی شاعری، اظہار کا فطری وصف رکھنے والے ایسے قلم کار کے جذبات و احساسات کا بے ساختہ بیانیہ ہے، جس میں اس نے اپنے مشاہدے، علم اور آگہی کے مطابق کچھ سوالات پوچھنے اور کچھ انکشافات کرنے کی جسارت کی ہے اور ان سوالات و انکشافات کا دائرہ زندگی کی کسی ایک جہت تک محدود نہیں ہے۔ ان میں داخلی حسی تجربات بھی ہیں اور اپنے گرد و پیش کے معاملات میں مذہب سے دل بستگی بھی ہے اور ملکی معاملات پر دل گرفتگی بھی۔ مگر ان شعری بیانیوں میں جہاں جہاں انھوں نے انسانی رشتوں سے تعلق کو ان کی شکست و ریخت کے تناظر میں، غم جاناں اور غم دوراں میں آمیز کر کے اپنی موزوئی طبع کے ذریعے portray کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں وہاں وہ اظہار کی تازگی اور اپنی بے ساختہ بیانی سے قاری کو لطیف جذبوں اور سچے محسوسات کی دنیا کی سیر کراتی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری کا جوہر ان کی سہل ممتنع میں کی گئی شاعری میں پنہاں ہے، جہاں سادہ بیانیے میں وہ ایک گہری رمزیت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پیچیدہ استعاراتی نظام اور نامانوس علامتوں سے گریز کا واضح رویہ ان کی سادہ طبیعت، نرم مزاجی اور غیر مبہم طرز اظہار

پریشانی کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ خوشی میں بھی غم کے احساس کو خود سے جدا نہیں کر پاتیں، اشعار دیکھیے:

جب خوشی آس پاس ہوتی ہے
کیوں طبیعت اداس ہوتی ہے
دل کے زخموں کو چھیڑ جاتی ہے
وہ عنایت جو خاص ہوتی ہے

نسیم آرا کے ہاں اظہارِ غم دراصل علامت ہے ایک پوری زندگی پر محیط احساسات اور مشاہدات کے انعکاس کی جو نہ صرف ہمارے باطن کی دنیا کو زیر و زبر کرتے ہیں بلکہ ہمارے ظاہری وجود کو بھی متاثر کرتے ہیں، اشعار دیکھیے:

اک غزل میں بیان ہو جائے
میرا غم اتنا مختصر بھی نہیں
دل میں اک درد مستقل ہے نسیمؔ
اور چہرے پہ کچھ اثر بھی نہیں

میں نہیں جانتا کہ نسیم آرا صرف خاتونِ خانہ ہیں یا عملی زندگی میں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہیں مگر ان کے ایک مطلع سے میں یہ ضرور جان گیا ہوں کہ وہ عملی زندگی کے اُن اسرار و رموز اور بدلتے تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہیں جو سفرِ حیات میں ہمیں پیش آتے ہیں۔ اس تناظر میں ان کا یہ سادہ مگر گہری رمزیت کا حامل مطلع دیکھیے:

کتنے سانچوں میں روز ڈھلتے ہیں
ہم زمانے کے ساتھ چلتے ہیں

دل و نظر کے معاملات کا اظہار ذاتی تجربے کے ضمن میں ہو یا مشاہدے کے ضمن میں، شاعری میں ایک لازمی وظیفے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی وہ تجربہ ہے جس سے گزر کر شاعر پر فنی اور فکری تربیت کے دروازے کھلتے ہیں۔ ان معاملات کے لطیف اور بے ساختہ بیانیوں ہی سے شاعر کی تخلیقی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ نسیم آرا نے جہاں جہاں ان درد آمیز احساسات کو شعر کی زبان دی ہے، وہاں وہاں شعری لطافت اپنا تاثر قائم کرتی ہے، شعر ہیں:

جذبۂ دل میں کچھ تو ایسا تھا
جانے والے نے مڑ کے دیکھا تھا
ہم نہ پہنچے تو کس کو دیں الزام
اپنے پیروں میں دم ہی اتنا تھا

اس تسلسل میں نسیم آرا کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کر لیجیے جن میں درد کی وہی بے نام لہر، بیان کی سادگی اور

بے ساختگی میں آمیز ہو کر غزل کی اسی روایتی لطافت کا مزہ دیتی ہے جو اردو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ اشعار ہیں

آج شہرِ مراد دیکھا ہے
اک زمانے کے بعد دیکھا ہے
اپنی محرومیِ تمنا پر
ہم نے کس کس کو شاد دیکھا ہے

نسیم آرا کے کلام میں پابند نظمیں بھی شامل ہیں اور قطعات بھی۔ ان نظموں اور قطعات کو اگر تجزیاتی نظر سے دیکھا جائے تو بادی النظر میں یہ ایک انتہائی حساس اور کسی حد تک رنجور شاعرہ کے ایسے بیانیے معلوم ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے جذبات، احساسات، توقعات اور گزرے وقت کی ہر یادداشت کو اپنے شعری اظہار میں ڈھال کر ایک منظوم دستاویز کی شکل دیتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں ''غم کی رات''، ''ایک رات''، ''ایسے حالات میں''، ''تمھاری وہ بات''، ''وہی یادوں کا دھواں'' اور ''وہ دن جب'' اس کی مثال ہیں۔

شاعری اظہاریہ تو ہے ہی مگر اس کی حیثیت ایک ایسی دستاویز کی بھی ہے جو شاعر کے ذاتی تجربات، حالات، فکر اور اس کے زمانے کی تہذیبی سرگرمیوں کا ریکارڈ رکھتی ہے۔ نسیم آرا نے محسوسات اور جذبات کو اور اپنے مشاہدے میں آنے والے سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ''اضطراب'' میں قلم بند کر کے پرسکون ہونے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک باشعور اور معاملہ شناس خاتون ہیں۔ انھیں اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی بھی نہیں ہے۔ انھوں نے ''عرضِ واقعی'' کے عنوان سے اپنے مختصر بیانیے کی ابتدا اس جملے سے کی ہے۔ ''میری شاعری علم و ادب میں کوئی اضافہ نہیں بلکہ میرے محسوسات کی ترجمانی ہے۔'' یہ جملہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور منکسر المزاجی کا عکاس ہے۔ اس جملے نے نسیم آرا کی اس کتاب کی وقعت میں اضافہ اور ان کی محنت کو باحیثیت بنا دیا ہے۔ اپنے احساسات کا تحریری اظہار بہ قلم خود بڑا کام ہے۔ تحریری سطح پر ایک مشقت کی ادائیگی کے لیے اور زبان کے تخلیقی اور تحریری سرمایے میں اضافے کے لیے بہت کم لوگ یہ ہمت کر پاتے ہیں اور بہت کم لوگ قلم و قرطاس سے جڑ کر یہ مشقت جھیل پاتے ہیں۔ نسیم آرا یہ ہمت کرنے اور اس مشقت کو جھیلنے پر مبارک باد کی مستحق ہیں۔

عکسِ خیال (افسانے)، سرفراز حسین صدیقی، ضخامت ۲۱۷ صفحات، قیمت ۳۵۰ روپے، ناشر: اشارات پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی، مبصر: **سلمان صدیقی**

افسانہ نگاری کا راست تعلق فن سے ہے۔ اس کا ماجرا واقعاتی بُنت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے لیکن اگر اسے تاثر، تحیر اور تجسس کی رنگ آمیزی سے آراستہ کر کے آگے نہ بڑھایا جائے تو یہ ایک بے روح بیانیے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دوسری طرف اس فن کا تعلق اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے مسائل کی نشان دہی سے بھی بہت گہرا ہے اور اس ضمن میں موضوعات اور مسائل کا چناؤ افسانہ لکھنے والے کے سماجی اور معاشرتی شعور کی

گہرائی، مشاہدے اور زندگی کے تجربے سے مشروط ہے، اس میں فنی اہلیت اگرچہ کم یا زیادہ ہو سکتی ہے لیکن ادبی پیش کش کا معیار اور تخلیقی ذہن کا درجہ کمال لکھنے والے کے طرزِ اظہار اور خلاقانہ وصف ہی سے پہچانا جائے گا۔ کسی نے درست کہا، ''ادب پارے کو پہلے ادب پارہ اور پھر کچھ اور ہونا چاہیے یعنی اس کی سماجی افادیت اور مقصد کے حصول کی اہمیت۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاری تک بات پہنچانا اگر سماجی افادیت اور مقصد کے حصول کی اہمیت تک محدود ہے تو اس کے لیے خبر، تبصرہ، کالم، مضمون یا واقعے کا من وعن تحریری بیان کافی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ادبی پیش کش میں تخلیق کاری کی پوری شدت نہ بھی ہو تو بھی فنی رچاؤ کا احساس بین السطور سرایت کرتا ضرور محسوس ہونا چاہیے۔

سرفراز حسین صدیقی کے مجموعے ''عکسِ خیال'' کی کہانیوں میں تاریخی منظر نگاری، فکری وسیع النظری، سماجی افادیت، بیانیے کی بے مثل روانی، مشاہدے کی باریکی اور اُس فنی رچاؤ کی موجودگی نے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، ایسے بیانیوں کو جنم دیا ہے جن کی ہر کہانی میں کئی افسانے موجود ہیں۔ ان کہانیوں میں نہ صرف سماجی اور معاشرتی حقیقت نگاری کا رنگ ہے بلکہ ہمیں ان کہانیوں میں وطن پرستی اور انسان دوستی کے جذبات بھی موجزن نظر آتے ہیں۔ ''پاکستان تحفۂ خداوندی'' کے عنوان سے کتاب میں شامل تحریر ہمارے وطن پاکستان کے آزادی کے دن سے آج تک پیش آنے والے حالات واقعات اور صدمات کا تجزیاتی بیانیہ ہے جسے ہم کہانی اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم اور ایک ملک کے سود و زیاں کی داستان ہے، اس میں سوچنے والے ذہنوں کے لیے نصیحت اور عبرت کا درس بھی موجود ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہانی مزید دلچسپ اور قابلِ توجہ ہوتی جارہی ہے۔

سرفراز حسین صدیقی نے جس دردمندی اور صداقت کے ساتھ حقائق رقم کیے ہیں، ان سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ دراصل وطنِ عزیز کا نوحہ ہے جس کے ہر لفظ سے وطن پرستی کی خوش بو پھوٹ رہی ہے۔ افسانہ ''نازکی اس کے لب کی'' قبل از تقسیم ہند کے سماجی اور سیاسی منظر نامے میں گندھی ایک love story کی تفصیل ہے جس کے پس منظر میں انگریز سامراج کی سازشی ذہنیت کا پردہ بڑی ہنرمندی سے چاک کیا گیا ہے۔ افسانے ''رنگِ وفا'' میں بیوی کی حیثیت سے عورت کے ایثار اور قربانی کے ذکر کے ساتھ ذہنی بیماری کے حوالے سے دماغ کے مختلف حصوں کی ساخت اور افعال کا بیانیہ سرفراز صاحب کی ہمہ جہت علمیت کا ثبوت ہے۔ ''عکسِ خیال'' کی اصلاحی کہانیاں اگرچہ اپنے دامن میں کئی افسانوں کو ساتھ لے کر چلتی ہیں مگر میری نظر کتاب میں شامل ایک مکمل افسانے پر خاص طور سے ٹھہری۔ ایک ایسا افسانہ جو عصرِ حاضر میں افسانے کی متعین کردہ اس تعریف پر پورا اترتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ افسانہ پورا معاملہ نہیں ہے بلکہ معاملے کا صرف ایک رُخ یا جہت ہے اور یہ کہ اسے ایک محدود طوالت میں پیش کیا جائے۔ جس افسانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کا متن، اس کا موضوع، اس کی تہذیبی اہمیت اور اس کا خوب صورت اختصار سرفراز حسین صدیقی کے ''عکسِ خیال'' کا بنیادی حسن ہے۔ یہ افسانہ ہے ''نانی اماں۔'' اس افسانے

میں مشرقی تہذیب کے ایک رُخ کی خوب صورت عکس بندی بھی ہے اور قابلِ تقلید روایات کی طرف مراجعت کا درس بھی۔ دوسری طرف یہ افسانہ نیک روحوں کی باطن کی آنکھ سے عالمِ بالا کی نورانی وسعتوں تک رسائی کا اشاریہ بھی ہے۔

"عکسِ خیال" کی کہانیوں میں سرفراز حسین صدیقی نے اپنے وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کی بنیاد پر جو معلومات افزا تفصیلات اور تاریخی حوالے شامل کیے ہیں، ان کی وجہ سے ان کہانیوں کو تحقیقی مقالوں کی سی اہمیت حاصل ہوگئی مگر سرفراز صاحب کی کہانیوں میں صرف علمیت اور دانش ہی نہیں ہے، ان کی کہانیوں میں جگہ جگہ دل کے تاروں کو چھو لینے والے ایسے حساس بیانیے بھی ہیں جنھیں پڑھ کر کسی بھی رقیق القلب کی آنکھوں میں نمی آسکتی ہے اور ان کہانیوں میں انسانی رشتوں کی حرمت اور پاس داری پر یقین رکھنے والوں کے بے لوث عملی اقدامات پر تعریف و توصیف کے تمام الفاظ کم تر لگتے ہیں۔ ایسے ہی کرداروں سے متعارف کراتی ان کی کہانی جس کا عنوان ہے "یہ میری زندگی ہے" مغربی سماج کے سب سے سنگین اور تکلیف دہ انسانی مسئلے کی طرف بڑے درد بھرے انداز میں اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی سماج کی بچی کھچی تہذیب پر فخر کا اظہار بھی کرتی ہے۔

سرفراز حسین صدیقی کی یہ کہانیاں سماجی حقیقت نگاری سے مزین ایسے شہ پارے ہیں جن کے پس پشت ان کا وہ تخلیقی ذہن ہے جو بہت کچھ جانتا ہے، ان کے مشاہدے میں بہت سے حقائق بہت سی زیادتیاں، محرومیاں اور استحصال جمع ہیں جنھیں وہ لوگوں سے share کرنا چاہتے ہیں، وہ بتانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کو کس طرح محسوس کیا اور کس کس زاویے سے دیکھا ہے۔ انھیں یہ بتانے کی خواہش بھی ہے کہ وہ چیزوں کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہ گھریلو مادیات سے لے کر ملکی سیاسیات تک جو معاملات درست نہیں ہیں، وہ کیسے درست ہوسکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم شدت پسند مزاج رکھنے والے مشرقی لوگ ہیں، ہم تیز مصالحوں والے کھانے، تیز خوشبوئیں اور تیز لہجے میں گفتگو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے نتائج کے حصول کی خواہش رکھنے والے لوگ ہیں مگر اس خواہش کے باوجود ہماری اجتماعی زندگی میں تبدیلی کا تناسب نہایت سست اور برائے نام ہے، نہ تو اخلاقی اور سماجی ڈھانچا بدلتا ہے اور نہ معاشرے میں استحصال کے ہتھکنڈے، ہاں نسلیں بدل جاتی ہیں اور یہ نسلیں سوچتی ہیں، تبدیلی کے بارے میں زندگی کی ہر سطح پر اور تبدیلی کی اسی خواہش کا عکس سرفراز حسین صدیقی کے "عکسِ خیال" کا بنیادی جوہر ہے۔ تبدیلی کی اس خواہش کے نتیجے میں تخلیق کار کے اندر اظہار کا اتنا شدید دباؤ ہے کہ وہ کسی موضوع کو چھیڑ کر اس پر اپنا پورا بیان قلم بند کرنا چاہتا ہے۔ معاشرے کے ہر زاویے اور ہر رُخ کی شمولیت کے ساتھ — اور کسی لکھنے والے کا یہی temprament تخلیق کار کو طویل بیانیے کی صنف ناول کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ سرفراز حسین صدیقی کی بیانیے پر گرفت اور جزئیات نگاری پر دسترس واقعے کی ڈرامائی تشکیل پر قدرت اور زمانوں کو جوڑ کر موضوع کو داستانی وسعت دینے کا وصف ان میں ایک ناول نگار کی صلاحیت کا پتا دیتا ہے اور ادب کے دامن

میں اچھے ناول ابھی خال خال ہیں۔ وضاحتی بیانیے کی اس صنف کو ابھی بہت سے زرخیز ذہن اور استقامت بھری انگلیاں درکار ہیں۔ میں سرفراز حسین صدیقی کے زرخیز قلم سے ایک بہت متاثر کن اور فکر انگیز ناول کے منظر عام پر آنے کی امید رکھتا ہوں۔

بجھتے سورج نے کہا (شاعری)، شاعر صدیقی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، قیمت ۳۰۰ روپے، ناشر: بزم رنگ ادب، تقسیم کار، ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی، مبصر: **شاعر علی شاعر**

جب سورج ڈوبنے لگا تو شب گزیدہ افراد کے چہروں پر پژمردگی چھا گئی اور ان کی آنکھوں کے سامنے خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔ ایسے شب گزیدہ افراد نے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہر صبح مشرق سے طلوع ہونے والے اجالوں کے پیمبر سے سوال کیا:

بعد تیرے کون ہے صبح کا پیغامبر

یہ سنتے ہی بجھتے سورج نے شب گزیدہ افراد کو دلاسا دیتے ہوئے برجستہ کہا:

ایک مٹی کا دیا

انسان بھی ایک مٹی کا دیا ہے، روشنی کا پیغامبر ہے، پیار کا سفیر ہے، اس نے اپنے ذہنی افکار سے کیسے کیسے کام لے کر روشنی کو اپنی دسترس میں کر لیا ہے، اس کے اس فکر و فن و تدبر کی بدولت روشنی کا معیار اور مقدار دونوں انسان کے قبضے میں ہے۔

بعد تیرے کون ہے صبح کا پیغامبر
بجھتے سورج نے کہا ، ایک مٹی کا دیا

''بجھتے سورج نے کہا'' سینئر سخن ور جناب شاعر صدیقی کا دوسرا مجموعۂ غزل ہے۔ اس سے پہلے ''آنکھوں میں سمندر'' آپ کا پہلا شعری مجموعہ تھا جسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ''بجھتے سورج نے کہا'' میں آپ کی غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔

شاعر صدیقی کی شاعری کو پڑھنے کے بعد متاثر ہو کر جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی نے لکھا تھا:
''ان کی شاعری جان دار اور پُر اثر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوجوان طبقے میں ان کی پذیرائی بتدریج بڑھ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقت میں وہ ایک باوقار اور ہر دل عزیز شاعر کے طور پر اپنے آپ کو منوانے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔''

جناب ڈاکٹر حنیف فوق نے لکھا ہے: ''شاعر صدیقی ایسے شاعر ہیں جو زندگی کے درد کا احساس بھی رکھتے ہیں اور زندگی کے حسن کو بھی پہچانتے ہیں۔ پھر ان کی شاعری میں ایسی غنائیت آ گئی ہے جو سادہ لفظوں میں بھی اپنی نغمہ آفرینی کا جادو جگاتی ہے۔''

جناب افتخار عارف نے لکھا ہے: ''دھیمے اور میٹھے لہجے میں دل کی بات کرنے والے اس نغمہ نگار کو

بہت سے مقبول اور دل میں گھر کر جانے والے نغمے تخلیق کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ موسیقی کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں آہنگ کے بہت جاذب توجہ مثالیے نظر آتے ہیں۔ ان کا مجموعہ ایک دردمند شاعر کے تخلیقی وجود کا بہت خوب صورت اظہار ہے۔ اسلوب و بیان کی سادگی، آہنگ کی دل آویزی اور تجربے کی سچائی نے ان کی شاعری میں اعلیٰ معیار کی ایک سطح قائم کر دی ہے جو قابل ستائش ہے اور قابل رشک بھی۔"

خواجہ ریاض الدین عطش نے گواہی دی تھی، "میں سمجھتا کہ شاعر صدیقی کی شاعری اپنے تجربوں کو اوزان اور ارکان کی پابندی کے ساتھ موزوں لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کا سلیقہ رکھتی ہے اور غزل کی روایت کے شعور کو برقرار رکھنا جانتی ہے جو بدلتی ہوئی زندگی کے نئے احساس اپنی فکر میں شامل کر کے غزل کے جدید رنگ کو روایت کا حصہ بنا دیتی ہے۔"

ان تمام آرا کی روشنی میں اگر شاعر صدیقی اور ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں فخر کرنا چاہیے کہ ایک عظیم، مستند اور قابل احترام سخن ور ہمارے درمیان موجود ہیں جن کی تخلیقات ادبی دستاویزات کی مثل ہیں اور جن کے مجموعہ ہائے کلام ادب کا سرمایہ ہیں۔

سنہری کہانیاں (تراجم)، مترجم: ابوالفرح ہمایوں، ضخامت: ۲۵۶ صفحات، قیمت: ۳۵۰ روپے، ناشر: بزم مزاح، کراچی، مبصر: **شاعر علی شاعر**

شارٹ اسٹوری کے ترجمے کی ابتدا برصغیر پاک و ہند کے معروف افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم نے ۱۹۰۰ء میں کی۔ روسی اور فرانسیسی زبانوں کے افسانوں کو انگریز افسانہ نگاروں نے انگریزی زبان کا لبادہ پہنایا اور پھر انگریزی میں ترجمہ کی گئی شارٹ اسٹوری کو افسانے کے نام سے اردوایا گیا۔ اس طرح ترجمے کی مدد سے اقوام عالم کی مختلف تہذیب و ثقافت اور تمدن سے آگاہی حاصل ہونے لگی۔ معلومات کا ایک بیش بہا سرمایہ ترجمے کی صورت اردو ادب کے دامن میں سمٹ آیا۔ ترجمہ نگاری کی افادیت کے پیش نظر مترجمین کی تعداد میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ ترجمہ نگاری میں معیار کا خیال بھی رکھا گیا۔ متعدد مترجمین نے ترجمہ نگاری کا کام نہایت دیانت داری، خوش اسلوبی اور دل جمعی سے کیا۔ جس کی وجہ سے یہ کام افسانے کے تراجم تک محدود نہ رہا بلکہ دیگر اصناف نظم و نثر تک وسعت اختیار کر گیا۔ ناول، سانیٹ اور ہائیکو اسی ترجمہ نگاری کے مرہون منت ہیں۔

اگر ہم آج کے دور پر نظر ڈالیں اور ترجمہ نگاری کے کام کا جائزہ لیں تو ہمیں بے شمار قابل ذکر مترجمین کے نام نظر آتے ہیں جن میں اسد محمد خاں، محمد عمر میمن، شاہد حمید، محمد سلیم الرحمٰن، اجمل کمال، آصف فرخی، مبین مرزا، آفتاب اقبال شمیم، احمد عقیل روبی، افضال احمد سید، انوار فطرت، انور زاہدی، تنویر انجم، توصیف تبسم، ثروت محی الدین، حارث خلیق، سرور کامران، امجد پرویز، شاہدہ حسن، شاہین مفتی، شبنم شکیل، عبدالرشید، علی محمد فرشی، فاطمہ حسن، فہمیدہ ریاض، محمد حمید شاہد، محمد منشا یاد، مشیر انور، ناہید قاسمی، نجیبہ عارف، نذیر قیصر، نصیر احمد ناصر،

یاسر جواد، یاسمین حمید، احمد منیر صدیقی اور ابوالفرح ہمایوں شامل ہیں۔

ابوالفرح ہمایوں کی ترجمہ نگاری کے نمونے ہمیں مختلف ادبی رسائل، مؤقر جرائد اور تواتر سے شائع ہونے والے کتابی سلسلوں میں ملتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''سنہری کہانیاں'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں عالمی ادب کی لاجواب کہانیوں کے تراجم شامل کیے گئے ہیں اور مترجم کا کہنا ہے کہ ان ترجمہ شدہ افسانوں سے ۹ سے ۹۰ سال تک کے بچے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب میں انگریزی، بنگلہ، پنجابی، ہندی، فارسی، جرمن، چینی، ہسپانوی، ترک، اطالوی اور فرانسیسی زبان و ادب کے ترجمے شامل ہیں اور دو طبع زاد کہانیاں بھی۔ اتنی زبانوں سے اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے فن سے جناب ابوالفرح ہمایوں کی قابلیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

ترجمے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پڑھتے وقت قاری کو اس تحریر کے ترجمہ کیے جانے کا گمان نہ گزرے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ترجمہ نگار دونوں زبانوں سے بہ خوبی واقف ہو۔ ابوالفرح ہمایوں کے تراجم میں شامل اکثر کہانیوں میں یہ وصف نظر آتا ہے کہ پڑھتے وقت ان پر ترجمہ شدہ ہونے کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ یہ کاوش کسی بھی ترجمہ نگار کو کامیاب ثابت کرتی ہے۔

ابنِ آدم کی مسیحائی (افسانہ)، جمشید اقبال، ضخامت: ۱۲۸ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: بیس پبلی کیشنز، بہاول پور، مبصر: ذیشان اطہر

شاعروں کو نثر نگاروں پر ایک فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے مجموعۂ کلام کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے ہی مشاعروں، ادبی رسائل اور شعری انتخاب کی اشاعتوں کے ذریعے ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے ہوتے ہیں، جب کہ اس کے برعکس نثر نگار عموماً اپنی کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے کم کم ہی موضوعِ گفتگو بنتا ہے۔ کم و بیش یہی صورتِ حال جمشید اقبال کو بھی درپیش ہے۔

جمشید اقبال جو بطور شاعر اپنی پہچان بہت پہلے کرا چکے تھے، اب اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''ابنِ آدم کی مسیحائی'' کی اشاعت کے بعد ایک ایسے خلاق افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں جن کا مشاہدہ تیز، مطالعہ وسیع، ذخیرۂ الفاظ کمال اور موضوعات حقیقی اور عہدِ حاضر کی زندگی سے متعلق ہیں۔ اُن کی اپنے موضوع پر گرفت بے مثال ہوتی ہے۔

اس کتاب کا انتساب اُن دو ہستیوں کے نام کیا گیا ہے جنھوں نے مصنف کے تعلیمی مراحل میں معاونت کر کے انھیں اس مقام تک پہنچنے کے قابل بنایا۔ کتاب میں ۱۲ افسانے شامل کیے گئے ہیں جب کہ ''جمشید اقبال کی افسانہ نگاری — ایک جائزہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید قاسم جلال کا ایک مضمون بطور دیباچہ دیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے جمشید اقبال کی شخصی صفات اور ان کی افسانہ نگاری پر پُرمغز گفتگو کے بعد شاملِ کتاب افسانوں پر بھی مختصر اظہارِ خیال کیا ہے۔ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے آغاز میں

افسانہ نگاری کی وجوہات اور افسانوں کے موضوعات پر قلم اٹھانے کی بجائے ''نقشِ اول'' کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کے نام مگر پوسٹ نہ کیے گئے دو خطوط--- ۱۰ر مارچ ۱۹۹۳ء اور دوسرا ۱۰ر جنوری ۲۰۱۰ء--- کا حوالہ دے کر نہ صرف ادبی مراکز سے دور بیٹھے ایک جینوئن تخلیق کی ذہنی کیفیت کو آئینہ کیا ہے بلکہ اپنی نجی اور ادبی زندگی کے نشیب و فراز کو اس بالواسطہ اظہاریے میں جس خوبی سے بیان کیا ہے، وہ شاید بالواسطہ انداز میں قاری تک منتقل ہونا ناممکن تھا۔

کتاب کا نام بھی شامل کتاب افسانوں میں سے ایک افسانے کے عنوان ''ابن آدم کی مسیحائی'' سے منتخب کیا گیا ہے۔ دیگر افسانوں میں ''پکی اینٹ''، ''محرم''، ''پائل''، ''شریف آدمی''، ''ٹھنڈا سانس''، ''دہشت گرد''، ''پیشہ''، ''ہدف''، ''عہد''، ''چیل کا بچہ'' اور ''نئی زندگی'' شامل ہیں۔

ان بارہ افسانوں پر الگ الگ گفتگو کر کے ان کے فکری و فنی محاسن گنوانا ایک مکمل تنقیدی مضمون کا تقاضا کرتا ہے، جس کا نہ یہ موقع ہے اور نہ میرا مقصود۔ سردست اتنا ضرور کہوں گا کہ کسی ایک افسانوی مجموعے میں عصری حالات و مسائل کے شعوری سطح، ذہنی انجذاب و قبول کے ساتھ تخلیقی وفور سے اتنی تعداد میں کبھی پیش نہیں کیا گیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان معاشرتی مسائل و معاملات کے اظہار میں مصنف کا نکتۂ نظر مثبت اور مقصد کے تابع رہا ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اس جذبے کو کسی اصلاح پسند مبلغ کی طرح کسی قاری کے سر تھوپتا نظر نہیں آتا۔

مجھے یقین ہے کہ اپنی فکری بالیدگی اور منفرد پیرایۂ اظہار کی بدولت یہ افسانے ادبی حلقوں میں موضوعِ گفتگو بننے اور باذوق قارئین سے داد و تحسین وصول کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ خوب صورت افسانوی مجموعے کی اشاعت پر جمشید اقبال کو مبارک باد۔

عہدِ نو کا نمائندہ تخلیق کار--- ڈاکٹر سیّد قاسم جلال (تنقید)، مرتب: جمشید اقبال، ضخامت: ۱۶۰ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: مکتبۂ عکاس، اسلام آباد، مبصر: **ذیشان اطہر**

اس کتاب کا انتساب بھی مرتب نے ڈاکٹر قاسم جلال کے نام ان الفاظ سے کیا ہے:

فنِ شاعری میں اپنے محترم استاد
شمس الادب، امیر التعلیم، دھرتی کے لعل، شاعرِ باکمال
حضرت سیّد قاسم جلال کے نام
حضور نے مجھے اور نہ جانے کتنوں کو قلم پکڑنا سکھایا

'انتساب' کے صفاتی القابات اور محبت میں ڈوبے الفاظ کے ساتھ ساتھ جمشید اقبال کی ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات اور شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں لکھی گئی 'نظم' اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مرتب کے پیشِ نظر جہاں ڈاکٹر قاسم جلال کے حقیقی مقام و مرتبے کو سامنے لانا ہے، وہاں صاحبِ موصوف سے اپنی

قلبی وابستگی اور محبت وعقیدت کا اظہار بھی مقصود ہے۔

ڈاکٹر قاسم جلال اس حوالے سے ایک خوش قسمت تخلیق کار ہے کہ اس کے فن وشخصیت کے حوالے سے مختلف ادبی رسائل نے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں جن میں ماہنامہ ''فرید رنگ'' ڈیرہ غازی خان، ماہنامہ ''رشحات'' لاہور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اعتراف فن میں لکھی جانے والی کتاب میں ''قاسم جلال کا فن اور شخصیت'' از پروفیسر فراز اطہر اور زیرِ تبصرہ کتاب کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔

اس مختصر تبصرے میں ڈاکٹر قاسم جلال کے فکروفن کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں کہنا کہ یہ کام کتاب میں شامل قلمی معاونین احباب اپنی تخلیقات کے ذریعے مجھ سے بہتر انداز میں انجام دے چکے ہیں۔ میں یہاں صرف جمشید اقبال کے ذوقِ ترتیب وتدوین کی داد دینا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر کتاب کو مختلف زمروں میں تقسیم کرکے توازن اور تناسب کے حسن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

کتاب کو موضوعات کے حوالے سے ملاقات، مقالات، تاثرات، حالات اور منتخبات کے عنوانات دیے گئے ہیں۔

'ملاقات' کے حصے میں قاسم جلال سے مرتب کا ایک تفصیلی انٹرویو شامل ہے۔ 'مقالات' کے زمرے میں پچیس صائب الرائے اہلِ قلم کے مضامین شاملِ کتاب کیے گئے ہیں جو ڈاکٹر قاسم جلال کے فکر و فن کے اہم گوشوں کو منور کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی حصہ کتاب کا حاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر پروفیسر جمیل احمد عدیل، پروفیسر فدائے اطہر، ڈاکٹر سجاد پرویز، ڈاکٹر گل عباس اعوان، جاوید احسن، پروفیسر ذیشان تبسم اور پروفیسر اعتبار ساجد کی تحریریں پڑھنے والوں کے لیے ڈاکٹر قاسم جلال کی بہترین تفہیم میں معاونت کرتی نظر آتی ہیں۔

'تاثرات' کے عنوان کے تحت پندرہ اہلِ فکرونظر کی مختصر آرا کو شامل کیا گیا ہے جنھوں نے اپنے ممدوح کے فکروفن کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصی خوبیوں کو موضوع بنایا ہے۔

'حالات' کے ضمن میں قاسم جلال کے مختصر کوائف، کتب کی تفصیل اور تخلیقی زندگی کا اشاریہ دیا گیا ہے جب کہ آخر میں 'منتخبات' کا عنوان دے کر صاحبِ مذکور کی مختلف زبانوں کی نمائندہ شعری تخلیقات شاملِ کتاب کی گئی ہیں۔ الغرض کہا جاسکتا ہے کہ جمشید اقبال نے ملک کے طول وعرض سے قاسم جلال کے فکری وفنی سفر پر گہری نظر رکھنے والے اہلِ قلم کے تازہ مضامین شامل کرکے سنجیدہ ادب کے قاری اور تحقیق و تنقید کے طالب علموں کے لیے آسانیاں فراہم کی ہیں' جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

''جہانِ حمد —— قرآن نمبر'' (کتابی سلسلہ)، مرتب: طاہر حسین طاہر سلطانی، ضخامت: ۱۵۰ صفحات، قیمت: ۱۰۰ ار روپے، ناشر: جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی، مبصر: **پروفیسر سیما سراج**

''تم میں سب سے اچھا وہ شخص ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔'' (الحدیث)

اردو میں حمد کے موضوع پر اولین کتابی سلسلہ ''جہانِ حمد'' ہے جسے حمد و نعت کا ماخذ بھی کہا جا سکتا ہے۔ طاہر سلطانی نے ''جہانِ حمد'' کا قرآن نمبر شائع کیا ہے۔ گو یہ پہلا قرآن نمبر نہیں ہے۔ اس سے پہلے ''نقوش''، ''خاتون پاکستان'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے قرآن نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اب قرآن پاک پر غور و فکر کرنا اور خلق خدا کو اس سے آگاہ کرنا بڑا کام ہے۔

''جہانِ حمد'' کا قرآن نمبر ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کا ہر باب گراں قدر سرمایہ ہے۔ حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی موضوع رہ نہ جائے۔ نئے نئے موضوعات بھی قائم کیے جا سکیں تاکہ قرآن کے فیضان و اسرار عام ہو سکیں۔

قرآن پاک دینی معلومات کا خزینہ ہے۔ ایک دستورِ حیات ہے۔ کون سا شعبۂ حیات ہے جس پر اللہ نے اپنی منشا اور رضا بیان نہ کی ہو۔ قرآن پاک کے علمی خزانے تک رسائی کی ایک کوشش۔ یقیناً یہ نمبر ایک قابل قدر دستاویز کی صورت میں علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

تاریخ، تفسیر، حدیث، اخلاقیات، سیاسیات، نثر و شعری ادب، سائنس، غرض علمی، ادبی تحقیق میں قاری و محقق استفادہ کریں گے۔ اس نمبر میں نامور اسکالرز کے مقالات و مضامین کے ساتھ نامور شعرائے کرام کی منظومات بھی شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جناب طاہر سلطانی کی کاوشوں کو دیکھ کر ان پر رشک کرتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو رہتا ہوں۔''

میری اطلاع کے مطابق اردو میں حمد کے موضوع پر اولین ماہنامہ ''ارمغانِ حمد'' کے اڑسٹھ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ایسے شخص کو جو اللہ کے رستے پر چل رہا ہو اور دین کی خدمت کو اپنا مقصد بنا لے، جو رب کائنات کی کتاب کی بات کرے، اس کی اور اس کے محبوب کی حمد و ثنا میں مصروف ہو اور دعوت حمد و ثنا دے، اُسے دنیاوی ایوارڈ کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ تو طالب ہوتا ہے اللہ کی خوشنودی اور رحمت کا، یہی اس کا انعام ہے اور یہی حاصلِ زیست۔

پروفیسر خیال آفاقی لکھتے ہیں کہ ''جہانِ حمد کا قرآن نمبر میرے پیش نظر ہے۔ اس کے عنوانات و موضوعات کو دیکھ کر میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ اس عظیم کام پر میں ان کی کن الفاظ میں تحسین کروں کیوں کہ حسنِ ترتیب میں جو تنوع اور خوب صورت انداز پایا جاتا ہے، اس نے اس نمبر کو ایک شاہکار اور اہم دستاویز بنا دیا ہے جو اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ محققینِ قرآن اس نمبر کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

میں پروفیسر خیال آفاقی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس بامقصد کاوش کو درجۂ قبولیت سے سرفراز فرمائے۔ اس کے ساتھ ہی حمد و نعت ریسرچ سینٹر کا قیام جدید تقاضوں کے مطابق ان کا خواب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس خواب کو بھی جلد تعبیر عطا فرمائے۔ آمین۔

مٹی ملے خواب (شاعری)، شاعر: علی افتخار جعفری، ضخامت: ۸۹ صفحات، قیمت: ۱۷۵ روپے، ناشر: القا پبلی کیشنز، ۱۲۰۔ کے، مین بلیوارڈ، گلبرگ ۲، لاہور۔ ۵۴۶۶۰، مبصر: سلیم یزدانی

علی افتخار جعفری نوجوان شاعر ہیں۔ گاہے گاہے ان کا کلام بعض رسائل میں نظر سے گزرتا رہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو اس وقت اچھا شعر کہہ رہے ہیں اور جن سے بجا طور پر آئندہ کے لیے اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ''مٹی ملے خواب'' علی افتخار جعفری کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں صرف غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ البتہ آخر میں ''لخت لخت'' کے عنوان سے فرد فرد اشعار بھی دیے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں افتخار جعفری کی ۴۹ غزلیں شامل ہیں۔

اس مختصر مجموعے میں جو کلام شائع ہوا ہے، اس کے بارے میں پہلی بات تو یہ کہی جاسکتی ہے کہ شاعر نے بہت دیکھ بھال، چھان پھٹک اور پوری ذمے داری سے منتخب کرکے اسے کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ اس لیے کہ یہ اندازہ تو بہت آسانی سے ہوجاتا ہے کہ علی افتخار جعفری ان شاعروں میں نہیں ہیں جو چھپنے چھپانے اور شہرت کی منزلیں طے کرنے کی عجلت میں ہوتے ہیں۔ ان کا جو کلام رسائل میں بھی نظر سے گزرتا رہا ہے، وہ ان کی فنی ریاضت اور سنجیدگی کا پورا تاثر دیتا ہے، لیکن اس مجموعے کو مرتب کرتے ہوئے تو انھوں نے اور زیادہ بردباری سے کام لیا ہے اور صرف وہی غزلیں شامل کی ہیں جنھیں وہ اپنے اصل creative self کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔

اس مجموعے کے مطالعے سے دوسری جس بات کا اندازہ ہوتا ہے، وہ شاعر کا فن کارانہ احساس ہے۔ علی افتخار جعفری کا شاعرانہ احساس دل، دنیا، حقیقت، وجود، روح، فنا اور بقا کے سوالوں سے گوندھا ہوا ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں، انسانوں کے بارے میں، انسانی جذبوں کے بارے میں، دنیا کی حقیقتوں کے بارے میں مسلسل سوچنے والا ذہن رکھتے ہیں۔ یہ ذہن اپنے استفسارات کے زیر اثر ایک مسلسل اضطراب میں رہتا ہے۔ تاہم یہ اضطراب کسی فلسفی کے انداز نظر کا نہیں ہے بلکہ اس کا سارا کا سارا معاملہ ایک شاعر کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی افتخار جعفری اپنی فکر اور اس کے اٹھائے ہوئے سوالوں کو احساس کی سطح پر نہ صرف اپنے اندر اتارنے میں کامیاب رہتے ہیں بلکہ انھیں شعر کا قالب عطا کرکے اپنے قاری تک پہنچانے میں بھی سرخ رُو نظر آتے ہیں۔

تیسری بات جو میں نے محسوس کی، وہ یہ کہ ''مٹی ملے خواب'' کا شاعر اپنی شعری روایت اور اس کی تہذیب کا پورا شعور رکھتا ہے۔ وہ اس تہذیب میں بیان کی نزاکت اور لطافت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے زمانے کے علوم، ادب کے اسالیب اور انسانی احساس کی کیفیات سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی شاعری کا لحن قدیم وجدید کی آمیزش سے تیار ہوا ہے اور آج کے نئے اور بامعنی اظہار کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس مختصر تبصرے میں تفصیل سے بحث کرنے کی زیادہ گنجائش نہیں، اس لیے میں صرف چند اشعار کو مثال کے طور پر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا:

کیسی آتش میں گھری خلق اماں ڈھونڈتی ہے
کون چلاتا ہے، ''پانی''، کوئی سنتا ہی نہیں

راستہ بھولتے پھرتے ہیں مسافر سرِ شام
ہم نے رکھا ہے قدم قریۂ آفات میں کیا

حسرتِ چشمِ جہاں میں ترا حاصل معلوم
ایک آنسو ہے فقط دیدۂ حیران کے بیچ

نیند آتی ہے مگر جاگ رہا ہوں سرِ خواب
آنکھ لگتی ہے تو یہ عمر گزر جاتی ہے

یہ اشعار یوں ہی کسی خاص محنت اور انتخاب کے بغیر چن لیے گئے ہیں لیکن ان سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ان کا خالق اپنے وقت، انسانی احساس، حقیقت اور خواب کے کتنے ہی رنگوں کو شعر میں گوندھنے کا ہنر جانتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت ہم عصر اردو شاعری کے نئے لہجے سے ہمیں آشنا کرتی ہے اور اس کے مستقبل کے امکانات کا اشارہ دیتی ہے۔

خواب کا رشتہ (افسانے)، افسانہ نگار: شہناز خانم عابدی، ضخامت: ۱۹۶ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: اکادمی بازیافت، آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، اسٹریٹ نمبر ۳، اردو بازار، کراچی، مبصر: **عدیل انصاری**

شہناز خانم عابدی کی افسانہ نگاری سے میں اس سے قبل واقف نہیں تھا۔ ان کا ایک افسانہ تو ''مکالمہ'' کے افسانہ نمبر میں نظر سے گزرا تھا لیکن اس سے قبل یا بعد میں انھیں کسی اور رسالے میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب ان کا یہ مجموعہ دیکھا تو خوش گوار حیرت ہوئی کہ ان کے پاس اتنا تخلیقی سرمایہ تھا کہ باقاعدہ ایک مجموعہ ترتیب دیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک عرصے سے افسانے لکھ رہی ہیں، یہ الگ بات کہ انھوں نے چھپنے چھپانے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ رسائل میں چھپنے کا یہ فائدہ تو بہر حال ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر کے قارئین کا ایک حلقہ بن جاتا ہے جو اُس کے نام اور کام سے بہ خوبی واقف ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب جب کتاب شائع ہوتی ہے تو اس کے خریدار خود بہ خود سامنے آنے لگتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہر ادیب یا شاعر اس کو اصول بنا کر اس کی پابندی کرے۔ بعض لوگ رسائل میں چھپ کر شہرت حاصل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ براہِ راست اپنی کتاب کی اشاعت کے قائل ہوتے ہیں۔ آج کے ادب پر نظر ڈالیے تو ایسے لوگوں میں مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر اسلم فرخی کا بھی یہی مزاج

ہے۔ شہناز خانم عابدی بھی اسی انداز نظر کی افسانہ نگار ہیں۔

''خواب کا رشتہ'' میں کل سترہ افسانے شامل ہیں اور یہ شہناز خانم عابدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ لیکن اس مجموعے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک باشعور اور پختہ کار افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے ہر افسانے میں کسی نہ کسی مسئلے اور زندگی کے کسی نہ کسی ایک پہلو کو اپنی نگاہ سے دیکھنے اور اپنے کرداروں کے ذریعے قاری کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان افسانوں میں ہمیں اپنے معاشرے کے کرداروں کے ساتھ ساتھ مغرب کے کرداروں کو بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ شہناز خانم عابدی ایک کامیاب افسانہ نگار کے طور پر اپنے سب کرداروں کو ابھرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور ان کے مسئلے کو بھی ان کے حالات اور کیفیت کے مطابق نمایاں کرتی ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں افسانے کے اندر اور اس کی مخصوص فضا کے مطابق بڑے فطری انداز میں ہوتی ہیں اور ہمیں یہ نہیں لگتا کہ افسانہ نگار نے غیر ضروری طور پر دخل اندازی کر کے افسانے کو یا اس کے کرداروں کو ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے کئی افسانے خاص طور سے ہمیں اپنی آج کی زندگی کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جن میں ''مکافات''، ''وہ ایک لمحہ''، ''صبح کمرہ'' اور ''امانت'' کا میں ضرور ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس مجموعے میں شامل ایک اور کہانی ''جنجال'' نے بھی بہت متاثر کیا۔ شہناز خانم عابدی نے ان سب افسانوں کو بہت سنبھل کر اور تجربے اور احساس کی سچائی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اسی لیے قاری کے ذہن اور دل پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس مجموعے کے بعد ہمیں ان کی نئی کتاب کا انتظار رہے گا۔

جمالِ حرف راز (شاعری)، شاعر: رفیع الدین راز، ضخامت: ۳۵۲ صفحات، قیمت: ۳۵۰ روپے، ناشر: رحمن بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی، مبصر: **عدیل انصاری**

رفیع الدین راز سینئر شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف مثلاً غزل، نظم، قطعات اور رُباعیات میں اپنا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے منظوم سیرۃ النبی بھی قلم بند کی ہے۔ انھوں نے ترویئی، ہائیکو اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک پختہ شاعر ہیں اور شاعری کی ہر صنف میں اظہار کی قدرت رکھتے ہیں۔

''جمالِ حرف راز'' اصل میں رفیع الدین راز کا کوئی نیا شعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ اس سے پہلے شائع ہونے والے چار مجموعوں ''دیدۂ خوش خواب''، ''بینائی''، ''پیراہن فکر'' اور ''اتنی تمازت کس لیے'' سے منتخب کی گئی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے آخری حصے میں کچھ تازہ غزلیں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ اس کتاب میں رفیع الدین راز کی کل ایک سو پچیس غزلیں شامل ہیں۔ یہ انتخاب ضیا خان ضیا نے کیا ہے۔ وہ رفیع الدین راز کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں کس قسم کے جذبات و احساسات رکھتے ہیں، اس کا اظہار انھوں نے اپنے مختصر سے مضمون میں کیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں یونس حسن کا ایک تفصیلی

مضمون شامل ہے جس میں انھوں نے رفیع الدین راز کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے اور ان کے کلام کے محاسن بیان کیے ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو یہ مجموعہ رفیع الدین راز کی تو اپنی شاعری سے ہمیں پوری طرح متعارف کرا دیتا ہے۔ ان کی غزل کا موڈ، ان کا انداز بیان، ان کے فن کی خصوصیات کا اندازہ ہمیں اس مجموعے سے باآسانی اور بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ رفیع الدین راز ایک حساس دل انسان ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک حساس انسان کی کیفیات کا اظہار ہوا ہے۔ وہ زندگی کی تبدیلیوں اور انسانوں کے درمیان ہونے والی تفریق پر غور کرتے ہیں۔ انسانوں کے بدلتے ہوئے رویوں اور ذہن و دل پر ان کے اثرات کے بارے میں سوچتے ہیں۔ شاعری کا ایک تعلق شاعر کے خوابوں اور اس کی آرزوؤں سے بھی ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ہم دیکھتے ہیں کہ رفیع الدین راز کے خوابوں کے ساتھ ان کے دور کے انسان کی حقیقتوں کا بھی بہت باقاعدگی سے اظہار ہوا ہے۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات میں بند نہیں، بلکہ اپنے زمانے اور اس کے حالات سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق نے ان کے دل پر اور ذہن پر جو اثر چھوڑا ہے، وہ انھوں نے اپنی شاعری میں کامیابی سے بیان کیا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

پا بہ جولاں زندگی کا بانکپن
موت رقصاں کوچہ و بازار میں

ہر آدمی آئینے سے خائف ہے ابھی راز
ہونٹوں پہ ابھی حرف گریزاں ہی رہے گا

وقت کا جھونکا مرے ہاتھوں سے آ کر لے گیا
خوش نصیبی کی لکیریں اک سکندر کے لیے

بظاہر خشک دریا پاؤں میں ہے
مگر میں ہوں کہ ڈوبا جا رہا ہوں

گہرا زخم (ناول)، مصنف: شاعر علی شاعر، ضخامت: ۲۱۰ صفحات، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر: مثالی ادب، کراچی، مبصر: ضیاء الرحمٰن

"گہرا زخم" ایک رومانی ناول ہے جس کی فضا شروع سے آخر تک ایک خاص موڈ اور خاص کیفیت میں رنگی ہوئی ہے۔ اس ناول کے کردار، اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات، ان کی ذہنی

کیفیات۔ یہاں تک کہ اُن کے اظہار کے انداز اور مکالمات میں بھی ہمیں اسی موڈ اور کیفیت کا رنگ مسلسل جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول نگار نے اس ناول کو جس طرح سوچا اور جو رنگ اسے دینا چاہا، وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہا ہے۔

اس ناول کے مطالعے کے آغاز میں ہی ہمیں اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ شاعر علی شاعر نے اس ناول کا مزاج عوامی سطح کا رکھا ہے اور اس کی کہانی کا انداز ویسا ہی ہے جیسا کثرت سے پڑھے جانے والے ڈائجسٹوں میں چھپنے والے ناولوں، ناولٹوں یا افسانوں کا ہوتا ہے، جن میں پڑھنے والے کو وقت گزاری کے لیے معاشرے میں آئے دن نظر آنے والے کرداروں کا قصہ، ان کی روداد، ابتلا، ان کے مسائل اور ان پر گزرنے والی مصیبتوں کا حال دل چسپ انداز میں سنایا جاتا ہے۔ شاعر علی شاعر نے بھی اس ناول میں ہمیں ایسے ہی کرداروں سے ملوایا اور ان کا قصہ سنایا ہے۔

اس ناول میں ہمیں اپنے معاشرے میں انسانوں کو پیش آنے والے حالات کا مطالعہ کرنے اور ان کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ امیر کس طرح غریب کا استحصال کر رہا ہے۔ اسے صرف معاشی طور پر ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی کس طرح اپنی ضرورت اور خواہشوں کی تکمیل کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ غربت اور مجبوری کس طرح خود ماں باپ کو اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں بیچنے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ خواب دیکھنے اور محبت کرنے والے دل کس طرح زندگی کی اندھی حقیقتوں کی بھٹی میں جل جاتے ہیں۔ ان ساری چیزوں کو ہم اس ناول میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ ناول عوامی ذوق اور دل چسپی کے معیار پر پورا اُترے گا اور ڈائجسٹ کے مزاج کی رومانی کہانیاں پڑھنے والے قارئین میں مقبولیت حاصل کرے گا۔

کتاب کے آخر میں کئی ادیبوں کے مضامین دیے گئے ہیں جن میں ناول نگار کے فن اور ان کے کرداروں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان مضامین کے ذریعے ناول نگار اور ان کے فن پر روشنی پڑتی ہے۔

☆☆☆

ممتاز شاعر، نقاد اور دانشور پروفیسر سحر انصاری کی زیرِ سرپرستی

عصری ادب کی شان دار دستاویز

سہ ماہی ادبی سلسلہ

ترتیب: [illegible]

ہر شمارہ خصوصی شمارہ

رابطہ:

C-147، بلاک J نارتھ ناظم آباد

کراچی۔ 74700

Book Series
Mukalama Karachi.